[illegible]

نقوش

شمارہ ۱۰۴
جنوری سنہ ۱۹۶۶ء

مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

قیمت فی پرچہ [illegible]

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۲۵ روپے

ترتیب

مقالے

نظمیں، غزلیں

محمد طفیل ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

لاہور
کا
چیلسی

حکیم احمد شجاع

[illegible]

[illegible] ہے ۔ انکی ادبی زندگی کا آغاز [illegible]
ہے جب ان کے بزرگ حکیم شہباز دین کے [illegible]
شہزاد، ارشد گورگانی اور ناظر حسین ناظم [illegible]
حکیم احمد شجاع کی تربیت کی تھی ۔ اس [illegible]
دلی اور میرٹھ کے قیام اور لاہور کی تربیت نے انکے [illegible]
کے پیرائے میں ادبی کارنامے انجام دینے کا [illegible]
مذہب اور انسان کا رشتہ قریب کا تھا ۔ زندگی [illegible]
تسلیم کرتی تھی ۔ مذہبی نقطہ نظر کو زندگی کے [illegible]
انسانی سیرت معاشرتی علوم سے بہرہ مند تھی ۔ [illegible] ایک خاص رشتہ
تھا ۔ اسلام کی تعلیمات اور قرآن پاک کے احکام نے حکیم احمد شجاع کے ذہن کی تشکیل کی ۔
ان کی اصلاح پسندی اسی نظام حیات سے کسب فیض کرتی ہے ۔ [illegible]
مظلوموں کی حمایت جیسی بنیادی انسانی اقدار اسلام اور [illegible]
ہیں ۔ اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ۔ جس ماحول میں حکیم احمد شجاع [illegible] یہ انکا
لازمی نتیجہ ہے ۔ ادیب اپنے ماحول سے اثر لیتا ہے ۔ حکیم احمد شجاع نے جس ماحول میں
پرورش پائی ہے اس میں ان اقدار کو اسی سیاق و سباق ہی سے دیکھا جاتا تھا لیکن یہ کسی
تقلید محض یا ذہنی بے دست و پائی کا نتیجہ نہیں ۔ وہ اپنے ماحول کے نقاد بھی ہیں اور مصلح
بھی ۔ مذہب کو انہوں نے رسمی لباس کے طور پر قبول نہیں کیا ۔ اسکی روح تک رسائی حاصل
کی ہے ۔ اس لئے انکے اظہار میں خلوص اور بیان میں وہ فنکارانہ بصیرت پائی جاتی ہے جو ہر
اچھے صاحب فن کے لئے ضروری ہے ۔

حکیم صاحب کے ادبی سرمائے کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔
افسانہ نگاری' ڈراما نویسی اور شاعری ۔ ''حسن کی قیمت'' حکیم صاحب کے پانچ افسانوں کا
مجموعہ ہے ۔ انہوں نے ''اندھا دیوتا'' ۱۹۱۳ء میں لکھا ۔ [illegible] ۱۹۱۵ء میں ۔
''آرام شاہ کی بیٹی'' ۱۹۱۵ء میں اور حسن کی قیمت ۱۹۱۷ء میں ۔ افسانوں کا یہ مجموعہ ۱۹۲۲ء
میں منظر عام پر آیا ۔

حکیم احمد شجاع اردو نثر نگاری کے ایسے دور سے متعلق ہیں جب نثر کو محض اظہار
کا وسیلہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اسکی نوک پلک سنوار کر اسے دلکش اور جاذب بنانا بھی
ضروری تھا ۔ نثر نگاری میں یہ ریاض انکی تحریر کو نکھار گیا ۔ اپنے دور کے رومانی طرز کے
زیر اثر حکیم صاحب نثر میں شاعری اور مصوری کو ضروری خیال کرتے ہیں ۔ اور بعض جگہ
تو انہوں نے نثر کو بالکل شعر کی سرحدوں سے ملا دیا ہے ۔ زبان و بیان کا یہ چٹخارہ انکے
افسانوں کے علاوہ ڈراموں اور عام نثری تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے ۔

حکیم احمد شجاع کی ڈراما نگاری کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں
کے معاشرتی مسائل پر سب سے پہلے قلم اٹھایا ۔

حکیم احمد شجاع کے ادبی کارناموں کا تیسرا حصہ انکے شعری مجموعوں پر مشتمل ہے ۔
''خون بہا'' انکی آپ بیتی کے علاوہ کلام کا مجموعہ بھی ہے ۔ دوسرا مجموعہ ''گرد کارواں''
کے نام سے شائع ہوچکا ہے ۔ اس شاعری میں بھی اصلاح (خاص کر اخلاقی اصلاح) کا پہلو
نمایاں ہے ۔ وہ اخلاقی اقدار کے علمبردار ہیں ۔ انکی نظر میں انسانی معاشرے کی بنیادی فکر
اخلاق ہے ۔ یہی نقطہ نظر انکے افسانوں اور ڈراموں میں جاری و ساری ہے ۔ اور اسی کو انہوں
نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ۔ اس دور میں جبکہ ہمارے معاشرے میں اخلاق کی کیفیت
ہے اور اس تنزل کی سب سے زیادہ زد اخلاقی اقدار پر پڑی ہے حکیم صاحب کے کلام ان کے
افسانوں اور ڈراموں سے ہمارے نوجوان بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔

حکیم احمد شجاع کا نام تاریخ ادب اردو میں ایک افسانہ نگار اور ڈراما نویس کی
حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)



حکیم احمد شجاع



حکیم احمد شجاع

یکم جون ۱۹۶۴ء کو بی بی سی لنڈن سے میرے ایک بہت ہی عزیز دوست ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے ادیبوں شاعروں اور لنڈن کے اس مشہور محلے کے متعلق جو "چیلسی" سے موسوم ہے اور لنڈن کے مضافات میں واقع ہے ایک نہایت بصیرت افروز اور معلومات افزا نشریہ کیا جس کے یہ چند اقتباسات اس مضمون کو قلمبند کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔

"چیلسی کی فضا لنڈن کے دوسرے محلوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں قدم قدم پر یوں محسوس ہوتا ہے گویا ماضی دوبارہ زندہ ہو کر مرئی صورت میں سامنے آگیا ہے۔ ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور فن کاروں کے مکان اس کثرت سے یہاں ہیں کہ یہ شرف غالباً لنڈن کے کسی اور محلے کو حاصل نہ ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ اب قدیم روایات کی پابندی اس شدت سے نہیں کی جاتی اور ادبا و شعرا کا شیرازہ ایسا بکھر رہا ہے کہ یہ لوگ لنڈن کی گنجان آبادی کو چھوڑ کر یہاں سے تیس تیس چالیس چالیس میل دور جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی چیلسی کی شان کسی حد تک قائم ہے۔ آج بھی لارڈ برٹرنڈ رسل جیسے شہرہ آفاق مصنف سر مائیکل ریڈ گریو جیسے نامور ایکٹر، آگسٹس جان جیسے بلند پایہ مصور اور جان آرمیٹیج جیسے مشہور عالم مغنی چیلسی میں رہتے ہیں۔

چیلسی میں اگرچہ اب نئی وضع قطع کے مکان بھی بنتے جا رہے ہیں لیکن بیشتر گلی کوچوں میں مکانوں کی طرز تعمیر وہی پرانی ہے جو آج سے سو دو سو سال پہلے تھی۔ اس لیے تاریخی تسلسل ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے قائم ہے۔ قہوہ خانوں کے اندر جھانک کر دیکھیے تو ماحول کچھ الوکھا سا نظر آتا ہے۔ روشنی عمداً اس قدر مدھم کی گئی ہے کہ در و دیوار پر تاریکی کا سایہ پڑتا ہے۔ چھت کے شہتیر اور کڑیاں نمایاں کر کے دکھائی گئی ہیں۔ ساز و سامان سے بھی دور حاضر کا تعلق نہیں بلکہ ماضی کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔

آج سے چار سو سال پہلے چیلسی ــــــ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو لنڈن شہر کے مضافات میں آباد تھا۔ جب سولھویں صدی کے وسط میں سر ٹامس مور نے یہاں اپنا مکان بنوایا تو چیلسی کو پہلی مرتبہ شہرت حاصل ہوئی۔ پھر مشہور مصور ہنبز ہولبائن یہاں آکر مقیم ہوا۔ اٹھارھویں

...کے اوائل میں گلیورز ٹریولز کا مصنف سوفٹ یہاں رہتا تھا۔

چیلسی کی حقیقی شہرت کا دور اس وقت شروع ہوا جب ٹامس کارلائل اپنا وطن چھوڑ کر لندن آیا۔ اور چیلسی کے محلے میں رہنے لگا۔ یہ واقعہ ۱۸۳۴ء کا ہے۔ کارلائل پورے سینتالیس سال ایک ہی مکان میں رہا اور یہیں ۱۸۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنی تمام کتابیں ایک ایک کر کے اسی مکان میں لکھی تھیں۔ خوش قسمتی سے یہ مکان ایک عجائب گھر کی طرح محفوظ کر دیا گیا ہے جس میں کارلائل کا گھریلو سامان کم و بیش اسی ترتیب سے رکھا ہے جیسا اس کی زندگی میں تھا۔ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔

ہانس سلون ایک دوسرا عظیم الشان شخص تھا جس نے چیلسی میں رہائش اختیار کی۔ سلون اسکوائر اور سلون سٹریٹ اسی کے نام سے منسوب ہیں۔ سلون پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا لیکن اس نے اپنی زندگی میں کتابوں کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک کے نوادر بھی اکٹھے کیے تھے۔ مرتے وقت یہ تمام چیزیں وہ قوم کو دے گیا۔ چنانچہ اسی ذخیرے سے برٹش میوزیم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

انیسویں صدی میں جو ادیب اور شاعر چیلسی میں آکر آباد ہوئے ان میں جارج ایلیٹ، لی ہنٹ، ڈی جی روزیٹی، رسکن، سوئن برن، اور آسکر وائلڈ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے میدان میں یکتائے زمانہ تھے۔ ٹرنر اور وسلر جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصوروں کے مکان بھی اسی محلے میں تھے۔ تھیٹر کی مشہور ایکٹریس ایلن ٹیری بھی یہیں رہتی تھی۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد ———" جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔"

چیلسی کا ایک حصہ تو شہری آبادی سے ملحق ہے اور دوسرا حصہ دریائے ٹیمز کے کنارے تک پھیل گیا ہے۔ یہ حصہ بے حد خوبصورت ہے۔ فراخ اور کشادہ سڑک کے ساتھ ساتھ عین لب دریا ایک پختہ بند باندھ کر سیرگاہ بنائی گئی ہے جو وسعت میں کئی میل لمبی ہے۔ دریا کے اس طرف ایک بڑا بیٹر پارک ہے جہاں گرمیوں کے موسم میں میلہ لگتا ہے۔ جو پورے چھ مہینے جاری رہتا ہے۔

گزشتہ ماہ جون میں جب ڈاکٹر عاشق حسین لاہور آئے تو مجھ سے ملے۔ تو دس برس کے بعد انہیں دیکھ کر جو مسرت مجھے حاصل ہوئی، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان ملاقاتوں کے دوران انہوں نے اور کئی علمی اور فنی مباحث کے علاوہ اس مضمون کا بھی ذکر کیا جو انہوں نے لندن کے چیلسی کے بارے میں بی بی سی لندن سے نشر کیا تھا۔ اور پھر یہ قصہ سنایا کہ:-

"میرے ایک انگریز دوست نے جو اپنی ملازمت کے سلسلے میں چند سال لاہور میں بھی بسر کر

بیچ ہی باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا کہ لاہور کے کس محلے کو آپ لاہور کا چیلسی کہنا پسند کریں گے؟ ان کے اس عجیب و غریب اور دلچسپ سوال نے لاہور کا پورا نقشہ میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور میں نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا کہ بھاٹی دروازہ ایک لحاظ سے لاہور کا چیلسی کہلانے کا مستحق ہے۔

انہوں نے پوچھا کہ اس کی وجہ؟

میں نے عرض کیا کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے بھاٹی دروازہ لاہور کے اُدبا و شعرا کا سب سے بڑا مسکن تھا۔ علامہ اقبال وہاں رہتے تھے۔ سر عبدالقادر نے وہیں سے اپنا مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا تھا۔ آغا حشر کا قیام بھی وہیں تھا۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی جب لاہور تشریف لائے تھے تو انہوں نے بھاٹی دروازے ہی میں قیام فرمایا تھا۔ چوہدری سر شہاب الدین جو پنجاب اسمبلی کے سپیکر ہونے کے علاوہ پنجابی زبان کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے۔ فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید نور الدین جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ مشہور مرثیہ گو شاعر سید ناظر حسین ناظم لکھنوی کا مکان بھی بھاٹی دروازے ہی میں تھا۔ غرضیکہ لاہور کی تاریخ میں ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ بھاٹی دروازہ نہ صرف ادیبوں اور شاعروں کا سب سے بڑا مسکن تھا بلکہ اکثر علمی اور ادبی محفلیں بھی وہیں گرم ہوتی تھیں۔

میرے انگریز دوست یہ جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن مجھے خیال ہوا کہ اس ملک کے باشندوں نے تو چیلسی اور چیلسی کی قدیم روایات پر بیسیوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور ہمارے وہاں کوتاہ قلمی کا یہ عالم ہے کہ کسی کو "لاہور کے چیلسی" یعنی بھاٹی دروازے پر ایک مضمون لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

اس تذکرے کے بعد ڈاکٹر عاشق حسین نے مجھ سے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ اگر آپ یہ کمی پوری کر دیں۔ آپ کا خاندان صدیوں سے بھاٹی دروازے کے اندر آباد ہے اور آپ اس کی پرانی روایات سے خوب واقف ہیں۔ اگر ان تمام ادیبوں شاعروں اور دوسرے نامور لوگوں کے حالات کسی یکسں طرح محفوظ ہو جائیں، جو کبھی لاہور کے بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے کی حدود کے اندر رہتے تھے، تو یہ تحریر نہ صرف لاہور کے اس مشہور مقام کی تاریخی حیثیت کو منظرِ عام پر لے آئے گی بلکہ اس سے دنیائے علم و ادب کے ذہن میں ان لوگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی جو کبھی یہاں رہتے تھے اور جن کے دم قدم سے ان کے اپنے اپنے زمانے میں علم و فن کی شمع روشن رہی۔

اب کہ عمرِ رواں کا کارواں زندگی کے سفر کی ستر منزلیں طے کر چکا ہے اور ڈاکٹر عاشق حسین بھی اپنی تقریر میں انہیں نامور لوگوں میں سے دو چار ایسے بزرگوں کا ذکر کر چکے ہیں جو اس زمانے میں بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور جن کی یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کمی پوری کر دوں جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ اور ان تمام ادیبوں، شاعروں اور دوسرے نامور لوگوں کے حالات مختصر طور

پر لکھ دوں کہ میرے سامنے بھاٹی دروازے اور ٹکسالی دروازے کی حدود کے اندر رہتے تھے اور جن کے کارنامے کی درخشانی سے صرف لاہور ہی کی نہیں بلکہ سارے پنجاب کی قومی مجلسی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق منور ہیں۔ اور جن کی زندگی کے کارنامے ہماری پرانی تہذیب کے امتیازی آثار ہیں۔

لاہور ایک بہت ہی پرانا شہر ہے۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ رام چندر جی کے دو بیٹے تھے۔ لو ہو اور کسو۔ لو ہو نے لاہور آباد کیا اور کسو نے قصور۔ انقلابات زمانہ کے ہاتھوں لاہور کئی بار آباد ہوا اور آباد ہو کر اجڑا۔ کبھی تو یہ شہر اس جگہ واقع تھا جہاں آج کل اچھرہ آباد ہے اور کبھی اس مقام پر جو اب نواں کوٹ سے موسوم ہے۔ بہر حال مغلوں کے زمانے میں لاہور اسی جگہ آباد تھا جہاں آج کل آباد ہے جب شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر نے اپنے بھائیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے لاہور کو اپنا عسکری مرکز بنایا تو اس وقت لاہور کا قلعہ تعمیر ہوا۔ یہ جگہ لاہور کے شمال مغرب میں ایک وسیع و عریض اور اونچے ٹیلے پر واقع تھی۔ پنجابی زبان میں کسی مقام کی سطح مرتفع کو ٹبی کہتے ہیں اور اسی لیے لاہور کا وہ علاقہ جو مستی دروازے سے لے کر بھاٹی اور ٹکسالی دروازوں کی حدود کے اندر واقع ہے "ٹبی" کہلاتا ہے۔ شاہجہان کے وقت میں لاہور تین حصوں میں منقسم تھا۔ ٹبی، میانی اور چوک دارا شکوہ۔ ٹبی کی حدود کے اندر ایک تو قلعہ تھا اور اس کے مضافات میں شاہی ٹکسال، دارو خانہ، اور امرائے حکومت کی حویلیاں۔ میانی کا علاقہ چوک دارا شکوہ اور ٹبی کے درمیان واقع تھا۔ آج کل یہ محض ایک قبرستان ہے بلکہ میانی کا نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے قبرستان کا تصور آجاتا ہے۔ اس وقت شہر لاہور کا بیشتر حصہ اسی مقام پر واقع تھا شہر کا یہ حصہ نواں کوٹ سے شروع ہو کر ایک طرف بھاٹی دروازے تک اور دوسری طرف مزنگ جس کا اصلی نام "مرزنگ" ہے اور اچھرے تک پھیلا ہوا تھا۔ چوک دارا شکوہ شہر کے اس حصے کا نام تھا جو دہلی دروازے سے شروع ہو کر ایک طرف شاہو کی گڑھی اور حضرت میاں میر علیہ الرحمۃ کے مزار مقدس تک اور دوسری طرف بدھو کے آوے سے لے کر باغبان پورے تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اس مقام کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے جو اس وقت ٹبی کہلاتا تھا اور جس کی حدود میں وہ علاقہ شامل ہے جو بھاٹی دروازے سے لے کر ایک طرف ٹکسالی دروازے تک اور دوسری طرف ہیرا منڈی میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی سے گزر کر مستی دروازے تک پھیلا ہوا ہے کہ یہی علاقہ اس مضمون کا موضوع ہے۔ ہاں یہ کہہ دینا بھی لازم ہے کہ بھاٹی دروازہ کا نام اصل میں بھٹی دروازہ تھا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں مغلوں کی سلطنت سے پہلے بھٹی قوم کے جنگجو دلیروں نے فتح ملتان کے بعد لاہور آکر پڑاؤ ڈالا تھا۔ استداد زمانہ سے بگڑتے بگڑتے بھٹی دروازہ بھاٹی دروازہ ہو گیا۔ بھاٹی دروازے کی تاریخی حیثیت سے قطع نظر چونکہ مجھے اس علاقے کی بعض ان سرگرمیوں کا ذکر کرنا ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر عاشق حسین نے اسے "لاہور کے چیلسی" سے موسوم کیا ہے اس لیے میں اب اس مضمون کے اصلی موضوع کی طرف آتا ہوں۔

جب بھاٹی دروازے کے اندر داخل ہوں تو کچھ دور چل کر بائیں طرف ایک کوچہ ہے جسے کوچہ چڑ نگاں کہتے ہیں۔ آج سے کوئی ساٹھ ستر برس پہلے اسی کوچے کے ایک مکان میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جیسے نامور ماہر السنۂ مشرقیہ کے استاد مولوی اصغر علی روحی رہتے تھے۔ یہ گویا کرامت تھے اور سرچشمہ ہدایت و رشد۔ ان کے درس کلام مجید کا شہرہ دور دور تھا۔ بعد میں انھوں نے کشمیری بازار میں بھی قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ بڑے پاک باطن اور فرشتہ صفت انسان تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کی صورت دیکھ

صحبت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جو بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اور اس زمانے میں جب تک سنٹرل ماڈل سکول لاہور سے رہا اسی کوچے کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے مولانا کی شاگردی کے فیضِ صحبت ہی سے عربی اور فارسی کے علوم میں وہ دستگاہ حاصل کی جو آگے چل کر ان کی ناموری کا باعث ہوئی اور جس کی بدولت اُنھوں نے ان دونوں زبانوں کی مشہور کتابوں اور دستاویزوں کے متعلق بڑی کاوش اور کوشش سے ریسرچ کی۔ ان کی تصانیف میں سے "فہارس العقد الفرید لابن عبد ربہ" جو ان کی پندرہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے اور چودہ سو صفحات پر مشتمل، پنجاب یونیورسٹی نے جلدوں میں شائع کی۔ مولوی محمد شفیع کے اہم علمی کارناموں اور تحقیقی دستاویزات کی فہرست اتنی طویل ہے اور ان کے مندرجات اس قدر تفصیل کہ اس مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ یہاں تو ان کے ذکر سے بس یہی مدعا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی بھاٹی دروازے کے اندر اس علمی اور ادبی ماحول میں گذری جو اس مضمون کا موضوع ہے۔

اورینٹل کالج لاہور کے پُرانے اُستادوں میں چار پانچ ایسے بزرگ ہیں جن کا نام اُس وقت بھی لوگ عزت و احترام سے لیتے تھے اور جن سے آج بھی اس احترام کے نقوش اُبھرتے ہیں جو اُس زمانہ کے اُستادوں کے علمی تصرفات کا خراج مقصود ہوتا تھا۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے یا دروازے کی خوبیِ قسمت کہ یہ سب لوگ بھاٹی دروازے ہی کے اندر بستے تھے۔ اور شاید اس لیے کہ یہ علاقہ اورینٹل کالج سے بہت ہی قریب تھا۔

اورینٹل کالج اپنے ابتدائی زمانہ میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں واقع تھا۔ اگر میں ان صاحبانِ علم و فضل کے کمالات گنوانے بیٹھوں تو ان میں سے ایک ایک بزرگ کے فضائل کی تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر چاہییں۔

یہاں اگر اورینٹل کالج کی مختصر سی تاریخ بیان ہو جائے تو مناسب ہے۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں لاہور میں علوم مشرقیہ ہندیہ کے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ایک انجمن قائم کی گئی تھی۔ جس کا نام "انجمن پنجاب" تھا۔ اس کی داغ بیل ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں پڑی۔ ڈاکٹر لائٹنر اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اسی انجمن کی سرپرستی اور ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں اسی سال مجلس علوم مشرقیہ کی بنیاد رکھی گئی اور اس جگہ جہاں لاہور رکشا سبھا نے ۱۸۶۳ء میں ہیرا منڈی کے قریب ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا اور جس میں محض ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ قائم ہوا۔ اور انجمن پنجاب نے اس پاٹھ شالہ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور اس کے نصاب میں اُردو، عربی اور فارسی کی تعلیم کا اضافہ کر دیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آج کل ہیرا منڈی میں حضرت پیر زنگرہ علیہ الرحمۃ کے مزار کے سامنے لاہور کارپوریشن کا ہسپتال واقع ہے۔ اس کے مقابل راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے جہاں گورنمنٹ کالج پہلے پہل قائم ہوا۔

مارچ ۱۸۷۲ء تک علوم السنہ مشرقیہ کا یہ ادارہ اورینٹل سکول کہلاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا نام اورینٹل کالج رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اورینٹل کالج کے لیے کھڑک سنگھ کی حویلی حاصل کر لی گئی۔ یہ حویلی لوہاری دروازے کے اندر نہال چند کے مندر کے سامنے واقع تھی۔ ۱۸۷۳ء میں اورینٹل کالج انارکلی میں کرائے کی ایک عمارت میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸۷۶ء میں جب گورنمنٹ کالج کی عمارت مکمل ہو گئی تو اس کے لیے اس عمارت کا شمالی مشرقی گوشہ مقرر ہوا۔ اور ڈاکٹر لائٹنر اس کے پہلے پرنسپل نامزد کیے گئے۔ اس وقت مولوی

فیض الحسن سہارنپوری صدر مدرس عربی تھے اور مولوی عبدالحکیم کلانوری صدر مدرس فارسی۔ یہ دونوں بزرگ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے جن مولوی صاحب کا میں ذکر کر رہا ہوں ان کے جانشین مفتی محمد عبداللہ ٹونکی صدر مدرس عربی تھے۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی بازار حکیماں میں ماسٹری حاجی محمد کے مکان میں رہتے تھے۔

لوہاری دروازے سے کچھ آگے بڑھیں تو ایک گلی آتی ہے جو نائیوں کی گلی کہلاتی ہے۔ اس کے کونے پر ایک مکان تھا جس میں شیخ گلاب دین وکیل رہتے تھے۔ اس زمانے میں ان کا وکیل ہونا ان کی قانون دانی کی سند تصور ہوتی تھی۔ شیخ گلاب دین سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہ زبان میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے قانون شہادت اور قانون رواج کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کوچے سے ذرا آگے چل کر دائیں طرف کو ایک کوچہ ہے جسے ملا جلوٹیاں کہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل وہ مکان ہے جہاں سر محمد اقبال رہتے تھے۔ وہ کئی برس تک یہیں رہے۔ اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک محلہ آتا ہے جسے "چوہٹہ" کہتے ہیں۔ اس میں اونچی مسجد کے خطیب مولوی علم الدین رہتے تھے جو اپنے علم و فضل کے باعث بہت مشہور تھے۔ اسی محلے میں آج کل مولانا غلام مرشد خطیب مسجد شاہی رہتے ہیں۔ معارف دین سے جن کی آگاہی کی تعریف میں نے اقبال کی زبان سے بھی سنی ہے اور جن کا درس قرآن مجید اب بھی مرجع ماہرین و عوام ہے۔ اس سے کچھ دور آگے بازار کے بائیں طرف کو محلہ واقع ہے اور دائیں طرف محلہ شیش محل۔ کوچہ محلے میں سید محمد شاہ وکیل رہتے تھے جو اس زمانے میں دیوانی قانون کے ماہر تصور ہوتے تھے۔ انھوں نے پہلے ملتان میں وکالت شروع کی اور بعد میں لاہور چلے آئے اور اپنی محنت کی کمائی سے ایک عالیشان مکان اسی محلے میں تعمیر کیا۔ محلہ شیش محل میں ڈاکٹر محمد حسین رہتے تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور آ گئے تھے۔ وہ اور ڈاکٹر رحیم خاں جن کی حویلی اب انارکلی کے قریب دھنی رام روڈ پر ٹریڈرز بنک سے ملحق واقع ہے۔ اس زمانے کے بہت بڑے طبیب سمجھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسین اپنی طبی مہارت کے باعث وائسرائے کے آنریری فزیشن تھے اور ڈاکٹر رحیم خاں اپنی جراحی کے کمال کی بدولت وائسرائے کے آنریری سرجن۔ انھی ڈاکٹر محمد حسین کے بڑے صاحبزادے منشی احمد حسین خاں تھے جو اپنے زمانے کے بہت مشہور ناولسٹ اور شاعر تھے اور دو سو سے زائد کتابوں کے مصنف۔

شیش محل سے آگے چل کر رائے بہادر میلہ رام کی حویلی تھی جس کا دستبرد زمانہ سے اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ رائے بہادر میلہ رام کی حویلی بھاٹی دروازے کی عمارتوں میں نہ صرف اپنی وسعت اور شان کے اعتبار سے اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی بلکہ خود رائے بہادر میلہ رام اور ان کے بعد ان کے بیٹے رائے بہادر رام سرن داس کی شخصیت ایسی تھی کہ اس علاقے کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ یہ سناتن دھرم کے پیرو تھے اور پرانی وضع کے رئیس۔ خود ادیب نہ تھے مگر ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست تھے۔ ۱۸۸۰ء میں جب امرتسر سے لاہور تک ریل چلی اور لاہور کا اسٹیشن تعمیر ہوا تو لنڈا بازار والے میاں سلطان مرحوم لاہور والے میاں محمد بخش دلال گر اور رائے بہادر میلہ رام کی شرکت کی ٹھیکیداری میں یہ کام انجام پایا۔ رائے بہادر میلہ رام اور رائے بہادر رام سرن داس جب تک زندہ رہے۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے تہوار بڑی شان سے مناتے رہے۔ ہر تہوار پر اپنی لال کوٹھی میں جو بھاٹی دروازے کے باہر واقع ہے محفل رقص و سرود سجاتے اور اپنے تمام احباب کو بلا تفریق مذہب و ملت بلا کر اس کی رونق بڑھاتے۔ سر محمد اقبال، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، میاں سراج الدین، راجہ نریندر ناتھ، راجہ سر دیا کشن کول، نواب لیاقت حیات خاں، نواب احمد یار خاں دولتانہ

سر سکندر حیات خان، میاں محمد نصیر الدین خان، خان بہادر سید مراتب علی، سردار سندر سنگھ مجیٹھیا اور سردار جوگندر سنگھ کو میں نے اکثر ان محفلوں میں اس بات کھل مل کر بیٹھے دیکھا ہے۔ اب یہ داستان ایک قصۂ پارینہ معلوم ہوتی ہے۔

اس کے سامنے ایک کوچہ ہے جسے موتی ٹبہ کہتے ہیں۔ اسی کوچے میں سر عبدالقادر رہتے تھے جن کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ گلی کے سامنے ہی خلیفہ نظام الدین رہتے تھے۔ جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے صدر دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے اور اپنی حساب دانی کے باعث بہت مشہور تھے۔ اسی محلے میں مولانا عبدالحکیم کلانوری بھی رہتے تھے۔ اس محلے سے ذرا آگے چلیے تو بائیں طرف کو ایک گلی آتی ہے۔ جسے "پیر بھولے کی گلی" کہتے ہیں۔ اس کے کونے پر ایک مکان ہے جس میں ڈاکٹر امیر دین رہتے تھے۔ یہ ان طبیبوں میں سے تھے جنھوں نے انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ایلوپیتھک طریقۂ علاج میں بڑی مہارت حاصل کی۔ وہ خصوصاً بچوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج کرنے میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور اپنی ہمدردی اور منکسر مزاجی کے باعث شہر کے غریب طبقے میں بہت مقبول تھے۔ کچھ دور آگے جا کر یہ بازار جوگی محلے کو جا ملتا ہے۔ مسٹر میراں بخش بیرسٹر ایٹ لا جو جرنیل میراں بخش کے نام سے معروف تھے، انگلستان جانے سے پہلے اسی محلے میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں ایک مشہور انگریز بیرسٹر مسٹر ریٹیگن اور اس کے بعد ایک اور انگریز بیرسٹر مسٹر رینالڈز کے ساتھ کام کیا۔ یہ رینالڈز اس مشہور و معروف افسانہ نگار جارج ڈبلیو۔ ایم رینالڈز کے بیٹے تھے جنھوں نے "مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن" لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اسی محلے میں اس زمانے میں منشی طاہر الدین بھی رہتے تھے۔ یہ اپنے ابتدائی زمانے میں میاں سر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا کے منشی تھے اور قانونی رموز سے خوب واقف۔ جب میاں سر محمد شفیع وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو کر دہلی چلے گئے تو انھیں منشی طاہر الدین کے مشورے سے ڈاکٹر سر محمد اقبال انارکلی میں اسی مکان میں چلے آئے جس میں سر محمد شفیع پریکٹس کیا کرتے تھے۔ سر محمد شفیع اپنے باقی ماندہ مقدمات کی پیروی کا کام سر محمد اقبال کو سونپ گئے تھے، اس سبب منشی طاہر الدین اس کام میں ان کے بہت ممد و معاون ثابت ہوئے۔ بعد میں انھوں نے ایک دوا "دل روز" کے نام سے ایجاد کی۔ اور اس کے موجد ہونے کی حیثیت سے زیادہ تر مشہور ہوئے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اقبال کے دل میں اپنی بے لوث خدمت سے ایسا اعتبار پیدا کر لیا کہ انھوں نے اپنی وصیت میں اپنے دو اور دوستوں کے ساتھ ان کو بھی اپنی اولاد اور جائداد کا ولی مقرر کیا۔ اس محلے میں ایک اور مکان ہے جس میں محمد طفیل ایک نوعمر صاحبزادے رہتے تھے۔ ان کو خوش نویسی کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ آگے چل کر انھوں نے اسی محلے سے "نقوش" کے نام سے اردو کا ایک مشہور اور کئی لحاظ سے لاثانی مجلہ شائع کرنا شروع کیا جو آج کل ایبک روڈ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ضخامت، مضامین کے تنوع اور کتابت کے تکلف کے اعتبار سے اپنے تمام پیش رو رسالوں سے مختلف اور ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے بعض نمبر تو ایسے ہیں کہ زمانۂ مستقبل میں ایک تاریخی مقام حاصل کر لیں گے۔ اور ان مصنفین کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے جنھیں موجودہ اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں حوالوں کی تلاش ہو۔

آگے چل کر شیخ سندو صاحب الرحمۃ کے مزار مبارک کے پیچھے محلہ کاندھیاں واقع ہے جہاں میاں نظام الدین ناظم شرع شریف میں رہتے تھے۔ وہ بعد میں کوچہ فقیر خانہ میں جو اسی بازار میں واقع ہے رہنے لگے۔ اسی کوچے میں میاں نبی بخش حلوائی رہتے تھے جو پہلوان بھی تھے اور سارے علاقے میں صاحب اثر بھی۔ ہر شخص ان کی طاقت کا لوہا مانتا تھا اور کسی آوارہ منش شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ اس بازار سے

ہوا کہ جب تک وہ زندہ رہے اس تمام علاقے میں نہ تو کوئی چوری کی واردات ہوئی اور نہ کبھی کوئی ایسا جھگڑا یا فساد جس سے یہاں کے لوگوں کا امن و سکون متاثر ہوتا ہو۔

محلہ کا ضیاں کے بالمقابل لال حویلی کا کوچہ ہے جس میں سکھوں کی حکومت کے زمانے میں فقیر سید نور الدین اور فقیر سید شمس الدین رہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ حویلی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک حصے میں فقیر سید قمر الدین اور دوسرے حصے میں فقیر سید شہاب الدین رہنے لگے۔ آگے چل کر کوچہ دربار صاحب آتا ہے۔ اس میں ایک سہ منزلہ اس سے ملحق ایک مکان واقع ہے جس میں وہ تبرکات عالیہ رکھے گئے ہیں جو فقیر سید عزیز الدین نے شاہ شجاع الملک سے حاصل کیے تھے۔ یہاں دن رات قرآن مجید کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ اسی مکان کے قریب حافظ محمد حنیف رہتے تھے جو اپنے زمانے میں قرأت کے ماہر تھے اور جن کے درسِ قرآن کا فیض عام تھا۔

اسی کوچے کے قریب پہلوانوں کا کوچہ واقع ہے جہاں پنجاب کے ایک مشہور پہلوان محمد حسن جو "حسا پہلوان" کے عرفِ عام سے مشہور تھے، رہتے تھے۔ انہی کے بیٹے دوست محمد حیات ہیں جو بعد میں سیاست ہند میں مولانا محمد علی کے دست راست تھے اور اس کے بعد ریاست بھوپال میں ایگزیکٹو کونسل کے سیکرٹری ہوئے۔ ان کی جوانی انہی گلیوں میں گزری ہے۔ کوچہ دربار صاحب بازار حکیماں میں واقع ہے۔ اس بازار میں چار مکان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو میرے والد کے بڑے بھائی حکیم حسام الدین کا مکان جن کے بیٹے حکیم امین الدین تھے جو ان مسلمان طلبا میں سے تھے جو پہلے پہل انگلستان گئے اور جنہوں نے قانونی سند لے کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی وہ مکان ہے جس میں ۱۸۹۵ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین کی سرپرستی میں ایک اردو بزم مشاعرہ قائم ہوئی۔ اور جس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اپنی اردو غزل پڑھی۔ حکیم حسام الدین لاہور اور امرتسر دونوں جگہ طبابت کے فرائض انجام دیتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں لاہور کا بازار حکیماں اور امرتسر کا کٹڑہ حکیماں انہیں کے دم قدم سے آباد تھا۔ یہ مہاراجہ کشمیر کے طبیب خاص ہونے کے علاوہ ریاست ہائے پٹیالہ کے بروالی ریاست کے طبی مشیر بھی تھے اور ان کی تشخیص مرض اور حذاقت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی خدا پرستی اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوا سے زیادہ ان کی دعا کے طالب نظر آتے تھے۔ اس کے بالمقابل میرے دوسرے عم زاد بھائی حکیم شہباز دین کا مکان تھا۔ یہ مکان لاہور کی ادبی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کی بیٹھک میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۲۲ء تک جب تک حکیم شہباز دین زندہ رہے۔ ہر روز شام کو لاہور کے ادیبوں، شاعروں، عالموں اور سیاستدانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق یہ ایک قسم کا لٹریری کلب تھا۔ اس میں جو لوگ باقاعدہ ہر شام کو جمع ہوتے تھے ان میں مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، منشی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد حسن جالندھری، مولانا اصغر علی روحی، سید محمد شاہ وکیل، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین اور ماسٹر مولا بخش کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اس محفل احباب میں کبھی کبھی سر محمد شاہ دین، سر محمد شفیع، فقیر سید افتخار الدین اور مرزا سلطان محمد بھی آ بیٹھتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے بانیوں اور ارباب نظم و نسق میں سے حاجی شمس الدین، خواجہ احمد بابا، مولوی حاکم علی اور خلیفہ حمید الدین بھی اس بزم احباب میں آ کر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ اس مکان کے ساتھ ہی ہمارا مکان ہے جس میں میرے والد

حکیم شجاع الدین رہتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور طبیب، فلسفی اور شاعر تھے۔ یہاں زیادہ تر ان کے وہ شاگرد دن بھر موجود رہتے تھے جن کو طب، اشعار اور فلسفہ میں ان کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید افتخار الدین کا مکان تھا۔ وہ چونکہ اپنے زمانے میں فقیر خانے کے ایک ممتاز رکن اور سرکاری ملازمت کے اعتبار سے ایک جلیل القدر عہدیدار تھے۔ ان کے ہاں زیادہ تر سرکاری اہل کاروں کا مجمع رہتا تھا۔ اس مجمع کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں ان کے ہندو، سکھ اور مسلمان دوست جو یا تو سرکاری ملازمت سے منسلک تھے یا ان کے خاندان سے دیرینہ تعلقات کے باعث وابستہ تھے مل بیٹھتے تھے۔ ان میں لالہ ہرکشن لال، سردار دیال سنگھ مجیٹھہ مجیٹھیہ، چوہدری سلطان احمد (فیض احمد فیض کے والد)، مرزا سلطان احمد، میاں نصیر الدین (نواب امام الدین صوبیدار کشمیر کے بھتیجے) سید اقبال علی شاہ اور سید مراتب علی شاہ (نواب امام الدین خاں صوبیدار کشمیر کے نواسے) قابلِ ذکر ہیں۔ جب فقیر سید افتخار الدین لاہور میں آتے تو اپنے مکان پر ایک پُرلطف مجلس شعر و سخن جمائے رکھتے۔ ان لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے پنجاب کے بڑے بڑے جاگیردار اور امرا جب کبھی لاہور آتے تو وہ اس محفل میں ضرور شریک ہوتے۔ اس مکان کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ چوہدری سلطان احمد اسی بازار میں اپنے بڑے بھائی چوہدری نبی بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بیرسٹر ہونے کے علاوہ علمِ ریاضی میں بھی بڑی دسترس رکھتے تھے۔ اور ریاضی ہی میں کیمبرج میں ٹرائی پاس حاصل کر کے آئے تھے۔ اسی بنا پر انہیں حکومتِ افغانستان نے اپنا وزیر مالیات مقرر کیا اور ان کی اس شہرت سے متاثر ہو کر مرزا ارشد گورگانی نے اس تقرر پر ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کا یہ ایک شعر ان کی اس مہارت پر شاہد ہے جو انہیں علمِ ریاضی میں تھی ۔۔۔

برشاہدِ ہندسہ برد فضیلت گر تو ریاضی می بینی

زاں رو ہست کہ خواہش کردہ والئ افغانستان

مرزا سلطان احمد ایک معزز سرکاری عہدہ پر فائز ہونے کے علاوہ بڑے پائے کے ادیب، شاعر اور سخن فہم تھے۔ جب ایبٹسن نے جو بعد میں صوبہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے اپنی "سنسس رپورٹ" لکھی تو اس میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بہت زہر اگلا۔ مرزا سلطان احمد نے جو اگرچہ اس زمانے میں انہیں کے ماتحت ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ اس رپورٹ کے خلاف ایک مدلل، بے ریا اور درشت رسالہ شائع کیا جس نے نہ صرف ایبٹسن کے دانت ہی کھٹے کر دیے بلکہ مرزا سلطان احمد کی غیرت و حمیت کا سکہ مسلمانوں کے دلوں پر بٹھا دیا۔ یہ بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ فقیر سید افتخار الدین کبھی کبھی اقبال کو بھی بڑے چاؤ سے کھینچ لاتے اور ان کی صحبت سے محفل کی رونق بڑھاتے۔ فقیر سید افتخار الدین کے بڑے داماد فقیر سید نجم الدین جو میرے بھانجے بھی ہوتے ہیں اور بھتیجے بھی اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ انہیں مراسم یگانگت کی یادگار ہیں فقیر سید نجم الدین کے بیٹے فقیر سید وحید الدین نے "روزگارِ فقیر" کے نام سے دو جلدوں میں ایک نہایت ہی مفید، دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب لکھی ہے جسے دلدادگانِ اقبال حرزِ جان سمجھتے ہیں۔ فقیر سید افتخار الدین کے چھوٹے بھائی فقیر سید اقتدار الدین جو انہیں کے ساتھ رہتے تھے اس زمانے کے مذاق کے مطابق شاعری کو اپنی شرافتِ نسبی اور وراثتِ علمی کا جزو سمجھتے تھے۔ اور اس مشاعرے کے ہر اجلاس میں جو حکیم امین الدین کے مکان پر ہوتا تھا ہمیشہ اپنی نئی غزل پڑھتے تھے۔ فقیر قمر الدین جو فقیر خانے کے بزرگ تھے اور جن کا مکان لال حویلی کہلاتا ہے اگرچہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے

تھے۔ ... دربار میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ بھی بہت اچھا شعر کہتے تھے اور ... تخلص کرتے تھے۔

اس سے آگے چل کر استاد شریف کا کوچہ آتا ہے جس میں فقیر سید جلال الدین کی تعمیر کی ہوئی لال مسجد واقع ہے۔ اور اسی کی بغل کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جس میں فقیر خاندان کے جد امجد فقیر سید غلام محی الدین کا مزار ہے جو "نوشہ ثانی" کے لقب سے ملقب تھے۔ اسی احاطے میں فقیر سید عزیز الدین، فقیر سید امام الدین، فقیر سید نور الدین اور فقیر سید شمس الدین کے مزار بھی ہیں۔ اسی کوچے میں سید مراتب علی شاہ کی اہلیہ محترمہ سیدہ مبارک بیگم کا امام بارہ ہے۔ اور ان کے والد فقیر سید افتخار الدین کی چھوٹی حویلی بھی۔ اسی حویلی سے ملحق فقیر سید امام الدین کی حویلی ہے جو سکھوں کے زمانے میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار اور شاہی خزانے کے محافظ تھے۔ اس کے سامنے فقیر سید حفیظ الدین کی حویلی میں مرزا افضل بیگ ایک پرانی وضع کے رئیس رہتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا اسلم بیگ کو شعر و شاعری کا شوق وافر تھا اور وہ میر ناظر حسین ناظم کے تلامذہ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اس قدر زیادہ دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ لکھ لُٹ مشہور ہو گئے۔ اس لوٹ میں ان کے ذوق سخن کو بھی مال غنیمت ملا۔ انھوں نے اپنی حویلی میں ایک محفل مشاعرہ قائم کی جس کے میر مشاعرہ ان کے استاد میر ناظر حسین ناظم تھے۔ اس بزم میں زیادہ تر مرحوم کے شاگرد ہی اپنا کلام پڑھتے اور اپنے استاد سے داد سخن پاتے۔ اس بزم مشاعرہ کے سیکرٹری فقیر سید امام الدین کے پوتے فقیر سید سعید الدین تھے جو میر ناظر حسین ناظم ہی کے شاگرد تھے۔ اور بہت صاف شعر کہتے تھے۔ اور اسی کوچے میں اپنے دادا کی حویلی میں رہتے تھے۔

شاید اس ناقدری کے زمانے میں یہ بیان کر دینا موجب تعجب ہو کہ مرزا اسلم بیگ نے اپنے اُستاد میر ناظر حسین ناظم کے دولت کدے کو حقیقت میں دولت کدہ بنا دیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ کی وفات کے ساتھ ہی اس محفل کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کی محفل جن کے نام اوپر گنوائے گئے ہیں بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین ہی کی بیٹھک میں جمتی تھی۔ اور اس محفل کا مذاق مرزا اسلم بیگ کی بزم مشاعرہ سے کچھ الگ تھا۔ وہاں زیادہ تر ادبی و قومی مسائل کا چرچا تھا۔ اور اس محفل میں وہی کاکل و زلف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس کوچے کے بالمقابل میرے جد امجد حکیم عبداللہ انصاری کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے جس کی تعمیر کی تاریخ اس مصرعے سے نکلتی ہے۔

کرد با صدق این عبادت گاہ عبد اللہ حکیم

جنھوں نے بازار حکیماں کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا یہ گھر بنایا تھا۔ اس کے سامنے ہی حکیم خدا بخش کی حویلی تھی جس کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں مگر اس کے کھنڈر میں ان کا مزار باقی ہے۔ یہ اپنے زمانے میں بہت بڑے طبیب تھے اور اپنے توکل اور فیاضی کے باعث مرجع خلائق۔

چند قدم آگے چلیں تو بازار کے بائیں طرف کوچہ فقیر خانہ آتا ہے جس میں فقیر سید ظفر الدین رہتے تھے۔ اور ان کے سامنے ہی وہ مکان ہے جس میں میر ناظر حسین ناظم عمر بھر اقامت گزیں رہے۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید حسن الدین کا مکان اور امام بارہ ہے اس میں ان کے بڑے داماد سید علی شاہ رہتے تھے جن کی مصوری کی شہرت اس امر کے باوجود کہ انھوں نے اسے ایک پیشے کی حیثیت سے کبھی اختیار نہ کیا محتاج بیان نہیں۔ بڑے بڑے مصور ان کی خدمت میں آتے اور ان سے رنگ آمیزی کا فن سیکھتے۔ مناظر قدرت کی جو صحیح عکاسی ان

یہ موقع شاید ہی کسی دوسرے معمر کی چابکدستی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی سخن فہمی کا یہ عالم تھا کہ جو اشعار بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور ان کی تعداد بے شمار ہے، اپنے دور کے بڑے بڑے شعراء کے نتائج فکر کا آئینہ تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر یہی محسوس ہونے لگتا کہ فطرت کے عجائبات کا ایسا نگار خانہ ہے جس کے پیش کش گئے ہیں اور فوادرِ شعر و سخن کا ایک چمنستان ہے جس پر بہار آگئی ہے۔ انھوں نے بڑی طویل عمر پائی اور قریب قریب ایک سو بیس سال کی عمر میں ابھی پچھلے ہی برس رحلت فرمائی۔

بازار میں آگے چل کر دائیں طرف فقیر سید عزیز الدین کی حویلی ہے جو ان کے بعد ان کے بیٹے فقیر سید جمال الدین کو ورثے میں ملی۔ اور آج کل اس میں ان کا امام باڑہ واقع ہے۔ کچھ دور آگے چل کر کوچہ تحصیل آتا ہے جہاں اس زمانے میں لاہور کے تحصیلدار کی کچہری ہوا کرتی تھی۔ اس کچہری کے مقابل ایک مکان ہے جس میں دار الاشاعت پنجاب اور رسالہ "تہذیب نسواں" کے مالک سید ممتاز علی رہتے تھے۔ اور اسی کوچے میں ایک عرصے تک مولانا محمد حسین آزاد بھی رہے۔ اس کوچے کے مقابل ایک بازار ہے جسے اس زمانے میں ہمبوں کا بازار کہتے تھے اور جو آج کل جج بازار کہلاتا ہے۔ اسی بازار میں ایک طرف سر شہاب الدین کا مکان اور چھاپہ خانہ تھا اور دوسری طرف تاریخ لاہور کے مشہور مصنف سید محمد عبد اللطیف کی حویلی۔ وہ اس زمانے میں سیشن جج تھے۔ اور اسی نسبت سے یہ بازار اب جج بازار کہلانے لگا ہے۔ اس بازار میں ایک اور بزرگ بھی رہتے تھے جن کا نام مولوی عبد الغنی تھا۔ وہ لکھنؤ میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ انہی کے بھانجے ہیں آغا شمس الدین کے مکان میں آغا حشر کا ایک مدت تک قیام رہا۔ اور یہیں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔

اس مکان سے ذرا آگے چل کر پروفیسر عبد الغنی کا مکان تھا جو اپنے زمانے میں شیکسپیر کے اسلوب نگارش کے فہم میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے تھے۔ بعد میں اپنے علم و فضل کی بدولت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

کچھ دور آگے چلیں تو وہ بازار آتا ہے جو آج کل ٹبی بازار کہلاتا ہے۔ زمانے کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں اور اس کے بعد سکھوں کے عہد میں بھی اس بازار میں عمائدِ حکومت کی حویلیاں تھیں مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں اس بازار میں زیادہ تر طوائفوں ہی کے ڈیرے تھے۔ ہاں اس بازار میں ایک عالیشان مسجد بھی ہے اور انجمن نعمانیہ کا مدرسہ بھی جس میں علوم اسلامیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مسجد کو دیکھ کر ایک دن میر ناظر حسین ناظم نے غالب کا یہ مصرعہ برجستہ دہرا دیا۔ اور سننے والوں نے لطف اٹھایا ——

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

جہاں یہ بازار ختم ہوتا ہے اس کی بائیں طرف شیخو پوریوں کا بازار ہے۔ اس کے کونے پر ایک مکان ہے جس میں اس زمانے میں مولوی محرم علی چشتی رہتے تھے۔ یہ پنجاب کے ایک پرانے اخبار "رفیقِ ہند" کے ایڈیٹر تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کا اثر اور رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جسے وہ چاہتے لاہور میونسپل کمیٹی کا ممبر منتخب کرا دیتے۔ اسی لیے لوگ انہیں "کنگ میکر" کہتے تھے۔ بعد میں یہ اس مکان سے اٹھ کر ہیرا منڈی کے عقب میں ایک وسیع حویلی میں رہنے لگے۔ بڑے علم دوست تھے اور خود بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر۔ حضرت مستان شاہ کابلی کے مرید تھے۔ ان کے ہاں اکثر حال و قال کی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان کا دستر خوان اس قدر وسیع تھا کہ مشائخ کرام اپنے مریدوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے سے آتے اور انہیں کے ہاں قیام فرماتے۔ اپنے ابتدائی

زمانے میں انگریزی تعلیم کے بہت مخالف تھے۔ اور اسی لیے سر سید احمد خاں کی اس باب میں ہر تحریک کی مخالفت کرتے رہے۔ مصنفِ نغماتِ جس کا ذکر اُوپر آیا ہے انھیں کی جدوجہد سے ایک زمانے تک منبعِ علم و فضل بنا رہا۔

اسی مکان کے قریب ہی ایک پرانی حویلی تھی جس میں مرزا عبدالرحیم رہتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مرزا محمد سعید ایم۔اے انگریزی زبان میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ میں نے گورنمنٹ کالج کے ایک انگریز پروفیسر مسٹر لینگ ہارن کو یہ کہتے سُنا کہ اُنھوں نے مرزا محمد سعید کا سا صحیح انگریزی بولنے اور لکھنے والا کوئی ہندوستانی طالب علم یا اُستاد نہیں دیکھا۔ مجھے مرزا محمد سعید کی شاگردی کا فخر اس زمانے میں حاصل تھا جب وہ ماڈل سکول میں مدرس تھے۔ بعد میں وہ انڈین ایجوکیشنل سروس سے منسلک ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کے دو ناول "خوابِ ہستی" اور "یاسمین" اُردو زبان میں بھی امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بلند پایہ انگریزی مضامین کو اُردو زبان کا جامہ پہنا کر شیخ عبدالقادر کے رسالے "مخزن" کی محفل میں سجایا اور بڑا نام پایا۔ پروفیسر محمد سعید دہلی کے رہنے والے تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی چلے آئے اور دو برس گزرے ہیں کہ اُنھوں نے اسّی (۸۰) برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصّہ چونکہ بھاٹی دروازے کے اندر ہی گزرا ہے اس لیے ان کی شہرت کا اسی علاقے ہی کے سر سہرا ہے۔

شہزو پوریوں کے بازار میں بھی شیخ عزیز الدین کی کشتری تک طوائفوں ہی کے مکان تھے۔ جن میں سے اکثر اپنے فن کے کمال کے باعث بہت مشہور تھیں۔ شیخ عزیز الدین کی کشتری میں مسجد یا ان کے قریب ایک مکان تھا جس میں مرزا ارشد گورگانی ایک مُدت تک مقیم رہے۔ یہ سلاطینِ مغلیہ کی اولاد میں سے تھے اور اسی نسبت کے باعث گورگانی کہلاتے تھے۔ بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔ اور درس و تدریس کے مشاغل کو اپنا سرمایۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور کے جن نوجوانوں کو شعر و شاعری سے وابستگی تھی وُہ یا تو اپنے کلام کی اصلاح ان سے لیتے تھے اور یا میر ناظر حسین ناظم سے۔ یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شروع شروع میں یہی دو بزرگ پنجاب میں اُردو زبان کی ترویج کا باعث ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی انھیں کے معاصر تھے۔ اور اُنھوں نے اُردو شاعری کو جس نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ان کی اس کوشش میں یہ دونوں بزرگ ہمیشہ ممد و معاون رہے۔ منشی احمد حسین خاں جن کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ انھیں مرزا ارشد گورگانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اقبال اگرچہ بذریعہ خط و کتابت اپنی ابتدائی غزلوں کی اصلاح حضرت فصیح الملک مرزا داغ سے لیتے رہے لیکن لاہور میں وہ اپنی غزلیں مرزا ارشد گورگانی ہی کو دکھایا کرتے تھے۔

نیچے بازار کے چوک سے جو راستہ ہیرا منڈی کو جا نکلتا ہے اس کے وسط میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے۔ اس بازار میں بھی اس زمانے میں زیادہ تر طوائفیں ہی رہتی تھیں۔ آگے چل کر یہ بازار دو حصّوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک راستہ تو لاہور واٹر ورکس سے گزر کر چوک رنجیت سنگھ کو جا نکلتا ہے اور دُوسرا بارود خانے سے ہو کر چونے منڈی کو جہاں شیخوپورہ کے راجہ دھیان سنگھ رہتے تھے۔ بارود خانے کے بازار میں میاں شمس الدین اور میاں نظام الدین دو علم دوست اور معارف پرور بھائی بستے تھے۔ اور اسی علم دوستی کے باعث ان کا دولت کدہ ادیبوں اور شاعروں کا ملجا و ماویٰ تھا جو ان کی فیاضی کے سہارے پر اپنی زندگی کے اوقات بے فکری سے بسر کرتے تھے۔ میاں امیر الدین جنھوں نے پنجاب کی سیاست میں ہمیشہ بہت نمایاں حصّہ لیا۔ میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی

میاں جلال الدین کے صاحبزادے اور پنجاب کے سابق گورنر میاں امین الدین کے بڑے بھائی ہیں۔ اور میاں محمد اسلم جن کا نام ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں میاں نظام الدین کے بیٹے ہیں۔ محمد الدین تاثیر جن کے علم و فضل کا چرچا اور اُردو اور انگریزی میں جن کا اسلوبِ نگارش آج بھی طلبا کے دل کو گرا دیتا ہے اور جو ایک مدت تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے اُسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بارُود خانے ہی میں رہتے تھے۔

حکیم یوسف حسن جو "نیرنگِ خیال" جیسے مقبول عام اُردو رسالے کے مالک بھی تھے اور ایڈیٹر بھی شروع شروع میں اسی بازار میں رہتے تھے۔ وہ طبیب بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور خاکسار بھی۔ ہر اسلامی تحریک میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور اُردو زبان کو مقبول عام بنانے میں اُنھوں نے اپنے رسالے کی قیمت اتنی کم کر دی کہ اپنا سارا اثاثہ اسی پر لُٹا بیٹھے۔ بارُود خانے کا علاقہ جن مایہ ناز ادیبوں کی سکونت کی بدولت دُنیائے ادب میں شہرت رکھتا ہے ان میں حکیم یوسف حسن کا مرتبہ کسی سے کم نہیں۔

بارُود خانے سے آگے جائیں تو قلعے کے عقب میں ایک میدان آتا ہے جو کھائی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کسی زمانے میں مُغل فوجوں کی خیمہ گاہ تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہ ایک بے آب و گیاہ ڈھلوان تھی۔ اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک بازار آتا ہے جسے موتی بازار کہتے ہیں۔ یہ چوک سرجن سنگھ سے شروع ہو کر مستی دروازے تک چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک بہت مشہور طبیب اور نیک سیرت انسان حکیم سید بزرگ شاہ رہتے تھے جو لاہور کے سادات کے ایک معزز خاندان کے نامور رُکن تھے۔ خُدا نے انھیں ایسا دستِ شفا بخشا تھا اور ان کی دُعا ایسی مُستجاب تھی کہ لوگ دُور دُور سے آتے اور نسخوں کے ساتھ ساتھ ان کے تعویذ بھی لے جاتے تھے۔ پُرانے زمانے ہی سے لاہور کے دو چار خاندانوں میں طبابت کا پیشہ موروثی تھا۔ ایک تو بازار حکیماں میں ہمارا خاندان تھا کہ اس کا ہر رُکن طبابت کے فن میں ماہر تھا۔ اور حکیم کہلاتا تھا۔ میں بھی اسی نسبت سے حکیم کہلاتا ہوں۔ دُوسرا موتی بازار میں انہی حکیم سید بزرگ شاہ کا خاندان۔ ان کے صاحبزادے بھی بیرسٹر ہونے کے باوجود حکیم سید عباس علی ہی کہلاتے تھے۔ تیسرا شاہ عالمی دروازے کے اندر حکیم عالم شاہ کا خاندان جوان کی ذات والاصفات کے باعث بہت مشہور ہُوا۔ چوتھا موچی دروازے کے اندر تیلیوں والے رڑے میں حکیم سید مراتب علی اور حکیم سید نوازش علی کا خاندان۔ حکیم سید نوازش علی نے سو برس کے قریب عُمر پائی۔ اور ابھی دو چار برس ہی گزرے ہیں کہ ان کا انتقال ہُوا۔ اور پانچواں چُونے منڈی میں حکیم سید بہادر شاہ کا خاندان۔ یہ شیخوپورہ کے راجہ دھیان سنگھ کے ذاتی طبیب تھے۔ اگرچہ سکھوں کے زمانے میں لاہور میں لالہ حاکم رائے اور بھائی وسطی رام جیسے مشہور ہندو اطبا فنِ طبابت میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندو زیادہ تر مغربی طریقہ علاج کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اور مغربی طب میں دو تین مُسلمان ڈاکٹروں کے سوا جس طرف بھی دیکھیے ہندو ڈاکٹر ہی نظر آتے تھے۔

موتی بازار میں حکیم سید بزرگ شاہ کے مکان سے ذرا آگے چل کر ایک گلی آتی ہے جس میں لاہور کے دو مشہور پہلوان جنھوں نے ملک بھر میں بڑے بڑے میدان مارے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رُستم ہند نوٹا پہلوان تھا اور دُوسرے کا نام کریم بخش پیلڑے والا۔ چُونکہ میں بھاٹی دروازے اور مستی دروازے کے درمیانی علاقے کے نامور لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس لیے ایسے لوگوں کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا جن کی شہرت محض اکتساب علم ہی پر مبنی نہ تھی یا جن کا حلقۂ اثر درس و تدریس ہی تک محدود نہ تھا۔ ان دونوں پہلوانوں

نے اپنے زمانے میں بنا لیا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر لاہور اور امرتسر کے پہلوانوں کے جسمانی کمالات کا درجہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کے علمی اور ادبی اکتسابات کے درجے سے کم نہیں تو ان پہلوانوں کے اکھاڑے بھی طرح طرح کی تعلیمی درسگاہوں سے کم اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ امرتسر کے غلام پہلوان اور کلو پہلوان اور لاہور کے گاماں پہلوان اور امام بخش پہلوان کے کمال فن کی شہرت اپنے ملک کی حدود ہی تک محدود نہیں بلکہ ممالک شرق و غرب بھی ان کی شہ زوری کا اور داؤ پیچ کا لوہا مان چکے ہیں۔

اس گلی کے اندر ایک مسجد ہے جس کے امام اور خطیب حافظ خیر محمد ایک نہایت باخدا بزرگ تھے۔ ان کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ اسلام کی حقیقی سیرت سے آشنا تھے۔ دن بھر کتابوں کی جلد بندی کرتے اور اس کی مزدوری ہی پر اوقات بسر کرتے۔ لیکن مسجد میں پانچوں وقت باقاعدہ نماز پڑھاتے۔ اور صبح و شام درس قرآن دیتے۔ انھیں طبابت میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا۔ اور لوگ ان کے تعویذوں پر بھی بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ اس قسم کے بزرگوں کا اب قحط ارجال ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ جس دینی یا دنیاوی خدمت کا اصل مقصد کسب زر ہو یا نمائش و شہرت وہ نہ تو وسیلۂ عزت ہوتی ہے نہ باعث برکت۔ اس بازار میں آگے چل کر مستی دروازے کے قریب ایک مسجد ہے جسے بیگم شاہی مسجد کہتے ہیں۔ اس کے امام اور خطیب مولانا غلام قادر تھے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے یہ افغان تھے اور گلینی کے صاحب فیض پیر صاحب کے مرید۔ عربی اور فارسی کے علوم میں ان کو وہ دستگاہ حاصل تھی کہ بڑے بڑے عالم و فاضل ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ میرے والد جو اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں دہلی میں قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین سے اکتساب علم کر چکے تھے عربی زبان کے فاضل اجل ہونے کے باوجود اپنی عربی اور فارسی لہجہ کی تصنیفات مولانا غلام قادر ہی کو دکھلاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مجھے بھی اپنے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اور میں نے اکثر دیکھا کہ وہ درس دیتے وقت بھنے ہوئے چنے اور منقیٰ چباتے رہتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسی پر ان کی خوراک کا دار و مدار ہے۔ ہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے درس و تدریس کا سلسلہ انھیں لوگوں تک محدود ہے جو علم و فضل میں منتہائے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ بچوں کو درس قرآن دینے کے لیے ان کے ایک شاگرد اور مرید تھے جو قاضی جی کہلاتے تھے۔ اس فقیر گوشہ نشین کو میں نے اس زمانے میں دیکھا جب مجھ میں ان کے علم و فضل کو پرکھنے کی استعداد نہ تھی۔ میں تو ان کی خدمت میں محض اکتساب سعادت و شرف کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ اور وہ اس لیے کہ میری بسم اللہ کی رسم اسی مرد حق آگاہ کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔ نام و نمود سے ان کو نفرت تھی اور اپنے کام سے کام۔ میں نے جب کبھی انھیں دیکھا مسجد کے محراب کے قریب ایک مصلیٰ پر بیٹھے دیکھا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہمارے گھر میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔

اس مضمون میں بعض بزرگوں کے علم و فضل کا تذکرہ محض اشارۃً کیا گیا ہے لیکن ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے کمالات کا بیان کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ یہ تفصیل اگر اختصار کے ساتھ بیان کر دی جائے تو مناسب ہے۔ اس سے ان بزرگوں کی یاد بھی تازہ ہو جائے گی اور اس مضمون کی تاریخی حیثیت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مولانا فیض الحسن سہارنپور کے رہنے والے تھے اور قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد۔ اپنی تیرہ کے زمانے میں انھیں مولانا امام بخش صہبائی حکیم مومن خاں مومن میرزا اسد اللہ خاں غالب اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کی صحبت کا بھی

شہرت حاصل رہا۔ ابتداً میں اپنا کلام مولانا امام بخش صہبائی کو دکھاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دہلی کے دوران دلی سے نکل کر اپنے وطنِ مالوف سہارن پور چلے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ جاکر عربی کی چند کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور آ گئے ڈاکٹر لائیٹنر ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں اسی سال اورینٹل کالج میں شعبۂ عربی کا صدر مقرر کر دیا۔ لاہور میں ان کا قیام بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں رہا۔ ۱۸۷۱ء میں اُنھوں نے اسلام کی سیاسی اور علمی تاریخ پر دو جلدوں میں "سنینِ اسلام" کے نام سے ایک بڑی مفید تالیف شائع کی۔ ان کی تصنیفات سے اُن کے علم و فضل کی وسعت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ "حیاتِ شبلی" میں سید سلیمان ندوی کا یہ قول مولانا فیض الحسن کے علم و فضل کی عظمت پر شاہد ہے۔۔۔

"مولانا فیض الحسن اس پائے کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند
نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔"

میرے والد حکیم شجاع الدین شاعری میں انھیں کے شاگرد تھے۔ مولانا فیض الحسن کا ہر شعر ان کے جوہرِ کمال کا آئینہ دار ہے۔ میں نے حضرت اقبال کو بھی اکثر ان کے اشعار کو پڑھتے اور ان کی تعریف کرتے سنا ہے۔ مولانا فیض الحسن نے سترہ برس تک اورینٹل کالج لاہور کے طلبا کو اپنی شاگردی کی سعادت سے فیض یاب کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا۔

مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی رحلت فرما چکے تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے بزرگوں کی زبانی سنا ہے اور وہ اس لیے لکھا ہے کہ بھاٹی دروازے میں رہنے والے صاحبانِ علم و فضل میں ان کا نام سرِفہرست ہے۔ اور اگر یہ مضمون ان کے ذکر سے محروم رہ جاتا تو گویا ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جاتا۔

شمس العلما مولانا عبدالحکیم کلانوری اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۹ء تک صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت وجیہہ انسان تھے اور ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہو۔ شام کے وقت اکثر میرے بھائی شہاب الدین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے۔ جب وہ آتے تو حضرت اقبال زیادہ تر انھیں سے مخاطب ہوتے اور شعر و شاعری کے ادبی محاسن پر گفتگو کرتے۔ اُنھوں نے قواعدِ فارسی کے علاوہ عروض، صنائع و بدائع اور املا کے خصائص پر کئی رسالے لکھے ہیں جن سے فارسی ادب کے طلبا کو اکتسابِ علم میں بڑی مدد ملی ہے۔ ان کے مکان پر ان کے شاگردوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اور جب بازار میں چلتے تھے تو اس وقت بھی اُن کے شاگرد اُن کے ساتھ ساتھ چلتے اور شعر و سخن کی گتھیاں سلجھانے میں ان کی رہنمائی کے طالب نظر آتے۔ سر پر بہت بڑا عمامہ ہوتا اور بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا جبہ۔ ہاتھ میں عصا کی وضع کی لکڑی رکھتے تھے۔ آخرکار اورینٹل کالج میں چوالیس برس تک استادی کے فرائض انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اُردو، فارسی اور عربی میں ان کی کئی تصنیفات مشہور ہیں۔

شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ۱۸۸۳ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن کے انتقال کے بعد عربی کے صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ ہمارے مکان کے دیوار بہ دیوار رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے مفتی انوار الحق اور میرا بچپن ساتھ ساتھ گزرا ہے۔ مفتی انوار الحق بھوپال میں ایک مدت تک ناظم تعلیمات رہے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی فقہ اسلامی کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ ناقابلِ تردید سند متصور ہوتا تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو کچھ

ان کو مذہب سے لگاؤ تھا یہاں تک کہ شرع کا علم رکھتا تھا۔ یہ لوگ ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جا بیٹھتے تھے۔ اس مجلس میں بیٹھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا پیشہ وکالت تھا۔ اور کچھ ایسے بھی جن کو قرآنی احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کا شوق تھا۔ اس باب میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کی رہنمائی ان لوگوں کے بڑے کام آئی۔

مفتی محمد عبداللہ بہت دبلے پتلے انسان تھے۔ پان ہر وقت چباتے رہتے تھے اور جب بات کرتے تو منہ پر رومال رکھ کر بات کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس نحیف و نزار جسم میں علم و فضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں دریا بند ہونے کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ ۴۴ سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور لاہور کو جسے وہ اپنا دوسرا وطن کہا کرتے تھے داغِ مفارقت دے گئے۔ شرح محمدی پر چار جلدوں میں ان کی کتاب اُردو زبان کا ایک قابل قدر سرمایہ ہے۔ کئی مسائل پر ان کے فتاویٰ رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے۔ اور تشنگانِ رموز و نکات شرع اسلامیہ نے ان سے بڑا فیض پایا۔ لاہور سے جا کر کچھ عرصہ تک دارالعلوم ندوہ میں کام کیا۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات سے عربی زبان ایک فاضل اجل اور اسلامی شریعت ایک بے نظیر نکتہ داں کی خدمات سے محروم ہو گئی۔ سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق وفات کے وقت مفتی محمد عبداللہ کی عمر کوئی ستر برس کے قریب تھی۔

اسے بھاٹی دروازے کی خوش قسمتی کہیے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلی اجڑی تو دلی کے سب سے پرانے اُردو اخبار کے مالک اور ایڈیٹر مولوی محمد باقر کے بیٹے مولوی محمد حسین آزاد نے انقلاباتِ زمانہ کے گوناگوں مصائب سے تنگ آ کر اپنے وطن مالوف سے ہجرت کی اور آخر کار لاہور آ کر بھاٹی دروازے کے اندر وہ تحصیل بازار میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کے علم و فضل کا جوہر ایسا نہ تھا کہ چھپائے چھپتا۔ سررشتہ تعلیم پنجاب نے لاہور میں ان کی آمد کو غنیمت جانا اور انہیں رشتہ ملازمت میں منسلک کر کے جہاں اُن کے جوہر کمال کی قدردانی کی وہاں ان کے لیے ایسے مواقع بھی بہم پہنچائے کہ ان کی شہرت کا آفتاب جسے گردشِ تقدیر سے گہن لگ چکا تھا۔ افقِ علم و ادب پر بڑی درخشانی سے چمکنے لگا۔ محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۸۷ء میں اورینٹل کالج میں شعبہ عربی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ اور اسی سال انہوں نے شمس العلما کا خطاب بھی پایا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ادبی کارنامے محتاجِ تعارف نہیں۔ پنجاب میں اُردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے باب میں جو سنہری کارنامے ان کی ذات سے منسوب ہیں وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصص الہند اور دربارِ اکبری جیسی مستند تصانیف ان کے علم کی وسعت اور دنیائے ادب میں ان کے مرتبے کی عظمت پر شاہد ہیں۔ لیکن سب سے بڑا احسان جو انہوں نے اُردو زبان کے طلبا پر کیا ہے یہ ہے کہ انہوں نے کرنل ہالرائڈ کے ایما پر جو اس زمانے میں سررشتہ تعلیم کے ناظم الامور تھے اُردو نصاب کی کتابیں لکھیں۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے لکھے ہوئے نصاب کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انہیں کی دکھائی ہوئی راہ کی پیروی تھی۔ مگر کسی دوسرے سے وہ بات بن نہ آئی جس کی طرح وہ ڈال چکے تھے۔

ایک اور احسان جو انہوں نے اُردو شاعری پر کیا وہ یہ تھا کہ اسے غزل کے پرانے ڈگر سے ہٹایا اور اس کی اُنگلی پکڑ کر اسے نیچرل شاعری کی نئی راہوں پر چلانے لگے۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے اب "خال و رخِ یار" "گیسوئے خم در خم" اور "حسن و عشق" اور "ہجر و وصال" کے خیالی صنم کدے نہیں بلکہ مظاہرِ قدرت کے وہ عجائب خانے بن گئے جن کے نوادر کو دیکھ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک بے مثال ادیب اور ایک عدیم النظیر

ناصر کی حیثیت سے مولانا محمد حسین آزاد کے کمالات کو ان چند سطور میں محدود کرنا ایک گستاخی ہے جس کا ارتکاب محض اس لیے قابلِ عفو ہے۔ اس مضمون کی حدود میں ان کی غیر محدود صلاحیتوں کا بیان نہیں سما سکتا۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف اکثر حاصل ہوا۔ اور اس زمانے میں جب انھیں انش فروشان مادہ پرست ہوش و حواس سے بیگانہ سمجھتے تھے۔ میں نے انھیں بڑے داناؤں سے زیادہ دانا پایا۔ آخری زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اٹھ کر اکبری دروازے کے اندر نواب صاحب کی حویلی کے عقب میں اپنے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم کے مکان میں چلے آئے۔ اور وہیں ۱۹۱۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شیخ سر عبدالقادر جو شروع شروع میں بھاٹی دروازے کے اندر موتی ٹبے میں رہتے تھے اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے علاوہ ان اعزازات کے باعث جو انھیں سرکار دربار میں حاصل ہوئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ چند سطور محض ان کی عظمت کے اعتراف اور ان کے کمال کی عظیم تفصیل کے اجمال کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔ وہ ۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے ۱۸۹۵ء میں وہ مسلمانوں کے پہلے انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کے مدیر مقرر ہوئے۔ انگریزی زبان میں ان کی قابلیت کی یہ پہلی سند تھی جو انھیں بن مانگے ملی۔ ۱۸۹۶ء میں جب سر سید احمد خاں نے لاہور میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کو پنجاب میں متعارف کرنے کے سلسلے میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی اور اس میں کالج کے پرنسپل سر تھیوڈور بیک نے انگریزی میں تقریر کی تو شیخ عبدالقادر نے ان کی تقریر کے ختم ہوتے ہی اس کا ترجمہ ایسی شستہ اردو میں کیا کہ اور لوگ تو کیا خود سر سید احمد خاں بھی حیران ہو گئے۔ اس دن سے وہ انھیں مولوی عبدالقادر کہنے لگے۔ اردو زبان کی ترویج کی دُھن اب ان کے دل میں ایسی سمائی کہ وہ روز و شب اسی کوشش میں مصروف رہتے کہ پنجاب کو اردو زبان کا مرکز بنا دیں اور علم و ادب کی جو بساط دلی اور لکھنؤ میں اُلٹ چکی تھی اسے ایک نیا رنگ روپ دے کر لاہور میں سجا دیں۔

وہ اس وقت بازار حکیماں میں فقیر جمال الدین کی حویلی کے سامنے میاں حسین بخش کے مکان میں رہتے تھے۔ اور یہیں سے ۱۹۰۱ء میں رسالہ "مخزن" جاری ہوا۔ اس رسالے کے سرورق پر ہندوستان کا ایک نقشہ ہوتا تھا جس میں تین مختلف نشانوں سے ان مقامات کی نشاندہی منظور تھی جن میں یا تو اردو بولی جاتی ہے یا اردو سمجھی جاتی ہے اور یا جن کے رہنے والوں کی مادری زبان اردو ہے۔ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا اور اس نے اپنے بے جان اوراق میں نئے نئے ادیبوں اور شاعروں کے رشحاتِ فکر و قلم سے زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی اور شائقینِ ادب کے دل میں اس دور کی یاد تازہ ہو گئی جب سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک، سید احمد خاں دہلوی، مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ان کے دوسرے ہم معاصر ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دہلی کے بعد گیسوئے اردو کی مشاطگی میں سرگرم رہے تھے۔ مخزن نے ایک ایسی محفل سجائی کہ اس میں اس زمانے کے تمام ممتاز ادیب مل بیٹھے۔ سر محمد اقبال، چوہدری خوشی محمد ناظر، مرزا اعجاز حسین، میر غلام بھیک نیرنگ، عبدالرشید چشتی، مولوی ظفر علی خاں، شیخ محمد اکرام، اور تلوک چند محروم اس محفل کے مستقل رکن تھے۔ یہ محفل کوئی محفلِ مشاعرہ نہ تھی، بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نئے رنگ کی محفل تھی۔ اس میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر کی سحر طرازیاں بھی اپنے پورے جوبن پہ نظر آتی تھیں۔ اس محفل میں مخزن کا رسالہ ترتیب پاتا تھا اور جو کچھ اس محفل میں پڑھا جاتا ہر مہینے مخزن میں شائع ہو کر تشنگانِ ادب کی پیاس بجھاتا۔ جب تک شیخ عبدالقادر لاہور میں رہے اس محفل کا رنگ جما رہا۔

اسی قسم کی ایک دوسری محفلِ ادب اُس وقت گرم ہوئی جب میں نے ۱۹۱۹ء میں "ہزار داستان" کا رسالہ شائع کیا۔ احمد شاہ بخاری پطرس، سید عابد علی عابد، سید امتیاز علی تاج، مسز ہادی حسین، مرزا اسما، میر صولت، حامد حسین خاں بیدل، عبدالمجید سالک، پنڈت سدرشن اور اختر شیرانی اس فضائے ادب کے روشن ستارے تھے۔ عبدالرحمان چغتائی کے مُوقلم کی سحر نگاری سے ہزار داستان کا ہر شمارہ دیدہ وروں کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور ہوتا تھا۔ مخزن ہی کی طرح ہزار داستان بھی ان نامور ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں ترتیب پاتا اور شعر و ادب کی وہ بساط بچھاتا جو کسی زمانے میں شیخ عبدالقادر نے بچھائی تھی۔ ہزار داستان کا ذکر اس جگہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ اس کی اشاعت کی ابتدا بازار حکیماں میں میرے مکان ہی سے ہوئی۔ اور یہ ستارہ بھی اس اُفق پر روشن ہوا جو بھاٹی دروازے کی زمین سے اٹھتا ہے۔ ہزار داستان کو وہ ایسی سعادتیں نصیب ہوئیں جن کا ذکر میرے تخیل کی مسرتوں کی معراج اور گزرے ہوئے زمانے کی یادگار کا سرور و کیف ہے۔ ہزار داستان کا سرورق حکیم فقیر محمد جیسے نامور خطاط نے لکھا اور سر محمد اقبال نے نہ صرف اس رسالے کا نام ہی تجویز کیا بلکہ اپنے قلم سے اس کے سرورق پر مجھے مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر تحریر فرمایا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

اب یہ شاعرِ مشرق کی فطرتِ روشن ہی پر آشکار ہوگا کہ اُنھوں نے میرے عشق کے داغِ ناتمام میں کیا سوز و ساز دیکھا اور وہ حاصلِ سوز و ساز کیا تھا جس سے وہ چاہتے تھے کہ اس زمانے کی بزمِ ادب میں اُجالا ہو جائے۔

شیخ عبدالقادر ۱۹۰۴ء میں انگلستان چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۹۰۷ء میں واپس آئے۔ اقبال بھی اسی زمانے میں انگلستان میں تھے۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کی زبان سے سنا ہے کہ قیامِ انگلستان میں انھیں ہمیشہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات پر غور و فکر کرنے میں مصروف رکھا۔ اقبال کے دل پر شیخ عبدالقادر کی شخصیت کے جو تاثرات تھے اس خط سے ظاہر ہیں۔ جو انھوں نے ان کے نام ایک نظم کی صورت میں لکھا۔ اور ان الفاظ میں انھیں دعوتِ عمل دی۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
اس چمن کو سبقِ آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
دیکھ یثرب میں ہُوا ناقۂ لیلیٰ بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزمِ گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

آگے چل کر ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی تنظیم میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ان تصورات کے آئینہ دار ہیں جن کی جھلک اس نظم کے اشعار میں نظر آتی ہے۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں شیخ عبدالقادر اپنی زندگی میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس قانون ساز پنجاب کے صدر بنے۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں مجلس اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندے مقرر ہو کر جینیوا گئے۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے اور سر کا خطاب پایا۔ ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لنڈن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ لاہور ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے اور پھر سرکار برطانیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۲ء میں بہاولپور ہائی کورٹ کے چیف جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر لاہور میں مقیم ہو گئے۔

زبان اردو کی ترویج میں جو انہماک سر عبدالقادر کو تھا وہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ۱۹۴۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایم۔ اے (اردو) کی جماعتوں کا سلسلہ شروع کیا تو انھوں نے اورینٹل کالج میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے ایم۔ اے (اردو) کی جماعت کو پڑھانا شروع کر دیا اور اس طرح کشت زار اردو کو اپنے ابر کرم سے سیراب کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود درس و تدریس کے باب میں وہ سرگرمی دکھائی کہ جوان سال اساتذہ کے لیے ایک مثال بن گئے۔ ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو ایک مصروف اور کامیاب زندگی کے شب و روز گزار کر سر عبدالقادر نے رحلت فرمائی۔ میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو جگہ انھوں نے خالی چھوڑی وہ پھر کبھی پُر نہ ہوئی۔

سر شہاب الدین بھی بھاٹی دروازے ہی کے اندر سمیوں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہ پنجاب کے ان نامور اور فقید المثال لوگوں میں سے ہیں جو ایک پسماندہ علاقے میں ہوش سنبھالنے کے باوجود کامیابی اور ترقی کے ان مدارج اعلیٰ تک پہنچے جہاں پہنچنا ہر انسان کے بس میں نہیں۔ ایک نہایت ہی باعمل زندگی اور شب و روز کی محنت و مشقت کے جتنے انعامات ہو سکتے ہیں انھوں نے حاصل کیے۔ ۱۹۰۰ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ پھر اس ملازمت سے دستبردار ہو کر کچھ دنوں تک اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں "پنجاب کریمنل لا جرنل" ایک قانونی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے کی کامیابی سے حوصلہ پا کر "انڈین سٹیچوٹس اینڈ کیسز" (Indian Statuies and Cases) ایک ہمہ گیر قانونی مجموعہ مرتب کرنے لگے۔ لاہور کی شہری اور پنجاب کی سیاسی زندگی میں عمر بھر ایک نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ایک مدت تک کارپوریشن آف دی سٹی آف لاہور کے میئر رہے۔ اور بائیس برس تک پنجاب کی مجلس قانون ساز کی صدارت پر فائز رہے۔ سر شہاب الدین پنجابی کے بڑے حامی اور بڑے مشہور شاعر تھے۔ مسدس حالی کا پنجابی زبان میں ایسا ترجمہ کیا کہ وہ ترجمہ ان کی اپنی ہی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے مجلس قانون ساز پنجاب کی صدارت کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیے کہ پھر ان جیسا صدر اس مجلس کو کبھی میسر نہ آیا۔ یہ

بھی ہر شام کو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے۔ اقبال اور ان کے بے تکلفانہ مراسم پر بے شمار لطائف مشہور ہیں جن کے بیان کی اس مختصر میں گنجائش نہیں۔ اپنی محنت اور مشقت سے بہت دولت کمائی اور اس دولت کا بیشتر حصہ راہِ خدا میں صرف کیا اور یا اپنے دُور و نزدیک کے رشتہ داروں کو دیا۔ نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کے شوق نے ان کی ذاتی لائبریری کو ایک بے نظیر کتب خانہ بنا دیا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کی وصیت کے مطابق اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ اسی وصیت کے مطابق وفات سے پہلے ہی وہ اپنی قیمتی زمین جو شاہدرہ ریلوے سٹیشن کے سامنے واقع ہے انجمن حمایت اسلام کو دے گئے تھے۔ عمر بھر ان کا دولت کدہ سیاسی تحریکوں کا اکھاڑہ بنا رہا۔ جس میں ہر سیاست فروش نے زور آزمائی کی۔ سر شہاب الدین نے کبھی اس پہلوان کی پیٹھ ٹھونکی کبھی اس پہلوان کو تھپکی دی۔ سیاست کے فن میں ایسے ماہر تھے کہ جیت ہمیشہ انہی کی رہتی تھی۔ بڑے بلند قامت اور رعب داب والے انسان تھے۔ آواز میں ایسا جلال تھا کہ جب ٹیلیفون پر بات کرتے تو ٹیلیفون کے تار دہشت براندام ہو جاتے۔ مجلس قانون ساز میں ان کی آواز کسی مائیکروفون کی محتاج نہ تھی۔ قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا کہ پارلیمنٹری پریکٹس کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے ازبر تھے۔ ان کی قانون دانی سے مجلس قانون ساز کا ہر رکن مرعوب رہتا تھا۔ انسان کی نکتہ وری کا لوہا سبھی مانتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن سے ان کے دمِ واپسیں تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس رفاقت سے بڑا فیض پایا۔ اس سرچشمۂ فیض کی اتنی خوبیاں مجھے یاد ہیں کہ ان کے بیان کے لیے اس مختصر مضمون میں نہ گنجائش ہے نہ وسعت۔ بس یہی کہہ دینا کافی ہے کہ سر شہاب الدین بجائے خود ایک محفل تھے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ محفل بھی سونی ہو گئی۔

مولوی احمد دین وکیل جن کا نام ان لوگوں میں آیا ہے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمع ہوتے تھے اپنے زمانے کے دیوانی قانون کے ماہر تھے۔ اور بڑے پائے کے ادیب۔ الفاظ کی تاریخ میں انھوں نے "سرگزشت الفاظ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اس موضوع پر ایک لاثانی تصنیف ہے اور اپنے مصنف کی عرق ریزی اور ژرف نگاہی پر شاہد۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ جو اب شاید کسی کی یاد میں محفوظ نہیں ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اقبال کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا اور ان کی شاعری کو اس کے اصلی رنگ میں سمجھا۔ اور اقبال کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کیے جو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ابھی کسی لڑی میں نہ پروئے گئے تھے۔ اور پھر ان اشعار کی اس طرز پر تشریح کی جس طرز پر "مائنڈ اینڈ آرٹ آف شیکسپیئر" (Mind and Art of Shakespeare) لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب لاہور کے ایک نامور ناشر شیخ مبارک علی نے چھاپی۔ لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ہوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہی وہ مجموعہ ہے جس نے بعد میں "بانگ درا" کی شکل اختیار کی۔ مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے "بانگ درا" کی اشاعت کو نقصان پہنچے گا۔ اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی۔ اور اس طرح دنیائے ادب ایک بڑی مفید تحقیقی یادداشت سے محروم ہو گئی۔ مولوی احمد دین کی تحریر کا اسلوب اپنے استاد مولانا محمد حسین آزاد کا ہو بہو خاکہ تھا اور بڑے بڑے نقادِ ادب کو بھی شاگرد کی تحریر میں استاد ہی کی تحریر کا عکس نظر آتا تھا۔

مولوی احمد دین بھی تحصیل بازار میں "دان والی گلی" میں رہتے تھے۔ ان کے مکان سے ملحق مولوی تاج الدین کا مکان تھا جو ان مسلمان گریجویٹوں میں سے تھے جنھوں نے انگریزی زبان میں بے مثال مہارت پیدا کرنے میں بڑا نام پایا۔ یہ پہلے سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوئے اور بعد میں ریاست پٹیالہ کے محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بڑے متین اور صاحب الرائے بزرگ تھے۔ شیخ عبدالقادر

مولوی احمد دین اور مولوی تاج دین پُرانی وضع کے اس قدر پابند تھے کہ میں نے اُنھیں اُن کی جوان سالی کے زمانے میں بھی کبھی بے ریش نہیں دیکھا۔

وان کی گلی سے آگے چل کر اسی تحصیل بازار میں ایک اور کوچہ ہے جسے بھاڑوں کی تھڑیاں کہتے ہیں۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور خواجہ امیر بخش تینوں بھائی اسی کوچے میں رہتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظر عام پر نہیں آئے۔ مگر وہ اس محفل کی رونق و روان تھے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمتی تھی۔ ان کی جرأتِ تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ جب تک سر محمد اقبال اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سنا لیتے تھے اسے کسی مجلسِ عام میں نہ پڑھتے تھے۔ "نالۂ یتیم" "ہلالِ عید" "تصویرِ درد" اور "شمع و شاعر" کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انھیں لوگوں کے سامنے پڑھیں اور پھر ان سے دادِ سخن پا کر انھیں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر جہانِ اسلام سے خراجِ تحسین و عقیدت وصول کیا۔ خواجہ فیروزالدین بیرسٹر ایٹ لا جو اقبال کے ہم زلف تھے اور جنھوں نے آگے چل کر ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے بڑا نام پایا انہی خواجہ رحیم بخش کے بیٹے تھے۔ اور خواجہ عبدالمجید "جامع اللغات" جیسی جامع اور ضخیم لغت کے مصنف خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے۔ اس لغت کی گیرائی اور اس کے مؤلف کی وسعتِ نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رموزِ ادب کا دلدادہ اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود عمر بھر کس انہماک سے اس عظیم الشان تالیف کی تکمیل کے درپے رہا جو آج اُردو ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیض اسی گھرانے کا ہے جس کے گہوارۂ عاطفت میں ان دونوں نوجوانوں نے پرورش پائی۔

اسی بازار میں اس کوچے کے سامنے ایک طرف پنڈت رگھبر دیال جوتشی (۔۔۔۔) اور ڈاکٹر ہیرا لال رہتے تھے۔ جیوتش کے علم کے متعلق لوگوں کے نظریات مختلف ہیں۔ لیکن ان سب نظریات سے قطع نظر میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پنڈت رگھبر دیال اس علم میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سر شہاب الدین ان کے بہت قائل تھے۔ اور سر شہاب الدین ہی کیا بڑے بڑے لوگ دُور دُور سے آتے اور ان سے اپنا زائچہ بنواتے۔ بڑے نیک دل اور خدا پرست انسان تھے۔ میں بھی ان کی خدمت میں کئی مرتبہ حاضر ہوا اور ان سے جیوتش کے رموز سیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سنسکرت کے علم سے بہرۂ وافر کے حصول کے بغیر اس بحرِ بے پایاں کی شناوری بہت مشکل ہے۔ ان کے مکان کے سامنے ہر قسم کے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور ہر شخص ستاروں کی گردش کے اس راز داں کی زبانی اپنے مستقبل کے ان اسرار کا جویا نظر آتا تھا۔ جو پردۂ غیب میں مستور ہوتے ہیں۔ بہر حال پنڈت رگھبر دیال کا مکان کوئی نصف صدی تک مرجعِ خواص و عوام رہا۔

ڈاکٹر ہیرا لال اپنے زمانے کے بڑے مشہور سرجن تھے۔ بہت ہنس مکھ، بڑے ملنسار اور اپنے فن میں ماہر۔ غریب ہو یا امیر ہر مریض کو بڑی احتیاط سے دیکھتے اور اپنے ہر مریض کا علاج بڑی توجہ سے کرتے۔ اس زمانے میں انگریزی طریقۂ علاج کا بھی ایسا چرچا نہ تھا۔ تاہم ڈاکٹر بیلی رام، ہیرا لال، ڈاکٹر نہال چند، ڈاکٹر محمد حسین اور ڈاکٹر رحیم خاں انگریزی طریقۂ علاج میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ہیرا لال کے مکان کے سامنے ڈاکٹر دولت رام کا مطب تھا۔ یہ ڈاکٹر ہیرا لال کے شاگرد تھے اور امراضِ چشم

سکا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کے کمالِ فن کی ایسی شہرت ہوئی کہ انھوں نے لاہور کے دو مختلف علاقوں میں اپنا مطب جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ صبح سات بجے سے بارہ بجے دوپہر تک وہ اسی تحصیل بازار میں مطب کرتے اور دن کے دو بجے سے رات گئے تک نکلسن روڈ پر مریضوں کو دیکھتے۔ میں نے ان میں ایک صفت ایسی دیکھی جس کی نظیر اس زمانے میں کہیں نہیں ملتی۔ غربا کا تو کیا ذکر وہ کسی متوسط الحال شخص سے بھی فیس نہ لیتے تھے، اور جو سب سے عجیب بات تھی وہ یہ ہے کہ اچھے اچھے خوشحال مسلمان مریضوں کا بھی علاج مفت کرتے تھے۔ ہندو مریضوں سے منہ مانگی فیس لیتے۔ ان کو میں نے اکثر یہ کہتے سنا کہ مسلمان امیر بھی غریب ہوتا ہے اور ہندو غریب بھی امیر ہوتا ہے۔ ہندو مریضوں سے اتنی فیس مل جاتی ہے جتنی میری ضرورت کے لیے کافی ہو۔ ان کے والد ڈاکٹر پارلم نے لاہور میں سب سے پہلے ڈاکٹر کیب سے عینکوں کے شیشے بنانے کا فن سیکھا۔ اور پھر ان شیشوں کو بنانے کا ایک بڑا کارخانہ بنایا۔ یہ بڑے نیک دل بزرگ تھے اور کرشن جی کی گیتا کے والہ و شیدا۔ جب ڈاکٹر کیب نے گیتا کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو لالہ کرپا رام نے اسے نہایت اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا گیتا کا یہ ترجمہ بعض نقادوں کی رائے میں لوک مانیہ تلک اور مسز اینی بیسنٹ کے ترجموں سے زیادہ فصیح اور سلیس ہے۔

تحصیل بازار سے آگے بڑھ کر سید مٹھے بازار کے قریب رائے صاحب لالہ مدن گوپال اور پنڈت پربھو دت شاستری کے مکان تھے۔ مجھے ان دونوں ماہرانِ تعلیم کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ پنڈت پربھو دت کی دماغی وسعت اور فطری صلاحیت ایک اعجاز کا درجہ رکھتی تھی۔ انھوں نے کئی مضامین میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ سنسکرت اور فلسفے سے ان کو خاص شغف تھا۔ جرمنی سے فلسفے میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ لیکن جلد ہی انڈین ایجوکیشنل سروس سے منسلک ہو کر کلکتے چلے گئے۔

رائے صاحب مدن گوپال پہلے تو ماڈل سکول لاہور میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ بعد میں ریلوے ٹیکنیکل سکول لاہور کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور ابھی ملازمت سے سبکدوش نہ ہوئے تھے کہ بارِ ہستی سے سبکدوش ہو گئے۔ ایسا استاد اس زمانے میں بھی خال خال نظر آتا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کی دیکھ بھال اپنے بچوں کی طرح کرتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مضمون میں کمزور دیکھتے تو اس سے بیزار ہونے کی بجائے اس کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا رعب داب ایسا تھا کہ ان کی مربیانہ شفقت سے حوصلہ پاکر کسی کو ادب کی حد سے گزرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اب پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا اچھا خاصا چرچا ہو چلا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین نے اردو زبان کی روزافزوں مقبولیت سے متاثر ہو کر ایک اردو بزمِ مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ "شورِ محشر" اسی بزمِ مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے بھائی حکیم امین الدین کے وسیع دیوان خانے میں منعقد ہوتا تھا۔ اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا وہ "شورِ محشر" میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد حسین کے بیٹے خان احمد حسین خاں تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ان کی شہرت ایک نادر ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ آگے چل کر انھوں نے "شبابِ اردو" کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا جس نے ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ سر محمد اقبال بھی جو اس زمانے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے ہر

بھتے اس مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تھے۔ اسی مشاعرے کی ایک محفل میں انھوں نے وہ غزل بھی پڑھی جس کا یہ شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے تھے جو مرے عرقِ انفعال کے

اسی غزل کے مقطع سے اقبال کی طبیعت کا وہ رجحان صاف ظاہر ہوتا ہے جس نے آخر کار انھیں ان لوگوں کی پیروی سے بے نیاز کر دیا جن کو محض زباں دانی کا دعویٰ تھا اور جن کے اشعار کا تار و پود لکھنؤ اور دلی کے محاوروں کے تانے بانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

مرزا ارشد گورگانی دلی سکول کے پیرو تھے اور میر ناظر حسین ناظم لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ۔ دونوں کی ٹولیاں جب اس بزم مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لیے غزل سرا ہوتیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کے اکھاڑوں کا نقشہ کھنچ جاتا۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی پنجاب کے شعرا میر اور مرزا ہی کے زیرِ قیادت میدانِ سخن طرازی میں ایک دوسرے سے پنجہ آزما ہوتے رہتے تھے۔ اس بزم مشاعرہ کی مقبولیت اس روداد سے ظاہر ہے جو "شورِ محشر" کے پہلے شمارے میں اس بزم کے پہلے مشاعرے کے متعلق چھپی۔ اس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اس میں اس زمانے کے کیسے کیسے نامور لوگ شامل ہوتے تھے۔ اور اردو زبان اس وقت پنجاب میں کس حد تک مقبول ہو چکی تھی۔

"۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو پہلا جلسہ مشاعرے کا جناب حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لا کے عالیشان مکان پر شام کے چھ بجے ہوا۔ اس جلسے میں علاوہ معتمد ذیل اصحاب کے قریباً تین سو شائقین کی بھیر بھاڑ تھی۔

۱۔ جناب حکیم شجاع الدین صاحب شجاع، میر مشاعرہ
۲۔ جناب نواب غلام محبوب سبحانی صاحب محبوب
۳۔ جناب مرزا عبدالغنی صاحب ارشد دہلوی
۴۔ جناب منشی محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار
۵۔ جناب منشی عبدالعزیز صاحب، منیجر پیسہ اخبار
۶۔ جناب لالہ موہن لعل صاحب مطلب، نائب میر مشاعرہ
۰۔ جناب میر نشاد علی صاحب شہرت
۸۔ جناب مولوی احمد دین صاحب بی۔ اے پلیڈر
۹۔ لالہ دھنپت رائے صاحب، بی۔ اے، ایل۔ ایل بی

۱۰۔ جنابِ منشی میران بخش صاحب، بیرسٹرایٹ لا۔

۱۱۔ جناب میر ناظر حسین صاحب ناظم

۱۲۔ جناب لالہ منوہر لال صاحب بی۔ اے

۱۳۔ جناب مرزا محبوب بیگ صاحب بی۔ اے۔

۱۴۔ جناب پنڈت سکھ چین ناتھ صاحب در۔ ایم۔ اے۔

۱۵۔ جناب لالہ گوبند رام صاحب، رئیس لاہور

۱۶۔ جناب لالہ دینا ناتھ داس صاحب مالک البرٹ پریس لاہور

۱۷۔ جناب شیخ دانشمند سقراط صاحب ایم۔ اے

۱۸۔ جنابِ منشی شام لال صاحب مجبور

۱۹۔ جناب مرزا عبدالحسین صاحب عارف۔

۲۰۔ جناب حکیم شہباز دین صاحب

۲۱۔ جناب فقیر سید زین العابدین صاحب چیئرمین

۲۲۔ جنابِ منشی غلام حسین صاحب شیدا

۲۳۔ جناب شہزادہ محمد علی صاحب المتخلص بہ شہزادہ۔

۲۴۔ جناب آغا سلطان علی صاحب کربلائی

۲۵۔ جناب سردار گنڈا سنگھ صاحب مشرقی

۲۶۔ جناب مولوی عبدالرؤف خان صاحب رافت بھوپالی، ایڈیٹر پیسہ اخبار

۲۷۔ جناب فقیر سید افتخار الدین صاحب

۲۸۔ جناب خلیفہ نظام الدین صاحب

۲۹۔ جناب حکیم امین الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا، سیکرٹری

۳۰۔ جنابِ منشی احمد حسین خان احمد صاحب، اسسٹنٹ سیکرٹری

اس بزمِ مشاعرہ کی اہمیت صرف اسی امر سے ظاہر ہے کہ اس میں جناب امیر احمد صاحب امیرؔ استاد، جناب نواب صاحب بہادر والیِ ریاست رامپور جو اس زمانے میں لاہور تشریف لائے ہوئے تھے نہ صرف شریک ہی ہوئے بلکہ مصرع طرح پر ایک غزل لکھی اور خود پڑھی اور پھر اس بزمِ مشاعرہ کا رنگ اقبال ملاحظہ ہو کہ اس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے لاہور میں سب سے پہلے اپنی غزل پڑھی: شورِ محشر کی روداد بابت دسمبر ۱۹۰۵ء میں ان کی غزل پر ان کا نام اس طرح درج ہے۔

"جناب شیخ محمد اقبال صاحب اقبال

تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی"

ں غزل کے مقطع میں انھوں نے خود داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے ۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر

مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

جب تک میرے والد زندہ رہے شعر و شاعری کے یہ ہنگامے بھی جاری رہے۔ اور "شورِ محشر" قیامت برپا کرتا رہا۔ میرے والد حکیم ہالدین اپنے زمانے کے بلند پایہ شعرا میں سے تھے ۔ "داغ ہجراں" کے نام سے ان کی غزلیات کا دیوان اور "تعزیۂ حزینہ" کے نام سے کے لکھے ہوئے مرثیوں کا مجموعہ ان کی ادبی کاوشوں کی یادگار ہیں۔ ان تصنیفات کے علاوہ اُنھوں نے طب کے علمی اور عملی پہلوؤں پر بہت سی بیں لکھیں جن سے اس زمانے کے طبیبوں نے بہت فیض پایا ۔ ان کی وفات کے بعد میرے بھائی حکیم امین الدین اور میرے دُوسرے بھائی حکیم باز دین نے اس بزمِ مشاعرہ کو جاری رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی نہ بنی۔ اور جذبِ صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی مت میں تھی نوجوانوں کی ہمت کو نصیب نہ ہُوئی۔ لیکن ایک بات ضرور ہُوئی کہ وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اس بزمِ مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دُوسر بت سے لُطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہوگئی تھی اب ہر روز شام کے وقت حکیم شہباز دین کے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ بسا اوقات سا بھی ہوتا تھا کہ ان ارباب علم و ادب کی دید کے شائق دُور دُور سے آتے اور ان کی صحبت سے اکتسابِ شرف کرتے ۔ اس مجلس کا ذکر اُوپر آ چکا ہے م شہباز دین ایک بہت ہی لاغر اور نحیف انسان تھے۔ مگر ان کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی۔ وُہ کچھ کماتے اپنے احباب کی خاطر مدارات پر صرف کر دیتے ۔ ان کی زبان کی شیرینی ان کی منکسر مزاجی اور مہمان نوازی نے ان کی خاکِ آستاں کو م و ادب کے درخشاں ستاروں کا آسماں بنا دیا۔

حکیم امین الدین اپنے زمانے میں نہ صرف ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے مشہور تھے بلکہ اپنے اس علم و فضل کے باعث جو انھوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پایا تھا بڑی شہرت رکھتے تھے ۔ ان کی ذکاوت اور طلاقت اس زمانے میں مشہور تھی ۔ انجمن حمایتِ اسلام ے سالانہ جلسوں میں جب وہ تقریر کرنے کے لیے آتے تو ان کی تقریر کو سُننے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے ۔ اور مُسلمانوں کی عظمتِ ذشتہ کے تاریخی واقعات کے آئینے میں اپنی آئندہ نسلوں کے شاندار مستقبل کی جھلک دیکھ کر اپنے دل میں ایک نئی زندگی کی حرارت سوس کرنے لگتے۔ ان کی آواز میں خُداداد جذب و اثر تھا اور ان کی عبارت میں ان کی وسعتِ نظر کا عکس۔ ان کے تبحرِ علمی کی یہ کیفیت تھی کہ ن کے کُتب خانے میں عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی کی سینکڑوں ایسی کتابیں موجود تھیں جن پر ان کے قلم کے لکھے ہوئے حواشی ان کی معلومات کی وسعت اور اُن کی تنقید کی گیرائی کی دلیل روشن تھے ۔ انھوں نے قانون پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔ اور اسلامی تاریخ پر بھی بلند پایہ مضامین تحریر کیے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ جو حضور رسولِ مقبول صلعم کی زندگی کے واقعات اور سیرت کی عظمت کو شرح و بسط کے ذریعے سے پیش کرنے پر مبنی تھا افسوس کہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اور وہ اس آرزوئے ناتمام کو دل میں لیے اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔ بازار حکیماں کی جن محفلوں کا ذکر اُوپر آ چکا ہے ان کی رونق حکیم امین الدین ہی کے دم قدم سے تھی ۔ جب وُہ نہ رہے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان

مضمون کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔

اوپر سر عبدالقادر کے مشہور رسالے "مخزن" کا ذکر آ چکا ہے اس کے متعلق یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب سر عبدالقادر اپنی سرکاری ملازمت کے مشاغل کے باعث اس رسالے کی ادارت اور اشاعت کے لیے وقت نہ نکال سکے تو انھوں نے یہ کام اپنے ایک عزیز دوست شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی اس رسالے کو انارکلی ہی سے شائع کرتے رہے۔ یہ وہی شیخ محمد اکرام ہیں جنھوں نے بعد میں دہلی جا کر "عصمت" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس نے نسوانی جرائد میں بڑا نام پایا۔ "مخزن" کے مالک شیخ محمد اکرام کے دہلی چلے جانے کے باعث کئی دور آئے۔ ایک زمانے میں شمس العلما مولانا احسان اللہ خاں تاجور اس کے ایڈیٹر رہے اور پھر جب انھوں نے اس سے قطع تعلق کیا تو یہ رسالہ ایک مدت تک مولانا حامد حسین بیدل کی ادارت سے مستفیض رہا۔ جب تک یہ رسالہ شائع ہوتا رہا اس کا اہتمام اشاعت بھاٹی دروازے کے کسی نہ کسی کوچے ہی میں رہا۔ اور جب تک سر عبدالقادر شیخ محمد اکرام مولانا تاجور اور مولانا بیدل اس کے ساتھ متعلق رہے وہ بھاٹی دروازے ہی میں مقیم رہے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ ہیرا منڈی بازار کے اس کونے پر جہاں یہ بازار ایک طرف بارود خانے کا اور دوسری طرف چوک سرجن سنگھ کو جا نکلتا ہے حکیم فقیر محمد رہتے تھے۔ حکیم فقیر محمد ۱۹۰۹ء میں دلی کے طبیہ کالج سے طبابت کی سند حاصل کر کے لاہور آئے تھے۔ وہ پنجاب کے ایک پہلے سے قصبے جگراؤں کے رہنے والے تھے۔ مگر اردو زبان پر کچھ اس طرح شیدا تھے کہ میں نے انھیں کبھی اردو کے سوا کسی دوسری زبان میں بات کرتے نہیں سنا۔ فن طبابت میں انھیں وہ دستگاہ حاصل تھی کہ دودمان شریف خانی کے کوکب اقبال مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں بھی ان کی ذکاوتِ تشخیص اور طریقۂ علاج کی تعریف کیا کرتے تھے۔ خطاطی میں انھیں وہ ملکہ حاصل تھا کہ مریض ان کے نسخوں کا نستعلیق پڑھ کر ہی روبصحت ہو جایا کرتے تھے۔ میں اکثر عبدالمجید پروین رقم کو جو اس زمانے کے ایک صاحب کمال خطاط تھے اور اپنی جواہر نگاری کی بدولت پروین رقم کے لقب سے مشہور ہوئے اور جن کو اقبال نے اپنی تصنیفات کی کتابت کے لیے منتخب کیا خطاطی کے نکات اور مد و خال کے تناسب کی تعیین کے لیے حکیم فقیر محمد ہی سے مشورہ کرتے دیکھا۔ عبدالمجید پروین رقم کے بیٹے محمد اقبال جو اپنے والد باپ کی نسبت سے اپنے مخطوطات کو ابن پروین رقم کے نام سے منسوب کرتے ہیں ایک صاحب کمال خطاط ہیں۔ جب اقبال کے لوح مزار پر اعلیٰ حضرت شہنشاہ کابل کے ایما سے ان کے قلم سے لکھے ہوئے کتبے دیکھے تو اس قدر محظوظ ہوئے کہ اپنی زبان سعادت نشان سے فرمایا "خوشنویسی خوب است"۔ حکیم فقیر محمد کو مصوری میں بھی بدرجہ اتم مہارت حاصل تھی۔ بڑے خوش لباس، بڑے ہنس مکھ، بڑے شیریں گفتار اور بڑے ہمدرد انسان تھے۔ مریض مرض سے کراہ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے مگر مرض سے شفا پا کر عمر بھر کے لیے ان کے گرویدۂ احسان ہو جاتے تھے۔ ضلع، جگت، پھبتی میں استاد تھے۔ لیکن حفظ مراتب کا ان کو اس قدر پاس تھا کہ اپنی تحریر اور تقریر کو مناسب اور نامناسب کی تمیز سے کبھی آزاد نہ ہونے دیتے تھے۔ جہاں اُن کے کمال فن نے انھیں لاہور کے ہر کہ و مہ کو ان کے دست شفا بخش کا دست نگر بنا رکھا تھا وہاں ان کے حسن مذاق نے ہر باذوق اہل قلم کو بھی ان کا دلدادہ و شیدا کر رکھا تھا۔ فارسی نظم میں اقبال کی پہلی کتاب "اسرار خودی" انھیں کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ اٹھائیس برس تک ان کا مطب مرجع روزگار رہا اور ان کی ذات مرجع اہل کمال حیثیت رہی یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء میں عالم طب ایک ایسے طبیب سے اور فن طباعت ایک ایسے ماہر فن سے محروم ہو گیا جس کا بدل اس زمانے میں مشکل اور حیرت کا

نعم البدل ہو سکنا نہیں ممکن ہے۔

مشرقی دواخانہ قائم کر کے انھوں نے طبابت یونانی کی وہ کمی پوری کر دی جس کے باعث یونانی اطبا کے تجویز کیے ہوئے نسخے دواؤں کی قیود سے آزاد اور تاثیر سے محروم تھے۔ ہر دوا اس کے نام اور وزن کے مطابق اور ہر مرکب اس کے اجزائے ترکیبی کے توازن اور تناسب کے ساتھ اگر کہیں مل سکتے تھے تو اسی دواخانے سے۔ یہ دواخانہ ان کے مکان کی نچلی منزل میں اس طرف کو واقع تھا جو رستہ چوک سرجن سنگھ کو جاتا ہے۔ مگر یہ دواخانہ بھی اپنے بانی کے ساتھ معدوم ہو گیا۔

اس دواخانے کے سامنے ایک کنواں تھا جس کی منڈیر پر رائے بہادر سانجھی مل بدن سے ننگے ایک دھوتی باندھے بیٹھے رہتے تھے اور ہر آنے جانے والے کو اپنے ہاتھ سے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پلاتے تھے۔ یہ کنواں اپنے آب سرد کے باعث شہر بھر میں مشہور تھا۔ رائے بہادر سانجھی مل پنجاب یونیورسٹی کے ان گریجویٹوں میں سے تھے جنھوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کے بعد سب سے پہلے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد یہ پروونشل سول سروس سے منسلک ہو گئے۔ اور پنشن پانے کے بعد اپنے آپ کو تمام دنیاوی تعلقات سے منقطع کر کے تیاگ کا آشرم دھار بیٹھے۔ اور اپنا آخری زمانہ پیاسوں کو ٹھنڈا پانی اور بھوکوں کو اپنی توفیق کے مطابق کھانا کھلانے میں صرف کر دیا۔ بچوں کو بہت پیار کرتے تھے اور ہر راہ چلتے مسافر کو ذرا سی دیر کے لیے روک کر اپنی میٹھی باتوں سے اس کا دل خوش کر دیا کرتے تھے۔ لوگوں کے دل میں ان کی بڑی عزت تھی۔ اور بڑے بڑے اُمرا بھی انھیں جھک کر سلام کرتے تھے۔

ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آغا حشر بھی بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ یہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ جب وہ اپنی کمپنی کے ساتھ لاہور آتے تھے تو بھاٹی دروازے ہی کے باہر اس مکان میں رہتے تھے جو ہری کرشن تھیٹر سے ملحق تھا جس میں ان کی کمپنی کے کھیل دکھائے جاتے تھے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جب وہ اپنی بیوی کی بیماری کے سلسلے میں لاہور آئے تو پہلے بھاٹی دروازے ہی کے اندر میرے غریب خانے ہی میں رہے اور اس کے بعد نگ بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہنے لگے۔ اور پھر جب وہ اپنی فلم کمپنی کا کاروبار چلانے کے لیے لاہور آئے تو اس زمانے میں بھی کچھ عرصے تک میرے ہی مکان میں رہے۔ اس کے بعد وہ ریس کورس روڈ پر ایک بنگلے میں رہنے لگے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ لیکن ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ بمبئی اور کلکتے میں گزرا۔ جب بھی ان کا قیام لاہور میں رہا ان کو ڈرامہ نویسی سے کبھی ایسی فرصت نہ ملی کہ وہ لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں کچھ زیادہ حصہ لے سکتے۔ ان ڈراموں میں جو انھوں نے لاہور میں رہ کر لکھے 'سفید خون' 'خواب ہستی' اور 'آنکھ کا نشہ' قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ نگ بازار میں میاں شمس الدین کے مکان میں رہتے تھے۔ اس مکان میں ایک شہ نشین تھی جس کے دروازے ایک گلی کی طرف کھلتے تھے۔ اسی میں ایک تخت پڑا تھا۔ جس میں ایک چھوٹی سی دری بچھی رہتی تھی۔ حشر دن کا بیشتر حصہ اسی تخت پر ہی گزارتے تھے۔ ان کی نشست کا سامان بہت مختصر ہوتا تھا۔ ایک دری ایک پنسل اور کچھ سادہ کاغذ۔ اس زمانے میں ان کے دوستوں میں سے حکیم فقیر محمد اور مداحوں میں سے عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت ان سے ملنے آتے تھے۔ میں بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ آغا صاحب کی بیوی کی بیماری روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس پریشانی کے باعث ان کی ڈرامہ نگاری کے کام میں ایسے زمانے میں تعطل واقع ہوا جب ہر طرف سے ان کے ڈراموں کی مانگ بڑھ رہی تھی۔ بیوی کی علالت کے دوران وہ بہت افسردہ خاطر رہتے تھے۔ آخر کار آپریشن کی نوبت پہنچی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ جب

ہم نے ان کی رفیقۂ حیات کو سپردِ خاک کیا تو آغا حشر بہت دیر تک قبر کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر اپنی چھڑی سے قبر کے ساتھ زمین پر ایک مستطیل کا خاکہ کھینچا اور کہا یہ حشر کی قبر ہے۔ اس کے بعد وہ بنارس چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں ناگہاں یہ خبر ملی کہ آغا حشر بہت زیادہ بیمار ہیں اور علاج کے لیے لاہور آئے ہیں۔ حکیم فقیر محمد کے علاج اور پنجاب کی آب و ہوا اور ایک نئے عزم کی گرمجوشی کی بدولت ان کی صحت جلد ہی بحال ہو گئی۔ اپنی ذاتی فلم کمپنی "حشر پکچرز" کے سلسلے میں اب وہ اس سرگرمی اور اتنی مستعدی سے کام کرنے لگے کہ میں نے انہیں ان کی جوانی کے زمانے میں بھی اس طرح کام کرتے نہ دیکھا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمت اور طاقت کا تمام باقی ماندہ سرمایہ جو شاید ایک مدت تک ان کی زندگی کا کفیل ہوتا ایک بیک بروئے کار آگیا اور ایک ہی برس میں ختم ہو کر رہ گیا۔

وفات سے دو روز پہلے یہ شعر کہا ۔

کھو چکا جو جوش طاقت پھر ملے دشوار ہے
حشر اب صحت میری گرتی ہوئی دیوار ہے

حشر ایک درخشندہ آفتاب کی طرح افقِ ہند پر چمکا اور ایک شہابِ ثاقب کی طرح اپنی تابانیوں کو اپنے ساتھ لے کر گم ہوگیا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو یہ سرمایہ دار سرور و کیف اور ہنگامہ آرائے عیش و نشاط اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ حشر لاہور کے مشہور قبرستان میانی شریف میں اسی مستطیل میں دفن ہیں جس کا خاکہ انہوں نے ۱۹۱۶ء میں اپنی بیوی کی قبر سے پیوستہ کھینچا تھا۔ یہ اس نیک بخت بیوی کا خراج تھا یا حشر کے خواب کی تعبیر۔ بہرحال یہ سعادت بھی بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی کہ حشر کی زندگی کا ایک اہم حصہ اسی کے جوار میں گزرا۔ اور لاہور ہی کی خاکِ پاک میں ان کو ابدی راحت ملی۔

آغا حشر نے اردو اور ہندی میں بے شمار ڈرامے لکھے ہیں جو ہمیشہ مقبول ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو انڈین شیکسپیئر کہا کرتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ لقب ان کی ندرتِ تخیل اور ان کے اسلوبِ نگارش کو بہت راس آیا۔

چونکہ ڈاکٹر عاشق حسین نے اپنے مضمون میں پچھلے ساٹھ ستر برس کے عرصے سے بہت دور جا کر فقیر سید عزیز الدین اور فقیر سید نور الدین کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے اور بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ اس لیے لازم آتا ہے کہ ان کا ذکر بھی کر دیا جائے اور اس معزز خاندان کی عظمت کا کچھ سرسری سا بیان ہو جائے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے۔

بھاٹی دروازے کے اندر موتی ہٹے کے کوچے سے شروع ہو کر کوچہ تحصیل تک ایک بازار ہے جسے بازار حکیماں کہتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کی بنیاد میرے جدِ امجد حکیم عبد اللہ انصاری نے اس زمانے میں ڈالی تھی جب وہ قاضی القضاۃ ہند اور صوبیدار کشمیر تھے۔ ان عالی قدر عہدوں کے علاوہ وہ بہت بڑے طبیب تھے۔ ان کے بھائی حکیم خدا بخش بھی جو نواب محمد زکریا خاں صوبیدار لاہور کے عہد میں وزارت کے عہدے پر ممتاز تھے۔ اور ملک الحکماء کے خطاب اور فرزند خانی کے اعزاز سے سرفراز بہت بڑے طبیب اور اپنے تمول اور جود و سخا کے باعث مرجع خلائق تھے۔ قصبہ چونیاں کے ایک بزرگ سید غلام شاہ کے بیٹے سید غلام محی الدین کی شادی حکیم خدا بخش کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے ان کے تین بیٹے تھے۔ فقیر عزیز الدین، امام

۱۸۴۵ء) فقیر امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) اور فقیر نورالدین (متوفی ۱۸۵۲ء)۔ فقیر نورالدین کے دُوسرے بیٹوں کے علاوہ فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۲ء) تھے۔ فقیر سید شمس الدین کے بیٹے فقیر سید شہاب الدین تھے۔ اور اُن کے بیٹے فقیر سید وحید الدین کے والد سید نجم الدین تھے۔ چونکہ سید غلام محی الدین کو فقر سے رغبت تھی اور خود بھی ایک رُوحانی پیشوا کی حیثیت سے صاحب رشد و ہدایت تھے۔ اُنھوں نے فقیر کا لقب اختیار کیا اور اُن کی اولاد نے بھی اسی لقب کو اپنا سرمایۂ افتخار و امتیاز سمجھا۔

فقیر سید عزیز الدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں وزارت امورِ خارجہ کے عہدے پر فائز تھے۔ پنجاب کی کسی تاریخ پر بھی نظر ڈالیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ خالصہ دربار میں جو عزت فقیر سید عزیز الدین کو حاصل تھی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ وہ صاحبِ قلم بھی تھے اور صاحبِ سیف بھی۔ ان کی دانشوری اور حاضر جوابی کے تذکرے زبان زدِ خلائق ہیں۔ یہ جگہ ان کے سیاسی کارناموں کی تفصیل کے بیان کے لیے موزوں نہیں۔ فقط اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس بحران کے زمانے میں خالصہ حکومت اور برطانوی اربابِ حل و عقد کے مابین جو خط و کتابت یا گفت و شنید ہوتی تھی فقیر سید عزیز الدین ہی کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اور ان دونوں حکومتوں کے مابین جو آخری معاہدہ ہوا وہ "عزیز الدین شکاف تریٹی" ہی کہلاتا ہے۔ فقیر سید عزیز الدین نثر اور نظم دونوں میں مشّاق اور اپنے زمانے کے بڑے بلند پایہ ادیب اور طبیب تھے اور آزاد تخلص کرتے تھے۔ ان کی نظم کا مجموعہ "دیوانِ آزاد" اب تک پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔

فقیر سید نورالدین اپنے بھائی فقیر سید عزیز الدین کی طرح خالصہ دربار میں اونچے مراتب عالی پر فائز رہے۔ ۱۸۱۲ء میں وہ جالندھر کے صوبیدار مقرر ہوئے اور اس کے بعد سیالکوٹ اور وزیرآباد کے پرگنوں کے عامل کی حیثیت سے اُنھوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح صاحبِ قلم اور صاحبِ سیف تھے۔ اور نہ صرف سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ممد و معاون رہے بلکہ اپنی عسکری صلاحیتوں کی بدولت بھی اُنھوں نے بڑا نام پایا۔ شاہ شجاع الملک والیٔ افغانستان جب اپنے وطن اور تخت کو چھوڑ کر لاہور آئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مہمان ہوئے تو فقیر سید نورالدین ہی نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ "کوہِ نور" جیسے مشہورِ زمانہ اور بے مثال ہیرے سے دستبردار ہو جائیں اور پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شاہ شجاع الملک کی من مانی شرائط اور مُنہ مانگی قیمت پر رضامند کر کے یہ ہیرا حاصل کیا۔ اور اسے ان کی کلغی کی زینت بنایا۔ اس تمام واقعہ کی روداد فقیر سید نورالدین کے قلم سے فارسی زبان میں لکھی ہوئی اب تک محفوظ ہے۔ یہ شاعر بھی تھے اور منوّر تخلص کرتے تھے۔ "دیوانِ منوّر" کا قلمی نسخہ اب بھی اُن کے خاندان میں موجود ہے۔

فقیر سید غلام محی الدین کے تیسرے بیٹے میرے پھوپھا فقیر سید امام الدین (متوفی ۱۸۴۴ء) جو عمر میں فقیر سید عزیز الدین سے چھوٹے اور فقیر سید نورالدین سے بڑے تھے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں امرتسر میں قلعہ گوبند گڑھ کے صوبیدار تھے اور شاہی خزانے کے محافظ۔ خالصہ فوج کا تمام اسلحہ بھی انھیں کی تحویل میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں دربار کا سارا کاروبار انھیں تین نامور بھائیوں کی نگرانی میں انجام پاتا تھا۔

فقیر سید نورالدین کے ایک بیٹے فقیر سید شمس الدین (متوفی ۱۸۷۲ء) تھے۔ یہ بھی میرے پھوپھا تھے۔ یہ بڑے بیدار مغز

اور صاحبِ علم و فراست تھے۔ انھوں نے خالصہ حکومت کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد جب پنجاب میں انگریزی تسلط ہوا تو اس زمانے میں بھی اپنے علم و فضل اور بے مثال لیاقت کی بدولت بڑا نام پایا۔ سید ناصر کے سلسلے میں ان کی کارگزاریاں اس زمانے میں جب کہ حکومت کی تمام تر توجہ اپنے ذاتی مفاد تک محدود تھی بڑی وقعت رکھتی ہیں۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر لاہور کے شہریوں میں اکتسابِ علم کا شوق پیدا کیا تھا۔ اور اس مقصد کے پیشِ نظر انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی۔ اور پھر پرانی روایات کو بالائے طاق رکھ کر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بھائیوں کے میدان میں ایک مدرسہ جاری کیا۔ انگریزی عہد میں یہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اور لاہور میونسپل کمیٹی کے رکن بھی۔ وہ فارسی میں بہت اچھا شعر کہتے تھے اور شمس تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں فقیر سید برہان الدین، فقیر سید زین العابدین اور فقیر سید شہاب الدین کو دنیاوی ثروت کے علاوہ علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ ۱۸۶۹ء میں فقیر سید برہان الدین اور فقیر سید زین العابدین نے وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور پھر یہ دونوں بھائی مدت تک پنجاب کی مختلف ریاستوں میں وزارت کے عہدوں پر فائز رہے۔ فقیر سید شمس الدین کے تیسرے بیٹے فقیر سید شہاب الدین پہلے تحصیلدار بنے اور پھر اپنے علم و فضل کی بدولت ضلع لاہور کے مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ یہ میرے والد کے بڑے بھائی حکیم حسام الدین کے داماد تھے۔ اور اس لیے رشتے میں میرے بھائی ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی زبان میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ اپنے معزز خاندان کی روایات کے پابند تھے اور نجابت و شرافت کی زندہ تصویر۔ سردی کے موسم میں سبز رنگ کی مخمل کی عبا پہنتے تھے اور اسی رنگ کی مخمل کی چوگوشیہ اوڑھتے تھے۔ اپنے دونوں لاولد بھائیوں کی وفات کے بعد جب اپنے والد کی جاگیر جو لاہور تحصیل میں رائے ونڈ کے قریب واقع تھی۔ اور نو سو ایکڑ زمین پر مشتمل وراثت میں پائی تو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ یہ بھی ہر شام حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آ کر بیٹھتے تھے اور اس محفلِ ادب کی رونق بڑھاتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے فقیر سید نجم الدین جو اس سے پہلے سرکاری ملازمت سے منسلک تھے اپنے نامور والد کی طرح اپنی جاگیر کے انتظام کی مصروفیتوں کے باعث ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ فقیر سید نجم الدین رشتے میں میرے بھتیجے بھی تھے اور بھانجے بھی۔ اپنے ماموں حکیم امین الدین کی صحبت میں رہنے کے باعث انھیں اسلامی تاریخ سے عموماً اور ہسپانیہ کی تاریخ سے خصوصاً بہت دلچسپی ہو گئی تھی۔ اور انھیں کی رہنمائی میں انھوں نے ان مضامین پر بہت سی کتابیں پڑھیں۔ آخر کار وہ سید امیر علی کی ان دو کتابوں "سپرٹ آف اسلام" اور "ہسٹری آف دی سیراسینز" کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ان کا اردو ترجمہ کیا۔ میں نے ان کا ترجمہ دیکھا ہے۔ اور ترجمے کے مسودات بھی پڑھے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بڑی کامیاب تھی۔ مگر افسوس کہ ان کی دوسری مصروفیتوں کے باعث یہ دونوں کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوئیں۔ ان کی ناگہانی وفات کے بعد کچھ ایسے حالات ہو گئے کہ ان کے باپ دادا کے قیمتی کتب خانے کی نادر کتابوں کے ساتھ یہ مسودات بھی ضائع ہو گئے۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جس کا صدمہ ہر اہلِ علم اب تک محسوس کر رہا ہے۔ فقیر سید نجم الدین کو موسیقی اور مصوری سے بھی بڑا شغف تھا۔ اور ستار پر تو ان کا ہاتھ ایسا چلتا تھا کہ اس فن کے بڑے بڑے ماہر بھی ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اقبال اکثر اصرار انھیں مجبور کر کے ان سے گھنٹوں دلربا سنتے۔ اس وقت ان پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری رہتا۔ ان کے بیٹوں میں سے فقیر سید وحید الدین

نے دُوسری جنگ عظیم کے دوران میں فوج میں ملازمت اختیار کی۔ اور ترقی کرتے کرتے کرنل کے بلند مرتبہ عُہدے تک پہنچ گئے تقسیم ہند کے بعد اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اُنھوں نے تجارت کا کاروبار شروع کیا۔ اس سے پہلے ان کے خاندان میں کسی نے تجارت کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ مگر فقیر وحیدالدین کی ذاتی صلاحیتیں ان کے بڑے کام آئیں۔ اور اُنھوں نے کئی تجارتی ادارے قائم کیے جو ان کے لیے بہت منفعت بخش ثابت ہوئے۔ لیکن وہ بہت جلد ہی اپنے تجارتی کاروبار کو اپنے بیٹوں کے سپرد کر کے اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اچھی کتابیں پڑھنے والوں کے دل پر اپنے انداز فکر کی ندرت اور اسلوب نگارش کی دل آویزی کا سکہ بٹھا دیا۔ اقبال کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "روزگار فقیر" کی دو جلدوں میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے قلمبند کیے اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے حضور رسول مقبول صلعم اور اصحاب کبار کی زندگی کے حالات اپنی کتاب "محسن اعظم و محسنین" میں ایسی سلیس عبارت اور ایسے عام پسند نادیہ نگاہ سے لکھے کہ اب اس کتاب کا انگریزی اور سندھی میں بھی ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ آج کل ان کے وقت کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف ہی میں صرف ہوتا ہے۔ اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ اُنھوں نے اس مصروفیت سے اپنے بزرگوں کی روایات تصنیف و تالیف کو قائم رکھا ہے۔ اور اس زمانے میں جب قحط الرجال کے باعث ان کے نامور خاندان کی عظمت کے نشان معدوم ہو چلے تھے اُنھیں اپنی محنت مشقت اور فطری استعداد سے از سرِ نو بڑی آب و تاب سے روشن کیا ہے۔ اس خاندان کے سب بزرگ جن کا میں نے ذکر کیا ہے بھاٹی دروازے کے اندر بازارِ حکیماں میں بستے تھے اور اس بازار کی وہ متعدد حیثیت جو اسے صدیوں تک حاصل رہی ہے انہی بزرگوں کی درویشانہ صفات اور بے ریا زندگی کے باعث ہی رہی ہے جن کا اُوپر ذکر آ چکا ہے۔ فقیر سید قمر الدین کے پوتے سید مغیث الدین اب بھی اپنے بزرگوں کی لال حویلی کے اس حصے میں رہتے ہیں جس کا پھاٹک بازار حکیماں میں کھلتا ہے اور اُنھوں نے اس حویلی کی دُوسری منزل کو اپنے بزرگوں کے تبرکات اور زمانہ قدیم کے عجائبات سے آراستہ کر کے حقیقی معنوں میں ایک خزینہ پارینہ بنا رکھا ہے۔

میں نے اُوپر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ سرسری سا ذکر کیا ہے۔ ایک تو اس سلسلے میں کہ وہ بھاٹی دروازے کے اندر محلہ جلوٹیاں کے سامنے ایک مکان میں رہتے تھے۔ اور پھر اس سلسلے میں کہ وہ ایک عرصے تک اس محفل علم و ادب کی رونق بنے رہے جو ہر شام بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمتی تھی۔ میں نے دانستہ ان کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس سے پہلے نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی عظمت کا سکہ اب دُنیائے علم و ادب پر اس قدر بیٹھ چکا ہے اور ان کی زندگی کے حالات اور ان کے فکر و ذکر پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ تاہم بھاٹی دروازے کی سب سے بڑی عظمت جس کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے اس کا مختصر سا ذکر بھاٹی دروازے کی نسبت سے کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اقبال کو اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق کچھ ایسا صحیح علم نہ تھا۔ جب وہ ایک طویل بیماری کے باعث بہت ضعیف ہو گئے اور اس وقت ان کا یہ اندازہ تھا کہ ان کی عمر ۶۰ برس سے تجاوز کر چکی ہے تو ایک دن اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ اب میں زیادہ دیر تک زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری عمر ۶۳ برس سے زائد نہ ہو جائے اس لیے کہ حضور رسول مقبول صلعم کی عمر جہاں تک یقینی طور پر معلوم ہو سکا ہے ۶۳ برس کی تھی۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اُنھوں نے بڑی دھیمی اور پرسوز آواز

میرا پایۂ شعر و ادب

روز محشر اعتبار ماست او
در جہان ہم پردہ دار ماست او

پھر ان کی آواز بھرا گئی۔ اور سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب 'ذکر اقبال' میں ان کی ولادت ۲۳ ذوالحجہ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ان کی وفات کے وقت ۶۵ برس کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ماخذ غالباً اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بیان ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہوتی تو اقبال کی حسرت دل ہی دل میں رہ جاتی۔ اور ۶۳ برس کی عمر سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کی آرزو پوری نہ ہوتی۔ لیکن ڈاکٹر فقیر سید وحید الدین کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنی کتاب 'روزگار فقیر' میں بڑی تحقیق کے بعد اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ۶۱ برس کی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اس تاریخ پر اعتبار کیا جائے تو اقبال کی آرزو پوری ہو گئی۔ اور وہ ۶۳ برس کی عمر سے پہلے ہی واصل بحق ہو گئے۔

فقیر سید وحید الدین کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہرحال جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی بی۔ اے کی جماعت میں داخل ہوئے اور انگریزی فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ شور محشر کے ۱۵ دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی غزل اس مشاعرے میں پڑھی جو بازار حکیماں میں اسی سال منعقد ہوا۔ مجھے اپنے بھائی حکیم امین الدین سے زبانی معلوم ہوا تھا کہ ان کے مکان پر اقبال کا آنا جانا ۱۸۹۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ انھوں نے ایم۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا۔ اس وقت تک اقبال گورنمنٹ کالج کے کواڈرینگل کے کمرہ نمبر ۱ میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں جب اقبال ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے تو وہ بھاٹی دروازے کے اندر اس بالاخانے میں جو محلہ جلوٹیاں کے سامنے گھسیٹو حلوائی کی دکان کے اوپر واقع ہے رہنے لگے۔ اقبال ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اسی مکان میں رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر شام کو بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے اور اپنے دوستوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھنے کے لیے اپنی نظم 'تصویر درد' لکھی تو سب سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سنایا۔ وہ اسی طرح ہر سال جب کوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھتے تو اسے جلسہ عام میں پڑھنے سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سناتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ 'مخزن' بازار حکیماں سے شائع کیا تو اقبال کی پہلی نظم 'ہمالہ' جسے شیخ عبدالقادر نے اسی بیٹھک میں سنا تھا مخزن کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔

اقبال کی وہ نظمیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے پہلے لکھیں اور جو بعد میں ان کی کتاب "بانگ درا" میں شائع ہوئیں اس مانے میں لکھی گئی تھیں جب وہ بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور اس لیے اس عظمت کی سعادت جو اقبال سے منسوب ہے اٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی۔

اقبال نے جو نظمیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہ کر لکھیں ان کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں گلستان سے واپس آئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اٹھ کر موہن لال روڈ پر جو آج کل اردو بازار سے موسوم ہے اس باغ کے عقب میں جو بھاٹی اور موری دروازے کے درمیان میں واقع ہے لالہ چونی لال مونگا کے مکان میں رہنے لگے۔ مگر اس مکان میں وہ کچھ زیادہ دیر تک نہ رہے۔ منشی طاہرالدین کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۰۸ء کے ماہ اکتوبر میں انارکلی والا بالاخانہ کرائے پر لے لیا جس میں پہلے سر محمد شفیع وکالت کرتے تھے۔ اس مکان میں وہ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس نقل مکان سے طلب نہیں کہ ان کا بھاٹی دروازے سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ شاید یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکیم شہباز دین کی بیٹھک کی کشش ان کے دل میں لے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ وہ اس تمام عرصے میں ہر روز شام کو بلا ناغہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں آ بیٹھتے اور جیسا میں ے اوپر لکھ چکا ہوں ان کے دم قدم سے یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی۔ وہ تمام نظمیں جو انھوں نے اس زمانے میں لکھیں اور جن میں اسرار دی کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق اسی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ اور کبھی یسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوئی نظم خلیفہ نظام الدین کو جن کی آواز بہت دل کش اور پرسوز تھی پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ اور ن کی زبان سے اپنے اشعار سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ ان نظموں کا بھاٹی دروازے ہی کے سر سہرا ہے حقیقت سے کچھ بعید نہ ہوگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۹۲۲ء میں حکیم امین الدین کی وفات کے بعد بازار حکیماں کی یہ پرانی محفل اجڑی اور ادھر اقبال ی برس انارکلی کے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک بنگلے میں جو اس زمانے میں سید محمد لطیف مصنف "تاریخ لاہور" کی بیوہ کی لکیت تھا اٹھ گئے۔ اور ان کی محفل جو کبھی بازار حکیماں میں جمتی تھی کوئینز روڈ پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے دولت کدے "زرفشاں" یں جمنے لگی۔ اب بھاٹی دروازے سے اقبال کی آمدورفت کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو گیا۔ مگر وہ شیخ گلاب دین وکیل سے ملنے کے لیے جو ان کے وطن مالوف سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے اور مولوی احمد دین وکیل کی مزاج پرسی کے لیے جو اس عرصے میں سلسل بیمار رہے کبھی کبھی بھاٹی دروازے کی طرف آ نکلتے۔ اور اس طرح چند لمحوں کے لیے بازار حکیماں کی پرانی محفل کی یاد تازہ ہو جاتی ں فقیر سید نجم الدین جو ابھی تک سلسلۂ ملازمت سے منسلک تھے جب کبھی چھٹیوں میں لاہور آتے تو وہ خود جا کر ہر روز انھیں اپنے کان لال حویلی میں اپنے ساتھ لے آتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اقبال ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کبھی ان سے دربا پر اپنے دل پسند راگ سنتے اور کبھی تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانانِ عالم نے جو عروج یا زوال کی منزلیں طے کی تھیں ان کے اسباب پر پنے خیالات ظاہر فرماتے۔ اور پھر عالم اسلامی کے مستقبل پر ان امید افزا نغمات سے سننے والوں کا دل گرما دیتے جن کی جھلک ن کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فقیر سید نجم الدین کے اصرار پر اپنا تازہ کلام سناتے۔ ان کی آواز

میں پیدا ہو رہا وہ سوز تھا کہ سننے والے جن میں سے اکثر اگرچہ ان کے اشعار کے معانی کی تہ کو تو نہ پہنچ سکتے مگر ان کی زبان سے ان کے اشعار سن کر بے تاب ہو جاتے۔

اس زمانے میں اقبال کی شاعری مقبولِ خاص و عام ہو چکی تھی۔ اور ان کا نام ایک ایسا طلسم بن گیا تھا کہ جو شعر بھی ان کے نام سے منسوب ہوتا یا شائع ہوتا لوگ اس کے الفاظ سے نہ صرف متاثر ہی ہوتے بلکہ اس کے مطالب کی گہرائیوں پر غور و فکر کرنے لگ جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب اقبال کا اندازِ تفکر اور اسلوبِ بیان ملک بھر کے تعلیم یافتہ طبقوں کے دل پر عموماً اور مسلمان نوجوانوں کے دل پر خصوصاً ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اسلام کے مستقبل کو اسی آئینے میں دیکھنے لگے تھے۔ اور ملک کا ہر برنا و پیر ان کی تصنیفات کو حرزِ جاں سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کی تصانیف کی اشاعت کی تعیین کر دی جائے کہ اس سے ان کی شاعری کے ادوارِ ارتقا کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے اگرچہ اقبال کی بعض نظمیں جو "بانگِ درا" میں شائع ہوئیں ان کی شاعری کے دورِ ارتقا کی ابتدائی منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مگر وہ ایک مجموعے کی شکل میں ۱۹۲۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ اس سے پہلے ان کی کتابیں "اسرارِ خودی" ۱۹۱۲ء میں، "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۸ء میں اور "پیامِ مشرق" ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی دوسری کتابیں "زبورِ عجم" ۱۹۲۷ء میں "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں "بالِ جبریل" ۱۹۳۵ء میں "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" ۱۹۳۶ء میں "ضربِ کلیم" بھی ۱۹۳۶ء میں اور "ارمغانِ حجاز" ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئیں۔ بلاشبہ اکبر الہ آبادی کے اشعار نے دو پردہ ہندوستان کے رہنے والوں کی آنکھوں پر سے وہ پردہ اٹھا دیا تھا جو مغربی تعلیم اور تہذیب نے ان پر ڈال رکھا تھا۔ لیکن اقبال کے ان غیر مبہم نظریات نے جو ان کے اشعار کے اُفق پر درخشاں ستاروں کی طرح اُبھر اُبھر کر ایک نئی صبحِ زندگی کا پیغام دیتے ہیں مغربی تہذیب کا وہ قلعہ مسمار کر دیا جو مغربی تعلیم کی بنیادوں پر طلبا کے ذہن میں استوار ہوا تھا۔

اس مضمون کے مقتضیات کے پیشِ نظر اس جگہ شاعرِ مشرق کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے عدیم المثال جوہرِ فکر و نظر پر افسوس کہ تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ——

دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

اور یقیناً اقبال وہ مردِ حق تھا جو قرنوں کے بعد پیدا ہوا اور اب شاید دور پہ دور گزر جائیں تو مطلعِ گیتی ایسا مردِ حق پیدا نہ کر سکے گی۔ اور گردشِ لیل و نہار اس نہاں خانۂ ہستی کے ہزار در ہزار اسرار فاش کرتی چلی جائے مگر وہ دانائے راز پھر پیدا نہ ہوگا جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالمِ اسلام کو ایک حیاتِ نو کا پیغام دے کر خود موت کی آغوش میں سو گیا۔

اقبال نے اپنی علالت کے زمانے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ایک رُباعی کہی تھی ——

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگارے ایں فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ ناید

س رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں اس امکان کا ایک ذرا سا شائبہ ضرور موجود تھا کہ شاید آئندہ کسی زمانے میں پردگی ـئے پارینۂ روزگار کا کوئی دانائے راز پھر پیدا ہو جائے مگر میں جو اپنے بچپن سے ان کی وفات کے وقت تک سائے کی طرح ان ـے ساتھ ساتھ رہا ہوں الحمد اللہ فطرت کے اس رازدان کی قدرتِ فکر و نظر سے خوب واقف ہوں انہیں کے ایک شعر پر ان کی عظمت ی اس مختصر داستان کو ختم کرتا ہوں ـــــ

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا

رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

مقصدِ بیان قطعی نہیں مگر جب بھاٹی دروازے کے بازار حکیماں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ بیان خودنمائی پر محمول نہ کیا جائے کہ راقم الحروف نے بھی علم و ادب کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آبِ رواں کا ایک جرعہ اور انہیں ایامِ آئینِ فطرت کے خوانِ نعمت کا ایک ریزہ ہیں جن کی صحبت کی سعادت خوبیٔ تقدیر سے مجھے نصیب ہوئی۔

میں نے ابتدا میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی۔ یہ مدرسہ اس وقت بھی آج کل کی طرح سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ملحق تھا۔ اور پنجاب کے سررشتۂ تعلیم نے اس بات کا خاص انتظام کر رکھا تھا کہ اس مدرسے کے اساتذہ علم و فضل میں فقید النظیر اور طریقۂ تعلیم میں عدیم المثال ہوں۔ مولوی سید احمد کبیر، لالہ مدن گوپال، مولوی غلام رسول قریشی، پنڈت پربھو دت شاستری، لالہ سکھ دیال، مرزا احمد سعید، مولوی عبداللہ خان، اور مسٹر پران ناتھ جہاں تعلیم و تعلم میں سخت کوش تھے وہاں اپنی شفقت اور شرافت کے باعث طلبا میں ہردلعزیز اور حکام کی نظر میں واجب الاحترام تھے۔ یہ مدرسہ میرے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ایسے ایسے نامور ہیڈ ماسٹروں کی نگرانی میں سرچشمۂ علوم و فنون رہا جن کے نام جوہرِ کمال کے ضامن اور سرمایۂ ثقافت و شرافت کے کفیل تھے۔ رائے بہادر شو دیال، رائے بہادر سندر داس سوری، مسٹر ٹائیڈ مین، مسٹر لنگاب ارن، مسٹر وانٹ اور ان سب سے بڑھ کر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل مسٹر نولش وہ شفیق استاد تھے جنھوں نے طلبا کی نظر میں مدرسے کو گھر سے زیادہ محبوب اور اکتسابِ علم کو جان سے زیادہ عزیز بنا دیا۔ میرے ذہنی نشوونما کی تربیت بھی انہیں استادوں کے دامنِ عاطفت میں ہوئی۔

انہیں ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس پر میں جس قدر بھی فخر کروں بجا ہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جو اس زمانے میں امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے کچھ دنوں کے لیے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں مولوی غلام رسول کی جگہ ہمیں عربی فارسی اور اردو پڑھانے لگے۔ جب وہ ہمیں سبق دیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک بحرِ مواج ہے کہ اُبل پڑا اور حکمت و دانش کا ایک ابرِ محیط ہے کہ فضائے آسمان پر چھا گیا۔ ہم تشنگانِ علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اس بحرِ بیکراں کی چھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور ان کی بارشِ دانش کے جتنے لآلیِ آبدار جمع ہو سکتے تھے ان سے اپنا دامن بھر لیا۔

سنٹرل ماڈل سکول اور اسلامیہ کالج کے اساتذہ کرام کا میں نے اس مضمون میں اس لیے ذکر کر دیا ہے کہ یہ دانش گاہیں بھاٹی دروازے ہی کے علاقے میں ہیں۔ اور وہ اکتسابِ علم کے خواہاں طلبا کی ناموری اور شہرت دوام کا باعث بنے۔ اسی علاقے کے اہلِ فن ہی کی تلاش کے مرہونِ احسان ہیں۔ میرے دل میں کچھ تو اس وجہ سے کہ ان نامور استادوں کے متبحر علم و فضل پر نامیہ فرسائی کر کے اور کچھ ان بزرگوں کے قدموں میں بیٹھ کر جو ہر شام میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمع ہو جایا کرتے تھے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے ہی میں حصولِ علم کا شوق اور صنائع ادب کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اور میں اپنے لڑکپن ہی میں اپنے مستقبل کو جس کی بہار اب ماضی کی خزاں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہے اور جس کی یاد کے سوا اب کچھ باقی نہیں۔ اُردو ادب ہی کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس باب میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اس کا بیان بہ ہر نوع اپنی ستائش پر محمول ہوگا اور اس سے میرے جبلی انکسار اور فطری عجز کے مجروح ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں ماہنامہ "کہکشاں" جو سرعبدالقادر اور سر محمد اقبال کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے "مخزن" ہی کے نقشِ قدم پر چل کر ایک پندرہ روزہ ادبی رسالہ "ہزار داستان" اور اس کے ساتھ ساتھ ہی بچوں کے لیے ادب لطیف کا ایک ہفتہ وار رسالہ "نونہال" شائع کیا۔ یہ دونوں رسالے ۱۹۲۳ء تک میری ذاتی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ اور جب میں اس سال سرکاری ملازمت سے منسلک ہو گیا تو میں نے ان رسالوں کی ادارت اپنے دو نہایت ہی عزیز دلدادگانِ ادب سید عابد علی عابد اور مسٹر ہادی حسین کو سونپ دی۔ سید عابد علی عابد جن کا نام اب علمی اور ادبی حلقوں میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں بعد میں قانون کا امتحان پاس کر کے اور مسٹر ہادی حسین انڈین سول سروس سے منسلک ہو کر جب لاہور سے باہر چلے گئے تو یہ دونوں رسالے بند ہو گئے۔

میں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے تنقید اور نظم کے مضامین بھی لکھے ہیں۔ شعر بھی کہے ہیں لیکن وہ حقیر خدمت جو محض اللہ کی توفیق ہی سے میرے ہاتھوں انجام پائی ہے اور جسے میں اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے اس لفظی ترجمے کو جو قدیم اُردو زبان میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا موجودہ زمانے کی آسان و سلیس زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس ترجمے کے پانچ پارے شائع ہو چکے ہیں اور باقی زیرِ طبع ہیں۔

ڈاکٹر عاشق حسین کی خواہش کے مطابق میں نے بھاٹی دروازے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مختصر سا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن یہ اجمال اب بھی تفصیل چاہتا ہے۔ اگر زندگی نے فرصت دی تو شاید یہ تفصیل بھی کبھی قلمبند ہو جائے۔ اس مضمون میں میں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جو میرے ذہن میں محفوظ تھیں لیکن سنین، واقعات اور بعض دوسرے تعینات کی صحت کے پیشِ نظر میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی تاریخ جسے ڈاکٹر غلام حسین نے بڑی محنت اور تلاش سے مرتب کیا ہے اور سر لیپل گرفن کی مشہور تالیف "تذکرۂ رؤسائے پنجاب" سے استفادہ کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔ یہ دونوں معتبر اور مستند ذرائع اگر دستیاب نہ ہوتے تو یہ مضمون تشنۂ استناد رہ جاتا اور اس لیے ان دونوں کتابوں کے مؤلفین کا غائبانہ شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تاریخ ولادت اور کئی دوسری معتبر معلومات کے لیے میں جناب اقبال پر فقیر سید وحید الدین کی بے مثال کتاب "روزگار فقیر" کا مرہونِ منت ہوں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ایک نثری اشاعت کے مقتضیات کے اعتبار سے یہ مضمون اختصار کی حد سے کسی قدر گزر گیا ہے مگر۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کھلونے

(ناولٹ)

مسعود مفتی

کھلونے

مسعود مفتی

عبدالرحمان نے دونوں ہاتھ جوڑ کر رکھیں اور اُن پر کھڑا ہو کر کھڑکی کے شیشے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

چھوٹا سا کمرہ ـــــ درمیان میں بڑی سی میز ـــــ میز کے اوپر کنارے پر ایک شکنجہ ـــــ دُوسرے کنارے کے پاس چھت سے بندھی ہوئی دو رسیاں لٹک رہی تھیں ـــــ میز پر ایک مرد بنیان اور دھوتی پہنے لیٹا تھا۔ اُس کے دونوں پاؤں شکنجے میں کسے تھے اور دونوں ہاتھ سر سے اوپر اُٹھا کر چھت سے لٹکی ہوئی رسیوں سے بندھے تھے ـــــ کمر کمان بنی تھی۔ جس کا نچلا سرا ادھی سا میز پر ٹکا تھا۔ ـــــ دھوتی سمٹ کر کمر کے گرد اکٹھی ہوئی تھی اور ننگی ٹانگوں پر شکنجے کے دباؤ کی وجہ سے رگیں پھول رہی تھیں۔

عبدالرحمان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے اپنا چہرہ شیشے پر اتنا دبایا کہ ناک چپٹی ہونے لگی۔

میز کے پاس بڑی بڑی مونچھوں والا تھانیدار ہاتھ میں کچھ کاغذ پکڑے کھڑا تھا۔ اُس کے تیور خشمگیں تھے اور جسم کا ہر رواں رُعب جھاڑ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ ہلتے نظر آئے ـــــ میز پر لیٹے ہوئے آدمی نے تھوڑا سر اُٹھایا۔ آنسو بھری آنکھوں سے تھانیدار کو ملتجیانہ انداز میں دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

تھانیدار نے سٹ پٹا کر سر جھٹکا اور پاس کھڑے ہوئے سپاہی کو اشارہ دیا۔ سپاہی نے گول پہیے کو گھما کر شکنجے کو ذرا سا کسا اور ٹرا۔ اُبرا ہوا تنا ہوا لیٹے ہوئے مرد کو دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔

وہ مرد تڑپ تڑپ کر ایسے چیخنے لگا کہ اس کی آواز بند کھڑکیوں میں سے بھی باہر آنے لگی۔

آج چند منٹ پہلے عبدالرحمان نے یہ چیخیں سنی تھیں اور چلتے چلتے گلی میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے شک گزرا کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کھڑکی دیکھ کر اس کے شیشوں میں سے اندر جھانکنے لگا تھا اب جو اُس نے یہ نظارہ دیکھا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلیں زمین پر رکھ دیں۔ ناک کو ایک دفعہ سہلایا اور پھر سے چہرہ شیشے پر دبا دیا۔ ناک پچکنے سے اُس نے بڑی مشکل سے ایک چھینک روکی۔

لیٹنے والا مرد بڑے زور سے ہائے ہائے کر رہا تھا اور سپاہی اس کو تڑا تڑ جوتے مار رہا تھا۔ مرد کی ہر چیخ کے ساتھ عبدالرحمان کا حلق خشک ہونے لگتا۔ جب اس کے جسم پر جوتے کی چوٹ لگتی۔ تو سارا جسم اُچھلتا۔ چھت سے لٹکی ہوئی رسیاں عجیب تانے بانے کھنچنے لگیں اور عبدالرحمان کانپ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپنے لگیں۔

پیچھے سے ایک زوردار تھپڑ عبدالرحمان کی کمر پر پڑا۔

——— وہ کلبلا کر پیچھے ہٹا۔

ایک سپاہی اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر اُس نے فائیلوں کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ڈپٹ کر بولا۔

"چل ہٹ پرے۔ آیا ہے ماں کا خصم تماشہ دیکھنے۔"

عبدالرحمان فائیلیں اُٹھا کر ایسا بھاگا کہ تھانے کی حد سے کافی دُور جا کر اُس نے سانس لیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور خوف کے مارے ہر تانگے، موٹر یا سائیکل سے بھی دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا۔ اسی کوشش میں وہ کئی دفعہ دُوسرے راہگیروں سے بھی جا ٹکرایا۔ چلتے چلتے اُس نے محسوس کیا کہ پیٹھ سے ساری قمیص پسینے سے تر ہے۔ تب اُس نے فائیلیں دُوسرے ہاتھ میں پکڑ لیں اور فارغ ہاتھ بڑی مشکل سے گھما کر پیٹھ کے پیچھے لے گیا۔ دو اُنگلیوں کی چٹکی میں قمیص کا ذرا سا کپڑا پکڑ کر کھینچا تو قمیص کے بتدریج الگ ہونے سے ایک لہر سی ساری پیٹھ پر گھوم گئی اور اُسے سکون سا مل گیا۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "توبہ، میری توبہ" اور وہ زیرلب آیت الکرسی پڑھنے لگا تا کہ خوف کچھ کم ہو۔

گھر پہنچا تو ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اُس نے دروازہ بڑے زور سے بند کیا۔ اندر سے اُس کی بیوی کی آواز آئی۔

"کون ہے باہر؟"

مگر وُہ جواب دیے بغیر گھبرایا ہُوا سا آگے بڑھ گیا۔ صحن میں چارپائی پر اُس کا تین سالہ بچہ سو یا پڑا تھا۔ وُہ بے تابی سے آگے بڑھا اور بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ایک دو دفعہ والہانہ چُوما اور پھر زیرلب بولا "توبہ میری توبہ۔"

بچہ نیند میں اچانک چونکنے پر رونے لگا تو عبدالرحمان اُسے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ مگر وہ روتا گیا۔ اُس کے کُھلے مُنہ کے آر پار رال تن جاتی۔ جو بوجھل ہو کر ایک طرف کو ڈھلک جاتی۔ ادھ کُھلی آنکھوں کی باریک درزوں میں پانی بھرنے لگا۔ جو باہر کے کونوں سے ڈھلک کر کانوں سے ہوتا ہوا گردن تر کرنے لگا۔

"ہائے کیا تماشہ کھڑا کر دیا آتے ہی؟"

بیوی کی آواز پر سر اُٹھا کر اُس نے دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھُری تھی اور دُوسرے میں آدھا چھلا ہُوا شلغم تھا۔

"اتنی مُشکل سے سلا کر ذرا کی ذرا کام کرنے لگی تھی اور اس فتنے کو پھر جگا دیا آپ نے۔"

بچے کے رونے کی تان بلند ہونے لگی تو بیوی پاس آ کر بولی:

"لائیے مجھے دیں ——— میں سلاؤں اس بجھتنے کو ——— نیند پُوری کیے بغیر جاگ اُٹھا تو ساری شام اجیرن کر دے گا۔"

عبدالرحمان نے خاموشی سے بچہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

بیوی نے کندھے سے لگا کر دو تھپکیاں دیں اور ساتھ ساتھ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے کندھوں کو گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلانے لگی۔ بچے نے ایک دو دفعہ ننھی ننھی ٹانگیں ہلائیں۔ بے تابی سے سر کو پٹخا۔ ایک آدھ دفعہ آں کو ... درست ماں کے

میں اپنا یہ شعر پڑھتے

روزِ محشر اعتبار ما است آں

در جہاں ہم پردہ دار ما است آں

پھر ان کی آواز بھرّا گئی۔ اور سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب "ذکرِ اقبال" میں ان کی ولادت ۲۴ ذوالقعدہ کے مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ان کی وفات کے وقت ۶۵ برس کی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ماخذ غالباً ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بیان ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہوتی تو اقبال کی حسرت دل ہی دل میں رہ جاتی۔ اور ۶۳ برس کی عمر سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کی آرزو بر آتی۔ لیکن خدا فقیر سید وحیدالدین کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنی کتاب "روزگار فقیر" میں بڑی تحقیق کے بعد اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۹۔ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی ہے۔ اس حساب سے اقبال کی عمر ۶۱ برس کی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اس تاریخ پر اعتبار کیا جائے تو اقبال کی آرزو پوری ہو گئی۔ اور وہ ۶۳ برس کی عمر سے پہلے ہی واصل بحق ہو گئے۔

فقیر سید وحیدالدین کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہرحال جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے۔ اور گورنمنٹ کالج کی بی۔ اے کی جماعت میں داخل ہوئے اور انگریزی فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ شورِ محشر کے ۱۵، دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی غزل اس مشاعرے میں پڑھی جو بازار حکیماں میں اسی سال منعقد ہوا۔ مجھے اپنے بھائی حکیم امین الدین سے زبانی معلوم ہوا تھا کہ ان کے مکان پر اقبال کا آنا جانا ۱۸۹۵ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور عربی اور انگریزی میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ انھوں نے ایم۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا۔ اس وقت تک اقبال گورنمنٹ کالج کے کواڈرینگل کے کمرہ نمبر ۱ میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں جب اقبال ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے تو وہ بھاٹی دروازے کے اندر اس بالاخانے میں جو محلہ جلوٹیاں کے سامنے گھیبڑ حلوائی کی دکان کے اوپر واقع ہے رہنے لگے۔ اقبال ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اسی مکان میں رہے۔ اس تمام عرصے میں وہ ہر شام کو بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے اور اپنے دوستوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھنے کے لیے اپنی نظم "تصویرِ درد" لکھی تو اسے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سنایا۔ وہ اسی طرح ہر سال جب کوئی نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھتے تو اسے جلسۂ عام میں پڑھنے سے پہلے اسی بیٹھک میں اپنے دوستوں کو سناتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ "مخزن" بازار حکیماں سے شائع کیا تو اقبال کی پہلی نیچرل نظم 'ہمالہ' جسے شیخ عبدالقادر نے اسی بیٹھک میں سنا تھا مخزن کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔

اقبال کی وہ نظمیں جو انھوں نے انگلستان جانے سے پہلے لکھیں اور جو بعد میں ان کی کتاب "بانگ درا" میں شائع ہوئیں اس زمانے میں لکھی گئی تھیں جب وہ بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ اور اس لیے اس عظمت کی سعادت جو اقبال سے منسوب ہے بھاٹی دروازے ہی کو نصیب ہوئی۔

اقبال نے جو نظمیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہ کر لکھیں ان کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آئے۔ اور وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے سے اٹھ کر موہن لال روڈ پر جو آج کل اردو بازار سے موسوم ہے اس باغ کے عقب میں جو بھاٹی اور موری دروازے کے درمیان میں واقع ہے لالہ چونی لال مونگا کے مکان میں رہنے لگے۔ مگر اس مکان میں وہ کچھ زیادہ دیر تک نہ رہے۔ منشی طاہر الدین کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۰۸ء کے ماہ اکتوبر میں انارکلی میں وہ بالاخانہ کرائے پر لے لیا جس میں پہلے سر محمد شفیع وکالت کرتے تھے۔ اس مکان میں وہ ۱۹۲۲ء تک رہے۔ اس نقل مکان سے یہ مطلب نہیں کہ ان کا بھاٹی دروازے سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ شاید یہ کہنا بجا ہوگا کہ حکیم شہباز دین کی بیٹھک کی کشش ان کے دل میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ وہ اس تمام عرصے میں ہر روز شام کو بلا ناغہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس بیٹھک میں آ بیٹھتے اور جیسا میں نے اوپر لکھا ہے ان کے دم قدم سے یہ محفل رات گئے تک گرم رہتی۔ وہ تمام نظمیں جو انھوں نے اس زمانے میں لکھیں اور ان میں "اسرار خودی" کو بہت اہمیت حاصل ہے وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق اسی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنے احباب کو سنایا کرتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی کوئی نظم خلیفہ نظام الدین کو جن کی آواز بہت دل کش اور پرسوز تھی پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ اور ان کی زبان سے اپنے اشعار سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ ان نظموں کا بھاٹی دروازے ہی کے سر سہرا ہے تو حقیقت سے کچھ بعید نہ ہوگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ۱۹۲۲ء میں حکیم امین الدین کی وفات کے بعد بازار حکیماں کی یہ پرانی محفل اجڑی اور ادھر اقبال اسی برس انارکلی کے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک بنگلے میں جو اس زمانے میں سید محمد لطیف مصنف "تاریخ لاہور" کی بیوہ کی ملکیت تھا اٹھ گئے۔ اور ان کی محفل جو کبھی بازار حکیماں میں جمتی تھی۔ کوئینز روڈ پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے دولت کدے "زرفشاں" میں جمنے لگی۔ اب بھاٹی دروازے سے اقبال کی آمدورفت کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو گیا۔ مگر وہ شیخ گلاب دین وکیل سے ملنے کے لیے جو ان کے وطن مالوف سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے اور مولوی احمد دین وکیل کی مزاج پرسی کے لیے جو اس عرصے میں مسلسل بیمار رہے کبھی کبھی بھاٹی دروازے کی طرف آ نکلتے۔ اور اس طرح چند لمحوں کے لیے بازار حکیماں کی پرانی محفل کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ہاں فقیر سید نجم الدین جو ابھی تک سلسلۂ ملازمت سے منسلک تھے جب کبھی چھٹیوں میں لاہور آتے تو وہ خود جا کر ہر روز انھیں اپنے مکان لال حویلی میں اپنے ساتھ لے آتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اقبال ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ کبھی ان سے رباب پر اپنے دل پسند راگ سنتے اور کبھی تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسلمانانِ عالم نے جو عروج یا زوال کی منزلیں طے کی تھیں ان کے اسباب پر اپنے خیالات ظاہر فرماتے۔ اور پھر عالم اسلامی کے مستقبل پر ان امید افزا توقعات سے سننے والوں کا دل بڑھا دیتے جن کی جھلک ان کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فقیر سید نجم الدین کے اصرار پر اپنا تازہ کلام سناتے۔ ان کی آواز

میں پیار، درد اور سوز تھا کہ طلبہ جن میں سے اکثر اگرچہ ان کے اشعار کے معانی کی تہ کو تو نہ پہنچ سکتے مگر ان کی زبان سے ان کے اشعار سن کر بے تاب ہو جاتے۔

اس زمانے میں اقبال کی شاعری مقبول خاص و عام ہو چکی تھی۔ اور ان کا نام ایک ایسا طلسم بن گیا تھا کہ جو شعر بھی ان کے نام سے منسوب ہو کر شائع ہوتا لوگ اس کے الفاظ سے نہ صرف متاثر ہی ہوتے بلکہ اس کے مطالب کی گہرائیوں پر غور و فکر کرنے لگ جاتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب اقبال کا انداز تفکر اور اسلوب بیان ملک بھر کے تعلیم یافتہ طبقوں کے دل پر چھا اور مسلمان نوجوانوں کے دل پر خصوصاً ایسا حاوی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اسلام کے مستقبل کو اسی آئینے میں دیکھنے لگے تھے۔ اور ملک کا ہر برنا و پیر ان کی تصنیفات کو حرز جان سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کی تصانیف کی اشاعت کی تعیین کر دی جائے کہ اس سے ان کی شاعری کے ارتقا کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے اگرچہ اقبال کی بعض نظمیں جو "بانگ درا" میں شائع ہوئیں ان کی شاعری کے ارتقا کی ابتدائی منازل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مگر وہ ایک مجموعے کی شکل میں ۱۹۲۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ اس سے پہلے ان کی کتابیں "اسرار خودی" ۱۹۱۲ء میں، "رموز بے خودی" ۱۹۱۸ء میں اور "پیام مشرق" ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی دوسری کتابیں "زبور عجم" ۱۹۲۷ء میں، "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں، "بال جبریل" ۱۹۳۵ء میں، "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ۱۹۳۶ء میں "ضرب کلیم" بھی ۱۹۳۶ء میں اور "ارمغان حجاز" ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئیں۔ بلاشبہ اکبر الہ آبادی کے اشعار نے وہ پردہ ہندوستان کے رہنے والوں کی آنکھوں پر سے اٹھا دیا تھا جو مغربی تعلیم اور تہذیب نے ان پر ڈال رکھا تھا۔ لیکن اقبال کے ان غیر مبہم نظریات نے جو ان کے اشعار کے افق پر درخشاں ستاروں کی طرح ابھر ابھر کر ایک نئی صبح زندگی کا پیغام دیتے ہیں مغربی تہذیب کا وہ قلعہ مسمار کر دیا جو مغربی تعلیم کی بنیادوں پر طلبا کے ذہن میں استوار ہوا تھا۔

اس مضمون کے مقتضیات کے پیش نظر اس جگہ شاعر مشرق کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے عدیم المثال جوہر فکر و نظر پر افسوس کہ تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ——

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

اور یقیناً اقبال وہ مرد حق تھا جو قرنہا قرن کے بعد پیدا ہوا اور اب شاید دور پر دور گزر جائیں تو بھی گیتی ایسا مرد حق پیدا نہ کر سکے گی۔ اور گردش لیل و نہار اس نہاں خانۂ ہستی کے ہزار در ہزار اسرار فاش کرتی چلی جائے مگر وہ دانائے راز پھر پیدا نہ ہوگا جو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالم اسلام کو ایک حیات نو کا پیغام دے کر خود موت کی آغوش میں سو گیا۔

اقبال نے اپنی علالت کے زمانے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ایک رباعی کہی تھی ——

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس شعر ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں اس احساس کا ایک ذرا سا شائبہ ضرور موجود تھا کہ شاید آئندہ کسی زمانے میں پردگی اسرار روزگار کا کوئی دانائے راز پھر پیدا ہو جائے مگر میں جو اپنے بچپن سے ان کی وفات کے وقت تک سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہا ہوں اور رموز فطرت کے اس رازداں کی قدرتِ فکر و نظر سے خوب واقف ہوں انہیں کے ایک شعر پر ان کی عظمت کی اس مختصر داستان کو ختم کرتا ہوں ۔

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

مقصد بیان تعلّی نہیں مگر جب بھائی صاحب مرحوم کے بازار حکیماں کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ بیان خود نمائی پر محمول نہ کیا جائے کہ راقم الحروف نے بھی علم و ادب کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں اسی سرچشمۂ علم و فضل کے آب رواں کا ایک جرعہ اور انہیں دانایانِ آئینِ فطرت کے خوانِ نعمت کا ایک ریزہ ہیں جن کی صحبت کی سعادت خوبیٔ تقدیر سے مجھے نصیب ہوئی ۔

میں نے ابتداً میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی ۔ یہ مدرسہ اس وقت بھی آج کل کی طرح سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ملحق تھا ۔ اور پنجاب کے سررشتۂ تعلیم نے اس بات کا خاص انتظام کر رکھا تھا کہ اس مدرسے کے اساتذہ علم و فضل میں فقید المثال اور طریقۂ تعلیم میں عدیم المثال ہوں ۔ مولوی سید احمد کبیر، لالہ مدن گوپال، مولوی غلام رسول قریشی، پنڈت پربھو دت شاستری، لالہ سکھ دیال، مرزا احمد سعید، مولوی عبد اللہ خاں، اور ماسٹر پران ناتھ جو اں تعلیم و تعلّم میں سخت کوش تھے وہاں اپنی شفقت اور شرافت کے باعث طلبا میں ہر دلعزیز اور حکام کی نظر میں واجب احترام تھے ۔ یہ مدرسہ میرے زمانۂ تعلیم کے دوران میں ایسے ایسے نامور ہیڈ ماسٹروں کی نگرانی میں سرچشمۂ علوم و فنون رہا جن کے نام جوہر کمال کے ضامن اور سرمایۂ ثقافت و شرافت کے کفیل تھے ۔ رائے بہادر شو دیال، رائے بہادر سندر داس سوری، مسٹر ہائیڈ مین، مسٹر لنگ ہارن، مسٹر واٹ اور ان سب سے بڑھ کر سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل مسٹر نولش وہ شفیق استاد تھے جنہوں نے طلبا کی نظر میں مدرسے کو گھر سے زیادہ محبوب اور اکتسابِ علم کو جان سے زیادہ عزیز بنا دیا ۔ میرے ذہنی نشو و نما کی تربیت بھی انہیں استادوں کے دامنِ عاطفت میں ہوئی ۔

انہیں ایام میں مجھے ایک ایسی سعادت بھی میسر آئی جس پر میں جس قدر بھی فخر کروں بجا ہے ۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جو اس زمانے میں امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت کے سلسلے سے امرتسر آئے ہوئے تھے کچھ دنوں کے لیے سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں مولوی غلام رسول کی جگہ ہمیں عربی فارسی اور اردو پڑھانے لگے ۔ جب وہ ہمیں سبق دیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک بحر مواج ہے کہ اُبل پڑا اور حکمت و دانش کا ایک ابر محیط ہے کہ فضائے آسمان پر چھا گیا ۔ ہم تشنگانِ علم نے اپنی تنگ ظرفی کے باوجود اس بحر بیکراں کی چھال سے اپنے کام و دہن کو سیراب کیا اور ان کی بارش دانش کے جتنے لآلی آبدار جمع ہو سکتے تھے ان سے اپنا دامن بھر لیا ۔

سنٹرل ماڈل اسکول اور اس کے اساتذہ کرام کا میں نے اس مضمون میں اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ دانش گاہ بھی بھاٹی دروازے ہی کے علاقے میں ہے۔ اور وہ کالج بھی جس کے طلبا کی نامدری اور شہرت کا باعث ہے اسی علاقے کے اہل ذوق ہی کی تلاش کے رہین احسان ہیں۔ بہرحال میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ ان اساتذہ اور ان کے علم و فضل پر ناصیہ فرسائی کرکے اور کچھ ان بزرگوں کے قدموں میں بیٹھ کر جو ہر شام میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں جمع ہوا کرتے تھے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے ہی میں حصولِ علم کا شوق اور صنائع ادب کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اور میں اپنے لڑکپن ہی میں اپنے مستقبل کو جس کی بہار اب ماضی کی خزاں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہے اور جس کی یاد کے سوا اب کچھ باقی نہیں۔ علم و ادب ہی کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس باب میں جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اس کا بیان بہر صورت اپنی ستائش پر محمول ہوگا اور اس سے میرے جیسی انکسار اور فطری عجز کے مجروح ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں بازار حکیماں ہی سے سر عبد القادر اور سر محمد اقبال کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے "مخزن" ہی کے نقش قدم پر چل کر ایک پندرہ روزہ ادبی رسالہ "ہزار داستان" اور اس کے ساتھ ساتھ ہی بچوں کے لیے ادب لطیف کا ایک ہفتہ وار رسالہ "نونہال" شائع کیا۔ یہ دونوں رسالے ۱۹۲۳ء تک میری ذاتی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ اور جب میں اس سال سرکاری ملازمت سے منسلک ہو گیا تو میں نے ان رسالوں کی ادارت اپنے دو نہایت ہی عزیز دلدادگانِ ادب سید عابد علی عابد اور مسٹر ہادی حسین کو سونپ دی۔ سید عابد علی عابد جن کا نام اب علمی اور ادبی حلقوں میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں بعد میں قانون کا امتحان پاس کرکے اور مسٹر ہادی حسین انڈین سول سروس سے منسلک ہو کر جب لاہور سے باہر چلے گئے تو یہ دونوں سلسلے بند ہو گئے۔

میں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے، تیشے اور نظم کے قطعے بھی لکھے ہیں۔ شعر بھی کہے ہیں لیکن وہ حقیر خدمت جو محض اللہ کی توفیق ہی سے میرے ہاتھوں انجام پائی ہے اور جسے میں اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے اس لفظی ترجمے کو جو قدیم اردو زبان میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا موجودہ زمانے کی آسان و سلیس زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس آیت کے پانچ پارے شائع ہو چکے ہیں اور باقی زیر طبع ہیں۔

ڈاکٹر عاشق حسین کی خواہش کے مطابق میں نے بھاٹی دروازے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مختصر سا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن یہ اجمال اب بھی تفصیل چاہتا ہے۔ اگر زندگی نے فرصت دی تو شاید یہ تفصیل بھی کبھی قلمبند ہو جائے۔ اس مضمون میں میں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جو میرے ذہن میں محفوظ تھیں لیکن سنین، واقعات اور بعض دوسرے تعینات کی صحت کے پیش نظر میں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کی تاریخ جسے ڈاکٹر غلام حسین نے بڑی محنت اور تلاش سے مرتب کیا ہے اور سر لیپل گریفن کی مشہور تالیف "تذکرۂ رؤسائے پنجاب" سے استفادہ کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔ یہ دونوں معتبر اور مستند ذرائع اگر دستیاب نہ ہوتے تو یہ مضمون تشنۂ استناد رہ جاتا اور اس لیے میں دونوں کتابوں کے مؤلفین کا غائبانہ شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تاریخ ولادت اور کئی دوسری معتبر معلومات کے لیے میں جناب ڈاکٹر فقیر سید وحید الدین کی بے مثال کتاب "روزگار فقیر" کا مرہون منت ہوں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ایک نشری اشاعت کے مقتضیات کے اعتبار سے یہ مضمون اختصار کی حد سے کسی قدر گزر گیا ہے مگر۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کھلونے

(ناولٹ)

مسعود مفتی

کھلونے

مسعود مفتی

عبدالرحمان نے دو اینٹیں جوڑ کر رکھیں اور اُن پر کھڑا ہو کر کھڑکی کے شیشے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

چھوٹا سا کمرہ ——— درمیان میں بڑی سی میز ——— میز کے اُوپر کنارے پر ایک شکنجہ ——— دُوسرے کنارے کے پاس چھت سے بندھی ہوئی دو رسیاں لٹک رہی تھیں ——— میز پر ایک مرد بنیان اور دھوتی پہنے لیٹا تھا۔ اُس کے دونوں پاؤں شکنجے میں کسے تھے اور دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا کر چھت سے لٹکی ہوئی رسیوں سے بندھے تھے ——— کمر کمان بنی تھی۔ جس کا نچلا سرا ابھی سا میز پر ٹکا تھا ——— دھوتی سمٹ کر کمر کے گرد اکٹھی ہوئی تھی اور ننگی ٹانگوں پر شکنجے کے دباؤ کی وجہ سے رگیں پھُول رہی تھیں۔

عبدالرحمان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے اپنا چہرہ شیشے پر اتنا دبایا کہ ناک چپٹی ہونے لگی۔

میز کے پاس بڑی بڑی مونچھوں والا تھانیدار ہاتھ میں کچھ کاغذ پکڑے کھڑا تھا۔ اُس کے تیور خشمگیں تھے اور جسم کا ہر رواں رُعب چھانٹ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ ہلتے نظر آئے ——— میز پر لیٹے ہوئے آدمی نے تھوڑا سر اُٹھایا۔ آنسو بھری آنکھوں سے تھانیدار کو ملتجیانہ انداز میں دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

تھانیدار نے سٹپٹا کر سر جھٹکا اور پاس کھڑے ہوئے سپاہی کو اشارہ دیا۔ سپاہی نے گول پہیے کو گھما کر شکنجے کو ذرا سا کسا اور پھر ایک جوتا اُٹھا کر میز پر لیٹے ہوئے مرد کو دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔

وہ مرد تڑپ تڑپ کر ایسے چیخنے لگا کہ اُس کی آواز بند کھڑکیوں میں سے بھی باہر آنے لگی۔

ابھی چند منٹ پیشتر عبدالرحمان نے یہ چیخیں سنی تھیں اور چلتے چلتے گلی میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسے شک گزرا کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کھڑکی دیکھ کر اُس کے شیشوں میں سے اندر جھانکنے لگا تھا۔ اب جو اُس نے یہ نظارہ دیکھا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائلیں زمین پر رکھ دیں۔ ناک کو ایک دفعہ سہلایا اور پھر سے چہرہ شیشے پر دبا دیا۔ ناک پچکنے سے اُس نے بڑی مشکل سے ایک چھینک روکی۔

پٹنے والا مرد بڑے زور سے ہائے ہائے کر رہا تھا اور سپاہی اُس کو تڑاتڑ جوتے مار رہا تھا۔ مرد کی ہر چیخ کے ساتھ عبدالرحمان کا دل حلق کو آنے لگتا۔ جب اس کے جسم پر جوتے کی چوٹ لگتی۔ تو سارا جسم اُچھلتا۔ چھت سے لٹکی ہوئی رسیاں عجب تانے بانے بُننے لگتیں اور عبدالرحمان کانپ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی ٹانگیں جیسے جیسے کانپنے لگیں۔

پیچھے سے ایک زوردار تھپڑ عبدالرحمان کی کمر پر پڑا۔

——— وہ کلبلا کر پیچھے ہٹا۔

ایک سپاہی اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر اُس نے فائیلوں کو پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ڈپٹ کر بولا۔

"چل ہٹ پرے۔ آیا ہے ماں کا خصم تماشہ دیکھنے۔"

عبدالرحمان فائیلیں اُٹھا کر ایسا بھاگا کر تھانے کی حد سے کافی دُور جا کر اُس نے سانس لیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگا اور خوف کے مارے ہر تانگے، موٹر یا سائیکل سے بھی دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا۔ اِسی کوشش میں وہ کئی دفعہ دُوسرے راہگیروں سے بھی جا ٹکرایا۔ چلتے چلتے اُس نے محسوس کیا کہ پیٹھ سے ساری قمیص پسینے سے تر ہے۔ تب اُس نے فائیلیں دُوسرے ہاتھ میں پکڑ لیں اور فارغ ہاتھ کو قدرے مشکل سے گھما کر پیٹھ کے پیچھے لے گیا۔ دو اُنگلیوں کی چٹکی میں قمیص کا ذرا سا کپڑا پکڑ کر کھینچا تو قمیص کے بتدریج الگ ہونے سے ایک لہر سی ساری پیٹھ پر گھوم گئی اور اُسے سکون سا مل گیا۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "توبہ، میری توبہ" اور وہ زیرِ لب آیت الکرسی پڑھنے لگا تاکہ خوف کچھ کم ہو۔

گھر پہنچا تو ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اُس نے دروازہ بڑے زور سے بند کیا۔ اندر سے اُس کی بیوی کی آواز آئی۔

"کون ہے باہر؟"

مگر وُہ جواب دیے بغیر گھبرایا ہُوا سا آگے بڑھ گیا۔ صحن میں چارپائی پر اُس کا تین سالہ بچہ سویا پڑا تھا۔ وُہ بے تابی سے آگے بڑھا اور بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ایک دو دفعہ والہانہ چُوما اور پھر زیرِ لب بولا "توبہ میری توبہ"۔

بچہ نیند میں اچانک چونکنے پر رونے لگا تو عبدالرحمان اُسے کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔ مگر وہ روتا گیا۔ اُس کے کھُلے مُنہ کے آر پار رال تن جاتی۔ جو بوجھل ہو کر ایک طرف کو ڈھلک جاتی۔ ادھ کھُلی آنکھوں کی باریک درزوں میں پانی بھرنے لگا۔ جو باہر کے کونوں سے ڈھلک کر کانوں سے ہوتا ہوا گردن تر کرنے لگا۔

"ہائے کیا تماشہ کھڑا کر دیا آتے ہی۔"

بیوی کی آواز پر سر اُٹھا کر اُس نے دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھُری تھی اور دُوسرے میں آدھا چھلا ہُوا شلغم تھا۔

"اتنی مُشکل سے سلا کر ذرا کی ذرا کام کرنے لگی تھی اور اس فتنے کو پھر جگا دیا آپ نے۔"

بچے کے رونے کی تان بلند ہونے لگی تو بیوی پاس آ کر بولی:

"لائیے مجھے دیں ——— میں سلاؤں اس کمبخت کو ——— نیند پوری کیے بغیر جاگ اُٹھا تو ساری شام اجیرن کرے گا۔"

عبدالرحمان نے خاموشی سے بچہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

بیوی نے کندھے سے لگا کر دو تھپکیاں دیں اور ساتھ ساتھ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے کندھوں کو گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلانے لگی۔ بچے نے ایک دو دفعہ ننھی ننھی ٹانگیں ہلائیں۔ بے تابی سے سر کو پٹخا۔ ایک آدھ دفعہ ناک کو زور سے ماں کے

کندھے پر رکھا اور پھر آہستہ آہستہ سو گیا۔

اس عرصہ میں عبدالرحمان غسل خانے میں جا چکا تھا اور اندر سے منہ دھونے کی آواز آ رہی تھی۔

بیوی باورچی خانے کی طرف چلی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج پھر دفتر میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ نہ معلوم کیسی عادت ہے ان کی۔ بس کے کام تو آتے ہی نہیں باہر لوگوں کو ناراض کر دیتے ہیں اور گھر میں آکر کبھی بچوں کو جھنجھوڑا۔ کبھی چیزیں توڑ پھوڑ۔ کبھی ویسے ہی ظلم تھا۔ شلغم پر چھری چلاتے ہوئے وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔

"نہ معلوم کس جنجال میں پھانس دیا اللہ نے مجھے۔"

تھوڑی دیر بعد عبدالرحمان باورچی خانے میں داخل ہوا۔ دیوار سے لگی ہوئی پیڑھی کو پاؤں مار کر نیچے گرا دیا۔ اور اس پر بیٹھتے ہوئے دھوتی کے پلو سے گیلا منہ صاف کرنے لگا۔ چہرہ جب پلو کی اوٹ سے باہر آیا تو وہ جھرجھری لے کر بولا۔

"توبہ میری توبہ۔"

بیوی اس کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ جن میں لاتعلقی بھی تھی اور سوال بھی تھا۔ ابھی تک بچے کو جگانے کا قصور معاف نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔

"لو۔ چائے ڈال۔"

دیگچی کے ڈھکنے کو اس نے لال دسترخوان سے اٹھایا اور پیالی میں اٹھیلتے اٹھیلتے پھونک مار کر چائے کی پتی کو گرنے سے بچانے لگی۔ جب تک چائے سے پیالی بھرتی اس کی ناراضگی تجسس میں بدل چکی تھی۔

"کیا ہو گیا آج؟"

"کچھ نہ پوچھو گڈو کی ماں۔ کیا بتاؤں کیا دیکھا آج۔ میں تو کہتا ہوں ——— شرررر" اس نے چائے کی چسکی بڑے زور سے لی اور زبان جلنے پر پیالی ایک دم نیچے رکھ دی۔

"آج تھانے میں ایک ملزم کو پٹتے دیکھا ہے۔"

"ہائے ——— میں مر گئی ———" اس نے اپنا ہاتھ پھیلا کر قمیص کے گریبان پر رکھ دیا "آپ کیوں چلے گئے تھے وہاں؟"

عبدالرحمان نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھائی اور پھر رکھ دی۔

ابھی تک اس کے اوسان برقرار نہ ہوئے تھے۔ دھوتی کے پلو سے ایک دفعہ منہ پونچھتے ہوئے اس نے پیڑھی میں پہلو بدلا اور بیوی کو بات سنانے لگا۔ شکنجے میں پاؤں ایسے جکڑے تھے جیسے سیمنٹ سے لگائے ہوں۔ ہاتھ بھر لمبے جوتے کی خوفناک آواز ——— پاؤں کٹ ہونے کی وجہ سے اوپر والے جسم کی کربناک تڑپ۔ جیسے پوپلے کے تناور درخت سخت آندھی میں اوپر سے سر پٹختے ہیں۔ درد کی دردناک چیخیں ——— عبدالرحمان کا دہشت کھا جانا۔

وہ پیالی اٹھا کر ہونٹوں تک لے گیا۔ مگر چسکی لیے بغیر پھر سے نیچے رکھ دی اور کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگا کر بولا:۔

"گڈو کی ماں، سچ پوچھو تو میرا جسم ایسے کانپ رہا ہے جیسے چکی کے آس پاس کی زمین دھڑکتی ہے۔"

"توبہ۔ توبہ۔" بیوی چولھے میں لکڑی گھسیڑتے ہوئے بولی "اللہ کسی کو مصیبت میں نہ ڈالے۔"

"وُہ تو ٹھیک ہے بگیماں۔ مگر آدمی ایسے کرتوت ہی کیوں کرے۔ جو بعد میں ایسی حالت میں پھنسے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔"

بیوی کچھ قائل نظر نہ آتی تھی اور دونوں میں بحث چل پڑی۔ عبدالرحمان کو اصرار تھا کہ ہماری ساری مصیبتیں ہمارے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ نہ کیچڑ میں پتھر پھینکو نہ چھینٹے تم پر گریں۔ کسی فقیر سے بادشاہ نے پوچھا تم مجھ سے زیادہ ڈرتے ہو یا خدا سے۔ تو اُس نے کہا میں نہ تم سے ڈرتا ہوں نہ خدا سے، بلکہ اپنے اعمال سے ڈرتا ہوں۔ اگر میرے اعمال اچھے ہیں۔ تو نہ تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو نہ اللہ میاں اور اگر اعمال خراب ہیں تو میرا کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔ اس لیے ساری بات اپنے پر ہے۔ اپنی مصیبتیں ہم خود لاتے ہیں۔ دُوسرا کوئی ذمہ دار نہیں۔"

بیوی یہ سب کچھ مانتی تھی مگر پھر بھی وُہ پوری طرح قائل نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی عقل پر پتھر بھی تو پڑ جاتے ہیں۔ آدمی سے اُلٹی سیدھی حرکت ہو ہی جاتی ہے۔ آخر انسان جو ہُوا۔ کوئی فرشتہ تو ہے نہیں کہ بدی کر ہی نہیں سکتا۔

"نہ بگیماں۔ نہ ——— یہ بات نہیں" عبدالرحمان اُٹھتے ہوئے بولا "اب مجھے ہی دیکھو میں کبھی رشوت نہیں لیتا۔ حالانکہ میرے دفتر میں کون ہے جو رشوت نہیں کھاتا۔ اِس زمانے میں چپراسی بھی اپنے افسر جیسی پوشاک پہننا چاہتا ہے اور لوگ اپنی جیب دیکھنے کی بجائے ہمسائے کی شان دیکھ کر مقابلے میں خرچ کرتے ہیں۔ میں اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں خوش ہوں۔ مزے سے رات کو سوتا ہوں۔ گھر میں صوفہ نہیں۔ ایرکنڈیشنر نہیں۔ فرج نہیں ہے تو کیا ہُوا۔ اطمینان تو ہے اور دیکھ لینا یہ اطمینان مجھے ساری عمر نصیب رہے گا۔"

بیوی نے کوئی جواب نہ دیا اور پنکھے پر شلغم کے چھلکے اکٹھے کر کے باہر لے جانے لگی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے جب اُس نے ایرکنڈیشنر، صوفے اور فرج کا ذکر سُنا تو اُس کے چہرے پر کرب کی ہلکی سی لہر آئی اور گزر گئی۔ جیسے نیچی اُڑان والے پتنگ کا سایہ آپ کے قدموں میں لوٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔

اتنے میں عبدالرحمان کو باہر سے کسی نے آواز دی تو وہ دھوتی کے پلّو سے مُنہ صاف کرتا ہُوا باہر نکل گیا۔

بگیماں صحن سے گزر کر ڈیوڑھی تک گئی۔ وہاں خالی ڈرم میں شلغم کے چھلکے پھینکے۔ پنکھے کو جھاڑا۔ ایک لمبا سا چھلکا ڈرم کے کنارے میں اٹک گیا۔ دو ایک چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باہر زمین پر لڑھک گئے۔ بگیماں نے پاؤں کی گھسیٹ سے اُن کو ڈرم کے قریب کیا اور پھر دروازے پر لٹکے ہوئے پردے پر آنکھ لگا کر باہر دیکھنے لگی کہ کون آیا ہے۔ پردے کا یہ سوراخ اُسی دن بنا لیا گیا تھا۔ جب نیا پردہ لٹکایا تھا اور اُس وقت سے اب تک نہایت مُفید ثابت ہو رہا تھا۔

عبدالرحمان کے ساتھ عاقل کھڑا تھا۔ وہ اُسے پہچانتی تھی۔ یہ بھی اُسی دفتر میں کام کرتا تھا اور اکثر ان کے ہاں آیا کرتا تھا۔ بگیماں نے اُسے اِسی سوراخ میں سے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ دونوں ایک ہی دفتر میں ہیں۔ ایک ہی طرح کی ملازمتیں ہیں تنخواہیں بھی برابر ہیں۔ مگر دونوں میں کتنا فرق ہے۔ عبدالرحمان پُرانی دھوتی اور بوسیدہ سی قمیص میں کھڑا تھا اور عاقل نے بڑھیا بوسکی کی کھدر۔ قمیص اور کڑکڑاتے لٹھے کی اُجلی سی شلوار پہنی تھی۔ وہ عمر میں عبدالرحمان سے کچھ بڑا ہی تھا۔ مگر سنہری فریم والے چشمے کے نیچے اُس کا چہرہ دیا؟

بکھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ بگیاں کو عاقل سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مگر اُسے عبد الرحمان پر افسوس آرہا تھا جو عاقل کی طرح رہ سکتا تھا مگر بنتا نہ تھا اور سو کمی تنخواہ کے محدود چوکھٹے میں اپنے بوسیدہ کپڑے لٹایا کرتا، اور بگیاں کے سامنے عاقل اور اُس قماش کے دوسرے لوگوں کو رشوت خوری کی وجہ سے گالیاں دیا کرتا۔ بگیاں کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر اپنے خیالوں میں خاوند کے لیے عجیب سی ہمدردی لیے واپس لوٹ آئی۔ ایسی ہمدردی جس میں پیار بھی تھا۔ ترس بھی تھا اور افسوس بھی تھا۔ جیسے امتحان کا نتیجہ سن کر پاس ہونے والے بچوں کے جمگھٹے میں ایک ماں اپنے فیل ہونے والے معصوم بچے کو دیکھتی ہے۔

صحن سے گزرتے گزرتے بگیاں کا پاؤں شوہر کے پائنچے میں اٹکا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ اس دھچکے سے چارپائی کو ٹھوکر لگی تو بچہ پھر سے بیدار ہو کر رونے لگا۔ ماں نے ایک دم اُٹھا کر چوما اور پھر کندھے سے لگا کر اپنا جسم ہولے ہولے جھلانے لگی۔ بچہ ذرا خاموش ہوا تو اُس نے جسم کی حرکت کو روک دیا۔ مگر وہ پھر بلکنے لگا۔ بگیاں ذرا جھلائی لیکن پھر جسم کو جھلانے لگی اور بچے نے آرام سے سر ٹکا دیا۔

اندر سے ہنڈیا جلنے کی بو آنے لگی۔ تو اُس نے آہستگی سے بچے کو لٹانا چاہا۔ مگر وہ بلکنے لگا تو بگیاں نے اُسے چارپائی پر پٹخ دیا۔

بچہ ایک دم رونے لگا۔

بگیاں نے زور سے ایک دھپ اُس کی کمر پر جمایا " چپ بھی ہو ——— لاڈ اتنے اور باپ کی اتنی توفیق بھی نہیں کہ ایک کھلونا ہی لے دے۔ "

بولتے بولتے اُس نے اُٹھ کر چارپائی پر پٹخا اور باورچی خانے میں گھس گئی۔ بچے کے رونے کی یکساں آواز اور اس میں بتدریج بڑھنے والے وقفوں کو کبھی کبھی ماں کی ڈانٹ یا کڑچھی کی آہٹ توڑ جاتی۔

اتنے میں ایک کوا صحن میں آن اترا اور پھدک کے چارپائی کے پائے کے پاس سے ہڈی اُٹھانے لگا۔ مگر جھاڑو کے دو تنکے پائے کے نیچے دبے تھے اور ان کے درمیان ہڈی پھنسی ہوئی تھی۔ اس لیے کوے کی چونچ ہڈی کا پہلو چھونے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی۔

گڈو نے آنسوؤں کی جھلمل میں سے کوے کو دیکھا اور منہ کا نقشہ بسورے بیٹھے کی آواز بند ہو گئی ....

کوا پھدک کر دوسری طرف گیا۔ گردن نیہوڑا کر ہڈی کو تاکا۔ اُچھل کر قریب ہوا۔ سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور قینچی کی طرح چونچ کھول کر جھٹکے سے ہڈی پر جھپٹا۔ مگر وہ ایک کنارے پر لگی اور ہڈی تنکوں کے شکنجے میں اور زیادہ پھنس گئی۔

گڈو کا منہ آہستہ آہستہ بند ہونے لگا۔ اور وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ آنسو کا آخری قطرہ پہلے رخساروں پر گیلے راستے سے ہوتا ہوا ٹھوڑی پر آن لٹکا اور تارے کی طرح ٹمٹمانے لگا۔ اس کی بھیگی بھیگی پلکوں میں مسکراہٹ سی پھیلنے لگی۔

کوا اِدھر سے اُدھر پھدک کر کوشش کر رہا تھا اور گڈو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی کی بسورنے والی سلوٹیں ابھی تک قائم تھیں۔ پھر اس نے اپنا موٹا بھرا بھرا سا بازو اُٹھا کر ہوا میں ہلایا اور ہونٹوں سے شیش کی غیر مکمل آواز نکالنے کی ناکام سی کوشش کی۔ کوا تھوڑا سا اُڑ کر پھر پیچھے ہٹا اور پھر چھوٹے چھوٹے کدکڑے بھرتا دوبارہ ہڈی تک آن پہنچا۔

مُنڈیا ایک جھٹکے اور ہلکے سے ہڈی تنکوں کے چنگل سے نکل آئی۔ کوّے نے اُچھل کر پوزیشن تبدیل کی۔ اُس پر چونچ جمائی اور لے اُڑا۔

گُڈّو کی آنکھیں اور چہرہ اُس کی اُڑان کے ساتھ ساتھ اُوپر اُٹھتی گئیں۔ وہ منڈیر پر جا بیٹھا۔ ہڈی کو سامنے لٹکایا مگر وہ لڑھک کر پھر سے نیچے سہن میں آ گری۔

گڈّو کھِل کھلا کر ہنس دیا اور جب کوّا دوبارہ نیچے آیا تو وہ چارپائی سے اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا۔

عبدالرحمان اپنے دوست سے بل کر فارغ ہوا اور اندر داخل ہونے لگا تو اُس نے بچّے کو انہماک سے کوّے کا تعاقب کرتے دیکھا۔ کوّا ہڈی کو اُٹھانے کی کوشش کرتا۔ تو گڈّو اس کے پیچھے بھاگتا اور کوّا اُچک کر اُس کی پہنچ سے باہر ہونے کے لیے کبھی نلکے کی ٹونٹی پر کبھی دیوار سے لگی چارپائی کے پائے پر اور کبھی کپڑے سکھانے والی رسّی پر بیٹھ جاتا۔ گڈّو نیچے کھڑا شور کرتا رہتا۔ ادھر پہنچ کر کوّے کی طرف دُور ہی سے ہاتھ بڑھاتا تو وہ جھٹ سے ہڈی تک آن پہنچتا اور گڈّو پھر شور کرتا۔ بازو ہلاتا ادھر کو بھاگتا۔

عبدالرحمان اندر آنے کی بجائے وہیں ٹک کر شفقت اور مسرت سے بچّے کو دیکھتا رہا۔ یہ بچّہ اُس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اُس نے دُنیا میں اور کسی لالچ کی تمنّا نہ کی تھی بلکہ بہت قناعت پسند انسان تھا۔ اُس کے دل میں ایک ہی تمنّا تھی کہ گڈّو کی مناسب تربیت کر کے اُسے اچھا اور ایماندار انسان بنا دے۔ جس کا کردار مثالی ہو۔ کوئی اُس پر اُنگلی نہ اُٹھا سکے اور لوگ اُس کی عزت کریں۔

کوّا نلکے کے پاس لوٹے پر بیٹھ گیا۔ گڈّو چھوٹی سی چھڑی ہاتھ میں اُٹھائے اُسے مارنے بھاگا۔ گیلی زمین سے اُس کا پاؤں جو پھسلا تو گرتے ہی اُس نے زور سے چیخ ماری۔

کوّا پھُر سے اُڑ گیا ——

عبدالرحمان بھاگ کر آگے آیا۔ گڈّو کو اُٹھایا تو وہ بے تحاشا چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ باپ نے اُس کی ٹانگ سہلا کر دیکھی۔ بازوؤں کو ٹٹولا۔ مگر وہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا امکان نہ تھا۔ مگر گڈّو چیخ رہا تھا۔ اُس نے پہلے کی سے کندھے سے لگایا۔ پیار کیا۔ مگر بچّہ اُسی طرح بے کل رہا۔ وہ اُسے سہلانے لگا۔ مگر اُس کے گھٹنے پر ہاتھ پہنچا تو وہ اور چیخا۔ عبدالرحمان نے کپڑا اُٹھا کر دیکھا —— اور آنکھیں پھاڑے دیکھتا ہی رہا۔ بچہ ایک دم چلّایا۔

"اری بیگماں۔ گڈّو کو تو بہت بڑا پھوڑا نکل رہا ہے۔"

عبدالرحمان کچھ تھک سا گیا تھا۔ قلم رکھ کر ہاتھ میز پر دھرتے ہوئے اُس نے انگلیاں پوری پھیلا دیں۔ پھر دونوں بازو اُٹھا کر سر کے پیچھے رکھتے ہوئے ایک انگڑائی لی اور جمائی لیتے ہوئے فائل بند کر دی۔ اکتاہٹ مٹانے کو اُس نے ادھر اُدھر دیکھا تو سب لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ مگر عاقل اُس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

اُس کمرے میں چھ اشخاص بیٹھے تھے۔ دو جونیئر کلرک، دو سینیئر کلرک اور دو اسسٹنٹ۔ عاقل اور عبدالرحمان دونوں اسسٹنٹ تھے ان کے میز آمنے سامنے تھے اور بیچ میں تنگ سا راستہ تھا۔

کمرے کی فضا بوجھل سی تھی۔ ایک کلرک پنج پرانی مشین پر ٹائپ کر رہا تھا جیسے ٹین کی چھت پر بارش گر رہی ہو۔ میزوں پر فائلوں کے بے ترتیب انبار کے علاوہ کمرے میں اور کوئی سجاوٹ نہ تھی۔ پرانی تعمیر میں محکمہ تعمیرات کی بدذوق سفیدی میں سے جابجا جالے بھی تھیں۔ اوپر ایک تیل بھرا پنکھا چل رہا تھا۔ جس کا ڈھیلا ڈنڈا ہولا ہوپ نچنے والے حبشیوں کی کمر کی طرح جھول کھاتا چھت سے بھاگتی ہوئی تاروں سے جا ملتا تھا۔ بیزار کلرک سست انداز میں کاغذ ادھر سے ادھر اٹھا کر رکھتے اور بے دلی سے فائلوں کے اوراق الٹتے۔ ذرا سی آہٹ پر آنکھیں اٹھا کر دیکھنے لگتے اور پھر دیکھتے رہتے۔ دیر تک کام کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ کبھی کبھار ایک ست الوجود چپڑاسی بیڑی پیتا ہوا کوئی فائل لیے اندر آتا۔ مگر اس ڈھیلے انداز سے، جیسے بیگار میں پکڑا گیا ہو۔ کسی کی میز کے گرد زیادہ چکر لگاتا۔ کسی کے کم اور کسی کے جانے کو بھی نظر انداز کر دیتا۔ چپڑاسی کی توجہ کے تناسب سے فوراً اندازہ ہو جاتا کہ کون سا شخص جونیئر ہونے پر بھی زیادہ اہم ہے اور کون سینیئر ہونے کے باوجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس اہمیت کا پیمانہ افسروں تک رسائی، دفتر کے اہم اثر و رسوخ اور کام آ سکنے کی اہمیت تھی۔ موجودہ دور کا چپڑاسی دفتری ضابطے سے زیادہ موجودہ دور کی اقدار کا زیادہ لحاظ کرتا تھا۔

عاقل اپنی میز سے اٹھ کر عبدالرحمان کے پاس آیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے پوچھنے لگا: "ہو جائے ایک پیالی چائے؟"

عبدالرحمان نے گھڑی پر نظر ڈالی اور سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر گھنٹی بجائی۔

"یہاں نہیں یار۔" عاقل کہنے لگا "کینٹین میں چلتے ہیں۔ ذرا گپ رہے گی۔"

ان کے باہر نکلتے ہی کمرے کا ماحول ڈھیلا ہو گیا۔ ایک کلرک نے آہستہ سے ہونٹوں سے وسل بجائی۔ دوسرے نے قلم رکھ کر انگلیاں چٹخائیں اور مسکرا کر مزے لینے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ تیسرے نے زور سے فائل بند کی۔ اس کو دھڑاک سے میز پر رکھا اور کرسی کی پشت پر پھیل کر بولا:

"یار یہ عاقل جب تک بیٹھا ہوتا ہے۔ اپنا تو سانس خشک رہتا ہے۔" وہ عاقل کے ماتحت کام کرتا تھا۔

"تم تو خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔" دوسرا کلرک بولا جو عبدالرحمان کے ماتحت کام کرتا تھا۔ "ہمارا بھی تو عبدالرحمان ہے۔ قسم لے لو جو کبھی خواب میں بھی اس سے ڈر لگا ہو۔"

"سالے ڈیوٹی تبدیل ہو تو پوچھوں گا۔ دو دن میں نوکری چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔"

"کیوں، کیا بات ہے اس میں؟"

"تو پھر جا کر سپرنٹنڈنٹ سے جو عاقل کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوتا ہے۔ عبدالرحمان کی تو وہ پروا تک نہیں کرتا اور سپرنٹنڈنٹ ہی کیا، سبھی اوپر والے ڈرتے ہیں اس سے ——— پتہ نہیں کہاں کہاں سلسلے قائم کر رکھے ہیں اس نے۔"

"اللہ قسم میں نہ ہوا اس کا افسر۔ دو دن میں نکال باہر کرتا۔ آخر کتنے قانون ہیں ان لوگوں کے لیے۔"

"پتہ نہیں اسے باہر کرتے یا خود باہر ہو جاتے ——— قانون خود بخود تو کچھ نہیں کرتا۔ جب تک اس کو چلانے والے

وعدہ کریں اور حوصلہ کون کرے۔ یہاں تو جو بھی افسر ہے وقت گزارنے کی فکر میں ہے۔"

بات چلتی گئی۔ مگر اسے عید دیپ پا کر دونوں تازہ ترین پاکستانی فلم پر بحث کرنے لگے۔ ایک سین پر اختلاف رائے ہو گیا۔ تو وہ دونوں اٹھ کر دوسری برانچ میں ایک اور کلرک سے فیصلہ کروانے چلے گئے۔ جو ہر پکچر پہلے ہی روز دیکھنے کے لیے جان کی بھی بازی لگا دیا کرتا تھا۔

صدر دفتر کے باہر سٹول پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے انگڑائی لی۔ پھر اطمینان سے اٹھا اور برآمدے کا موڑ مڑ کر غائب ہو گیا۔

دفتر کی کینٹین میں پتھر کی سل والی میزیں تھیں۔ لکڑی کی سیٹ والی کرسیاں تھیں۔ سوکھی ہوئی کریم والی پیسٹری تھی۔ ٹوٹے ہوئے کنڈوں والی پیالیاں تھیں اور چپک جانے والی مکھیاں تھیں۔

وہ اندر داخل ہوئے تو کینٹین میں کافی لوگ بیٹھے تھے۔ مختلف اطراف سے بیٹھنے والوں نے حسب تعلقات آواز دے کر ہاتھ ہلا کر یا سر کی حرکت سے سلام کیا۔

دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ پہلے دفتر کی باتیں ہوئیں۔ پھر دوستوں کی باتیں ہوئیں اور پھر عاقل عبدالرحمان کی بوسیدہ ٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یار کبھی ذوق کی توہین کرتے ہو۔ ٹائی تو کوئی ڈھنگ کی خریدو۔"

"میاں جب تک نئی کے پیسے نہیں ہوں گے۔ پرانی ہی چلے گی۔"

"اگر یہی لچھن رہے تمہارے تو پیسے آ چکے۔"

عبدالرحمان سر جھکا کر چمچی سے پیالی کا کنارا بجانے لگا۔

"رحمان بھیا۔ یہ بتاؤ" عاقل آگے جھک آیا "تم کیوں اپنی جان پر ظلم کرتے ہو۔ اللہ نے ایک ہی زندگی عطا کی ہے۔ اس کو بھی رسیوں سے باندھ کر جکڑ دیا ہے تم نے۔"

"تو کیا کروں۔ اللہ کی مرضی ہی یہی تھی کہ ایسے رہوں۔ ورنہ وہ بڑی آسانی سے کسی رئیس کے گھر پیدا کر سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے میاں۔ اگر اس نے یہ نہیں کیا تو یہ تو کر دیا نا کہ تم رئیسوں کی جیبوں میں شراکت کر سکو —— اچھی بھلی ملازمت ہے۔ ذرا ہمت کرو تو سب دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"چھوڑو بھی یہ بکواس۔ تم تو ہمیشہ مجھے غلط راستے پر ہی ڈالتے رہو گے۔"

"دیکھو میاں بچے نہ بنو" عاقل بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا "غلط اور صحیح کا معیار ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز سب لوگ کرنے لگ جائیں وہ صحیح ہو جاتی ہے اور جب سب نہ کریں تو البتہ وہ غلط ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے برقع نہ پہننا عورتوں میں بہت برائی سمجھی جاتی تھی۔ مگر آج کل بے پردگی کوئی برائی نہیں ہے۔ اسی طرح رشوت اس زمانے میں غلط تھی جب زیادہ تر لوگ پاکباز تھے۔ مگر آج کل سوائے تم جیسے چند سر پھروں کے باقی تو سبھی دنیا دونوں ہاتھوں سے پیسے بنا رہی ہے۔ زبان کے معاملے

کی اصطلاح میں بھی اگر کوئی چیز غلط العام بن جائے تو صحیح گنی جاتی ہے اور یہ تو عملی زندگی کی بات ہے جو چیز سب لوگ کہتے ہیں۔ وہ غلط کیسے ہوئی؟"

رحمان خاموش رہا۔ دو ایک چسکیاں چائے کی لیں اور پیسٹری کی پلیٹ عاقل کے آگے کر دی۔

عاقل نے ترچھی نظروں سے پلیٹ کو دیکھا۔ پیسٹری کی سوکھی سوکھی سطح پر دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ صرف ایک دانہ قدرے بہتر تھا۔ جو پلیٹ کے رحمان والے کنارے پر پڑا تھا۔ عاقل نے آگے بڑھ کر وہی دانہ اٹھایا اور منہ چلانے لگا۔ رحمان نے بھی ایک سڑی ہوئی پیسٹری اٹھالی۔

"بھیا! غلط صحیح کے چکروں میں تو کتابیں لکھنے والے ماہر پڑیں۔ ہم تو زندگی گزارنے والے لوگ ہیں۔" عاقل بولا۔ "جیسے مسائل زندگی کو پیش کرتی ہے ویسا ہی ان کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ساری دنیا تو عیش کرے اور ہم اپنے بچوں کو اپنے سامنے آرام کو ترستے دیکھیں۔ ہمارے بچے دوسروں سے کم ہیں کیا؟"

"بھئی دوسروں نے اپنی قبر میں جانا ہے۔ ہم نے اپنی قبر میں۔ مجھے دوسروں سے کیا؟" عبدالرحمان نے جیسے بات ختم کرنا چاہی —"

"ٹھیک ہے میاں۔ ہم تو تب قبر میں جائیں گے جب وقت آئے گا۔ فی الحال تو جینا ہے ——— مگر تم تو ابھی سے قبر میں گھس کے بیٹھ گئے ہو — اپنے پہ تو جو ظلم تم نے کیا وہ چاہے ٹھیک ہو۔ مگر تمھارے بچوں نے کیا قصور کیا ہے کہ اپنی اعلیٰ عقل سے ان کو بھی اچھی زندگی سے محروم کر رہے ہو۔ اس تنخواہ میں تم نہ تو انہیں اچھی تعلیم دلا سکتے ہو۔ نہ اچھا پہنا سکتے ہو۔ آج کل وہ بچپن میں کمتر محسوس کرتے رہیں گے۔ جوان ہونے پر ملازمت کے وقت تعلیم کی کمی کی وجہ سے پیچھے رہ جائیں گے۔ ان کی تو ساری زندگی تمھاری وجہ سے خراب ہوئی نا ——— آخر کچھ تو سوچا کرو۔"

"یہ غلط ہے عاقل۔ اگر بچے اپنے جیسے لوگوں میں رہیں گے تو کمتر محسوس نہیں کریں گے اور اگر ان کی تربیت مناسب ہے ...."

مگر عاقل نے بات کاٹ دی اور ہنس کر بولا "ارے میاں۔ آج کل کون ہے اپنے جیسا۔ پندرہ روپے تنخواہ والا بھی جائز یا ناجائز طریق سے رئیسوں کے ٹھاٹھ رکھتا ہے۔ تم پتہ نہیں اپنے جیسا کہاں سے لاؤ گے؟"

رحمان زچ ہو گیا "یہ تم پر آج ہیرا پھیری کا بھوت کیوں سوار ہے۔ ادھر فائلوں سے منہ ماری کرتے آئے ہیں اور ادھر تم نے جھک جھک شروع کر دی ہے۔"

"میاں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ شاید تمھاری اوندھی کھوپڑی میں کوئی سیدھی بات سما جائے ——— " وہ آگے جھک گیا "دیکھو آج کل موقعہ ہے ایک ہاتھ میں۔ چاہو تو اس سے کئی گنا بہتر پچاس ٹائیاں خرید لو۔"

"میاں تم یہ موقعے اپنے پاس ہی رکھو۔ اپنے بس کا تو روگ نہیں یہ۔"

"روگ کی بات نہیں پیارے۔ بس تمہیں زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔ نہ ہینگ لگے گی نہ پھٹکڑی اور اللہ کے فضل سے اتنا

چمکار رنگ لگنے لگا۔ ہماری بھابی شادی کے چھ سال بعد بھی تم پر نئے سرے سے عاشق ہو جائے گی۔"

عبدالرحمان خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

عاقل نے پیالی رکھی، پرچ کو تھوڑا سا آگے سرکایا۔ خود بھی جھک گیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

"مٹھو صاحب۔ کام ہو جائے تو ایک ہزار روپے مل جائیں گے۔"

"چھوڑو میاں۔ میرے پاس تو ایسا کوئی کام ہی نہیں۔ افسر بھی آدمی دیکھ لیتے ہیں۔ ایسی ساری چیزیں تمھاری میز پر رکھی ہوئی ہیں۔"

عاقل اس کی چوٹ کو نظر انداز کرتا ہوا بولا "وہ فائل ہے نا سیٹھ اکرام والی۔ اس میں سے قواعد والا حصّہ کہیں گم کرنا ہے ——

بس اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"مگر اس سے کیا ہوگا۔"

"ہوگا یہ کہ قاعدہ نہ ہونے کی وجہ سے فیصلہ سیٹھ کے حق میں ہو جائے گا —— اور کیا؟"

"اور جو ریکارڈ روم میں رکھے ہیں؟"

عاقل کھل کھلا کر ہنس دیا۔ پیچھے ہٹ کر چائے کی پیالی اٹھائی۔ زوردار لمبی چسکی لی اور فتح مندانہ سرگوشی میں بولا۔

"پیارے وہ تو گم ہو بھی چکے۔"

عبدالرحمان تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا "تم نے مجھ سے یہ بات کیوں کی —— تم جانتے ہو میں اس قسم کی چیزوں سے بھاگتا

ہوں۔ اگر کاغذات ہی گم کرنے تھے تو وہ تم بھی تو چرا سکتے تھے۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں" عاقل بے تکلفی سے ہاتھ پھیلا کر بولا "مگر تمھاری کھوپڑی میں تو سارے قاعدے بھرے پڑے ہیں۔ تم

وہ زبانی ہی نوٹ کروا دوگے۔"

"ہوں اوں اوں" عبدالرحمان بولا "تو گویا مجھے ناموس کرانا چاہتے ہو کہ میں نوٹ میں صحیح رائے بھی نہ لکھوں۔"

عاقل بولا "کوئی نرالی درخواست تو نہیں کر رہا۔ تمھارے سارے دفتر میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

"سارے والی بات تو نہ کہو" عبدالرحمان اٹھتے ہوئے بولا "تمھیں سارے اپنے جیسے نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے تو اب بھی کئی

لوگ ایماندار لگتے ہیں —— بہرحال جس کا کام اسی کو ساجھے۔ مجھے تو تم معاف ہی رکھو —— اور نہ ہی آئندہ مجھ سے اس

قسم کی بات کرنا۔"

صحن میں داخل ہوتے ہی عبدالرحمان کو چارپائی پر میلی کچیلی آنکھوں والا کالا برقعہ نظر پڑا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ پاروکی ماں آئی

ہوئی ہے۔ وہ غالباً ساتھ کے کمرے میں بیگم کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بچے کو سینے سے ہٹا کر عبدالرحمان نے برقعہ ایک طرف ہٹایا اور دوسرے

ہاتھ سے بستر ٹھیک کر کے بچے کو احتیاط سے لٹا دیا۔ گڈو نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور پھر غنودگی سے سر ایک طرف

ڈال دیا۔

عبدالرحمان نے سلطان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو تیز بخار کی تپش محسوس کر کے اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ اُس چارپائی پر بیٹھ کر اُس نے اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے قدموں میں نظریں جمائے سوچنے لگا۔

اندر سے پارو کی ماں کے مسلسل بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ عبدالرحمان کی پڑوسن تھی۔ وہ خود تو کوئی مشہور و معروف ہستی تھی کہ لوگوں میں پارو کے باپ کو شاید ہی کوئی جانتا تھا۔ اور اگر جانتے بھی تھے تو پارو کی ماں کے خاوند کے طور پر۔ اُس کی خاص صفت بلا قیمت مشورے دینا تھی۔ محلے کا یا بیرونی زندگی میں کیسا ہی مسئلہ درپیش کیوں نہ ہو ——— وہ کوئی نہ کوئی مشورہ تیار رکھتی تھی اور تلقین کرتی تھی کہ اُس پر عمل ہو گا اور اگر عمل نہیں ہوتا تھا تو سب ہمسایوں کے سامنے فرداً فرداً پہلے تو سنے کا ذکر کرتی۔ پھر اس پر اپنے ملامت مشورے کا۔ پھر ان تمام خدشات کا جو اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ممکن ہو سکتے تھے۔ مشورہ دینے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور عقل تجربہ چاہتی ہے مگر ہمسایوں کی بدقسمتی سے چالیس سالہ پارو کی ماں کو اتنا تجربہ تھا کہ خضر کی عمر کے بڑے بوڑھوں کو بھی نہ ہو۔ وجہ یہ تھی کہ دنیا میں کوئی بھی واقعہ یا مسئلہ جو وہ اُس سے پہلے اس کے خاندان کے کسی نہ کسی فرد سے پیش آ چکا ہوتا۔ اور یہ سب واقعات سالوں کی گردش کے ساتھ بند اصولوں کی طرح اس اصول کے سختی سے پابند تھے کہ اگر واقعہ اچھا ہوتا تو وہ ہمیشہ پارو کی ماں کے میکے میں ظہور پذیر ہوتا اور اگر برا ہوتا تو اس کی سسرال میں۔

——— مگر یہ ناممکن تھا کہ پارو کی ماں سے ایسی کوئی چیز نئی ہو۔

گڈو کے پھوڑے کی خبر سن کر اس نے کئی علاج بتائے۔ پھوڑے کے ارد گرد پان کھلانے والا چونا لگانا۔ نیلے تھوتھے کو نیم کے پانی میں حل کر کے لگانا۔ چیس باندھنا اور باسی تھوک لگانا۔ ان سب علاجوں کی سند کے طور پر اس نے اپنے عزیزوں کے اتنے چشم دید واقعات پیش کیے کہ یہ تمام علاج بیک وقت شروع کرنے میں بھی اُسے کوئی حرج نظر نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ اُس کی نند نے حسد کی وجہ سے اُس کی بات ٹالی تھی تو بلا غرض بہت خراب ہوا پڑا تھا۔ اور اُس کی چھوٹی بچی کی ٹانگ کٹوانا پڑی تھی۔

مگر عبدالرحمان اُسے سرکاری ہسپتال لے گیا۔ گزشتہ چار روز وہاں کا علاج ہو رہا تھا اور آج عبدالرحمان سیدھا ہسپتال سے واپس آکر گڈو کی پائنتی بیٹھا سوچ رہا تھا۔

آہٹ سن کر اندر سے اُس کی بیوی نکل آئی۔

منتظر ماں کی مامتا میں ایک نئی حس طرح سے یقین رہتی ہے جو چشم زدن میں امید و مایوسی کی جھلک دکھا دیتی ہے۔ بیگماں نے خاوند کے انداز دیکھے تو اُس کی لرزش سے اُس کا دل کانپ گیا۔

"کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟" مختصر سا سوال تھا۔

"ڈاکٹر نہ کہو بیگماں قصائی کہو" عبدالرحمان جیسے پھٹ پڑا "ڈاکٹر کے دل میں تو خدا کا خوف ہوتا ہے۔ بیمار کے لیے ہمدردی ہوتی ہے۔ فرض کا خیال ہوتا ہے۔ ——— مگر ان لوگوں میں تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

مگر وہ اپنے خیال میں بولنے لگا "ہمارے سرکاری ہسپتال نہیں ہیں بیگماں بلکہ سرکار نے بڑے بڑے ذبح خانے کھول رکھے

ہیں۔ جہاں مرنے کے بعد اماں دی جاتی ہے۔

"ہائے ہائے۔ کیا اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ کوئی خیر کا کلمہ نکالیے مُنہ سے۔"

بیگماں نے آگے بڑھ کر گڈو کو ساتھ لپٹا لیا اور کپڑا اُٹھا کر پھوڑا دیکھنے لگی۔ خاوند کا موڈ دیکھ کر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اُس کا دل مُنہ کو آ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے گڈو کے متعلق کیا کہا ہے۔ جب تاب نہ لا سکی تو اُس نے طریقے سے پوچھنے کی کوشش کی۔

"دوائی کہاں ہے؟ میں پلاؤں اپنے لال کو۔"

تھکا تھکا سا جواب تھا۔ "دوائی شام کو لاؤں گا ——— بازار والے ڈاکٹر سے ——— ابھی نہیں لایا۔"

بیگماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ہسپتال سے خالی ہی لوٹ آئے کیا؟"

"خالی تو نہیں آیا ——— ڈاکٹر سے سخت جھگڑ کر آیا ہوں۔"

بیگماں ہتھیلی اپنے ماتھے پر مار کر چٹک دار بیزاری سے ہاتھ اُس کی طرف پھیلاتے ہوئے بولی "آپ کو تو ہر وقت لڑنے ہی کا شوق رہتا ہے۔ ساری رات بچے کا تڑپنا نہیں دیکھا جاتا جناب سے شام تک اور سُولی پر چڑھائے رکھو گے۔"

عبدالرحمان فکرمند نظروں سے اپنے دونوں پاؤں کے بیچ کی زمین دیکھتا رہا۔ بیگماں نے گڈو کا غنودگی میں ڈوبا ہوا سر اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"ہائے ہائے میں واری جاؤں۔ کیسا بھاڑ جُھلس رہا ہے پنڈے میں۔ نہ معلوم کتنا بُخار ہے ——— ہے تو ہوا کرے کسی کو کیا ——— دُکھ تو ماں کو ہوتا ہے۔"

بچے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اُس نے جسم کو ٹٹولا اور پھر ماتھے سے بال ہٹانے لگی ——— پھر جس طرح سائیکل کی خالی ٹیوب ہوا بھرنے سے آہستہ آہستہ پھولتی ہے اسی طرح اُس کی آنکھوں میں نمی پھوٹنے لگی اور وہ جذباتی آواز میں بولتی گئی۔

"ماں کا دل اور کسے ملا ہے جو یہ ٹیس جانے ——— دُوسروں کو تو بس اپنی لڑائیوں کا نشہ ہے ——— وہ پورا ہوتا رہے ——— گھر میں بیوی پر رُعب۔ دفتر میں لوگوں سے ماتھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں سے جھگڑا۔ بچے جائیں جہنم میں ——— وہ تو پہاڑی کے پتھر ہیں۔ خود ہی ڈھلانوں سے لڑھک لڑھک کر کہیں اٹک جائیں گے یا ٹوٹ پھوٹ جائیں گے ——— اُن کو کون ہے رونے والا۔"

آنسو پلکوں کی جڑوں میں موتی پرونے لگے۔ پھر مزار پر جانے والے عقیدت مندوں کی طرح بے پاؤں آنکھوں سے باہر نکلنے لگ گئے۔ تھوڑے وقفے بعد اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنا احتجاج جاری رکھا۔

"وہ کوئی اور ہی مرد ہوتے ہیں جن کو بیوی بچوں کی لگن ہوتی ہے ——— یہاں تو بیوی بھی دن پورے کر رہی ہے اور جو شامت کا مارا پیدا ہو گیا وہ بھی اُسی سڑک پر چل پڑے گا ——— نہ گھر میں برتن۔ نہ تن پر ڈھنگ کا کپڑا ——— دل کے شوق تو کون پورے کرے گا۔ یہاں تو خالی خولی زندگی گزارنا ہی عذاب ہے......"

عبدالرحمان دونوں ہاتھوں کے پیالے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرہ اُٹھائے بغیر وہ دھاڑا "بند کر یہ بکواس۔ اسے تو بر

وقت ہی باتیں سوجھتی ہیں۔"

بگیاں نے دوپٹہ اٹھا کر آنسو صاف کیے۔ ناک سے زور کی شوں کی اور بغیر کچھ کہے اس نے گڈو کے نیچے کا گدا کھینچ کر ٹھیک کیا: ہم کو چادر سے ڈھانپا اور بگیاں بیٹی اندر کو چلی۔

عبدالرحمان اسی لہجے میں بولا "ساری رات تڑپتا دیکھا تھا، اسی لیے تو ڈر کر آیا ہوں۔"

عبدالرحمان کے کانوں میں بگیاں اور پارو کی ماں کی آوازیں پڑتی رہیں۔ مگر اس نے سننے کی کوئی کوشش نہ کی۔ حالانکہ ان میں بگیاں کی سسکیوں کی آواز اور پارو کی ماں کے دلاسے بھی شامل تھے۔ وہ سر جھکائے سوچوں میں غرق رہا.....

ہسپتال میں جب وہ پہلے روز گیا تھا تو گڈو کو گود میں لیے بنچ پر بیٹھا تھا۔ اردگرد بہت سے دوسرے مریض بھی جمع تھے۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے، فرش پر لیٹے ہوئے، کوارٹر کے سہارے ٹکے ہوئے، سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے —— کوئی درد سے بے حال، کوئی نقاہت سے نڈھال، کوئی تکلیف سے بے چین، کوئی بالکل بیزار اور خالی الذہن سا۔ کبھی کبھار ہسپتال کے ڈاکٹر ان سب کو نظرانداز کرتے گزرتے تو تمام مریضوں کی نظریں ان کی طرف تشکر بھری امید سے اٹھ جاتیں، مگر وہ ایسے گزر جاتے جیسے پاکستان بننے سے پہلے انگریز حاکم مقامی لوگوں کے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ پرچی بنوا کر عبدالرحمان کتنی ہی دیر انتظار کرتا رہا۔ اور گڈو کی گرم گرم بے کل کروٹیں اس کی گود میں جاری رہیں۔ باری آئی۔ تو وہ ڈاکٹر کو مفصل حال بتانا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ احتیاط سے بچے کو دیکھے۔ مگر ڈاکٹر تو ایسے مریضوں کو آگے چلا دیتا تھا جیسے جلدی جلدی میں تاش کے پتے پھینٹ رہا ہو۔ وہاں سے نکلا تو ڈریسنگ والے کمرے میں کمپاؤنڈر چائے پی رہے تھے۔ پھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے ان میں سے ایک نے پھوڑے پر ایسا سخت ہاتھ لگایا کہ گڈو اور عبدالرحمان دونوں چیخ پڑے۔ زخم پھاڑنے کے بعد اس نے کمزور سا ٹکڑا لگا کر کہا کہ یہ دوائی ختم ہو گئی ہے۔ بازار سے خرید لاؤ۔ عبدالرحمان نے بچے کے جسم سے خون کے فوارے کی طرف اشارہ کیا تو اس نے دوسری مرہم لگا کر چلتا کیا۔

یہ سب تفصیلات اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ چار روز تک اسی قسم کے چکر چلتے رہے۔ دیہات کے شکووں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی نظر میں بھی قصوروار بنا دیا تھا۔ مگر جب اسے یہ سب حالات یاد آنے لگے۔ جن میں اس کے بچے کی حالت مسلسل سنگ دلانہ لاپرواہی کی وجہ سے بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹر سے جھگڑنے پر سفید اپرن میں ملبوس اردلی نے اسے باہر نکال دیا تھا۔ تو اس کا غصہ پھر سے تازہ ہو گیا اور اب ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت بیوی پر بھی کھولنے لگی۔ جو باہر کے حالات سے بے خبر اس کے دماغ کی بھاپ کو چارپائی کی ادوائن کی طرح کس رہی تھی۔

عبدالرحمان کافی دیر سوچتا رہا پھر اٹھا اور نلکے کی ہتھی چلانے لگا۔ کہ اس میں سے پانی نکلے مگر ہتھی کا پیچ ڈھیلا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر دو تین جھٹکے دیے اور اسے کر دوم ٹک سے فرش پر پٹک مارا۔ پیتل کے نلکے کی ٹونٹی ٹن سے اچھل کر علیحدہ گری تو ٹوٹنے کی بھاری آواز کے ساتھ ایک بجلی سی چمک بھی فضا میں پھیل گئی۔ پاؤں پٹختا ہوا عبدالرحمان باہر نکل آیا۔

کمرے کے اندر سے پارو کی ماں نے جھٹ سے ایک آنکھ نکال کر جھانکا۔ عبدالرحمان کی پیٹھ باہر نکلتی دکھائی دی تو وہ پورا سر باہر نکال کر دیکھنے لگی۔ پورا جائزہ لے کر جب سابقہ پوزیشن میں دوبارہ جم چکی تو ترس بھری نظروں سے بگیاں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"توبہ ہشت ـــــ یہ مرد بھی کیا ذلت ہے ـــــ اب خود ہی اُلٹے بھی ہو رہے ہیں۔"

بیگماں کی زندہ دار سسکی سے پارو کی ماں کو تسلی ہو گئی کہ موجودہ موقع اس موضوع کے لیے مناسب ہے اور جب دونوں اکٹھے کر بار میں تو پارو کی ماں اُن تمام خاوندوں کا نوحہ کر رہی تھی جو بیوی بچوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ مثال کے طور پر اپنی بدقسمت بہن کے خاوند کے قصے ارہی تھی جو عبدالرحمان سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ اسی ذکر میں بیگماں نے ایک دفعہ کہا کہ سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں تو پارو کی ماں نے فوراً دیہ کی اور اپنے بھائی کی مثال دی جو اپنی کم ظرف بیوی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ حالانکہ اُس جیسی عورت قطعاً اس قابل نہ تھی کہ اتنے شاندار بھائی بیوی بن سکے یا پارو کی ماں کی بھاوج بن سکے۔ اسی طرح اُس کی ایک نند بالکل چڑچڑی تھی۔ مگر اُس کا خاوند بہت خیال رکھتا تھا ـــــ پارو ماں کے دلائل جاری تھے اور بیگماں اپنی کھوٹی قسمت پر خود ہی ترس کھاتی مری جا رہی تھی۔

بازار والے ڈاکٹر نے گڈو کی حالت دیکھی اور کچھ کہے بغیر ایک ٹیکہ لگا دیا۔ نئی مرہم پٹی کی اور بخار کے لیے پینے کی دوا دی۔ دو تین ن کے علاج سے بخار تو ٹوٹ گیا۔ مگر گڈو کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ عبدالرحمان نے جب وجہ پر اصرار کیا تو اُس نے مختصر سا جواب دیا کہ سے ٹھیک کرنا ہے تو فوراً ہسپتال میں داخل کر کے پھوڑے کا اپریشن کروا دو۔ مگر عبدالرحمان اس کے لیے تیار نہ تھا۔ ہسپتال میں داخل ہونا آسان م نہ تھا۔ مریض پندرہ پندرہ دن انتظار کرتے ہیں۔ سو سفارشیں ڈلواتے ہیں۔ تب کہیں جنرل وارڈ کے ایک کونے میں جگہ ملتی ہے اور پھر بیعت یہاں بھی نہیں کٹتی بلکہ علاج میں کوئی پروا نہیں کرتا۔ ہسپتال کا عملہ ایسی بے رخی اور اوپرے دل سے بات کرتا ہے جیسے سات پشتوں پر احسان کیا ہوا ہو۔ اگر خون بہنے لگتا ہے تو پڑے پکارو، کوئی نہیں منہ دکھاتا۔ پچھلے دنوں خود اُس کا ایک عزیز ہسپتال میں ہی مر گیا تھا کیونکہ اپریشن کے چند گھنٹوں بعد ہی پھر سے خون نکلنے لگا تھا وہ چیختا رہا۔ مگر پہلے تو کوئی آیا ہی نہیں اور جب نرس آئی تو اُسے آرڈر لینے میں اتنی دیر ہو گئی کہ دوبارہ پٹی کرنے سے پہلے وہ مر چکا تھا۔

"نہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں اسے ہسپتال میں داخل نہیں کرواؤں گا۔ آپ خود اس کا اپریشن کر دیں۔"

مگر ڈاکٹر کے پاس کوئی مناسب انتظام نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ ہسپتال کا جو بڑا ڈاکٹر ہے اُس کا پرائیویٹ مریض بن جائے تو وہ خود ہی داخل کروا دے گا۔ یہ آسان ترین طریقہ تھا ـــــ اور اُس کی فیس مشورہ بتیس روپے تھی۔ سپیشلسٹ

جو ہوا۔

عبدالرحمان سپیشلسٹ کے پاس پہنچا تو کوٹھی میں کئی کاریں کھڑی تھیں۔ وقفے وقفے کے بعد اور بھی آتی گئیں اور اُن میں سے مریض نکل نکل کر کرسیوں پر بیٹھتے گئے۔ وہ خود بھی کافی دیر سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ پھر جب ایک آدمی نے آ کر اُس سے پرچی طلب کی تو یہ معلوم ہونے پر کہ وہ نیا مریض ہے اُس نے بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے وقت مقرر کرنا ضروری ہے۔ جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں اُن کا وقت مقرر ہے۔ اور اُن میں سے کسی کا وقت ڈاکٹر صاحب کسی کو نہیں دے سکتا۔ عبدالرحمان نے جب وقت مانگا تو اُس نے تین دن بعد کی تاریخ دے دی۔ وہ بھونچک سا رہ گیا لیکن اگر علاج کروانا تھا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً عبدالرحمان یہ تین دن بازار کے ڈاکٹر سے علاج کرواتا رہا۔

سپیشلسٹ نے معائنہ کیا تو اُس کا خیال تھا کہ ابھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا فوری طور پر اپریشن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ

اُس نے چار دواجعات مسلسل خون ٹسٹ کروانے کو کہا۔ تین مختلف اطراف سے ایکسرے لینے کو کہا تاکہ پتہ چل سکے کہ پھیپھڑے کی جڑیں بھی تنگ ہو گئی ہیں یا نہیں اور پھوڑے پر سے گوشت کے ذرا سے ٹکڑے کا خورد بین کے نیچے معائنہ کروانے کو کہا۔

عبدالرحمان کا دل بیٹھ گیا۔ اُس نے سمجھا کوئی بہت ہی خطرناک بیماری ہے۔ ڈاکٹر سے نسخہ لیتے وقت اُس کی انگلیوں میں کپکپاہٹ دوڑ رہی تھیں اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا: "مگر ڈاکٹر صاحب۔ اس کو ہے کیا؟"

ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر آیا تو کہنے لگا: "اگلا مریض بھیجو۔ جلدی۔"

پھر کاغذ سمیٹتے ہوئے بولے: "ابھی کچھ اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ سب ٹسٹ کرواؤ تو کچھ پتہ چلے گا۔ اس دوران میں مرہم لگاتے جاؤ۔"

سارے ٹسٹ ہونے میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے کیونکہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی دقت تھی۔ بعد میں جب عبدالرحمان دوبارہ نتیجے لے کر گیا تو سپیشلسٹ نے چند اور ٹسٹ لکھ دیے اور دوسری دوائیاں تجویز کر دیں ——— علاج جاری رہا۔ ٹسٹ ہوتے رہے۔ ٹیکے لگتے رہے۔ بازار سے مہنگی دوائیں آتی رہیں۔ دفتر والے عبدالرحمان کو بتاتے رہے کہ چونکہ علاج سرکاری ہسپتال سے نہیں ہو رہا اس لیے اس کو گورنمنٹ سے علاج کے پیسے نہیں مل سکتے اور وہ گھر کے کونے کھدروں سے روپے تلے اوپر پیسے کھرچنے کے بعد ادھر اُدھر سے قرض لے کر علاج کراتا رہا۔

اس عرصے میں پارو کی ماں برابر چکر لگاتی رہی۔ وہ اپنے مشوروں سے نوازتی رہتی۔ نتیجے میں منگل کے روز سفید تل کالے چیونٹوں کی گزرگاہ پر بکھیرے گئے۔ کالے بکرے کی سری آدھی رات کو چوراہے میں پھینکی گئی۔ پیر صاحب کی زیارت پر پانچ روپے کی دیگ کی منت مانی گئی۔ عبدالرحمان پر جو قرضہ چڑھا اُس میں پندرہ روپے پارو کی ماں کے بھی شامل تھے۔ اور وہ صبح و شام آکر بیگماں کی دلداری کرتی رہتی تھی۔ جب کبھی گلّو کو گود میں لیے رونے لگتی تو پارو کی ماں اُسے بہت دلاسے دیتی اور پھر اڑوس پڑوس میں خود بھی آ بیٹھ کر بیگماں کی بپتا کی بات سناتی۔ کبھی کبھار ساگ یا حلیم وغیرہ پکاتی تو بیگماں کو بھی بھجوا دیتی تاکہ وہ رسوئی کے جھنجھٹ سے بچی رہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی ماں کا ذکر ضرور کرتی جو ہمسایوں کے گھر میں بیماری ہونے پر کئی کئی دن اُن کے لیے پورا کھانا پکوا کر بھیجتی اور پھر اُس کا مقابلہ اپنی ساس سے کرتی جو اتنی سنگدل تھی کہ ہمسایہ چاہے بھوکے مرنے والے ہوں، وہ اُس کا کھانا پینا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عبدالرحمان عجیب بولایا ہوا سا سڑک پر چل رہا تھا۔ راستہ دفتر کا ہی تھا۔ مگر کتنا غیر مانوس لگتا تھا۔ دھوپ کی چمک کے باوجود ہر چیز کی رنگت اُڑی اُڑی سی تھی۔ جیسے سینما میں فلم کی روشنی میں دکھائی جا رہی ہو۔ ہر راہگیر اُس کے دکھ سے بے خبر ہشاش بشاش سا نظر آتا تھا۔ اُسے یوں لگتا جیسے سارے عالم میں صرف وہی پریشان ہے اور دوسرے کسی کو بھی کوئی پریشانی نہیں۔ اس کے ناہموار سے قدم پتھروں اور روڑوں کو لڑھکا رہے تھے اور ہاتھ مستقل طور پر جیب پر تھا۔

اُس کی جیب میں کینسر تھا۔

آج صبح جب اُٹھے تھے تو ناشتے کے دوران میں عبدالرحمان بالکل خاموش تھا۔ بیگماں جیسے خاموشی کی ایک ایک سطر کا مطلب سمجھتی تھی

اور دونوں کے درمیان بے زبانی کا ایک پُل تھا جس پر سے گزر کر ان کے خیالات ایک دوسرے تک پہنچ رہے تھے ——— بڑے ہی واضح اور صاف گفتگو سے بھی بہتر ڈھنگ سے۔ بدلتے وقت اُس نے کنکھیوں سے بیگمان کی طرف دیکھا تھا جو سر جھکائے گٹھڑ کے پاس بیٹھی تھی اور جیسے آپ ہی آپ عبدالرحمان کے مُنہ سے کسی اجنبی سی آواز نکل گئی۔

”کچھ ہے؟“ ——— بیگمان نے نگاہ اُٹھائی۔

”بیچنے کے لیے؟“

اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ جب باہر آئی تو وہ تیار ہو کر دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ بیگمان نے ہاتھ بڑھایا اُس نے بھی خاموشی سے ہاتھ آگے کیا اور ایک دوسرے سے نظریں چُراتے ہوئے کاغذ کی پُڑیا اُس کے پاس منتقل ہو گئی۔ دونوں ایسے مُنہ پھیر کر بھاگے جیسے انھوں نے کوئی شرمناک جُرم کیا ہو اور اب احساسِ شرمندگی سے شکل نہ دکھا سکتے ہوں۔ مکان سے باہر نکل کر وہ کافی دُور تک ایسے ہی چلا گیا ——— پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر پُڑیا کو پھاڑا اور اُس کا انگوٹھا ایک گول چکر پر پھرنے لگا۔

”ارے یہ تو کنگن ہے“ ایک زلزلہ سا اُس کے سارے جسم میں کوند گیا۔

کنگن کی یادیں لاوے کی طرح دماغ میں پھٹنے لگیں . . . .

. . . . . . چند سال پہلے وہ جھجکتا ہوا حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تھا۔ ٹانگوں میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں اور سارا جسم اندر ہی اندر ایک سُہانے ارتعاش سے پھڑک رہا تھا۔ قابو پانے کے لیے وہ کبھی ایک پٹھے کو اکڑاتا کبھی دوسرے کو اور اپنی دانست میں بہت ہی نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا ——— دُلہن کے پاس بیٹھا تو گھونگھٹ کے پیچھے سے نقوش کا ہیولیٰ لہریں مارتا معلوم دیا۔ اور کبھی ایک آدھ زیور کا ادھ سوا چمکارا گھونگھٹ کے تاروں میں سے اندھی دُھوپ کی طرح چھن کر آنے لگا۔

اُس کا مُنہ خشک ہو گیا۔ دماغ میں فلیتہ سا دہکنے لگا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پہلو بدل کر اُس نے جائزہ لیا ——— سر کی گولائی سے نیچے پھیلتا ہوا جھلملاتا گھونگھٹ اور پہاڑی سڑک کی طرح بل کھاتا اُس کا سنہری کنارہ۔ نیچے ٹکے ہوئے گھونگھٹ تلے گود میں دو مہندی والے ہاتھوں کا ڈھیر سا تھا۔ ہر چیز گڈمڈ سی تھی۔ سوائے ایک کنگن کے جو اُس وقت کی بہت ہی صاف اور نمایاں یاد تھی۔

اُس نے پھر پہلو بدلا ——— ہاتھ تھوڑے اُٹھائے ——— پھر روک لیے ——— جھجک سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور آخر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔

دو لانبی لانبی پلکیں ——— اُن پر ہلکی سی مسکراہٹ ——— وہ دیکھتا رہا اور متوقع رہا کہ اب آنکھیں کھلیں گی۔ . . . . . . کھلیں گی . . . . . کھلیں گی . . . . مگر وہ ویسی ہی رہیں ——— اتنے میں چند رنگے ہوئے ناخن ٹھوڑی سے اوپر اٹھتے اٹھتے ٹھٹک گئے ——— اور مہندی والا ہاتھ چہرے سے پسینہ پونچھنے لگا ——— اُنگلیوں کے دباؤ تلے نرم گوشت غوطے لگانے لگا ———

اُس ہاتھ کی کلائی میں ایک کنگن کندے مارتا ہوا نیچے کو کھسکنے لگا۔ جیسے چوڑیوں کی جھنکار پر ناچ رہا ہو ——— اور پھر اب

نظر سے گھماتا ہوا کونے میں پھنس گیا۔ جیسے بچہ اطمینان سے ماں کی آغوش میں سمٹ جائے۔

عبدالرحمان کے جسم میں آتش بازی چھوٹنے لگی۔ اُسے زندگی میں کسی لڑکی کے اتنا قریب ہونے کا پہلا موقع تھا اس لیے ذرا گھبراہٹ تھی۔ وہ باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا —— پہلے رُک رُک کر —— پھر ذرا اعتماد سے اور بعد ازاں مزے سے۔ مگر وہ باتوں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ پر اُسے کوئی طریقہ نہ سوجھتا تھا۔ وہ کمرے میں پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھتا کہ شاید ان میں سے کوئی کام نکل جائے۔ دُلہن کے کپڑوں پر نظر ڈالتا کہ شاید اِدھر سے کوئی بہانہ ہاتھ آ جائے۔ گفتگو میں خواہ مخواہ موڑ توڑ لاتا مگر کوئی حل نظر نہ آیا۔

اتنے میں دلہن نے پہلو بدلا۔ سُرخ کپڑوں کے انبار میں کہیں ہاتھ اٹکا اور چھناکے سے کنگن زمین پر آ رہا۔

وہ نیم وا آنکھوں نے شرمیلے سے لہجے میں پوچھ کر کہا "اس کا پیچ کچھ ڈھیلا ہے۔"

اگلے لمحے وہ گھٹنوں کے بل فرش پر پیچ ڈھونڈ رہا تھا —— پھر کپڑوں کی سرسراہٹ اور خوشبو کے جھونکے بھی اس کے پاس آ بیٹھے —— اور تلاش میں شامل ہو گئے —— چارپائی کے نیچے —— کرسی کے پاس —— میز کے پائے کی اوٹ میں —— ہر جگہ عبدالرحمان کی انگلیوں اور کنگن نے زندگی میں پہلی بار کئی دفعہ نیا لمس پایا —— بالآخر پیچ مل گیا۔ عبدالرحمان نے کنگن اُٹھا کر اس میں ڈالا اور دُلہن کی طرف دیکھا

—— مسکراہٹ

—— ادا

—— خواہش

ہاتھ بڑھا کر اس نے کلائی تھامی —— نرمی سے کنگن پہنا دیا اور پھر —— اُس نے کلائی نہ چھوڑی۔ . . . .

دو چار روز بعد جب حجاب کی دیواریں گر گئیں اور اُن کے تعلقات مذاق کی سرحد میں داخل ہو گئے تو عبدالرحمان نے اُس کنگن کو "مشکل کشا" کا نام دیا۔ اور بیگماں بہت ہنسی۔ پھر وہ آئندہ بھی اُسے مشکل کشائی کے لیے استعمال کرنے لگے۔ وقت گزرنے پر وہ واقعی ثابت بھی ایسا ہی ہوا۔ ازدواجی تعلقات کے خاص پیار کے لمحے میں جب زندگی کی سنگلاخ حقیقتیں بھی جھلک دکھانے لگیں۔ تو دونوں کبھی کبھی لڑائی جھگڑے بھی ہو جاتے۔ شروع شروع میں معمولی ناراضگیوں کے بعد دو تین روز تک بول چال بند رہنے لگی۔ ایسی حالت میں عبدالرحمان جب بھی صلح کرنا چاہتا۔ کمرے میں جا کر چپکے سے کنگن نکال لیتا اور کسی وقت بیگماں کے بازو میں پہنا دیتا —— جھگڑا کتنا ہی شدید کیوں نہ ہوا ہوتا بیگماں کنگن پہنتے ہی فوراً مان جاتی اور دونوں اگلے جھگڑے تک ٹھیک ٹھاک رہتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بیگماں خود صلح کے موڈ میں عبدالرحمان سے پہلے آ گئی تو وہ کنگن نکال کر ایسی جگہ رکھ دیتی جہاں عبدالرحمان کی نگاہ سیدھا پڑنے کا امکان ہوتا تھا۔ وہ ایک دفعہ نظر پڑنے پر وہ مزید اُس کی چمک کا شکار ہو جاتا تھا۔

ایک دن اپنی تنگ دستی کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرحمان نے جذباتی سا ہو کر کہا تھا "پگلی جب سے تیری شادی ہوئی ہے۔ تجھے کوئی زیور بھی نہیں بنوا کر دے سکا۔"

تو بیگماں نے ہنس کے لگاوٹ سے کہا تھا "آپ مجھے جب بھی کنگن پہناتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں نیا بنوا کر پہلی دفعہ پہنا رہے ہیں۔"

عبدالرحمان کتنی ہی دیر تک مسکراتا رہا تھا۔

آج بیگم ان نے وہی کنگن اُسے بیچنے کو دیا تھا۔ وہ اِسے لے کر دفتر جا رہا تھا تاکہ وہاں کچھ دیر کام کرنے کے بعد گھنٹہ بھر کی چھٹی لے کر بیچ آئے اور دوائیوں وغیرہ کا قرضہ ادا کر کے گڈو کا علاج جاری رکھ سکے۔

پوں۔۔۔ پوں۔۔۔۔ چونک گئی گئی۔۔۔۔۔ ایک دم کار کے ہارن اور پھر سخت بریک کی آواز نے اُسے اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ بڑبڑا کر رُکا۔ سوچوں میں غرق وہ کار کے نیچے آنے لگا تھا مگر بروقت بریک نے اُسے بچا لیا۔ معذرت کے انداز میں اُس نے کار پر نظر ڈالی تو اندر پرویز بیٹھا تھا۔ عبدالرحمان نے مسکرا کر سر کے اشارے سے اُسے سلام کیا۔ مگر وہ ایک دفعہ گھورنے کے بعد آگے نکل گیا اور عبدالرحمان پیچھے سے لمبی نیلے رنگ کی امپالا کار کے پیچھے پھیلاؤ پر گول گول سُرخ شیشے دیکھتا رہا۔

پرویز سکول کے زمانے میں عبدالرحمان کا ہم جماعت تھا۔ حد سے زیادہ نالائق۔ رعایتی نمبر لے کر یا نقل کر کے پاس ہونے والا۔ امتحانوں کے قریب عبدالرحمان کے پیچھے پیچھے گھومتا تھا۔ بعد ازاں کسی سرکاری ملازمت میں گیا تھا۔ سُنا تھا بہت سارا روپیہ غبن کر کے استعفیٰ دے دیا اور اب اپنا کاروبار کرتا تھا۔ یہ نہیں پتہ کیا کاروبار کرتا تھا۔ مگر عبدالرحمان کو یقین تھا کہ اُس جیسا بے اصول اور کوئی الٹا ہی دھندا کرتا ہو گا۔

سڑک پار کر کے فٹ پاتھ پر چڑھنے میں اُس کا انگوٹھا پھر سے کنگن کی گولائی پر پھسلا۔ لمحہ بھر کو اُس کے دل میں خیال آیا کہ پرویز جیسے لوگ جن کا کوئی کردار نہیں۔ مزے کرتے ہیں اور وہ اپنے اصولوں کی خاطر اتنی تکلیف اُٹھا رہا تھا۔ کہ زندگی کا سب سے پیارا اثاثہ فروخت کرنے جا رہا تھا۔ اِس کنگن کی قیمت سُنار تو ماشوں کے حساب سے دے گا۔ مگر اُس کا ترازو اُن پیار بھرے پکڑوں کو نہ تول سکے گا۔ جو پیچ کے سرے پر ان گنت دفعہ عبدالرحمان نے دیے تھے۔ سُنار گھڑائی کی قیمت تو ضرور دے گا۔ مگر اُس کی ہتھوڑی کے بعد اُس پر جلے بجھے، مدھم مدھم، نیم گرم گوشت کے دباؤ زندگی کی حرارت دیتے رہے ہیں۔ اِس گولائی میں کتنے ہی سہانے لمحے اور ہری بھری یادیں مقید ہیں جو کبھی نہ دُہرائی جائیں گی۔ اُس نے جیب کے اندر ہی اندر کنگن کو ہاتھ سے پیار کیا اور دفتر میں داخل ہو گیا۔

کرسی میں بیٹھ کر اُس نے فائیلوں کے ڈھیر پر نظر ماری۔ ایک فائل کے ساتھ گلابی رنگ کا "فوری" کا لیبل چپکا تھا۔ اُٹھا کر سامنے رکھی اور کھول کر پڑھنے لگا۔ اتنے میں چپراسی دو اور فائلیں لے آیا۔ جن میں سے ایک اوپر بھی اُسی قسم کا گلابی رنگ کا لیبل چپکا تھا۔ عبدالرحمان نے پہلی فائل رکھ دی اور دوسری اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ حاقی اپنی میز پر جھکا ہوا افسر کی ڈانٹ کی چٹھی پڑھ رہا تھا جس میں اُس کے پاس بہت سی پرانی فائیلوں کے اکٹھے ہونے کا ذکر تھا۔ ایک کلرک کام میں منہمک تھا۔ دوسرا جمائیاں لے کر صبح صبح کی سُستی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور تیسرا بڑی بے دلی سے قلمیں اور پنسلیں رکھ رہا تھا۔

چپراسی ایک رقعہ ہاتھ میں پکڑے پھٹر پھٹر کرتا اندر آیا اور عبدالرحمان کو دیتے ہوئے بولا "صاحب نے یہ کیس مانگا ہے۔"

اُس نے میز کی فائیلوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک فائیل نکال کر دے دی۔

عبدالرحمان کمرے کے ماحول سے بیگانہ سا بیٹھا تھا۔ وہ ایک "فوری" فائیل اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ پہلی چند سطروں کو بار بار پڑھتا

مگر پھر طبیعت مطمئن نہ ہوتی تو اُسے رکھ دیتا تھا، دُوسری فائیل اُٹھا لیتا۔ اِس طرح کئی دفعہ اُس نے دونوں فائیلوں پر نظریں گاڑیں مگر چند سطروں سے آگے نہ چل سکا ـــــ اُس کا دماغ قطعی غیر حاضر تھا۔

اتنے میں صاحب کی طرف سے بُلاوا آگیا اور وہاں جا کر اُسے فوراً شرمندگی ہوئی کہ اُس نے غلط فائیلیں بھجوائی تھیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ کام پر تو اُس کا دل نہیں لگ رہا، کیوں نہ ابھی جا کر گھڑی فروخت کرے۔ چنانچہ اُس نے ایک صاف کاغذ اٹھایا اور بڑی سنجیدگی سے ایک گھنٹے کی رُخصت کی درخواست لکھنے لگا ـــــ دستخط کرکے اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور کرسی کی پیٹھ سے ٹیک لگا کے یونہی بیٹھ گیا۔ اُس کے ذہن میں خیالوں کے عجیب تانتے بندھے تھے۔ بغیر کسی ربط یا تسلسل کے ـــــ بیگماں کا اُترا ہوا اُداس چہرہ۔ گڈو کی بے چین کروٹیں۔ ڈاکٹر کا مشینی انداز۔ صبح گھڑی دیتے وقت بیوی کا ضبط ـــــ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر گھڑی کو ٹٹولا اور نہ معلوم کیوں، اُس وقت اُس کو پرویز یاد آگیا اور اُس کی بڑی سی امپالا کار میں لال لال روشنیاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وہ اسی طرح جیب میں ہی گھڑی کی گولائی پر انگلیاں جمائے سوچتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی کبھار انگوٹھے کا ناخن غیر محسوس حرکت سے پٹ کے سرے کو کھولنے کی کوشش کرتا ـــــ اور وہ سوچتا رہا۔

بالآخر وہ اُٹھا کہ درخواست افسر کو دے کر بازار جائے۔ اُٹھ کر اُس نے لمحہ بھر کو دم لیا۔ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ سر جھکائے کام میں مصروف تھے اور مکمل سکوت تھا۔ اُس کی نظر عاقل پر پڑی ـــــ وہ بڑے مطمئن انداز میں فائیل پر جھکا ہوا تھا۔ میز کے کونے کے اُس پار اُس کا پاؤں جھولے جا رہا تھا۔ جیسے وہ بڑی لاپرواہی سے بجا رہا تھا۔ پنسل میز پر رکھتے وقت وہ بڑی دھیمی سی دُھن گنگنایا اور پھر اطمینان سے ہوا میں سر ہلاتا ہوا فائیل کے ورق اُلٹنے لگا۔

عبدالرحمان اُسے دیکھتا رہا ـــــ جیب میں گھڑی پر اُس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

ـــــ کمرے میں مکمل سکوت

ـــــ عبدالرحمان کی ذہنی پریشانی

ـــــ عاقل کا اطمینان

ـــــ پرویز

ـــــ گھڑی

ان سب نے جیسے سازش کرکے ایک ایسے طوفانی لمحہ کو جنم دیا جو ہماری زندگی میں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ جس میں ہماری شخصیت کی نفی ہو جاتی اور ہم وہ کچھ کر گزرتے ہیں جو ہم نہیں ہیں۔ اس طاقتور لمحے کے سامنے عبدالرحمان بالکل بے بس ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
کرسی پیچھے کرکے وہ دروازے کی طرف چلا مگر اُس کے قدم عاقل کی طرف خود بخود اُٹھ گئے ـــــ عاقل نے کندھے پر ہاتھ محسوس کرکے سر اُوپر اُٹھایا۔

"آئیے سرکار ـــــ کیا حال ہیں؟" وہ ترنگ میں بولا۔

"چائے پیوگے؟" عبدالرحمان نے جیسے نیند میں پوچھا۔

"مزدور۔ مزدور" وہ چیخا "چاسنے سے کون انکار کر سکتا ہے ———" اسے کدھر گیا یہ لاٹ صاحب" اس
نے ادھر اُدھر چپراسی کو دیکھ کر کہا اور گھنٹی پر ہاتھ مارنے لگا مگر عبدالرحمان نے ہاتھ روک لیا۔ اُس کا جسم اندر سے ایسے کانپ
رہا تھا جیسے دُور سے آنے والی گاڑی کی حرکت سے لائن لرزتی ہے۔ وہ بولا۔
"یہاں نہیں ——— کینٹین میں چلتے ہیں ——— ذرا گپ رہے گی۔"
کینٹین کے راستے میں عبدالرحمان کی گرفت اپنی عرضی پر مضبوط ہونے لگی۔ اُس کی اُنگلیوں کے پوروں نے آہستہ آہستہ
کاغذ کو سمیٹنا شروع کیا۔ جیسے بکری گھاس کے لمبے تنکوں کو ہوتے ہوتے مُنہ میں کھینچتی ہے۔ کاغذ کا سپاٹ پھیلاؤ چُر مُر ہو کر اس
کی کانپتی ہوئی مُٹھی میں غائب ہونے لگا۔ بالآخر وہ سمٹ کر ایک چھوٹی سی گولی بن گیا۔ جس کو عبدالرحمان نے انتہائی زور سے دبایا
اور کینٹین میں داخل ہونے سے پہلے دروازے کے پاس پڑے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں دے ماری۔

چارپائی پر گڈو سو رہا تھا۔ اُس کا جسم چادر سے ڈھکا تھا۔ کبھی کبھار کوئی مکھی چہرے پر بیٹھتی تو وہ مُنہ سکوڑ دیتا۔ یا نیند
میں سر جھٹک دیتا۔ پاس بیگماں اور پارو کی ماں بیٹھی تھیں۔ پارو کی ماں بولے جا رہی تھی۔
"چودھری کی بیوی میری مانتی تو آج کیوں خوار ہوتی۔ میں نے سو مرتبہ سمجھایا کہ بہن لڑکی کی طلاق ہو گئی سو ہو گئی۔ اب اللہ کا
نام لے کر کہیں اور شادی کر دو۔ کہتے ہیں رنڈیاں تو دن نکال بھی لیں مگر مُشٹنڈے نہیں نکالنے دیتے۔ ٹھیک ہے دُنیا میں نیک
عورتیں بھی ہیں اور بد بھی۔ مگر بہن نیکی بدی بھی تبھی ہے جب حالات سازگار ہیں۔ ورنہ تو مجبوری بڑے بڑوں کی نیکی کو منٹوں میں پیس
کر گنہگار بنا دیتی ہے ——— اور وہ ہے بھی خوبصورت۔ چند ماہ کی شادی میں مرد کا چسکا بھی پڑ چکا ہے۔ اب وہ
کیسے اکیلی رہے گی۔ مگر چودھری کی بیوی نہیں مانی۔ اب دیکھ لو گھر میں مُنہ چھپائے پڑی ہے۔ آخر کوئی تہ خانے میں تو رکھتی نہ
تھی بیٹی کو ——— آبادی میں رہتی تھی۔ پاس پڑوس میں ڈھیروں مرد پڑے ہیں۔ کوئی لگا گیا ہوگا داؤ۔"
بیگماں ہنسنے لگی "تم تو بہن خوب حساب لگاتی ہو۔"
"ہاں۔ ہاں۔ تو کیا جھوٹ کہتی ہو۔ بہن مجھے تو ہیر پھیر کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں۔ میں تو صاف کھری کہتی ہوں
اپنی بیتی چیز تو یہ ہے کہ اگر اب مجھے بھی مرد کے بغیر رہنا پڑے تو جان عذاب کو آ جائے۔ نہ جانے کیا کر گزروں۔"
پھر وقفہ ڈال کر بولی "اور تم بتاؤ۔ بھلا تم رہ سکو گی۔"
بیگماں پھر ہنسنے لگی۔
"نہ۔ نہ۔ بات کرو نا سیدھی ——— آخر انسان ہو ——— فطرت بھی تو کوئی چیز ہے یا نہیں۔ تم بے شک مومن ہو کے
صبر کر کے رہ لو گی۔ مگر بہن ہم تو صاف کہتے ہیں کہ ہمارا گزارہ نہیں ہوگا۔"
بیگماں بولی "سچ ہے بہن۔ کام ذرا مشکل ہی ہے۔"
اتنے میں گڈو کسمسایا اور وہ دونوں "ہائے بسم اللہ" کہتی ہوئی ادھر لپکیں۔

گڈو نے بے چینی میں بستے بستے بہت سے پے چینی سے ایک دو کروٹیں بدلیں اور پھر سو گیا۔ مگر ماں کا موضوع بیچ میں ہی رہ گیا۔ کیونکہ اُسی وقت عبدالرحمان گھر میں داخل ہوا۔ پاروکی ماں کی آواز سُن کر کہا سنا تو وہ پر قہر اُٹھا کر بھاگی۔ " ہائے بھرا جی آ گئے ——— میں چلوں اب ۔"

عبدالرحمان نے بیگماں کے سامنے کنگن نکالا تو خوشی کا سیلاب حیرت کے چہرے پر اُمڈ آیا۔ اُس نے عبدالرحمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ بیگماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے پیچ ڈھیلا کیا ——— کلائی پکڑی ——— کنگن چڑھایا ——— پیچ کسا ——— اور پھر ساتھ بٹھا لیا۔

بیگماں نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اُس کے لیے یہی تسلی کافی تھی کہ کنگن واپس آگیا ہے۔ مگر عبدالرحمان نے خود ہی کہہ دیا کہ کہیں سے پیسے مل گئے تھے اس لیے بیچا نہیں۔ بیگماں مسرور ہو کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

عبدالرحمان نے جھک کر بچے کو دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے گالوں میں چھوٹا سا ناک سانس کی آمد سے ہلکی سی آواز پیدا کر رہا تھا جیسے کوئی ننھے پاؤں گھسیٹ کر فرش پر چلے۔ نچلا ہونٹ اُوپر والے ساتھی سے بہت چپٹا ہوا تھا اور دونوں کے ملاپ کی لکیر سے پیڑیاں باہر کو پھیل رہی تھیں۔ بند آنکھوں پر پلکوں کے بال یوں جیسے بُنے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح کسی وقت ذرا سے مڑ جاتے۔ اس معصوم اور بے خبر چہرے کو بالکل علم نہ تھا کہ اس کے مضبوط اصولوں کو سُرخی میں بدلنے کے لیے باپ کتنی مشکل حدود پھلانگ چکا تھا۔ اور اُس کے مضبوط اصولوں کا ملبہ چند روپے بن کر جیب میں پڑا تھا ——— صبح ہی عبدالرحمان نے جانے سے پہلے بچے کے چہرے کو اسی طرح دیکھا تھا اور اب بھی دیکھ رہا تھا ——— مگر اس اثنا میں اُس کا اپنا چہرہ کتنا بدل چکا تھا۔ ——— کیا وہ اپنی پہلی شکل واپس لے سکے گا؟؟ عبدالرحمان کی آنکھیں سوچ سے بوجھل ہو گئیں اور وہ جلدی سے اندر چلا گیا۔

کمرے میں جا کر روپوں کا بنڈل جیب سے نکالا اور دونوں ہاتھوں میں لے کر غور سے تکنے لگا۔ دفتر کے وقت کے بعد جب وہ عاقل کے ساتھ اُس آدمی کے پاس روپے لینے گیا تھا تو اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کو عاقل نے کئی دلاسے دیے تھے۔ عبدالرحمان بار بار کہتا کہ میں یہ پہلی اور آخری مرتبہ کر رہا ہوں اور یہ بھی مجبوری کے تحت ہے ورنہ پھر کبھی نہ کروں گا۔ تو عاقل مسکرا کر کہتا۔

"شروع میں سبھی اسی طرح کہتے ہیں میرے بھائی ——— کوئی بات نہیں ——— پہلی بار گھبراہٹ ہوتی ہی ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

اور پھر اُس آدمی نے کیسے کاروباری انداز میں اُسے روپے دیے تھے۔ جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں اور سبزی فروش تولنے کے بعد سودا بغیر کسی بُرے احساس کے دیتا ہے۔ عبدالرحمان کے ماتھے پر ایک دم پسینہ آگیا تھا۔ سارے جسم میں تار کے کھمبوں پر کان لگا کر سنائی دیے جانے والی شاں شاں ہونے لگی اور دل نہ معلوم کہاں ڈوبا جا رہا تھا۔ باہر نکلا تو بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

کمرے میں نوٹوں کا بنڈل اپنی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ ملامت کے تازیانے لگا رہا تھا۔ کھڑکی میں سے آنے والے دن کی

روشنی ناقابلِ بیان طریقے سے غیر مانوس سی تھی۔ کمرے کا سارا ماحول بیگانہ لگتا تھا۔ اور برسوں کے گھسے پٹے سامان کی ہر شے ایک خاموش تماشائی لگ رہی تھی جو اُس کے دل و دماغ کے اندر ہونے والی ہر حرکت کا مخالفانہ دلچسپی سے اندازہ لے رہی ہو۔ جیسے کوئی سخت گیر جج سزا دینے سے پہلے خاموش اور گہری آنکھوں سے ملزم کا بیان سُنتا ہے۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ تھا۔ مگر اس کے دماغ میں ایک بھاری انجن کے چلنے کا شور تھا۔ جس کی بوجھل گونج میں بار بار یہ سوال اُٹھتا تھا۔

'یہ میں نے کیا کر دیا؟'

شوخی میں آکر اپنا کھلونا توڑنے والے بچے کی طرح اب وہ ناسفت میں ڈوبا اُس لمحے کو واپس لانا چاہتا تھا۔ جب اُس نے یہ فعل نہیں کیا تھا اور اپنی زندگی از سرِ نو اُس لمحے سے آگے پھر سے جاری کرنا چاہتا تھا۔ مگر کھلونا ٹوٹ چکا تھا اور اس کے بکھرے ہوئے ملبے کے پیچھے آرام و سکون کے سارے سابقہ لمحے غائب ہو چکے تھے ———— جیسے کوئی مُنہ زور ہوائی جہاز ایک دم غوطہ لگا کر فضا کی خاموشی کو پاش پاش کر کے فوراً ہی غائب ہو جائے اور شور سے بے قرار ہو کر اُڑنے والی چڑیاں واپس نہ بیٹھ سکیں۔

اتنے میں گڈو نیند بھری تتلی دار آواز میں بابر کا با تو عبدالرحمان کے اپنے درد نے نئی کروٹ لی۔ ایک نئی دھار اُس کے دل میں اُترتی چلی گئی اور دو جیبوں کے ٹکراؤ پر ایک ہیجان کے عالم میں اُس نے نوٹوں کے بنڈل کو ایسے پکڑا جیسے ڈوبنے والا تنکے کو پکڑتا ہے۔ جیب میں ڈال کر باہر نکلتے ہوئے وہ خود ہی بڑبڑایا۔

'اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔'

آج ڈاکٹر بڑی نرمی سے بات کر رہا تھا۔ گڈو کی حالت دیکھنے میں اُس نے بہت دیر لگائی۔ اور دوائی تبدیل کر دی۔ جب وہ ٹیکے کے متعلق ہدایات دے رہا تھا تو اُس کی آواز میں ہمدردی تھی۔ اور جب عبدالرحمان گڈو کو گود میں لیے اُٹھنے لگا تو ڈاکٹر نے ویسے ہی بچے کے سر پر ہلکا سا پیار پھیر دیا۔

عبدالرحمان کا دل خوشی سے بھر آیا۔ پیسے میں کتنی طاقت تھی۔ اُس نے سوچا۔ آج یہ کتنی ہمدردی دکھا رہا ہے۔ اگر ایسا ہی حساب رہا تو انشأ اللہ گڈو جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔

بچے کو گھر چھوڑ کر وہ ٹیکے لینے کو بازار چلا گیا۔ دوائی وغیرہ خریدنے کے بعد اُس نے بازار کا چکر لگایا اور اُن تمام دکانداروں کے بل ادا کیے جن کا وہ مقروض ہو چکا تھا۔ سب کو بقایا ادا کرنے کے بعد وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اور گھر کی واپسی کے راستے میں وہ ایک ریستوران میں گھس گیا۔

کوکا کولا کے ٹھنڈے گھونٹ پیتے ہوئے اُس نے سوچا کہ عاقل سچ ہی کہتا تھا۔ ایک معمولی سی چیز سے میری کتنی مشکلات ختم ہو گئی ہیں۔ اس سے پہلے دُنیا میری نظروں میں تاریک ہو رہی تھی۔ یاروں دوستوں نے قرض مانگنے کی وجہ سے مُنہ چھپانا شروع کر دیا تھا۔ بازار میں نکلنے سے وہ گھبراتا تھا کہ ہر دکاندار بل کے لیے مُنہ پھاڑے بیٹھا تھا۔ ذہنی اُلجھنوں کے گھٹن اور گھونسلے نے اُسے کھا ہی اندر ہی اندر سے ختم کر رہے تھے اور اب۔۔۔۔

ٹھنڈا گھونٹ لے کر اس نے پُرمزہ لیتے ہوئے ڈکار لی ——— اب کوئی بوجھ نہیں۔ معدے کی بیماری کا پتہ بھی درست ہے۔ مگر وہ انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گا ——— پھر ——— سب ٹھیک ہے۔

ریستوران میں ایک مرد اور ایک عورت داخل ہوئے۔ اس نے غور سے مرد کو دیکھا۔ پچھلی دفعہ جب وہ دوسرے دفتر میں میٹنگ کے لیے اپنے افسر کے ہمراہ گیا تھا۔ تو یہ شخص بھی وہاں اپنے افسروں کو کاغذات وغیرہ پیش کر رہا تھا۔ غالباً کوئی کلرک یا اسسٹنٹ تھا۔ ایک آنکھ میچ کر عبدالرحمان نے سوچا کہ یہ عورت اس کی کیا لگتی ہوگی تو اُسے ایک دم مائل کا قاعدہ کلیہ یاد آیا۔ جو جاسوسوں کی طرح شور کر کر کے سب کو ہنسا ہنسا کر بتایا کرتا تھا۔

"ہماری باتوں سے کچھ سیکھو دوستو۔ سڑک پر لڑکا اور لڑکی جا رہے ہوں تو ان کا رشتہ دیکھنے کے لیے لڑکے کو دیکھو۔ اگر وہ اکڑ کر چل رہا ہو تو عاشق ہے اگر جھینپ کر چل رہا ہو تو بھائی ہے اور اگر بیزار نظر آئے تو خاوند ہے۔"

اُس نے فوراً یہ نسخہ آزمایا اور نتیجہ نکالا کہ وہ لڑکی کا عاشق ہے۔ کوکا کولا کی خالی بوتل کو غور سے دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا۔ عیش کرنے دو سالوں کو۔ کیا پڑا ہے اصولوں میں۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہی تکلیف ہوتی ہے۔ دُوسرے تو تمہارے بغیر ہی مزے کرتے ہیں۔ تم چاہے جلوس میں ہو یا نہ ہو۔ اُن کا کیا جاتا ہے نقصان تو اپنا ہی ہے۔

وہ منہ موڑ کر بیٹھ گیا تاکہ اس جوڑے کو نظر میں رکھ سکے۔ منہ کی ڈھکی چھپی بے تابانہ حرکتوں نے اُس کے شبے کو یقین میں تبدیل کر دیا۔ میز کے نیچے سے پاؤں کا ٹکرانا۔ ٹوسٹ پکڑاتے وقت انگلی پکڑ لینا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا۔ کافی واضح نشانیاں تھیں۔

اُس نے جھک کر بوتل میں لگی ہوئی نلکی سے دو تین گھونٹ بھرے اور سوچنے لگا۔ اس قسم کے مزے پیسے کے بغیر ممکن نہیں۔ مگر اب تو یہ مشکل نہ ہوگا۔ اگر یہ کلرک کر سکتا ہے میں کیوں نہیں کر سکتا۔ ایک ہی تو زندگی ہے اس میں بھی چند روز عیش نہ کیا تو کیا بات ہوئی۔ افسوس کہ اتنا عرصہ پہلے بھی میں نے اصولوں کی قید میں ضائع کیا۔ نہ صرف یہ کہ ایسی خوشیوں سے خود محروم رہا بلکہ اپنی بیوی کی جوانی بھی عذاب میں ڈال ——— کل اتوار ہے ——— پرسوں جاتے ہی اُس فائل میں سے قاعدہ کم کر کے کیس اُوپر بھیج دوں گا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اتنی چیز میں ہمارا کیا جاتا ہے بلکہ فائدہ ہی ہے —— گورنمنٹ کو میں نقصان نہ پہنچاؤں گا تو اور ہزاروں لوگ کریں گے۔ اس لیے میں کیوں مُفت کی خیر خواہی میں گھاٹا اٹھاؤں۔

بیرہ بل لایا تو عبدالرحمان نے دس روپے کا نوٹ بڑی شان سے ٹرے میں پھینکا۔ باقی پیسے واپس دیتے وقت پلیٹ میں ایک روپیہ ٹپ دیکھ کر بیرے نے جھک کے سلام داغ دیا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے عبدالرحمان ایڑھی پر گھوم سا گیا۔ باہر نظر دوڑائی تو سڑک پر کاروں، سائیکلوں اور پیدل لوگوں کی ریل پیل میں دُنیا بہت ہی سہانی نظر آئی۔ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہ ٹہلتا ٹہلتا چل دیا۔ فٹ پاتھ کے ایک کنارے پہ پنواڑی بیٹھا تھا۔ اُس کے تختے پر اس نے دونی بڑی شان سے پھینکی۔

"میاں۔ ایک میٹھا پان تو دو۔"

اُس نے کٹوری بھائی تو عبدالرحمان لمبا سانس لے کر ہوا کی باس لیتا ہوا بولا۔

"فرا خوشبو اچھی لگا۔"

پان والے کے سامنے چوڑا سا تختہ تھا۔ جس کے دونوں طرف ڈھکنے سے کھلے تھے۔ اُن میں سگریٹ کی ڈبیاں جڑی تھیں۔ عبدالرحمان اُن کے نام کے پڑھتا رہا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ مگر اُس نے سوچا آج یہ مزا چکھنے میں بھی کیا حرج ہے۔ چنانچہ دس روپے کا ایک اور نوٹ نکالتے ہوئے وہ بولا۔

"ایک ڈبیا تھری کاسل اور ایک ماچس۔" عاقل کو یہی سگرٹ پیتے دیکھا تھا۔

گھر کو جاتے ہوئے اُس نے سوچا کہ ذرا عاقل سے ملتا چلے۔ وہ اُسے اپنا ہمدرد اور محسن نظر آ رہا تھا۔ جس کے بروقت مشورے اور تعاون سے اُس کی پریشانیاں دُور ہوئی تھیں۔

"ابے مولانا۔ کہاں گھوم رہے ہیں؟" عاقل مسکراتے ہوئے بولا۔

"پیر مُرشد کے در پر زیارت کے لیے آیا ہوں۔" وہ شرارت سے بولا۔

"ٹھیک ہے بچہ۔ جس نے ہمارے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ سدا سُکھی رہا۔" اُس نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا اور پھر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

عاقل اُسے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ فرش پر قیمتی قالین۔ بہت عُمدہ صوفے اور کُرسیاں۔ بھاری پھولدار پردے نہایت نفیس ریڈیو گرام۔ عبدالرحمان صوفے پر بیٹھا تو بڑی گدیوں میں دھنستا چلا گیا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی آیا تھا۔ اُس نے دل میں عاقل پر ہزار لعنتیں بھیجی تھیں جس نے یہ سب ساز و سامان حرام کی کمائی سے اکٹھا کیا تھا۔ مگر آج اُس نے قدرے تحسین سے ان چیزوں کو دیکھا اور اُس کے دل میں چھوٹی سی اُمنگ نے سر اُٹھایا کہ میں بھی اپنا کمرہ ایسے سجاؤں۔ اپنا گھر تو بالکل کباڑ خانہ ہے۔ اپنی تنخواہ میں تو یہی ہو سکتا تھا نا۔ لیکن اگر اب عاقل اِسی طرح آسامیاں پھنساتا رہا۔ تو مشکل نہ ہوگا۔

اُس نے بڑی گرمجوشی سے عاقل کے کندھے پر ہاتھ مارا "اچھا تو اور کیا خبریں ہیں۔"

"بس مزے ہیں۔" عاقل نخوت سے بولا۔

کمرے کے ایک طرف بہت بڑا پیکٹ پڑا تھا۔ جس کے اندر سے نیا ریڈیو جھلک مار رہا تھا۔

"یہ اب خریدا ہے؟"

"نہیں میاں میرا نہیں ہے۔ تمہارے ایک پیر بھائی کا ہے۔"

"پیر بھائی" کی اصطلاح پر دونوں ہنس پڑے۔

"تو یہ پیر صاحب کے پاس کیسے آ گیا؟"

"ابھی تو انگلیاں ڈبوئی ہیں برخوردار تم نے۔ آگے چلو گے تو پتہ چلے گا کہ یہ ایک سمندر ہے سمندر۔ سو ڈھنگ کرنے پڑتے ہیں اِس کام میں۔"

"میاں کیا ڈھونگ کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ـــــــ کسی کی چیز ہے۔ اس نے کسی کا نام کیا۔ تو کسی نے مجھے دے دی کہ اس تک پہنچا دوں۔ پہلے ہی راستے میں دیر نہ ہو گا۔"

"ہوں" عبدالرحمٰن مسکرایا "بڑا باقاعدہ نظام ہے۔"

"میاں یہ بڑا لمبا چوڑا کاروبار ہے۔ اس میں اپنی ساکھ بہت ہے۔ آج تک کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ اس لیے آخر میں دیں پیسے ذمے ہوتے ہے۔"

اس کے بعد عاقل اُسے مختلف قصے سناتا رہا۔ اور ایسی ایسی ہستیوں کے پوشیدہ اعمال بتانے جن کی ایمانداری اور دیانتداری کے متعلق عبدالرحمٰن کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ڈیوڑھی میں سے عاقل کی بیوی کے جھگڑنے کی آواز آئی۔ عاقل اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ عبدالرحمٰن نے دبی آواز میں بیوی کو ڈانٹتے سنا۔ پھر پردے کی درز کے سامنے سے اُسے دھکیل کر اندر لے جاتے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد جب عاقل واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تین خط تھے۔ وہ کھول کر پڑھنے لگا اور بیچ بیچ میں ہنستا جاتا۔ عبدالرحمٰن نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا مگر وہ خود ہی بولا۔

"یار یہ بیویاں بھی عجیب مصیبت ہوتی ہیں۔ خواہ مخواہ اپنی اتنی اہمیت سمجھتی ہیں کہ خاوند ان کے لیے ساری دُنیا کے مزے چھوڑ ہی دے۔ اب ہماری بیگم اسی چکر میں رہتی ہے کہ ڈاکیے سے پہلے خط خود وصول کرے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"ہوا کیوں نہیں۔ روز روز کی چخ چخ رہتی ہے۔ میں نے ڈاکیے کو خاص طور پر منع کیا ہے کہ میرے خط میرے علاوہ کسی کو نہ دے مگر یہ ہر روز اس سے جھگڑتی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یار۔ عورتوں وغیرہ کی چٹھیاں ہوتی ہیں نا۔" عاقل زور سے ہنسا۔

"مگر یہ تو بُری بات ہے عاقل۔"

"سب چلتا ہے پیارے۔" عاقل نے پھر قہقہہ لگایا "آخر کماتے کس لیے ہیں۔ تھوڑی عیش تو کرنا ہوئی۔"

پھر عاقل اُسے اپنے معشوقوں کا حال بتانے لگا۔ کئی تو ختم ہو چکے تھے اور کئی چل رہے تھے۔ اتنے میں کوئی آواز سن کر عاقل اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے میاں بیوی کے جھگڑنے کی آواز آنے لگی۔ اور پھر عاقل نے پکڑ کر بیوی کو مارنا شروع کیا۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

عبدالرحمٰن اُٹھ کر چلا آیا۔

اپنی گلی میں داخل ہونے سے پہلے اس کے سر پر ایک گیند لگی۔ مُڑ کر دیکھا تو چند بچے کھیل رہے تھے۔ اُن میں سے دو ایک ہنسنے لگے۔ دو ایک ڈر گئے۔ اور ایک جرات کر کے گیند لینے آگے آگیا۔ عبدالرحمٰن نے ایک نظر اُن سب پر کر دیکھا اور پھر چپ چاپ اندر خوشی کا احساس

کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ دو چار روز تک گڈو بھی ٹھیک ہو جائے گا اور ان کے ساتھ کھیلے گا۔ چنانچہ اس نے بڑی اپنائیت سے مسکراتے ہوئے گیند واپس کر دی ——— جب سے اس کی معاشی فکریں دُور ہوئی تھیں وُہ ہر چیز کے متعلق بہت پُر امید نظر آنے لگ گیا تھا۔

مگر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں عورتوں کا ہجوم تھا ——— چارپائی پر گڈو سفید چادر میں ڈھکا تھا اور بیگماں چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

"ہائے بھاجی۔ اب کیا لینے آئے ہو۔" پارو کی ماں چلائی تو سب عورتیں مڑ کر دیکھنے لگیں۔ عبدالرحمان سن ہو کر متوحش سا کھڑا تھا۔ اُسے اپنی بینائی پر یقین نہ آیا۔ بالکل خالی الذہن سا ہو کر آنکھیں پھاڑے سامنے چارپائی کو گھور رہا تھا۔ بیگماں ایک دم "ہائے اللہ" کہہ کر اُٹھی اور دوڑ کر اُس سے چمٹ گئی۔ اُس کی چھاتی پر بلکتا ہوا چہرہ رکھ کر چلائی "کہاں تھے تم۔ وہ تمہیں پکارتا گیا ——— ہوں اوں اوں اوں . . . . وہ تمہیں بلاتا رہا ——— وہ 'اباجی' 'اباجی' کہتا رہا ——— تم کیوں گئے تھے ——— تم نہ جاتے تو وہ کبھی نہ جاتا . . . . . . ہوں اوں اوں اوں . . . . ."

عبدالرحمان نے اُسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ پھپک پھپک کر رو رہی تھی۔

"کہاں چلا گیا میرا گڈو ——— میں اس کے لیے پلوش بناتی رہی ——— اور وہ پہلے ہی چلا گیا ——— ہائے اللہ میں کیا کروں ——— میرا ایک ہی بچہ تھا وہ بھی چھین لیا . . . . . ."

پارو کی ماں آگے آئی۔ اُس نے بیگماں کو کھینچ کر پرے کیا "حوصلہ بہن حوصلہ"

اور راستہ چھوڑتی ہوئی بولی "آجائیے بھاجی آپ۔"

عبدالرحمان مسحور جانور کی طرح آگے بڑھا۔ عورتیں سمٹتی گئیں۔ وہ اُن کے کندھوں، سروں اور گھٹنوں سے ٹھوکریں کھاتا چارپائی تک جا پہنچا ——— بستر پر سفید چادر سپاٹ سی بچھی تھی۔ بیچ میں ہلکا سا اُبھار تھا۔ عبدالرحمان کو توقع تھی کہ جیسے وہ قریب پہنچے گا۔ وُہ اُبھار ہلے گا۔ اُوپر والے سرے پر گنبد بُد ہو گی۔ دو ننھے ننھے ہاتھ چادر کی سلوٹوں سے لڑتے ہوئے نمودار ہوں گے اور گڈو ایک آنکھ نکال کر کہے گا۔

"تا آآ۔ اباجی!"

مگر وہاں کوئی حرکت نہ ہوئی اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

پھر اُس نے دھیرے ہی نرم ہاتھ سے چادر کا سرا اُٹھایا۔

عورتوں کی چیخیں ایک دم آسمان تک چلی گئیں۔ بیگماں پچھاڑ کھا کر گری۔ پارو کی ماں اور دُوسری تین چار عورتیں فوراً اُس کی طرف لپکیں۔

گڈو کا چہرہ بالکل بے حس اور خاموش تھا۔ اُس پر جیسے سناٹے کا خول چڑھا تھا ——— مکمل سکوت۔ ایک مکھی آ کر ناک پر بیٹھی مگر اُس نے منہ نہیں سکوڑا۔ پیلی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔ بند آنکھوں کے گرد اُداسی تھے پر جیسے دھول کی ہلکی سی تہ تھی۔ ہونٹ بھینچے

ہوئے دیکھے ایک دوسرے کے ساتھ نئی سے سے گھسے تھے۔ پسینے سے بھیگ کر تنگ ہوتے ہوئے بال ابھی تک ماتھے پر چپکے تھے۔

عبدالرحمن نے رخسار پر انگلی لگائی۔ تو ایسے لگا جیسے نئی تیار شدہ ریشمی رضائی ہو۔ نرم اور ٹھنڈی۔ گال میں انگلی کی حدود کے گرد گھلا سا پھیلنے لگا۔ عبدالرحمن بے خود سا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر یہ سب ایک جھلملاتی دھند میں غائب ہونے لگا۔ . .

دھند گاڑھی ہوتی گئی . . . .

روشنی اور اندھیرے آپس میں خلط ملط ہونے لگے۔

پھر ایک دم سب کچھ پھر سے نظر آنے لگا ——— انگلی پر موٹا سا آنسو گرا اور اس کے گرد گڑھے میں گھیرا ڈال کر چمکنے لگا

عبدالرحمن نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں پر لگا کر جھکتا ہوا چارپائی کے پائے پر جھک گیا

دس دن بعد وہ دفتر میں داخل ہوا۔

وہاں کا ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ دروازے پر سپاہی چاق و چوبند کھڑا تھا۔ ذرا آگے انکوائری آفس سے پاس ہونے والے چوکیدار آنے جانے والوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ سائیکلوں کے پہیے اور اکا دکا کاروں کی گڑگڑاہٹ اس کے اردگرد سے گزر رہی تھی۔ کچھ آگے فائلوں کے بنڈل اٹھائے چپراسی ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ ڈرائیور افسروں کو کمروں میں اتار کر گاڑیاں کھڑی کرنے جا رہے تھے اور ابھی ابھی پہنچنے والے صاحبوں کے کمروں کے دروازوں پر گھنٹی کی آواز سن کر چپراسی اندر کو لپک رہے تھے۔ کوئی واقف کار پاس سے گزرتا تو ہاتھ اٹھا کر سلام کر دیتا۔ تنہا روں پر انعام لینے والے خاکروب جھک کر لمبے ہاتھ کا سلام کر رہے تھے۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ مگر اسے یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ جو یکتائی اور اطمینان وہ پہلے اندر داخل ہونے پر محسوس کیا کرتا تھا اس کی بجائے اس کے اندر ایک خلا تھا جو ہر قسم کی دلچسپی یا لگاؤ سے خالی تھا۔ فضا میں ایک ہمہ گیر اداسی تھی جس کے بے رنگ اور پھیکے چوکھٹے میں دنیا کا کاروبار آویزاں تھا۔ اور ایک ان دیکھا پردہ اس کو ماحول سے جدا کر رہا تھا۔

دفتر کے کمرے میں داخل ہوا تو ساتھیوں نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ اکثر لوگ اس کے گھر ماتم پرسی کے لیے ہو آئے تھے مگر چند ایک جو نہ جا سکے تھے اب ایک ایک کر کے آنے لگے۔ وہ تعزیت کے رسمی جملے کہتے۔ اسے حوصلہ دلاتے۔ صبر کی تلقین کرتے اور چلے جاتے مگر کسی کی باتوں سے اطمینان نہ ہوتا۔ وہ خلا بدستور قائم تھا جس کی ضخیم وسعتوں میں وہ انتہائی اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے انسان گھپ رات کے اندھیرے میں تاریک آسمان کو دیکھ کر کرتا ہے۔

چپراسی کی آواز دروازے میں سے سنائی دی

"وہ بیٹھے ہیں!"

اس نے مڑ کر دیکھا تو چپراسی ایک ادھیڑ عمر آدمی کو اندر دکھا رہا تھا۔ وہ اس کا واقف نہ تھا۔ صرف شکل سے شناسائی تھی۔

ر کا ہے۔ اُس نے سمجھا کوئی سرکاری کیس لینے آیا ہے۔ مگر وہ قریب آکر سٹول پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میرا نام عبدالخالق ہے۔"

عبدالرحمان نے سر ہلایا۔

"مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کا بچہ فوت ہو گیا ہے"

عبدالرحمان نے پھر سر ہلایا۔

عبدالخالق نے ہاتھ میز پر رکھا۔ شہادت کی اُنگلی کے ناخن سے میز کی سطح کو کھرچنے لگا۔ وہ خود ہی اُنگلی کی حرکت

ا رہا ۔ پھر بولا۔

"میرا بھی بچہ فوت ہو گیا تھا ــــــ"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ ــــــ عبدالرحمان متوقع رہا کہ وہ کچھ کہے گا۔ مگر وہ چپ رہا۔ عبدالرحمان کچھ بات کرنا

ا۔ مگر کچھ سوجھتا نہ تھا۔ وہ تھوڑا سٹپٹایا مگر خاموش رہا۔

عبدالخالق پھر بولا۔

"اُس کی عمر پانچ سال کی تھی . . . . پچھلے ہفتے چالیسواں کیا ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ عبدالرحمان بھی چپ تھا۔

پھر وہ بڑی دیر اُس کے پاس بالکل گم سم بیٹھا رہا۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ مگر عبدالرحمان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن
م ایک اَن دیکھے تار سے بندھ رہے ہیں اور اُن کی بے زبانی ایک دُوسرے کے دُکھے ہوئے دلوں کو پُرخلوص ہمدردی
ینے لگ گئی۔ اپنے مشترکہ غم میں وہ ایک دُوسرے کا دُکھ اپنے دیکھ رہا تھا۔ جیسے آئینے میں جھانک رہے ہوں۔ اُن کے دلوں
و دھڑکن میں اب تنہائی کی ٹیس نہ تھی۔ بلکہ کسی کی شرکت کی تسلّی تھی جو انہیں سکون دے رہی تھی۔ اُس غیر محسوس اُنگلی کی طرح جو ستار
نا تے ہوئے تاروں کی جھنکار کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی بالکل سلا دیتی ہے۔

کافی دیر کی خاموش نشست کے بعد عبدالخالق اُٹھ کھڑا ہوا۔ عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہولے سے دبایا اور بولا۔

"اب چلتا ہوں۔"

وہ نرم قدموں سے باہر نکل گیا۔ جاتے میں عبدالرحمان نے اُس کی دُور ہٹتی پیٹھ دیکھی۔ اُس کے سر کی پُشت پر بے کسی
، چارگی کے سائے تھے۔ ناہموار چال میں اداسی کی زنجیریں بجتیں اور دروازے سے مڑتے وقت نظر آنے والے ایک
چہرے پر خاموش قرب کا سایہ تھا۔ ترس کی پُرجوش لہر عبدالرحمان کے سینے کی گہرائیوں سے نکل کر منہ کو آنے لگی۔ وہ اپنا
ل کر عبدالخالق کے متعلق سوچنے لگا۔ بہت سے کئی آدمی اُس کے پاس تعزیت کے لیے آئے تھے۔ اُنھوں نے رسمی دُکھ
ں اور ہمدردانہ الفاظ بھی کہے تھے۔ مگر کسی کی باتوں سے عبدالرحمان کو اتنی تسلّی نہ ہوئی تھی۔ جتنی اس ناواقف شخص کی خاموش
سے۔ وہ اس کے غم کا ہم پایہ تھا اور ہمسایگی کی تسلّی سیکڑوں خالی خولی دلاسوں سے بہتر ہوتی ہے۔

اٹھ بیٹھا اور وہ فائیلیں اٹھانے لگا۔

اتنے دن بعد فائیلوں کے چہرے اجنبی تھے۔ مگر وہ کام کرتا گیا۔ کسی فائیل کو واپس بھجواتا تھا، کسی کو ریکارڈ میں رکھتا تھا، کسی پر نوٹ لکھتا تھا۔ کسی کے متعلق کلرک سے پچھلے کاغذات نکلوانے تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے سب کچھ کرتا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا دل کام میں لگنے لگا اور وہ اس میں منہمک ہوتا گیا ——— مگر ایک نئی فائل اٹھائی تو ایک جھرجھری سارے جسم میں دوڑ گئی ———

——— یہ وہی فائل تھی ———

اور اس فائل نے اس کے بچے کی جان لی تھی۔

پچھلے دس دنوں میں یہ خیال اس کے دل میں جڑ پکڑ تا گیا تھا کہ بچے کی موت خدا کی طرف سے سزا تھی۔ اگر وہ رشوت نہ لیتا تو اس کا بچہ یقیناً ٹھیک ہو جاتا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوتا اور پارو کی ماں کی آواز سن رہا ہوتا جو بیگماں کو تسلی دینے اکثر آیا کرتی۔ وہ کئی مسئلے بیان کرتی۔ مگر جب کبھی یہ کہتی کہ زندگی کے دن گنتی کے ہیں اور انھیں کوئی نہیں بڑھا سکتا تو عبدالرحمان کے دل میں گویا دھوکا سا اٹھتا کہ ایسا نہیں ہے۔ گڈو ٹھیک ہو رہا تھا۔ میں نے رشوت لی اور بعد ازاں اپنے سارے چلن کو بدلنے کا ارادہ کیا جس کی فوری سزا مجھے قدرت کی طرف سے ملی۔ اگر میں اپنے ایمان کو خراب نہ کرتا تو یقیناً اس عذاب سے بچ جاتا۔

اس خیال نے مزید تقویت اس رات پکڑی جب اس نے خواب دیکھا ———

یہ تیسری رات تھی۔ سہ پہر کو قل کا ختم دلوانے کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ اور گھر میں رات کے بند بازار کی سی ویرانی تھی۔ اس کے بوجھ سے تنگ آکر بیگماں نے وہ دراز کھول لیا جس میں گڈو کی چیزیں تھیں۔ چاک کے ٹکڑے، بڑے بڑے نیلے موٹے سگرٹوں کی خالی ڈبیاں، جن کو ایک دوسرے پر رکھ کر وہ مکان بنایا کرتا تھا۔ مٹی کے گھوڑے جو دروازے کی دہلیز کو سڑک فرض کر کے اس پر دوڑائے جاتے تھے۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جن کے گرد جلتا ہوا کپڑا لپیٹ کر وہ کھلونا بنایا کرتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی چائے دانی کا ڈھکنا جس میں مٹی کے گھروندے کو مویشیوں کے چوں کا چارہ کھلایا جاتا۔ بکھارا ئیل کا ٹوٹا ہوا کنگھا اور ایسی ہی کئی الّم غلّم چیزیں۔ بیگماں ہر چیز دیکھ کر یادوں کے طوفان اٹھاتی اور زار زار روتی جاتی۔

عبدالرحمان نے بڑی مشکل سے اسے چیزوں سے علیحدہ کیا۔ بازوؤں میں اٹھایا اور آہستہ آہستہ نرمی سے دھکیل کر چارپائی تک لے گیا۔ وہاں اسے بٹھایا۔ بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کا سر اپنے سینے پر رکھا اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے کو سہلانے لگا۔ خود اس کا دل رو رہا تھا مگر وہ ضبط کیے بیگماں کو چپ کراتا رہا۔ کبھی خدا کی مرضی کا ذکر کرتا، کبھی حوصلہ کرنے کو کہتا، کبھی زیادہ غم سے اس کی صحت کی خرابی کے خطرے کا خدشہ ظاہر کرتا۔ کبھی اور بچوں کی امید دلاتا۔ کافی دیر بعد آہستہ آہستہ بیگماں کی سسکیوں میں کمی آنے لگی۔ اور وہ سینے پر ٹکی ہوئی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی سسکی سے تھرا جاتی۔ اور عبدالرحمان اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگتا یا ہاتھوں کے ہلکے سے دباؤ سے سر تھپک دیتا۔ یا پھر اپنے پست ہاتھ پیچھے جا کر اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگتا ———

شام گہری ہو رہی تھی۔ جھٹپٹے کی سیاہی میں وہ ڈھیر سا بن کر چارپائی پر بیٹھے تھے۔ عبدالرحمان نے اُس کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ کندھا دبایا۔ پھر نرمی سے اپنے سے علیحدہ کیا اور ایک ہاتھ سے ٹھوڑی اُٹھا کر کہنے لگا۔

"اُٹھو۔ بیگی۔ کھانا کھالو۔"

بیگاں کا سارا جسم ایک دبی ہوئی سسکی کے اُبھرنے سے کانپ اُٹھا۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں نہیں کھاؤں گی آپ کھالیں۔"

"تھوڑا سا تو چکھ لو" عبدالرحمان نے منت کی۔

"اوں ہوں" وہ پرے ہو کر ناک صاف کرنے لگی۔

خاوند کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اندر سے بستر اُٹھا کر لائی۔ گدیلے کو جھاڑ کر چارپائی پر بچھایا۔ تکیے پر دھپ مار کر مٹی اڑائی۔ اور بستر پر رکھ دیا۔ اور پھر چادر کو دونوں کونوں سے پکڑ کر جھاڑا ——— شام کے اندھیرے میں کوئی چیز اُچھل کر چارپائی پر گری ——— چادر کے دو کونے ایک ہاتھ میں سمیٹتے ہوئے بیگاں نے دوسرے ہاتھ سے وہ چیز اُٹھائی اور عبدالرحمان بھی جھک کر دیکھنے لگا۔

...... وہ گڈو کا موزہ تھا۔ پنجے پر پیلی اُنگلیاں بنی تھیں اور ٹخنے والے حصے پر سلوٹوں کے گول گول دائرے تھے۔ ایڑی پر معمولی سا سوراخ تھا اور اُس میں سے دو ایک پھوسڑے باہر کو جھانک رہے تھے۔ یہ موزہ اتنا چھوٹا تھا کہ بیگاں کی کھلی ہتھیلی پر پورا پھیل رہا تھا۔ کپڑے کا چپٹا سا ٹکڑا۔ جس میں اب سلوٹیں تھیں لیکن اُس میں سے بھری بھری سڈول پنڈلی باہر کو آتی تھی۔

بیگاں زور سے مٹھی بھینچ کر اُسے اپنے سینے میں دبانے لگی۔ اور اُونچی اُونچی روتی ہوئی اُسی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ اب اُس کے خاوند سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور وہ بھی اُسی چارپائی پر ڈھلک گیا۔ دونوں کی شدید سسکیوں سے چارپائی ہلتی رہی اور تاریک آسمان پہ تارے بھید بھری آنکھوں سے ان کو دیکھتے رہے۔ جیسے انہیں پتہ ہو کہ آگے کیا ہونے والا ہے ——— ایسے ہی روتے روتے دونوں نہ معلوم کب سو گئے۔

اُسی نیند میں عبدالرحمان نے وہ خواب دیکھا......

...... تاریک آسمان ——— بادلوں کی گرج ——— بجلی کی چمک اور بھیانک ہوائیں ——— کسی وقت بجلی چمکتی ہے تو گڈو ایک سیدھی سڑک پر سفید کپڑے پہنے بھاگتا جاتا ہے۔ عبدالرحمان اُسے پیچھے سے بلاتا ہے۔ تعاقب کرتا ہے۔ مگر وہ آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ سڑک پر کبھی گڑھے ہیں۔ کبھی جھنڈیاں اور کبھی وہ ان میں غائب ہو جاتا ہے ——— پھر عبدالرحمان ایک چوٹی پر کھڑا ہے۔ جس کے نیچے گہری وادی ہے اور اُس کے پار ایک اور بہت اُونچی چوٹی ہے جس پر بادلوں کے دھوئیں میں آگ جل رہی ہے۔ اُس آگ کے شعلوں کے اُوپر ہوا میں گڈو معلق ہے اور گرمی سے تڑپ رہا ہے۔ عبدالرحمان اُسے آوازیں دیتا ہے تو ایک ہیولیٰ سا نمودار ہوتا ہے جو پھونکوں سے آگ جلا کر زیادہ روشن کرتا ہے۔ عبدالرحمان غصے میں گالی دیتا ہے تو وہ مڑ کر دیکھتا ہے ———

وہ تب یہ پہچانتا ہے کہ وہ گڈو کا سالم ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر ہنس کر عبدالرحمان کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر اپنے بیگ میں سے نوٹوں کے بنڈل نکال نکال کر آگ میں جھونکنے لگتا ہے۔ شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ گڈو کی تڑپ زیادہ ہو جاتی ہے اور عبدالرحمان کی چیخ حلق میں پھنس جاتی ہے . . . . .

آنکھ کھلی تو وہ پسینہ میں شرابور تھا۔ حلق خشک تھا اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ساتھ ہی بیگماں گھاس پھوس کر پڑی تھی۔ اُس کی گردن ڈھیری ہونے کی وجہ سے چہرہ اُوپر کو اُٹھا تھا۔ اور چاند کی مدھم روشنی میں رُخساروں پر آنسوؤں کا راستہ چمک رہا تھا۔ وہ ہموار سانس لے رہی تھی۔ عبدالرحمان دبے دبے اُٹھا اور باہر چھت پر نکل آیا۔ بے قراری میں وہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

رات کا سناٹا گہرا اور بھاری تھا۔ دُور دُور پھیلے ہوئے تاروں اور اُفق کے دبیز اندھیروں میں کائنات کی لامحدود وُسعت میں خوف دیکھ رہی مارتا تھا۔ تاروں کی پھیکی روشنی نے لمبے لمبے سائے پیدا کر کے ہر چیز کو دن کی نسبت زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔ اِس وسیع و عریض نیم تاریک پس منظر میں عبدالرحمان ایک نامعلوم تنکے کی طرح تھا جیسے سمندر کی چوڑی لامحدود سطح پر دیو پیکر لہروں میں خشخاش کا ایک دانہ بھٹک رہا ہو ——— مگر اُس کے دہشت زدہ دماغ کی ہراسانی ماحول سے بھی وسیع تر تھی۔ ایک پریشان ذہن کی پریشانی سے سامنے آفاق بھی ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اِس متزلزل دُنیا میں عبدالرحمان کو سارا قصور اپنی ذات میں نظر آیا۔ نیم تاریک فضا دُور تک پھیلی ہوئی اُسے خدا کے غضب کا مظہر معلوم ہونے لگی۔ اور اِس ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر اُس کے اعصاب پر پچھتاوے کے زوردار سیلاب نے حملہ کر دیا۔ یہ سب میرا قصور ہے۔ اگر میں اپنا ایمان خراب نہ کرتا تو مجھے اتنی کڑی سزا نہ ملتی۔ صحیح انسان تو وہ ہے جو بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی نہ ڈگمگائے۔ میں تو ذرا سے جھٹکے سے ہی اپنے حواس کھو بیٹھا۔ یہ سزا میرے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ میں سنبھل جاؤں ——— یہ بھی شکر ہے کہ میں نے وہ کیس ابھی تک بگاڑا نہیں تھا۔ اب میں اُسے ہرگز خراب نہ کروں گا ایمانداری سے نوٹ درست لکھ کر بھیجوں گا۔ جن لوگوں سے میں نے رشوت کا پیسہ لیا ہے۔ اُن کو واپس دے دوں گا۔ زندگی میں ایک غلطی ہے۔ اب پوری طرح اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ لوگ نیت کا حال جانیں یا نہ جانیں۔ خُدا تو جانتا ہے۔ اب اگر میں بُرے راستے سے ہٹنا چاہوں گا تو یقیناً خدا میری مدد کرے گا۔ یہ روپے واپس کرنے کے لیے اگر مجھے گھر کی چیزیں بھی بیچنا پڑیں تو میں بیچ دوں گا۔ بیگماں یقیناً میرے موافق ہو گی۔

یہ سوچ کر اُسے کچھ اطمینان ہوا۔ ایک گلاس پانی پینے سے اعصاب کو تقویت ہوئی اور وہ اندر آ کر لیٹ گیا۔ چھٹی کے باقی دنوں میں یہ خیال زیادہ تقویت پکڑ گیا اور وہ نماز پڑھتے وقت رو رو کر معافی مانگتا اور آئندہ کے لیے توبہ کرتا۔

آج وہی فائل اُس کے سامنے تھی جو ماضی کا آئینہ بنی اُس کے ضمیر کو کرید رہی تھی۔ اِس فائل کے ذریعے اب وہ اپنے گناہ کو مٹانا چاہتا تھا۔ بغیر مزید توقف کیے اُس نے لکھنا شروع کیا۔ نوٹ ختم کر کے فوراً فائل چپراسی کے حوالے کی تو گہرا اطمینان اُس کے دل میں ایسے پھیلنے لگا جیسے کپڑے کے تھان کو تہ در تہ پھیلایا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو پھر سے پہلے جیسا ایماندار بنتے ہوئے سوچنے لگا کہ بالآخر میں نے اپنا گندہ ماضی مٹا دیا ہے۔ اب میری زندگی پھر سے پہلے جیسی ہے۔ کرسی کی ٹیک پر پھیلتے ہوئے وہ بڑبڑایا کہ عاقل سے بات کرے گا اور پانچ سو روپے قسطوں میں ادا کرے گا۔ آدھی تنخواہ کافی ہو گی۔

مگر دوسرے دن اُسے پتہ چلا کہ عاقل نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ اس نے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"ہاں یار کیا کرتا۔ روز روز کی چخ چخ سے تو یہی بہتر تھا۔"

"مگر بھائی تم چخ چخ ختم کرنے کی کوشش کرتے ——— یہ بھلا کیا حل سوچا تم نے۔"

"چھوڑو میاں تم کیا نصیحت لے بیٹھے۔ بس اب جھگڑا ہی تو ختم کر دیا ہے۔"

"تو اب کیا کرو گے؟"

عاقل نے سگرٹ کا لمبا کش لے کر مسکراتے ہوئے دھواں چھوڑا اور وقفے کے بعد بولا تو کیا عورتوں کی کمی ہے دنیا میں جو بدصورتی ہمارا رج۔ وہ تو ہمیں بیوی کی موجودگی میں بھی مل جاتی تھیں۔ اب تو پھر آزادی ہوگی ——— مزے میں سب کچھ کریں گے۔ نہ روک نہ ٹوک۔"

"اور اُس بے چاری کا کیا بنے گا؟"

"بننا کیا ہے؟" عاقل لاپرواہی سے بولا "شادی کرے گی۔ یا کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی ——— یا پھر دن کو نمازیں پڑھا کرے گی اور رات کو چوری چوری کسی کے بستر میں گھس جایا کرے گی ——— آخر ہمسائے کس مرض کی دوا ہیں۔"

اور وہ خود ہی اپنے مذاق پر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

عبدالرحمان مزید کچھ کہے بغیر اُٹھ کر واپس چلا آیا۔ اُس نے سوچا روپوں کی بات کرنے کا ابھی موقع نہیں ہے۔ چند دن بعد دیکھا جائے گا۔

مگر ان چند دنوں میں فائل واپس آگئی اور اُس میں عاقل کی پارٹی کے خلاف فیصلہ ہو چکا تھا۔

دفتر کے وقت کے بعد عبدالرحمان کیبنٹ سے نکل کر فٹ پاتھ پر ہو لیا۔ لوگ سائیکلوں پر ٹیکسیوں پر اور پیدل جا رہے تھے۔ کلرکوں کی ایک ٹولی اُس سے آگے تھی۔ وہ ایک پیچھے تھے۔ مگر وہ ان سب سے بے پروا اپنے خیال میں گم جا رہا تھا۔ چوراہے میں پہنچ کر وہ دائیں مڑا اور سڑک عبور کر کے دوسرے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عاقل کی درشت آواز آئی "ٹھہرو دے۔"

عبدالرحمان نے ٹھٹھک کر اُس کے غضبناک چہرے کو دیکھا اور اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ سائیکل کو دوسرے ہاتھ میں تھام کر عاقل نے اُس کا بازو پکڑا اور جلدی جلدی اپنے ساتھ چلانے لگا۔

"رحمان۔ یہ کیا حرامزدگی ہے۔"

"کیوں۔ کیا ہوا؟" خشک حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

"مجھ سے پوچھتے ہو کیا ہوا حرامی ——— شرم نہ آئی تمہیں دھوکا دیتے۔ کمینے۔ رذیل روپے بھی لے کر ڈکار گئے اور سارا کیس بھی خراب کر دیا۔ تمہیں اتنی بھی شرم نہ آئی کہ میں نے مشکل وقت میں تمہاری مدد کی تھی۔ تمہیں دنیا میں رہنے کا ڈھنگ بتایا تھا۔ اُلٹا تم مجھی کو رَد دمنے لگ گئے۔ اب میں اُن لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"سنو عاقل، تم غصہ نہ ہو۔ میں روپے واپس کر دوں گا۔"

"روپے واپس کر دوں گا۔" عاقل غصّے میں الفاظ چبا کر بولا "اب میں تمہارے روپوں کا بھوکا ہوں۔ ہزار روپے کی اہمیت ہی کیا ہے۔ میں تو شام تک کئی ہزار اکٹھے کر لوں ——— میں تو ان روپوں پر تھوکتا بھی نہیں۔"

"تو پھر چاہتے کیا ہو؟"

"تم نے میرا اعتبار کھو دیا ——— میری ساکھ ضائع کر دی۔ ایک مضبوط پارٹی میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ میں تمہارے سودے کو چاٹوں گا۔ آخر زبان بھی تو کوئی شے ہے۔ اصول بھی کوئی چیز ہے۔ میں اب ان لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"عاقل بھائی" عبدالرحمان بہت نرم تھا "اسی اصول نے تو میرے ہاتھ روک لیے اور تم مجھے رشوت پر مجبور کر کے نہ جانے کس اصول پر یقین رکھتے ہو۔"

"میں تمہارے اصولوں کی بات نہیں کر رہا اور نہ تم وہ سکھاؤ مجھے۔ میں بزدلی کو اصول کا نام نہیں دیتا۔ جس میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی وہ مردہ اور بے جان اصولوں کا سہارا لیتا ہے۔ میں تو ان اصولوں کی بات کر رہا ہوں جو زندہ رہ کر زندگی کے کاروبار کرنے والے لوگوں کے اصول ہیں۔ تم مجھے کیا اصول سکھاؤ گے۔"

بحث بڑھتی گئی۔ عبدالرحمان نے اپنی الجھن کا ذکر کیا۔ اپنے بچے کی موت قدرت کی طرف سے سزا بیان کی۔ اپنی توبہ کا ذکر کیا۔ مگر عاقل ان تمام دلائل کو فضول اور لغو بات کہتا تھا۔ اس کی ساکھ بگڑ گئی تھی۔ کاروبار خراب ہو گیا تھا اور یہ اس کے لیے سب سے بڑا صدمہ تھا۔ بالآخر عبدالرحمان بھی غصّے میں آ گیا۔

"جب میں تمہارے روپے واپس کر رہا ہوں۔ تو تمہیں اور کیا چاہیے ——— میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

عاقل نے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھا۔ اور بولا "باز جیسے تیسے کیس کو دوبارہ ٹھیک کراؤ۔ یا پھر تمہیں دنیا کے سامنے ایسی سزا ملنی چاہیے کہ میری ساکھ قائم رہ جائے۔"

اور وہ پیڈل پر پاؤں رکھ کر یہ جا وہ جا۔

"ایسی تیسی اس کی" عبدالرحمان نے دانت بھینچ کر کہا اور سڑک پر زور سے تھوک دیا۔

اگلے چار پانچ روز ان دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ عبدالرحمان کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ معاملہ کو ختم کرے مگر عاقل کوئی موقع ہی نہ دیتا تھا اور مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

ایک دن دفتر آنے کے گھنٹہ بھر بعد جب عبدالرحمان سر جھکائے کام کر رہا تھا کہ تین سپاہی اور ایک مجسٹریٹ اندر داخل ہوئے۔ وہ سیدھے عاقل کی میز کی طرف بڑھے۔ ان کے ساتھ وہی آدمی تھا جس نے ہزار روپے عبدالرحمان کو دیے تھے۔ اس نے مجسٹریٹ کے استفسار پر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"ذرا ٹھہرو تو مسٹر" مجسٹریٹ نے کہا۔

عبدالرحمان متوحش سا کھڑا ہو گیا۔ ایک سپاہی نے گدّی اٹھائی تو نیچے دو ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ مجسٹریٹ نے فوراً تھما

اور اُن پر اپنے دستخط شناخت کیے۔ عبدالرحمان نے پھٹی پھٹی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور پھر چلّا کر بولا:۔

"یہ سب دھوکا ہے۔ یہ نوٹ کسی نے یہاں رکھ دیے ہیں۔"

مگر مجسٹریٹ نے سپاہیوں کو اشارا کیا اور اُنھوں نے آگے بڑھ کر عبدالرحمان کو پکڑ لیا۔ اُس نے زخمی پرندے کی طرح آخری دفعہ نگاہ اُٹھائی۔

عاقل اپنی کُرسی پر نہ تھا۔

وارڈر نے تالے میں کنجی گھمائی تو اندر والے قیدی اُٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گئے اور نئے قیدی کو دیکھنے لگے۔

دروازے کی چُولوں سے چیخ نکلی اور وہ بھاری گھسیٹ سے نفوڑا کھل گیا۔

"اندر!" وارڈر نے عبدالرحمان کو اشارا کیا۔ وہ جھجکا ـــــ ایک قدم اُٹھایا ـــــ پھر رُکا ـــــ مگر وارڈر نے کندھا پکڑ کر اندر دھکیل دیا۔

"ارے چل اندر ـــــ جو آتا ہے یہاں نخرے ہی کرتا ہے۔"

پھر پیچھے سے بند ہونے والے آہنی دروازے کے زوردار دھکے نے اُسے آگے کمرے میں دھکیل دیا۔

کنجی گھماتے ہوئے وارڈر چلّایا "اب آرام سے رہنا سوّرو۔ خبردار جو اس کو کسی بُری حرکت پہ اکسایا۔"

کمرے میں دو اور قیدی تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ نیا قیدی لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی دیوار تک پہنچا اور دونوں ہاتھ فرش پر ٹکا کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہ سیدھی نظروں سے فرش کو دیکھتا رہا۔ کمرے کے ماحول یا اُس میں رہنے والوں کا جائزہ لینے کی کوئی حرکت نہ کی۔ بلکہ بادل کی گرج سُن کر تالاب میں دَب جانے والی مچھلی کی طرح چُپکا بیٹھا ہوا زمین کو دیکھتا رہا۔

ان دونوں قیدیوں میں سے ایک لحیم شحیم تنومند جاٹ تھا۔ جس کے سات فٹ اُونچے جسم کی اُٹھان میانوالی کے میدانوں میں اُٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں موٹی موٹی، لال لال، باہر کو اُبلتی تھیں۔ سر پہ لمبے لمبے بال تھے اور چوڑی ہڈیوں والے کرخت چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں، چوڑے بدنما ناک کے آر پار پھیلی تھیں۔ اُس کے ماتھے پر بڑا سا زخم کا نشان تھا۔ اور قیدیوں کا لباس اُس کے جسم پر عجب طریقے سے ٹنگا کھڑا تھا۔ اُونچے پاجامے میں سے بالوں بھری کسی ہوئی پنڈلیاں ایک دم باہر نکل آتی تھیں اور آستینوں میں سے نیلی نیلی رگوں والے موٹے بازو نکل کر ہڈی دار بھاری ہاتھوں کو سنبھالے تھے۔ جن کی موٹی گانٹھ دار اُنگلیوں میں چاندی کے چھلّے پڑے تھے۔ اُس کی عمر کوئی چالیس برس کے قریب ہوگی مگر کاٹھی بے حد مضبوط تھی۔ اور وہ اپنے تنومند مضبوط جسم کو ایک دم سیدھا رکھے لال آنکھوں سے نئے قیدی کو دلچسپی سے گھور رہا تھا۔

دُوسرا چوبیس پچیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ بھی قیدیوں والا دھاری دار لباس پہنے تھا۔ اور بالوں کے انداز اور وضع قطع سے بوچی قبیلے کا نظر آتا تھا۔ اُس کے چہرے پر مُجرموں والی کرختگی نہ تھی۔ بلکہ ایسے کسان کی پُرخلوص معصومیت تھی جو بڑی لگن سے کھیتوں پر سے کام کر کے آ رہا ہو۔ سیدھی ستواں ناک چھوٹا سا تھا، اور تیز چمکدار آنکھیں جن میں سنجیدگی کا ہلکا سا رنگ جھلک مار رہا تھا۔

اُس کمرے کے دونوں مکینوں نے قیدی کو غور سے دیکھا جو دیوار سے لگا ہوا اپنے دائیں بیٹھک کی طرح گھٹنوں بیٹھا تھا۔ پھر اُنھوں نے مسکرا کر ایک دُوسرے کو دیکھا۔ پہلا آدمی بے تکلفی سے آگے بڑھا اور اُس نے بے تکلفی سے عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ سمٹ کر سہمی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں بابو" وہ پیلے پیلے دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا "جیل تو مردوں کا سسرال ہے۔ میاں ہنستے آؤ۔ اور ہنستے جاؤ۔"

دُوسرا قیدی بھی ہنسنے لگا۔ تکلف کی ہنسی۔ جیسے واقف ہونا چاہتا ہو اور پہلے قیدی کی بات میں اپنے آپ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہو۔

عبدالرحمان نے کوئی جواب نہ دیا۔

"شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔" وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھوں کے درمیان منہ سے تھوک دیا "پر اگر وہ چاہیے پہلے دن ہنسنے کے لیے۔"

"کیوں رنگے؟" دُوسرا قیدی بولا "تو بھی ہنسا تھا پہلے دن۔"

رنگے نے اپنی ران پر زور سے ہاتھ مارا اور فخریہ مسکراہٹ سے بولا۔

"ہنسنا تو مجھے یاد نہیں۔ مگر یہ ہے کہ آیا بڑے ٹھاٹھ سے تھا۔ جس دن فیصلہ سُنانا تھا میں دُھلے ہوئے کپڑے پہن کر گیا تھا۔ لمبی ڈب والی دھوتی۔ ابرق والی پگڑی۔ کندھے پر نئی چادر۔ اور پاؤں میں نیا کھوسہ۔ وکیل ماں کے یار نے جھوٹ بولا تھا کہ تم بری ہو جاؤ گے۔ وہاں جج پُوما ہی جلا انسن نکلا۔ اُس نے اکٹھے سات سال ٹھوک ڈالے۔"

رنگے نے کہیں سے بدبودار تمباکو نکالا اور ہاتھ میں مسلنا شروع کیا۔ بات کرتے وقت وہ ساتھ ساتھ کنکھیوں سے عبدالرحمان کا بھی جائزہ لیتا رہا۔

"دروازے میں سے اندر آیا تو ادھر کرنے والی کوٹھڑی سے کوئی قیدی پکارا "لو بھئی دُولہا آگیا" میں نے بھی شرارت سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا ——— مگر یار یہ ٹھاٹھ دو دن میں ختم ہو گئے۔ (اُس نے تمباکو کو ہتھیلی پر زور سے مسلا) سوؤر کے بچوں نے وہ کپڑے اُتروا کر یہ کفن پہنا دیا۔"

اُس نے نفرت سے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ فرش میں سے ایک ڈھیلی اینٹ اُٹھا کر نیچے سے چلم نکال لی۔ پھر اینٹ برابر جما دی اور چلم کو زمین پر جھاڑ کر اُس میں تمباکو بھرنے لگا۔

"اور رنگے۔ دُوسری بار کیسے آیا؟" دُوسرے قیدی نے پُوچھا۔

"بس پھر تو واقعی دُولہا تھا۔ چھٹے مہینے ہی لوٹ آیا تھا واپس۔ ابھی باقی سنگی یہیں تھے۔ رحیم دراکی نے تو اپنی کوٹھڑی سے ہی نعرے لگانے شروع کر دیے۔ باقی بھی واقف قیدیوں نے خوب شور کیا۔"

رنگا ہنسنے لگا پھر مُنہ موڑ کر عبدالرحمان سے کہنے لگا "ابھی نئے ہو بابو ——— جب اگلی دفعہ آؤ گے تو خوب گزرے

میں ہو گئے۔"

عبدالرحمان نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

"اللہ سے خیر مانگ رہتے ہو" دُوسرا قیدی عبدالرحمان کے تاثرات کو تاڑ کر بولا "وہ کیوں آئے گا دوبارہ۔"

رنگا پھر ران پر ہاتھ مار کر چلایا "آئے گا ــــــ ضرور آئے گا ــــــ جو ایک دفعہ آیا وہ آتا ہی رہے گا ــــــ تمہارے بھی خالی دھرے ہی ہیں ــــــ دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں آتے وارث میاں؟"

عبدالرحمان کے دل میں غصّے اور نفرت کے اُبال اُٹھنے لگے۔ وہ بڑی ناگواری سے اُٹھ کر دروازے کے پاس آگیا اور سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔

باہر بہت بڑا صحن تھا جس کے چاروں طرف کوٹھڑیاں تھیں۔ بعض کے دروازوں پر سلاخیں تھیں۔ بعض پر کواڑ لگے تھے اور اُن میں سر کی اُونچائی کے برابر چھ اِنچ قطر کا سوراخ تھا۔ جس میں سے باہر جھانکا جا سکتا تھا۔ ایک طرف اُونچی اُونچی سلاخوں کا جنگلہ تھا جس میں دیسا ہی دروازہ کھلتا تھا۔ اُس کے پاس سپاہی رائفل کندھے پر رکھے کھڑا تھا۔ یہی جنگلہ آگے جاکر جیل کے دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ جہاں قوی ہیکل کواڑ بڑے بڑے تالوں اور کنڈوں کو سینے پر سجائے کھڑے تھے۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر ٹین کی چادروں میں گھری ہوئی ٹٹیاں تھیں۔ صحن میں خاکی کپڑے پہنے اِکا دُکا وارڈر گھوم رہے تھے۔

اندر دونوں قیدی باتیں کر رہے تھے۔ مگر عبدالرحمان کا دھیان اُدھر نہ تھا۔ وُہ اِس نئے ماحول میں بے حد شرمندہ محسوس کرتا تھا اپنی گراوٹ اور زوال پر حیران ہو رہا تھا۔ دُوسری کوٹھڑیوں کے دروازوں میں سے قیدی اپنے دھاری دار لباس میں نظر آتے تو اُسے یقین نہ آتا کہ اتنی پاک اور صاف زندگی گزارنے کے بعد بھی وہ ایسی جگہ پر آ سکتا ہے۔ جو عام دُنیا کے نزدیک بد ترین جگہ تھی۔

جیل کے باہر سپاہیوں کے ٹار روم کے پاس گھنٹی پر ٹن ٹن پانچ بجے۔

"پانچ بج گئے۔ آج مُلاقات نہیں ہوگی۔" وارث بولا۔

"کیا بات ہے؟" رنگے نے کہا "بہت یاد آتے ہیں گھر والے جو منگل کو ہی جمعرات کی آس کرنے لگا۔"

پھر رنگا بھی آ کر عبدالرحمان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ کبھی صحن میں دیکھنے لگتا اور کبھی اپنی لال لال آنکھوں سے اُوپر سے نیچے تک عبدالرحمان کا جائزہ لیتا۔ اُس کا مُنہ مسلسل کُھلا تھا اور اندر سے پیلے دانت اور لال زبان کا ٹکڑا سا جھلکتا نظر آتا تھا۔ اُس کی سانس کے ساتھ عبدالرحمان کو بدبو کے بھبکے آنے لگے۔

"بابو۔ تم نے کیا کیا ہے؟"

عبدالرحمان نے مجرب ہو کر دیکھا اور چپ ہو گیا۔

"شرماتا کاہے کا اس میں ــــــ یہاں تو ہم سب ایک جیسے ہیں۔"

"ایک جیسے" یہ سُن کر عبدالرحمان کے دل پر چھری سی چل گئی کہ وہ مکروہ، بدنما اور عادی مُجرم اُسے اپنے ساتھ ملا رہا

ہے۔ وہ [illegible] کھڑا ہو گیا۔

"ہے ہے" وہ ہنسا "مت بتاؤ۔ پریڈ پر گارڈ اُٹھا کر کھڑے ہو گے تو سب پتہ چل جائے گا۔"

عبدالرحمان نے تھوڑا توقف کیا پھر بولا۔

"مجھ پر الزام تھا۔"

"ہے ہے ہے" رنگا دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ پھر اس کے کندھے پر دھپ مار کر بولا "اُستاد ہمیں کیوں اُڑاتے ہو۔ افسروں کے سامنے تو ایسی بات ٹھیک ہے۔ معائنہ ہوتا ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ مگر یہاں تو سچ بتا دو۔"

عبدالرحمان نے سوچا کہ اب جیل آ کر جھوٹ سچ کا کیا قصہ۔ جب سزا ہو چکی تو مقدمہ کیسا بھی کیوں نہ ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قدرے رُک کر بولا۔

"رشوت لی تھی۔"

"ہے ہے ہے۔" رنگا پھر ہنسنے لگا۔

"رشوت!" وہ طنز سے چلایا۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر اس نے ہاتھ رانوں میں دے لیے اور جھک کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ہنسی ہنسی میں اُسے کھانسی شروع ہو گئی۔ اور وہ لال منہ سے تھوک کے ذرے اُڑاتا دوسرے قیدی وارث کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا کندھا پکڑ کر بے صبری سے کھانستا رہا کہ ٹھیک ہونے پر بات کر سکے۔ بالآخر کھانسی رُکی تو بولا۔

"رشوت!" وہ پھر ہنسا "یہ بھی کوئی جرم ہے —— اسے جرم کرنا تھا تو کوئی مردوں والا کام —— زور دوں والا —— کسی کا خون کرتے۔ کسی کی لڑکی نکالتے۔ کہیں ڈاکہ ڈالتے —— یہ کیا بزدلوں والا جرم ہے۔"

اس نے حقارت سے مونچھیں ہلائیں اور [illegible] بستر پر بیٹھ گیا۔ جیسے فخر سے اس نے لاتعلقی اختیار کر لی۔ جیسے عبدالرحمان بہت ہی کم تر شے ہو۔ پھر وہیں سے اس نے نخوت سے پوچھا "اور سزا کتنی ہوئی؟"

"ڈیڑھ سال۔" بغیر مڑے عبدالرحمان نے جواب دیا۔

"اچھا۔ اچھا۔ یہ تو کافی ہے۔" وہ ایسے بولا جیسے اس کے دل میں عبدالرحمان کا کھویا ہوا وقار تھوڑا بڑھ گیا ہو۔ جب خوش ہوا تو وہ بولا "یار چرس کھاؤ گے؟"

عبدالرحمان نے انکساری سے منہ موڑ لیا۔ رنگے نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا اور پھر ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ بالکل ہی گھٹیا ہے یہ شخص اور کپڑے کی پوٹلی میں سے چرس ڈھونڈنے لگا۔

اس دوران میں وارث چپ رہا تھا۔ اب وہ بھی آ کر رحمان کے پاس کھڑا ہو گیا اور اُسے جیل کے قواعد اور کوٹھڑیوں کے متعلق بتانے لگا۔ عبدالرحمان کبھی کوئی سوال کر دیتا ورنہ وہ زیادہ تر خود ہی بتاتا رہا۔ اُسے یہاں چار مہینے ہو گئے تھے اور وہ جانتا تھا کہ کون سا وارڈر اچھا ہے۔ کون سا بد دماغ ہے۔ قیدی افسران کیسے ہیں۔ جیلر کا رویہ کیسا ہے۔ ان سب کے بارہ میں وہ آپ

ہی آپ عبدالرحمان کو تکتا رہا۔

صحن میں جھنکار سی ہوئی۔ جنگلے کے اندر والا دروازہ کھلا۔ دو سپاہی ایک قیدی کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ دبلا پتلا دبلا سا آدمی تھا مگر اس کے بیڑیاں لگی ہوئی تھی۔ ٹخنوں پر لوہے کے چھلے پنڈلی کے گرد اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ ان سے لگی ہوئی دو سیاہ سی سلاخیں ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اوپر کو چڑھتی ہوئی رانوں کی جڑ تک پہنچ جاتی تھیں اور کمر سے ذرا نیچے رانوں کے گرد لوہے کے بڑے بڑے چھلے ان کو سنبھالے تھے۔ وہ ٹانگیں چوڑی کر کے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور ہاتھوں میں لٹکی ہوئی ہتھکڑیاں جب کسی چھلے سے ٹکراتیں تو دھات بجنے کی آواز سارے صحن میں پھیل جاتی۔ ایک کوٹھڑی سے ایک قیدی نے کوئی جملہ کسا تو اس نے مسکرا کر سر ہلا کر جواب دیا۔

"اسے بیڑیاں کیوں پہنائی ہیں؟"

"یہ بڑا خود سر قیدی ہے۔ قواعد کی خلاف ورزی کی ہو گی تو جیلر نے دو چار روز کے لیے بیڑیاں پہنا دی ہوں گی۔"

"اب کہاں گیا تھا؟"

"دن بھر مشقت کے لیے کہیں لے گئے ہوں گے۔ شاید چکی والے کمرے میں یا جیل کا کنواں چلوانے کے لیے۔ اب شام کو واپس لا رہے ہیں۔"

ایک وارڈر نے سوراخ والے دروازے کا کواڑ کھولا تو وارث کہنے لگا "اچھا! اسے تو قید تنہائی بھی ہے۔ ان کوٹھڑیوں میں صرف وہی رکھے جاتے ہیں۔"

عبدالرحمان خوفزدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھ رہا تھا۔ اور وہ سب کچھ توڑ تاڑ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ دروازہ چھوڑ کر کمرے کے اندر جا سکتا۔ خاموش کھڑا وہ صحن کو گھورتا رہا۔

اتنے میں گھنٹی بجی۔

"یا علی مدد" رنگے نے انگڑائی لی۔

"چلو برتن سنبھالو!" وارث بولا "کھانا لینے جانا ہے۔"

"تم جاؤ۔ مجھے بھوک نہیں۔" عبدالرحمان نے کہا۔

"یہاں یہ نہیں چلے گا۔ روٹی لے لو۔ ورنہ وارڈر آ کر بڑی غلیظ گالیاں دے گا۔"

"ہونہہ" عبدالرحمان کو ایک دم غصہ آ گیا "تو مجھے گالی دینا نہیں آتی کیا؟"

وارث ہنسا اور ہمدردی سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ایسے خیال نکال دو دل سے۔ ورنہ بیڑیاں لگ جائیں گی۔"

وارڈر نے آ کر دروازے میں کنجی گھمائی اور شور کرتا ہوا چلا۔

"جلدی نکلو۔ جلدی جلدی کرو۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

رنگے نے دانت پیس کر زیر لب ایک گالی دی اور برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔

وارث نے عبدالرحمان کی طرف دیکھا۔

"اللہ قسم میرا دل بالکل نہیں کرتا۔"

"تو نہ کھا۔ لے آ اِدھر ——— مجھے اُلٹ دینا۔"

جنگلے کے پاس تین ٹرالیاں کھڑی تھیں۔ ایک کے پاس روٹیاں تھیں۔ دوسرے کے پاس دال کی دیگ اور تیسرے نے تھال میں اُبلے ہوئے چاول رکھے تھے۔ عبدالرحمان اپنا مٹی کا پیالہ اور مٹی کی پلیٹ لے کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ قیدی ایک دوسرے کو ٹہوکے مارتے۔ فحش مذاق کرتے اور ماں اور بہن کے حوالوں سے چیخ پکار کرتے قدم بہ قدم ٹرالیوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور عبدالرحمان کا دل مُنہ کو آ رہا تھا۔

کمرے میں آ کر اُس نے اپنا کھانا اسے اُلٹ دیا۔ مگر اس نے وارث کو تھمادی اور بولا۔

"پہلے دن نہ کھانا مشکل ہے ——— زیادہ نہیں تو ایک نوالہ تو لے لو۔"

عبدالرحمان نے بہتیرا انکار کیا۔ مگر دونوں کے اصرار پر اس نے ایک نوالہ مُنہ میں ڈالا۔ بدمزہ، پھیکا ذائقہ اُس کی زبان پر پھیل گیا۔ گھبرا کر مُنہ چلایا تو ریت کی کرکری دانتوں کے نیچے بجنے لگی۔ وہ تھو تھو کرتا موری کی طرف بھاگا۔

رنگا مُنہ اونچا اُٹھا کر قہقہے لگانے لگا۔

عبدالرحمان نے بکسے سے بوسیدہ کمبلوں کا بنڈل کھولا جو اسے اندر آتے وقت سٹور سے ملا تھا۔ ایک کمبل پھٹا ہوا تھا۔ اس کی تہہ جما کر اور لٹکے ہوئے چیتھڑوں کے کنارے دبا کر زمین پر بچھایا۔ سرہانے کی طرف کنارا اُٹھا کر نیچے دو اینٹیں رکھیں۔ دوسرا کمبل اوڑھنے کو رکھ لیا اور وہ پھر بیٹھ گیا۔

رنگا دیا جلانے لگا۔ تیلی کو ماچس پر رگڑتے ہی تڑ تڑ کی آواز آئی۔ چھوٹا سا شعلہ بے ترتیبی سے کانپا۔ تھوڑا لہرا کر سیدھا ہوا تو کاجل کی لمبی لکیر بتدریج باریک ہوتی ہوئی فضا میں کالی اوڑھنی اُٹھنے لگی۔ ماچس جیب میں ڈالتے ہوئے رنگا بڑبڑایا۔

"حرام زادے ہر شے میں بے ایمانی کرتے ہیں۔ کڑوے تیل کی ملاوٹ سے ان کی ماں کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ حرامی اب اس میں پانی بھی ملانے لگے ہیں۔"

عبدالرحمان سیدھا بیٹھا رہا۔ دروازے کے باہر سامنے والی کوٹھڑیاں صحن کے پار نظر آ رہی تھیں اور اُن کی چھت کے اُوپر سے نیلے آسمان کی گز بھر لمبی اور فٹ بھر چوڑی مستطیل نظر آ رہی تھی۔ اُس کی یکسانیت کسی وقت چشم زدن میں گزر جانے والے پرندے سے ذرا دیر کو ٹوٹ جاتی۔ آہستہ آہستہ اُس کا رنگ بدلنے لگا۔ نیلے رنگ پر سیاہی بکھرنے لگی۔ اور مستطیل بڑھتی ہوئی سیاہی میں ڈوبنے لگی جیسے تاریک سینما ہال میں سفید پردے کا ہلکا سا ہیولا نظر آئے۔ کچھ دیر بعد اُس کے کونے میں اکیلا ستارہ اُبھر آیا۔ جو آہستہ آہستہ دوسرے مدھم ستاروں کے جھرمٹ میں گھر گیا۔

دیا جلنے سے کمرے میں گھٹن سی ہونے لگی اور گندے تیل کی کڑواہٹ فضا میں رچ گئی۔ اس سے عبدالرحمان کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا سوچتا رہا۔ اُس نے زندگی ——— میں ایسی شام کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ایک

ارہ ہی آدمی تھا جو سزا اور جزا کے فارمولوں سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ چند ماہ پیشتر جب اُس نے تھانے میں ایک ملزم
ے دیکھا تھا تو بیوی سے کافی دیر بحث کرتا رہا کہ اس حالت پر پہنچنے کی تمام تر ذمہ داری اُس آدمی کے اعمال پر تھی۔ تاریک
کے کونے میں روشنی کا اسے پر ننظریں گاڑے اپنی بیوی کے ساتھ وہ بحث یاد آنے لگی ——— پھر وہ سوچنے لگا
رمیں رشوت نہ لیتا تو یہاں کیوں آتا؟ ——— اس خیال میں گمن وہ کتنی ہی دیر بیٹا رہا مگر پھر خیالات نے پلٹا کھایا۔
لیکن ہمارے ملک میں اور بھی ہزاروں لوگ جو رشوت لیتے ہیں۔ بلکہ آج کل اکثریت ایسے لوگوں کی ہے اور اُن کی ساری
یاں اسی چکر میں کٹتی ہیں۔ مگر انھیں کبھی سزا نہیں ہوئی۔ اور میں نے ایک دفعہ ضرورت سے مجبور ہو کر رشوت لی تو مجھے سزا
——— کہتے ہیں اللہ نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ مگر میری کیا مدد کی؟ گڈو کو پھوڑا نہ نکلتا تو واقعات کا یہ سلسلہ ہی شروع
تا۔ اگر وہ نہ مرتا اور مجھے وہ بھیانک خواب نظر نہ آتا تو میں عاقل کو ناراض نہ کرتا اور اگر بالفرض گڈو کو مرنا ہی تھا تو خدا ایک دو
پہلے مار دیتا تاکہ میں رشوت لینے سے بچ جاتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ یا اُس دن دفتر میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اتفاقیہ
دیز نہ ملتا اور میلا ایان اُس کی مثال دیکھ کر نہ ڈولتا۔ خدا نے واقعی میری کوئی مدد نہ کی۔ بلکہ پہلے پھوڑا نکالا اور پھر یکے بعد دیگرے
ب حالات اس طرح چلائے کہ میں یہاں آن پہنچا ——— مگر مجھے رشوت لینے کی سزا تو نہیں ملی۔ اگر میں لیتا جاتا اور عاقل
ے کام کرتا رہتا تو میرے بھی مزے تھے۔ نہ یہ جیل ہوتی۔ نہ عمر کی خواری تھی۔ یہ سب کچھ تو مجھے توبہ کرنے کی وجہ سے ملا ہے۔
ند میاں بھی عجیب ہے۔ ایک طرف سے توبہ کرنے کو کہتا ہے اور دوسری طرف سے توبہ کرنے پر خواری دیتا ہے۔ مجھے رشوت
لینے پر سزا نہیں ملی۔ اُس سے تو میری مشکلیں حل ہو گئی تھیں۔ قرض اتر گیا تھا۔ دوائیوں کے لیے کافی پیسے پاس تھے۔ پریشانی کم ہو
ئی تھی۔ مصیبت تو پڑی توبہ کرنے پر۔ جب اپنی ملازمت، عزت اور آزادی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا......

"دھپ ———"

"ماں کا خصم ——— یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا۔" رنگا بڑبڑایا۔

"کیا ہوا رنگے؟" وارث سر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

"بچھو تھا!"

"مار ڈالا؟"

"ہاں ایک ہی چپت میں چپٹا ہو گیا۔"

"ہتھیلی سے مار ڈالا؟" عبدالرحمن حیران تھا۔

"تو اور کیا؟" وہ کمبل اوڑھتے ہوئے بولا "ہر کھیل کا طریقہ ہوتا ہے بابو ——— بچھو کو اُوپر سے کمر پہ چپت مارو۔ سانپ
کو پیچھے سے سر پر لاٹھی مارو اور مرد کو سامنے سے رانوں کے درمیان چھرا مارو تو دُوسرا سانس نہیں نکلتا ——— ہے ہے ہے۔"

وہ اس فلسفے پر خود ہی مزا لیتا ہوا ہنسنے لگا۔

"اور عورت کو کیسے مارو گے؟" وارث شریر انداز میں بولا۔

رنگے نے موٹی سی گالی دے کر کروٹ بدلی۔

وارث نے لمبا سا قہقہہ لگایا اور عبدالرحمان کی طرف منہ اٹھا کر بولا۔

"ابے یار۔ رنگے نے اپنی بیوی کو مار ڈالا تھا۔"

مگر عبدالرحمان کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش لیٹ گیا۔

——— توبہ

——— توبہ

——— توبہ

عبدالرحمان سوچ رہا تھا توبہ کرنے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ماضی کی لغزشیں پاک ہو جاتی ہیں ——— اللہ میاں کے ہاں ہوتے ہوں گے۔ مگر دنیا میں تو ہم توبہ چھوڑ کچھ بھی کر لیں ہمارا ماضی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا ——— ہم اپنا تو ماضی کے گزرے غلام ہیں اور قدم قدم پر سوسائٹی ہمیں وقت کے آئینے دکھاتی ہے۔ جس میں ہمارے ماضی کی لغزشیں بھیانک سایوں کی طرح مجسم رہتی ہیں۔ سات تہ خانوں کی پوشیدہ گہرائیوں میں چھپ چھپ کر کاٹے ہوئے لمحے وقت کے پرچھیوں اور بازاروں کی چھتوں سے ہمیں پکارنے لگ جاتے ہیں۔ زندگی کے فساد راہی بھی بعض اوقات حالات کے بوجھ سے پھسل جاتے ہیں۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا اور حالات کے الجھاؤ ہماری عقل کو ماؤف کر کے ایسا فعل کروا دیتے ہیں جس سے ہم سارا عمر دامن بچاتے رہے تھے۔ اپنی مرضی کے خلاف ہمارے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ لگ جاتا ہے۔ نادم ہو کر اسے نیک نیتی سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ماضی کے نقوش وقت کی کروٹ بھی نہیں مٹا سکتی۔ اور ان کلنک کے ٹیکوں کو اپنا جسمانی عضو سمجھ کر ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تب یہ ایک ٹیکہ سینکڑوں نئے ٹیکوں کے حالات پیدا کر دیتا ہے اور ماضی کا طلسم گزر جانے کے بعد ہانک دعووں کے باوجود قدم قدم پر مستقبل کی گود میں سے نکل کر ہماری راہوں میں حائل ہو جاتا ہے۔

او خدا ——— ہم اتنے بے بس کیوں ہیں؟ . . .

ہم کیا ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ . . . .

ہماری زندگیوں میں ہمارا اپنا دخل کیوں اتنا کم ہے۔ حالانکہ ہر شے پر ہماری نیت کی چھاپ لگی جاتی ہے؟؟

ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ اگر ریل گاڑی کے ڈبے کی طرح ہمیں حالات کی پٹڑیوں پر چلنا ہے اور کسی ان دیکھے ہاتھ نے کانٹے بدلنے ہیں؟؟ . . . .

سوچتے سوچتے عبدالرحمان اونگھ گیا۔

جیل کی زندگی بالکل سپاٹ۔ یکساں اور بے کیف تھی۔ لٹھے کے پیسے ہوئے تھان کی طرح۔ وہی صبح، وہی شام، وہی چہرے وہی گالیاں اور ننگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی تھم گئی ہو۔ اور اس میں کوئی تنوع یا تبدیلی نہ ہوتی ہو۔ جیل میں سحر کے قریب

ی تھے۔ اُن میں سے کبھی کوئی رہا ہو کر جانے والا ہوتا تو چند گرمجوشی سے معانقے ہو جاتے اور چند آنکھوں میں جگنو چمک جاتے ۔
ئی نیا قیدی آتا تو وہ ایک دن تک دُوسرے قیدی آپس میں چہ میگوئیاں کرتے مگر اُس کے سارے حالات پتہ چل جانے پر یہ جوش
ختم ہو جاتا۔ شروع شروع میں عبدالرحمان کو جب کھلنے پر، پریڈ پر، طبی معائنہ کرواتے وقت یا مشقت کے موقع پر دُوسرے
دیوں سے ملنے کا موقع ملتا تو اُس کا دل کچھ بہل جاتا۔ مگر پھر یہ بھی باسی معلوم ہونے لگا۔ سبھی دن پُورے کر رہے تھے۔ جس سے بات
ر۔ وہ یا تو پچھلی یادوں سے تڑپ رہا ہوتا یا آئندہ کے لیے رہائی کے دن گن رہا ہوتا۔ بے کاری نے اُن کے تخیلات کو تیز تر کر دیا
ا اور یادوں کو پکنے پر پھوٹنے والے زخم کی طرح دیکھتے۔ اس میں اُن کو اپنے دشمن قوی ہیکل نظر آنے اور دوست بونے سے لگتے۔ جیل
ں رہنے والوں کو دُوسرے لوگوں کی سرد مہری، بے مروتی اور زیادتیوں کا جتنا احساس ہوتا ہے۔ باہر گھومنے والوں میں کبھی نہیں ہو
تا اور ہر ایک سے ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار سُن سُن کر عبدالرحمان اُکتا گیا تھا۔

سٹاف کے لوگ قدرے مختلف تھے۔ مگر وہ اپنی شان میں مگن رہتے۔ قیدیوں کو وہ بالکل بے جان مشینوں کی طرح سمجھتے جو
میوں، ڈانٹ، سختی اور بعض اوقات گھونسوں سے چلتی ہیں۔ اُن کے خیال میں قیدی اس قابل ہی نہ تھا کہ اُس سے اچھا سلوک کیا
ئے اور ایک عجیب طرح کی بے جان اور حیوانی فرعونیت جیل کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔

وہاں پندرہ کے قریب وارڈر تھے۔ سپاہیوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ پانچ قیدی افسر تھے جو لمبی سزاؤں پر تھے
ر جیل کے قواعد کی پابندی کرنے کی وجہ سے اب دُوسروں پر نگرانی کے لیے مقرر تھے۔ ایک جیلر تھا اور ایک سپرنٹنڈنٹ
ر کبھی کبھار معائنہ پر آیا کرتا۔

عبدالرحمان کا سبھی وارڈروں سے وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا تھا۔ دو ایک کی ڈیوٹی اُس کا کمرہ کھولنے، بند کرنے اور باہر
ھینے پر تھی۔ دو ایک چکی والے کمرے میں تعینات ہوتے تھے۔ ایک آدھ جیل کے باغ میں کام کرواتا تھا۔ ایک ٹیموں پر تعینات
تھا۔ چٹائی بُننے والے کمرے اور بان بٹنے والے درخت پر بھی ایک دو نگرانی کرتے تھے۔ چند ایک ملاقات کے وقت
گرانی کرتے۔

اُن سب کا کردار حیرت انگیز طور پر ایک سا تھا۔ یہ درست ہے کہ اُن میں غصیلے بھی تھے اور نرم دل بھی۔ خاموش طبیعت
بھی تھے اور باتونی بھی۔ مگر قیدیوں سے تعلقات کے معاملے میں سب ایسے تھے جیسے ایک ہی کارخانے سے بنے ہوئے جوتے
ہوں۔ خاکی کپڑے، چمڑے کی پیٹیاں کمر کے گرد۔ اُن میں پیتل کی پلیٹ پر "وارڈر" لکھا ہوا۔ اور چہروں پر ایک سی سختی۔ اُن کے کردار
کا پہلو ذائقہ عبدالرحمان کو اُس دن ملا جب شروع شروع میں جمعرات کے روز بیگمان پہلی دفعہ ملاقات کو آئی۔

وُہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وارث پچھلے گھنٹہ بھر سے اپنا مُنہ دھو کر تیار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کا ماموں اور ممانی ملنے آیا کرتے
تھے۔ وُہ ہر جمعرات کو بلاناغہ آتے اور وارث صبح ہی سے بے کل رہنے لگتا تھا۔ رنگا حسبِ معمول اپنے پھٹے ہوئے بستر پر بیٹھا تھا۔
اور چرس کے نشے میں دھت تھا۔ عبدالرحمان نے وارث سے پوچھا۔

"آج اس کی ملاقات نہیں آئے گی؟"

رنگے نے ہلکی سی گالی دے کر کروٹ بدلی۔

وارث نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور عبدالرحمان کی طرف منہ اٹھا کر بولا

"ابے یار۔ رنگے نے اپنی محبوبہ کو مار ڈالا تھا؟"

مگر عبدالرحمان کی طرف سے جواب نہ ملنے پر خاموش بیٹھ گیا۔

——— توبہ

——— توبہ

——— توبہ

عبدالرحمان سوچ رہا تھا توبہ کرنے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ماضی کی لغزشیں پاک ہو جاتی ہیں ——— اللہ میاں سے ان ہوتے ہوں گے۔ مگر دنیا میں تو ہم توبہ چھوڑ کچھ بھی کر لیں ہمارا ماضی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا ——— ہم تو قہر ماضی کے گزرے غلام ہیں اور قدم قدم پر سوسائٹی ہمیں وقت کے آئینے دکھاتی ہے۔ جس میں ہمارے ماضی کی لغزشیں بھیانک سایوں کی طرح جھوم رہی ہیں۔ سات تہ خانوں کی پوشیدہ گہرائیوں میں چھپ چھپ کر کاٹے ہوئے وقت کے لمحے پر گلیوں اور بازاروں کی چھتوں سے ہمیں پکار نے لگ جاتے ہیں۔ زندگی کے فساد راہی بھی بعض اوقات حالات کے بوجھ سے پھسل جاتے ہیں۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا اور حالات کے بہاؤ ہمیں مشتعل کر کے ایسا فعل کروا دیتے ہیں جس سے ہم ساری عمر دامن بچاتے رہے تھے۔ اپنی مرضی کے خلاف ہمارے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ لگ جاتا ہے۔ نادم ہو کر اسے نیک نیتی سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ماضی کے نقوش وقت کی کروٹ بھی نہیں مٹا سکتی۔ اور اس کلنک کے ٹیکوں کو اپنا جسمانی عضو سمجھ کر ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تب یہ ایک ٹیکہ سیکڑوں نئے ٹیکوں کے حالات پیدا کر دیتا ہے اور ماضی کا طلسم گزر جانے کے بعد بانگ دعووں کے باوجود قدم قدم پر مستقبل کی گود میں سے نکل کر ہماری راہوں میں حائل ہو جاتا ہے۔

او خدا ——— ہم اتنے بے بس کیوں ہیں؟ . . .

ہم کیا ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ . . . .

ہماری زندگیوں میں ہمارا اپنا دخل کیوں اتنا کم ہے۔ حالانکہ ہر شے پر ہماری نیت کی چھاپ لگی جاتی ہے؟؟

ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ اگر ریل گاڑی کے ڈبے کی طرح ہمیں حالات کی پٹڑیوں پر چلنا ہے اور کسی ان دیکھے ہاتھ نے کانٹے بدلنے ہیں؟؟ . . . . .

سوچتے سوچتے عبدالرحمان اونگھ گیا۔

جیل کی زندگی بالکل سپاٹ۔ یکساں اور بے کیف تھی۔ کھٹے کے پیسے ہوئے تھان کی طرح۔ وہی صبح، وہی شام، وہی چہرے وہی گالیاں اور مشقت۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی تھم گئی ہو۔ اور اس میں کوئی تنوع یا تبدیلی نہ ہوتی ہو۔ جیل میں سوا کے قریب

ری تھے۔ اُن میں سے کبھی کوئی رہا ہو کر جانے والا ہوتا تو چند گرمجوشی سے معانقے ہو جاتے اور چند آنکھوں میں جگنو چمک جاتے ۔
رئی نیا قیدی آتا تو وہ ایک دو دن تک دُوسرے قیدی آپس میں چہ میگوئیاں کرتے مگر اُس کے سارے حالات پتہ چل جانے پر یہ جوش
ختم ہو جاتا۔ شروع شروع میں عبدالرحمان کو جب کھانے پر، پریڈ پر، طبّی معائنہ کرواتے وقت یا مشقت کے موقع پر دُوسرے
یوں سے ملنے کا موقعہ ملتا تو اُس کا دل کچھ بہل جاتا۔ مگر پھر یہ بھی باسی معلوم ہونے لگا۔ سبھی دن پُورے کر رہے تھے۔ جس سے بات
وہ یا تو پچھلی یادوں سے تڑپ رہا ہوتا یا آئندہ کے لیے رہائی کے دن گن رہا ہوتا۔ بے کاری نے اُن کے تخیلات کو تیز تر کر دیا
ا اور یادوں کو پردے پر چلنے والی فلم کی طرح دیکھتے۔ اس میں اُن کو اپنے دشمن دیو ہیکل نظر آتے اور دوست بونے سے لگتے۔ جیل
ں رہنے والوں کو دُوسرے لوگوں کی سرد مہری، بے مروّتی اور زیادتیوں کا جتنا احساس ہوتا ہے۔ باہر گھومنے والوں میں کبھی نہیں ہو
تا اور ہر ایک سے ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار سُن سُن کر عبدالرحمان اُکتا گیا تھا۔

شاف کے لوگ قدرے مختلف تھے۔ مگر وہ اپنی شان میں مگن رہتے۔ قیدیوں کو وہ بالکل بے جان مشینوں کی طرح سمجھتے، جو
ایں، ڈانٹ، سختی اور بعض اوقات گھونسوں سے چلتی ہیں۔ اُن کے خیال میں قیدی اس قابل ہی نہ تھا کہ اُس سے اچھا سلوک کیا
ے اور ایک عجیب طرح کی بے جان اور حیوانی فرعونیت جیل کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔

وہاں پندرہ کے قریب وارڈر تھے۔ سپاہیوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ پانچ قیدی افسر تھے جو لمبی سزائیں بھگتتے
ر جیل کے قواعد کی پابندی کرنے کی وجہ سے اب دُوسروں پر نگرانی کے لیے مقرر تھے۔ ایک جیلر تھا اور ایک سپرنٹنڈنٹ
ر کبھی کبھار معائنہ پر آیا کرتا۔

عبدالرحمان کا سبھی وارڈروں سے وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا تھا۔ دو ایک کی ڈیوٹی اُس کا کمرہ کھولنے، بند کرنے اور باہر
ھینے پر تھی۔ دو ایک چکی والے کمرے میں تعینات ہوتے تھے۔ ایک آدھ جیل کے باغ میں کام کرواتا تھا۔ ایک ٹیلیوں پر تعینات
ھا۔ چٹائی بُننے والے کمرے اور بان بٹنے والے درخت پر بھی ایک دو نگرانی کرتے تھے۔ چند ایک ملاقات کے وقت
گرانی کرتے۔

اُن سب کا کردار حیرت انگیز طور پر ایک سا تھا۔ یہ درست ہے کہ اُن میں غصیلے بھی تھے اور نرم دل بھی۔ خاموش طبیعت
بھی تھے اور باتونی بھی۔ مگر قیدیوں سے تعلقات کے معاملے میں سب ایسے تھے جیسے ایک ہی کارخانے سے بنے ہوئے جوتے
ہوں۔ خاکی کپڑے، چمڑے کی پیٹیاں کمر کے گرد۔ اُن میں پیتل کی پلیٹ پر "وارڈر" لکھا ہوا۔ اور چہروں پر ایک سی سختی۔ اُن کے کردار
کا پہلا ذائقہ عبدالرحمان کو اُس دن ملا جب شروع شروع میں جمعرات کے روز بیگمان پہلی دفعہ ملاقات کو آئی۔

وُہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وارث پچھلے گھنٹہ بھر سے اپنا مُنہ دھو کر تیار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کا ماموں اور ممانی ملنے آ رہے
تھے۔ وُہ ہر جمعرات کو ملاقات کو آتے اور وارث صبح ہی سے بے کل رہنے لگتا تھا۔ رنگا حسب معمول اپنے پھٹے ہوئے بستر پر بیٹھا تھا۔
اور چرس کے نشے میں دھت تھا۔ عبدالرحمان نے وارث سے پُوچھا۔

"اِس کی ملاقات نہیں آئے گی؟"

تو ملاقات کے بعد اُچک کر بیٹھا تھا" اسے کیا ہے بیٹے والا —— یہ تو چرس سے ملاقات کر سکتا۔"

اور اُس نے دیکھا کہ وہ عام دنوں کی نسبت بہت زیادہ چرس پی رہا تھا۔ بعد میں اُسے پتہ چلا کہ ہر ملاقات کے روز وہ اتنی چرس پیتا تھا کہ نشے میں اُسے پتہ نہ چلتا تھا کہ ملاقات سے واپس آتے تو اُس کے منہ سے رالیں ٹپک رہی ہوتیں۔ اور گھڑے کی مدت پر بیٹھا ہوتا یا بستر میں اوندھا لیٹا رو رہا ہوتا یا ویسے ہی ہنس رہا ہوتا۔ وارث نے عبدالرحمان کو خاص طور پر منع کیا تھا کہ اسے جب بہت سے ملنے مت بلایا کرو۔ یا نشے میں اُس کے قریب نہ جایا کرو کیونکہ وہ بہت دکھی ہوتا ہے۔

اُس دن وارث ملاقات کر جا چکا تھا۔ عبدالرحمان بیٹھا تھا کہ اتنے میں قیدی افسر نمبر ۱۳ آیا اور عبدالرحمان سے کہنے لگا۔

"تمہاری ملاقات آئی ہے۔"

عبدالرحمان ہڑبڑا کر اٹھا۔ اسے توقع نہ تھی کہ کوئی اُسے اتنی جلدی ملنے آجائے گا۔ وہ کپڑے ٹھیک کرتا ہوا جوتا پہننے لگا۔

نمبر ۱۳ نے ہنس کر رنگے کو مخاطب کیا۔

"اوئے رنگے۔ تیری ملاقات کرنے والا کوئی نہیں؟"

رنگے کی لال لال نشے بھری آنکھوں میں ایک لہر دوڑ گئی۔ جیسے درد کی ٹیس ہو۔ پھر وہ بڑی ہی زہریلی ہنسی میں بولا۔

"تم اپنی ماں کو بھیج دو۔ سب کے سامنے ایسی ملاقات کروں گا کہ اُسے ساری عمر اتنا مزہ نہ آیا ہو گا۔"

نمبر ۱۳ ایک دم ٹھٹک گیا۔ پھر وہ دانت پیس کر بولا "حرامزادے، سُور کے بچے" اور آگے بڑھ کر زور دار تھپڑ رنگے کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر دُہرا ہوا اور پھر اُس نے نہ جانے کیسے پانی کے گھڑے کا ڈھکن اٹھایا اور وحشت سے نمبر ۱۳ کو دے مارا۔ اُس نے چکر کھا کر بچنا چاہا مگر وہ اُس کی کنپٹی پر شدت سے لگا۔

عبدالرحمان وہاں سے بگٹٹ بھاگا۔

بڑے دروازے کے پاس لوہے کے جنگلے پر ہجوم سا تھا۔ قیدی جنگلے کے اندر سلاخوں سے چمٹ کر کھڑے تھے۔ جنگلے کی دوسری طرف پولیس والوں کے پہرے میں ملاقاتی تھے۔ عبدالرحمان نے جنگلے کے دو اطراف چکر لگایا۔ مگر کوئی نہ ملا۔ تیسری طرف گیا تو بگیاں نقاب اٹھائے کھڑی تھی۔ جنگلے کی دو سلاخوں کو بھینچتے ہوئے عبدالرحمان نے اپنا چہرہ اُن پر جما دیا اور زور سے روتے ہوئے پکارا۔

"بیگی!!"

بگیاں نے دیکھا اور لپک کر آگے آئی۔ عبدالرحمان نے بے اختیار ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالا۔ بگیاں نے جھپٹ کر ہاتھ اور اپنی تر بتر آنکھوں سے لگایا۔

"اوں ہوں" ایک وارڈر سختی سے بولا "دور دور کھڑے رہو۔ یہ چومنے کی جگہ نہیں۔"

بگیاں نے سہم کر دیکھا اور پھر جیسے سہا ہوا بچہ اپنے پیارے کھلونے کو چھننے کے ڈر سے آہستہ آہستہ بے دلی سے چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح اُس نے عبدالرحمان کا ہاتھ چھوڑا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ عبدالرحمان کچھ

پر اندرونی تکلیف سے کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔

بیگماں اور عبدالرحمان خاموش کھڑے ایک دُوسرے کو تکتے رہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہ بولا۔ وارڈر کی فہمائش نے دونوں کو گنگ کر دیا تھا۔ بیگماں نے عبدالرحمان کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ دھاری دار لباس کے بے ڈھنگے پن کو دیکھا۔ بغیر کالر کے گلے میں سے اُس کی گردن لٹکتی ہوئی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اور پاجامہ ٹخنوں سے کتنا ہی اُونچا تھا۔ کہنی سے ذرا نیچے آستین پھٹی ہوئی تھی اور قمیص کے دو بٹن غائب تھے۔

بیگماں کے نتھنے کانپے۔ آنکھیں بھر نے لگیں اور پھر آنسوؤں کے تار اُس کے بھرے بھرے خُوبصورت گالوں پر بہنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ بُرقع کے پلّو سے پونچھ ڈالتی۔ اُس کی بھیگی آنکھیں مستقل طور پر عبدالرحمان پر گڑی تھیں۔ اور وہ کبھی زمین کو تکنے لگتا۔ کبھی بیوی کو اور کبھی دُوسرے ملاقاتیوں کو۔

گھنٹی بجنے لگی۔ ملاقاتیوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔

"چلو جلدی کرو سب لوگ۔" وارڈر چلایا۔

بیگماں نے جلدی سے برقع میں لپٹا ہوا تھیلا نکالا اور عبدالرحمان کی طرف بڑھایا۔

وارڈر لپکا آیا۔ "ٹھہرو، پہلے دکھاؤ، کیا ہے؟"

تھیلا کھول کر وہ چیزیں دیکھنے لگا۔ سگریٹ کا خالی ڈبہ گھی سے بھرا ہوا۔ پڑیا میں کھانڈ۔ اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا سوجی کا خشک حلوہ۔ بسکٹ کا ڈبہ۔

"یہ نہیں چلے گا۔ واپس لے جاؤ" اُس نے حلوہ بیگماں کو دے دیا۔ بڑی مایوسی سے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے بے دلی سے واپس لے لیا۔

بسکٹ کا ڈبہ اپنی جیب میں گھسیڑتے ہوئے وارڈر نے تھیلے کے خالی کونوں میں جھانکا۔

"سگریٹ نہیں ہیں؟"

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" عبدالرحمان نے غصّے میں کہا۔

"مگر میں تو پیتا ہوں۔" اُس نے مسکرا کر کہا "اگلی دفعہ ضرور لانا بی بی۔" اور پرے ہٹ گیا۔

"یہ بسکٹ کیوں لے گیا؟" بیگماں نے پوچھا۔

"یہ لوگ ہیں ہی سُوؤ" خاوند غصّہ دباتے ہوئے بولا "تم ادھر دو حلوہ مجھے۔ اگر اس نے ذرا چوں بھی کی تو میں بسکٹوں کی رپورٹ کردوں گا۔"

بیگماں نے چُھپا کر حلوہ آگے کیا۔ مگر وارڈر نے دیکھ لیا لیکن کچھ کہنے کی بجائے اُس نے مُنہ دُوسری طرف موڑ لیا۔

عبدالرحمان کوٹھڑی میں پہنچا تو وہاں ایک ہجوم تھا۔ جیلر اور ہیڈ وارڈر بیچ میں رنگے کھڑے تھے۔ دو تین وارڈر۔ قیدی نمبردار اور دو ایک اور قیدی افسر تھے۔ پولیس کے دو مسلح سپاہی بالکل جیلر کے پاس کھڑے تھے۔ جیلر کا لمبا گز کا اُونچا لمبا دھا

کنپٹیوں پر سفید بال اور چہرے کا کھرا کھرا متین نقش تھا۔ سنجیدہ پیشانی میں چمکدار آنکھیں تھیں۔ بھاری [illegible]
سے داخل ہوتے ہی نمبر ۱۳ چلایا۔

"یہ آگیا ہے جناب ——— اس کے سامنے رنگے نے مجھ کو مارا تھا۔"

جیلر بھرپور نظروں سے عبدالرحمان کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بجلیاں سی ملنے کے بعد کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔ اور جذبات کی اندرونی یلغار کی وجہ سے کسی بیرونی چیز میں دلچسپی لینے کے قابل نہ تھا۔ جیلر اپنی آنکھوں سے اس کے چہرے کو ٹٹولتا رہا۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ہیڈ وارڈر نے ڈپٹ کر عبدالرحمان سے پوچھا۔

"کیوں بے نمبرہ نے مارا تھا اس کو؟"

عبدالرحمان کچھ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا اور اپنے بستر کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں" نمبر ۱۳ چلایا۔

عبدالرحمان پھر بھی خاموش رہا۔ مگر رنگا چلایا" ابے کیوں تنگ کرتے ہو اسے میں نے مارا تھا ——— مارا تھا ——— مارا تھا ——— اور اب بھی سو دفعہ ماروں گا۔"

"دیکھیے جناب" نمبر ۱۳ دونوں ہاتھ پھیلا کر جیلر کو اپیل کرتا ہوا بولا۔

جیلر ناخوشی سے رنگے کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ماتحت کی طرف دیکھا اور بولا" اس نے چرس کہاں سے لی ہے"
سب وارڈر اور قیدی افسر چپ ہو کر دبک گئے۔

"بولتے کیوں نہیں؟" وہ ڈپٹ کر بولا۔

"حضور ہمیں کیا پتہ۔ ملاقاتیوں سے منگوا لیتے ہیں۔"

"اور تم کیا سوئے رہتے ہو۔ دیکھ نہیں سکتے۔ کون کیا لا رہا ہے؟"

جیلر چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "نمبرہ کو چھ دن کے لیے بیڑی پہنا دو اور دو ہفتے دو زانہ چکی دانے کی ڈیوٹی لگاؤ ——— اندر کی بھی چھٹی نہیں۔"

باہر نکلتے وقت نمبر ۱۳ نے مڑ کر فتح مندانہ انداز میں رنگے کو دیکھا تو اس نے بازو تان کر گھونسے سے بڑی کوشش ضبط کر کے اسے بچا دیا۔

رنگے کی لال لال آنکھیں اور چڑھا ہوا سانس دیکھ کر عبدالرحمان وارث کے پاس پہنچ گیا۔

"اسے چرس کیسے مل جاتی ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وارڈروں کو خوش رکھو تو یہاں سب کچھ مل جاتا ہے" اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

اس کے بعد رنگے کو روز چکی پر لے جاتے اور جب وہ شام کو واپس آتا تو تھکن سے نڈھال ہوتا۔ اس کا مضبوط توانا دھوپ میں مرجھائے ہوئے پتوں کی طرح ڈھیلا پڑا ہوتا۔ ناہموار قدم پڑنے سے بیڑیاں بج اٹھتیں۔ اور وہ گھسیٹ کر

بستر میں گرا دیتا۔ دونوں ہاتھوں کو منہ سے لگے رکھ کر اس میں پھونکیں مارتا رہتا۔ نہ وارث سے بات کرتا نہ عبدالرحمان سے۔ بلکہ ی سے بولتا رہتا۔ اس کا کھانا بھی باہر سے یہی لوگ لے آتے۔ رات کو اُسے کروٹ بدلنے میں تکلیف ہوتی تو بیڑی کی جھنکار کے ساتھ ں کراہیوں کی بڑبڑاہٹ بھی سنائی دیتی۔

رنگے کی مشقت ختم ہوگئی۔ بیڑیاں اُتر گئیں۔ مگر وہ نڈھال نڈھال اور مردہ ہوگیا تھا۔ سارا دن لیٹا ہوا کراہتا رہتا۔ اُس کے ت راتوں سے بھیگے رہتے۔ آنکھوں سے پانی بہتا رہتا۔ وہ نہ منہ دھوتا، نہ کھانے میں دلچسپی لیتا۔ کئی دن سے صبح کے وقت اجابت کے لیے بھی نہ گیا۔

ایک دن عبدالرحمان نے وارث سے کہا "رنگے کی طبیعت خراب ہے۔ اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔" وارث ہنسا۔ "نمبر ۱۳ نے دوسرے وارڈروں سے کہہ کر اس کی چرس اندر آنا بند کر دی ہے بتک یہ اُس سے معافی نہ مانگے۔"

عبدالرحمان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس کے بعد جب کبھی نمبر ۱۳ نظر آتا۔ تو عبدالرحمان نفرت سے اُس کے چیچک زدہ چہرے کو دیکھتا رہتا۔ وہ آنکھوں سے بھینگا اور لمبوترے چہرے پر نوکدار ٹھوڑی بہت گھناؤنی لگتی تھی۔

دو تین روز بعد وہ کوٹھڑی کے آگے سے گزر رہا تھا کہ رنگے نے دونوں ہاتھ سلاخوں سے باہر نکال کر جوڑ دیئے اور بڑی شامد سے اُسے دیکھنے لگا۔ مگر وہ بڑی اکڑ سے "ہونہہ" کر کے گزر گیا۔

مگر شام کو وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو رنگے نے اس کے پاؤں پکڑ لیے "دیکھ اب جانے دے۔ رب کی قسم میرا سارا جسم سوگیا ہے۔"

"ابھی تو تیرا جسم سویا ہے۔" وہ بڑی نفرت اور رعب سے بولا۔ "مگر تیرا دماغ تب ٹھیک ہوگا۔ جب تُو اپنی ماں کے ساتھ سوئے گا۔"

رنگے نے اُس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ اُس کی پھیلی ہوئی مونچھیں ٹخنوں کو چھونے لگیں "سو دوں گا —— ضرور سو دوں گا —— تو جو چاہے گا، کر دوں گا —— مگر اب خدا کے لیے جانے دے۔"

نمبر ۱۳ نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے سیدھا کیا اور بولا "چل جیٹھ ادھر اب اور خبردار جو ایسی حرکت پھر کبھی کی۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر بند مٹھی اندر کی۔ رنگے نے ایسے جھپٹ کر پکڑا جیسے چیل ہوا میں اچھالے ہوئے گوشت پر آتی ہے۔ اور سیدھا اپنے بستر پر پہنچا۔

رات کو جب رنگے کو چرس کا نشہ چڑھا تو وہ بازو ہوا میں جھلا کر کہہ رہا تھا۔

"اوئے یار۔ چند دن چکی پیسوا کر یہ سالے میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ میں تو کئی سال لگاتار چکی چلا سکتا ہوں۔ جس میں ان سب کی ماں کا بھی آٹا کر دوں۔"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبدالرحمان جیل کی زندگی کا عادی ہوگیا تھا۔ جب اُسے بھی مشقت پر لگا دیا گیا تو اُس کے دن جلدی جلدی کٹنے لگے۔ جیلر نے ایک دن اُس کا لمبا انٹرویو لیا تھا اور اُس کے بعد تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اُسے سخت مشقت سے چھٹی دے دی تھی۔ چنانچہ وہ چکی والے کمرے میں کبھی نہیں گیا۔ مگر چٹائی بننا اور بان بٹنے کا کام کرتا رہا۔ ایک آدھ دفعہ ترکھان کے ساتھ اُس نے چارپائی بنانے کی کوشش بھی کی۔ مگر جیلر ادھر سے گزر رہا تھا اور اُس نے منع کر دیا تھا۔ تب وہ زیادہ وقت باغ میں پانی لگانے، نلائی کرنے اور کھاد بچھانے پر صرف کیا کرتا۔

جیل میں جب کبھی قیدی پہلی بار ملتے۔ وہ گفتگو شروع کرنے کے لیے ایک دُوسرے سے یہی پُوچھتے کہ جرم کیا ہے اور کتنی سزا ہوئی تھی۔ اکثر لوگ ایسے بھی تھے جو دُوسری تیسری مرتبہ جیل آئے تھے۔ عبدالرحمان اُن قیدیوں سے بات چیت کرتا رہتا تھا لیکن وہ لوگ انتہائی طور پر خود پسند ہو گئے تھے۔ اور اُن کی بات کا موضوع ہمیشہ اپنی ذات، اپنا جرم اور اپنے ساتھ دُنیا کی زیادتی ہوتا تھا۔

عبدالرحمان کے دل میں بھی ایک ہی خلش رہتی تھی۔ وہ کسی وقت تو اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا تھا کہ اُس نے رشوت لی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اُس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ عاقل نے دھوکے سے اُس کی کرسی پر رقم رکھوا کر اُسے قید کرایا ہے اور وہ بے گناہ ہے۔ اگر اُس نے ایک دفعہ رشوت لی بھی تھی تو خدا نے اُس جرم کے تناسب سے بہت زیادہ سزا دی ہے۔ اور قسمت نے اُن پر ظلم کیا ہے اس لیے دُوسرے قیدیوں سے بات کرتے وقت وہ ہمیشہ یہ جانچنے کی کوشش کرتا کہ آیا وہ بھی جیل میں آنے کے مستحق تھے یا اُس کی طرح اُن پر بھی ظلم ہوا ہے۔

قیدیوں کی سرگزشت سے جو کوائف اُس نے اکٹھے کیے تھے۔ اُن سے بنیادی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر حالات کا شکار تھے۔ ایسے حالات جو اُن کے اختیار سے باہر تھے۔ کبھی جائیداد کا جھگڑا۔ کہیں عورت کی رقابت یا اُس کے پیچھے غیرت کے تقاضوں کا قضیہ اور کہیں حالات کے مسلسل دباؤ سے پیدا شدہ پریشانی کے زیر اثر لوگوں کو کوئی غلط قدم جیل کی طرف لے جاتا۔ عبدالرحمان اکثر قیدیوں سے یہ سوال کرتا کہ اُنھوں نے جرم کیوں کیا ہے، تو اُسے عجیب و غریب جواب ملے تھے۔ ویسے تو انسانی فطرت کے عین مطابق کوئی بھی تسلیم نہ کرتا تھا کہ قصور اُس کا ہے۔ لیکن وُہ یہ بتاتے تھے کہ وہ یا تو اُکسائے گئے تھے یا مجبور تھے۔ اور بسا اوقات اُن کی باتیں ٹھیک بھی لگتی تھیں۔

عبدالرحمان کے دل میں اکثر یہ سوال گونجتا کہ ہم اپنے اعمال کے کس حد تک ذمہ دار ہیں؟ ہم کتنے خود مختار ہیں؟

یہ درست ہے کہ خدا بار بار کہتا ہے کہ انسان کو ہم نے اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے کے لیے عقل دی ہے۔ اُس کے بعد وُہ خود ذمہ دار ہے ——— قانون بھی سزا دیتے وقت یہی پیش نظر رکھتا ہے کہ یہ آدمی اگر چاہتا تو جرم سے بچ سکتا تھا اور اُس نے جان بوجھ کر کیا ہے۔

مگر کیا یہ درست ہے؟

نہیں ——— ہر شخص کی طبیعت مختلف ہے۔ اُس کا ماحول مختلف ہے اور انسان کا طرزِ عمل طبیعت اور ماحول کے

زکی جھنکار ہے ـــــــ طبیعت بنانے میں انسان کا اپنا کوئی دخل نہیں اور نہ ہی ماحول کا تعین وہ اپنی مرضی سے کرتا
۔ بلکہ جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے کم و بیش ساری زندگی اُسی میں گزارتا ہے ـــــــ تو پھر انسان کو اس جھنکار کا ذمہ دا
ں ٹھہرایا جائے؟ . . . . . . سزا اور جزا کا کیا جواز ہے ؟؟ یہاں دُنیا میں جیل کیوں بنائی گئی اور آخرت میں دوزخ کس

ے؟؟؟

جب عبدالرحمان کو ایسے خیالات بہت تنگ کرتے تو وہ چاہتا کسی سے اس موضوع پر بات کرے مگر اُسے کوئی
ں نہ ملتا تو وہ تنگ ہونے لگتا۔ وارث گو ذہین تھا مگر وہ جاہل تھا اور ان مسائل کے بارے میں اتنی گہرائی تک نہ جا سکتا تھا۔
ہی وہ غنیمت تھا اور عبدالرحمان کا زیادہ تر اُس کے ساتھ دل لگتا تھا۔ وہ متین سنجیدہ اور خاموش طبیعت تھا۔ اور اُس نے
نے آپ کو کبھی بھی مجرموں میں سے نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ جیل سے باہر جا کر با عزت زندگی گزارنے کی باتیں کیا کرتا۔ اُس کے پچھلے حالات
ں کر عبدالرحمان کو اُس سے گہری ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ اکٹھے بان بٹ رہے تھے۔ جب وارث نے اُسے اپنی کہانی سُنائی۔
. . . وہ درخت کے نیچے بان بٹ رہے تھے۔ عبدالرحمان کو یہ کام کرتے دُوسرا دن تھا۔ مگر اُسے ابھی تک طریقہ نہ آیا تھا۔ اُس
ے ہاتھ بار بار کٹ جاتے اور بازوؤں پر کھجلی ہونے لگی۔

"تم تھوڑی دیر مجھے دیکھو۔" وارث نے ہمدردی سے کہا۔

پھر اُس نے اُسے بتایا کہ پُورا مروڑنے سے کچھ پہلے بان کی نئی مونجھیں سوٹوں میں اٹکا دو اور ہاتھ کو تھوڑا پانی لگا کر گھماؤ۔
ب ہاتھ سے اور رہیشے اٹھا رہوں تو رسی کے آخری سرے کو دانتوں میں پکڑ لو۔

"تم شاید یہ کام کافی عرصہ سے کر رہے ہو؟"

"ہوں! بہت مدّت سے۔"

"مگر جیل میں تو ابھی تمہیں چار مہینے ہی ہوئے ہیں۔"

"نہیں ـ میں اپنے گاؤں میں کبھی کبھار کیا کرتا تھا۔"

"وہاں تمہارا کاروبار یہی تھا کیا؟"

"نہیں۔ کھیتی باڑی کرتا تھا اور کسان کو ایسے اکثر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتے ہیں۔ میرے ماموں کی زمین کافی تھی۔ اور میں نے
سان عمر وہیں گزاری ہے۔"

"کیوں تمہارے والدین نہ تھے؟"

وارث چُپ ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ جواب دے یا نہ دے۔ پھر کافی دیر بعد بولا۔

"جب والدین کی آپس میں ناچاقی ہو تو بچوں کو دُوسروں کے ٹکڑوں پر ہی پلنا پڑتا ہے۔"

عبدالرحمان چُپ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس سے کچھ اور پُوچھنا مناسب ہو گا یا نہیں۔ مگر تھوڑے وقفے بعد وارث رسی کو بل دیتا
ہوا خود ہی بول پڑا۔

میری بڑی بہن دو سال کی تھی اور میں ابھی ماں کے پیٹ میں تھا جب وہ میرے باپ سے لڑ کر میرے ماموں کے ہاں آگئی
میں وہیں پیدا ہوا اور ہم دونوں بہن بھائی ماموں کے ہاں ہی پلے۔

"باپ کے پاس کبھی نہیں گئے؟"

"نہیں ـــــ اس نے دوسری شادی کر لی تھی۔"

"تو تمہاری والدہ کو اس نے طلاق دے دی ہوگی؟"

وارث نے نفی میں سر ہلایا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر وارث بولا "بابو تم ہمارے رواج نہیں جانتے۔ ہم بلوچستان کے قبائلی لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر لڑکا لڑکی کے والدین کو کافی رقم دیتا ہے جسے ولور کہتے ہیں۔ میری ماں کی شادی پر میرے باپ نے پندرہ ہزار روپیہ دیا تھا۔ اب وہ طلاق دینے کے لیے یہ روپیہ واپس مانگتا تھا۔"

"اور تمہارے ماموں دیتے نہ تھے؟"

"وہ کیسے دیتے۔ یہ ان کے والدین نے لیا تھا اور وہ مر چکے تھے۔"

"تو تمہاری والدہ کی نہ طلاق ہوئی نہ وہ کبھی واپس گئی۔"

"نہ ـــــ ہم اپنے ماموں کے پاس جوان ہوئے۔ ہمارے باپ نے ہمیں کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور ہم اپنے ماموں کے کھیتوں پر کام کرتے رہے اور بڑے ہوتے گئے ـــــ ہماری ماں ہمیں دیکھ دیکھ کر رویا کرتی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر..... وہ اسی طرح روتے روتے مر گئی۔"

عبدالرحمان خاموش ہو گیا۔ وارث رسی بانٹ رہا تھا۔ اتنے میں نمبر ۳ ادھر آیا۔ اس نے ان دونوں کو باتیں کرنے پر فہمائش کی۔ گالیاں دیں اور خبردار کیا کہ اگر شام تک انھوں نے پانچ گز بان نہ تیار کیا تو سزا ملے گی۔

مگر اس کی تنبیہ کے باوجود وارث نے کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے دل کی کھڑکی کھل گئی تھی اور اب یادیں اس کے روکے نہ رکتی تھیں۔ وہ باتیں کر کے دل ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے بات جاری رکھی۔

"تب میرے باپ نے دعویٰ کر دیا کہ دونوں بچے مجھے واپس ملنے چاہئیں۔"

"مگر کیوں؟ جب اس نے ساری عمر خبر نہ لی تو اب تمہاری ماں کے مرنے کے بعد کیوں آن ٹپکا؟"

"میری بہن جوان ہو گئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور اس کی شادی پر میرے باپ کو کئی ہزار روپے ولور مل جاتا ـــــ میرے ماموں کو بھی یہی لالچ تھا اور ویسے بھی ہم اس کے پاس رہے تھے۔ چنانچہ وہ مقدمہ لڑنے کو تیار ہو گیا۔ معاملہ جرگے کے پاس پہنچا۔ مگر ممبرانِ جرگہ میں سے دو نے میرے باپ سے پیسے کھائے اور باقیوں نے اس لیے حمایت کی کہ اگلی الیکشن میں وہ ان کو بہت سے ووٹ دلوا

سکتا تھا۔

"مگر تم لوگوں نے کچھ نہیں کہا؟"

"میں نے اور میری بہن نے صاف طور پر جرگہ کے سامنے کہا کہ ہم اپنے ماموں کے پاس رہنا چاہتے ہیں مگر انھوں نے والد کو جائز قرار دیا اور کہا کہ بچوں کو لے جاؤ ـــــ پھر جرگہ والوں اور دوسرے لوگوں کے سامنے میرا باپ میری بہن کو گھسیٹنے لگا۔ اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ باپ کے قدموں کو ہاتھ لگایا۔ جرگہ ممبروں کے سامنے اپنی اوڑھنی بچھائی ـــــ اور مجھے پکارا کہ اس وقت میرا بھائی بھی چھوڑ گیا مجھے ۔ ۔ ۔ ۔"

وارث ایک دم چپ ہو گیا۔

"پھر؟"

"پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ میری بہن تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت بے بس تھی ۔ ۔ ۔ ۔ میں غصہ میں پاگل ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہیں ایک بڑا پتھر اٹھا کر باپ کو دے مارا۔"

عبدالرحمان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

"اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ مگر قسمت اچھی تھی جان بچ گئی ـــــ اور مجھے قتل کرنے کی کوشش میں پانچ سال کی سزا ہو گئی۔"

"اور بہن؟"

"اسے باپ لے گیا۔"

"تمھارا باپ کبھی جیل میں ملنے آیا ہے تمھیں؟"

وارث نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔ "کبھی نہیں ـــــ اس کا ہم سے کیا واسطہ ـــــ ماموں اور ممانی ہر دفعہ ملنے آتے ہیں۔ اتنا لمبا سفر کر کے آتے ہیں۔ وہ بالکل میرے والدین کی طرح ہیں ـــــ سچ مچ کے والدین۔"

عبدالرحمان کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم نے غلطی کی۔ تمھیں غصہ میں بے قابو نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔"

"تم نے میری بہن کو بلکتے ہوئے نہیں دیکھا نا۔" وارث کام ہاتھ سے چھوڑ کر جوش سے بولا "نہ بھائی جی کر سوچا ہے ـــــ تم نے میرے باپ کی نظروں میں خباثت کی فتحمندانہ چمک نہیں دیکھی تھی ـــــ تم نے جرگہ ممبروں کو اپنی بے ایمانی چھپانے کے لیے قانون اور رواج پر اصرار کرتے نہیں دیکھا تھا نا ـــــ ہم بے بس تھے اور بے بسی میں غصہ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔"

"پھر بھی وہ تمھارا باپ تھا۔"

"اونہوں" اس نے سر ہلایا۔ "باپ تو وہ تھا جس نے ہماری پرورش کی۔ دوسرا آدمی تو ہمارے لیے اجنبی تھا۔ جو اپنے منافع کی خاطر ہمارے گھر کو جدا کرنا چاہتا تھا ـــــ تم میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے جو میں نے کیا تھا۔"

عبدالرحمان کو وارث کی بات کچھ سچ معلوم ہونے لگی۔ مگر وہ خاموش رہا۔

دونوں کافی دیر تک باہم بیٹھے رہے۔ وارث خاموش تھا۔ کبھی کبھی وقت اُس کے ہاتھ کانپ جاتے اور وہ ٹھنڈی آہ بھر لیتا۔ اپنے اپنے خیال میں گم وہ شام تک کام کرتے رہے۔

واپسی پر عبدالرحمان نے پوچھا "اور رنگے نے کیا کیا ہے؟"

وارث ہنسا "کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ اُس کا تو پیشہ ہی یہی ہے۔ کئی بار قید بھگت چکا ہے۔"

"پیشہ کیا؟"

"وہ میانوالی کا مشہور بدمعاش ہے۔ ساری عمر پولیس کے نمبر دس پر رہا۔ وہ لوگوں سے پیسے لے کر وارداتیں کرتا ہے۔ کوئی دشمنی کی وجہ سے دوسرے کو قتل کرنا چاہے۔ یا کسی کی بھینس کھلوانا چاہے یا فصل کو آگ لگوانا چاہے تو رنگا پیسے لے کر یہ سارے کام کر سکتا ہے۔"

"مگر وہ کیوں ایسا کرتا ہے؟"

"اُس سے پوچھو ——— مجھے کیا معلوم؟"

"تم اس روز کہہ رہے تھے کہ اُس نے اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا تھا۔ وہ کیا قصہ ہے؟"

"ساری بات کا تو مجھے بھی علم نہیں ——— میں نے بھی سُنا تھا۔ جب اُس سے پوچھا تو وہ گالیاں دینے لگا۔"

عبدالرحمان کو قید ہوئے تین مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں بگیاں چار دفعہ ملاقات کو آئی تھی۔ وہ ہر دفعہ اِدھر اُدھر کی خبریں سنا [illegible] تھی۔ پارو کی ماں اُس کا بہت خیال رکھتی تھی اور اس کی وجہ سے وہ تنہا اپنے مکان میں بے خوف رہ رہی تھی۔ اکثر اوقات وہ سوتی بھی اُسی کے گھر تھی۔ یا بعض اوقات اس کی بڑی لڑکی اُس کے پاس سو جاتی۔ ملاقات کا وقت بہت مختصر ہوتا تھا۔ اس لیے موٹی موٹی خبریں ہی چلتے چلتے سنا سکتی تھ[illegible]
جب وہ بگیاں مل کر چلی جاتی عبدالرحمان کے لیے رات کو سونا مشکل ہو جاتا۔ بستر پہ بیٹھے بیٹھے وہ آسمان کی چھوٹی سی مستطیل تکتا رہتا۔ اُس [illegible] شام کے وقت ایک روشن تارہ اُبھرتا۔ پھر آہستہ آہستہ جگہ بدلتا وہ آدھی رات تک مستطیل کے دوسرے کونے تک پہنچ جاتا اور جب اُس [illegible] آخری کرنیں دیوار کی اوٹ چھپ جاتیں تو عبدالرحمان صبح کا انتظار کرنے لگتا۔ دو گھنٹوں بعد مستطیل کا نچلا کنارا روشن ہونے لگتا۔ پھر یہ روشنی [illegible] پڑ جاتی اور اُس سے ٹھیک آدھا گھنٹہ بعد مستطیل کے سارے کنارے واضح ہونے لگتے۔ پھیکے تارے آہستہ آہستہ گھل جاتے اور ایک [illegible] چادر کناروں کے آرپار تن جاتی۔ پھر اس میں سے آسمان کا نیلا رنگ اُبھرنے لگتا۔ اور ایک روشن ٹھنڈی آہ بھر کر نیند سے بھاری سر کو [illegible] پرے مارتا۔ اور وہ چارپائی پہ کروٹیں لے کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔

اس دفعہ بگیاں آئی تو عبدالرحمان نے کہا۔ "بگی تم اب اپنے گاؤں چلی جاؤ۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ کب تک [illegible] خراب ہوگی۔"

"مگر گاؤں میں بھی میرا کون بیٹھا ہے۔" بگیاں کے والدین مر چکے تھے۔

"پھر بھی سارے جاننے والے لوگ ہیں۔"

"مگر اتنی دُور سے تمہیں دیکھنے بھی تو نہیں آ سکوں گی۔"

"تو کیا ہوا ——— اب تمہارے پاس کھانے کو بھی تو پیسے نہیں رہے ہوں گے۔"

"ہیں ابھی تو ——— میں نے کنگن بیچ ڈالا تھا۔"

"کون سا کنگن"، وہ چونکا۔

"وُہی والا" بیگماں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

سمجھ کر عبدالرحمان کا دل ڈوب سا گیا۔ مگر وہ چپ رہا۔

"کس کے ہاتھ بیچا؟" بالآخر اُس نے پوچھا۔

"میں نے تو پارو کی ماں کو دیا تھا ——— اُس نے اپنے میاں کو دیا ——— وہ لے کر سنار کے ہاں گیا تو وہاں عاقل بیٹھا تھا۔ اُس کے پوچھنے پر اُس نے بتایا تو وہ پارو کے خاوند کو لے کر سیدھا میرے پاس آ گیا ——— اور کہنے لگا ——— بھابی آپ زیور کیوں بیچتی ہیں ——— ہم کس دن کے لیے ہیں عبدالرحمان میرا دوست تھا۔ خواہ مخواہ لوگوں نے اُسے غلط فہمی کرا دی کہ میں نے اُس پر مقدمہ کرایا تھا۔ حالانکہ جب چھاپا پڑا تو میں وہاں موجود ہی نہ تھا۔ ——— اور پتہ نہیں کیا الم غلم کہتا رہا۔ بہرحال میں نے کچھ مدد لینے کے لیے انکار کر دیا تو بالآخر کہنے لگا۔ آپ بیچیں نہیں بلکہ گروی رکھیں۔ میرا ایک دوست ہے جو اچھے پیسے دے دے گا۔ جب رقم ہو چھڑوا لینا۔ پارو کے باپ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ اب اگر میں اُن دونوں کی بات نہ مانتی تو کس کے پاس جاتی۔ میرا اللہ کون سجن بیٹھا ہے ادھر۔ اس لیے میں نے کہا کہ مجھے نورو پے لا دو۔ چاہے گروی رکھوا دیو۔ اگلے روز عاقل نے مجھے دو سو پچاس روپے لا دیے۔"

"تو پھر تو گروی ہُوا تھا" عبدالرحمان نے اطمینان کا سانس لیا۔

"گروی کیا۔ بکا ہی سمجھو۔ ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں ہوں گے کہ اسے چھڑوا سکیں۔"

عبدالرحمان خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا "عاقل بہت ذلیل آدمی ہے اس کو منہ نہ لگایا کرو۔ پھر کبھی آئے تو صاف طور پر دھتکار دینا۔"

وقت ختم ہو گیا اور وہ پھر واپس مڑے۔ چلتے وقت عبدالرحمان نے پھر کہا "عاقل کو گھر نہ آنے دیا کرو۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں ہے۔"

عبدالرحمان کمرے میں آیا تو وارث بھی اسی وقت پہنچا۔ وہ بہت مضمحل اور اداس تھا۔ عبدالرحمان خود بھی بیگماں کے خیال میں کھویا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رنگے سے باتیں کرنے لگا جو اس روز حسب معمول ملاقات کا ذکر ملنے کو بہت چرس کے نشے میں تھا۔ اور اپنے بسی والے کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا۔ اُس کی پارٹی نے مویشیوں کی ایک منڈی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اور رات ہی رات میں سو مویشی ہنکا کر لے گئے تھے۔

"اور تم ڈاکے کہاں ڈالتے تھے؟" عبدالرحمان پوچھنے لگا۔

"تم ڈکیتی کہاں کرتے تھے بابو؟" اُس نے اُسی لہجے میں طنزیہ پوچھا۔ اور پھر اپنا قصہ شروع کر دیا۔

رات کو رنگا پورس سے بے سُدھ ہو کر سویا۔ مگر بیگیاں کے جانے کے بعد عبدالرحمان نہ سو سکا۔ اور وہ حسبِ معمول چھت کے چھوٹے ٹکڑے میں تاروں پر نظر جمائے سوچوں میں گم تھا۔ کافی رات گزر گئی۔ اتنے میں وارث پانی پینے اُٹھا۔

"ابھی تک سوئے نہیں تم؟" عبدالرحمان نے پوچھا۔

"نہیں۔"

عبدالرحمان کروٹ بدل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے گھڑا انڈیلنے کی آواز سُنی۔ پھر وارث کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے۔ بعد میں پیالہ زمین پر رکھا گیا۔ اور سرسراہٹ ہوئی مگر وہ آواز دوسری طرف جانے کی بجائے عبدالرحمان کی طرف بڑھی اور اُس نے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ محسوس کیا۔

"بابو:"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میری بہن کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔" وارث کا گلا رُندھ رہا تھا۔ "میرا باپ کر رہا ہے۔" وہ چند لمحے رُکا، پھر دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر بے اختیار رونے لگ گیا۔

آسمان کی مستطیل میں چاند چمک رہا تھا۔ اُس کی روشنی میں وارث بیٹھا تھا۔ سلاخوں کے سائے اُس کے جسم پر اوپر تلے پڑتے جاتے تھے۔ اور وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ عبدالرحمان اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ باوجود کوشش اور خواہش کے تسلی کے لیے کچھ نہ کہہ سکا۔ وارث پھر بولا۔

"وہ اُس گھر میں بیاہی جا رہی ہے۔ جس سے ہماری پُرانی دشمنی ہے۔ اور ——— میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

چاند کی روشنی میں سسکیاں بھرتا ہوا مرد عبدالرحمان کو ایک دم بچے کی طرح لگنے لگا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور آہستہ آہستہ اُس کی کمر پر تھپکی دینے لگا۔ اُس کی بے چارگی پر عبدالرحمان کا اپنا دل بھر آیا۔ مگر وہ ضبط کیے رہا۔

تھوڑی دیر بعد جب وارث سنبھلا تو اُس نے بتایا کہ آج وہ ملنے آیا تھا۔ اُس نے یہ تجویز کی ہے کہ اب وہ گھر کا مال ادھر کیا لڑکی کو اغوا کر لیں یا بارات پر حملہ کر دیں۔ پھر وہ دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مستطیل سے چاند غائب ہو گیا اور دن کی ہلکی ہلکی روشنی کے نشان نظر آنے لگے۔

دوسرے دن عبدالرحمان اور رنگا باغ میں کام کر رہے تھے۔ سبزی لگانے کے لیے کیاریاں تیار کرنا تھیں اور وہ چھوٹے کھرپے لیے بھربھری مٹی کی تھوڑی تھوڑی تہہ جماتے جاتے۔ پھر کھرپے کے چوڑے بلیڈ سے اُس کو کوٹ کر دباتے۔ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ اتنے میں نگران وارڈر ادھر آیا۔ ان کے کام کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا "نہ معلوم ان مزدوروں کو عقل کب آئے گی۔ ہر کام خود دیکھنا پڑتا ہے۔"

عبدالرحمان کام چھوڑ کر نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"اسے پاگلو۔ چاروں طرف سی کمڑی کر دی ہے۔ پانی کدھر سے آئے گا ـــــــ بناؤ اِس طرف سے راستہ۔"

رنگا بڑبڑاتے ہوئے ٹھیک کرنے لگا اور وہ مارڈر آگے جاکر پولیس کے سپاہی سے باتیں کرنے لگا جو بندوق زمین پر ٹکائے کھڑا تھا۔

رنگا پوچھنے لگا "بابو رات وارث کیوں رو رہا تھا؟"

وہ ہنسا "ارے تم جاگ رہے تھے؟"

"بس ایک آدھ دفعہ کی نیند میں سُنا تھا۔"

عبدالرحمان نے ساری بات سُنائی۔

"بزدل" اُس نے زمین پر تھوک دیا "مرد ہو کر روتا ہے۔"

"کیوں نہ روئے رنگے۔ اُسے اپنی بہن سے پیار ہے۔"

"پیار ہے تو کچھ کر کے دکھائے ـــــ جیل کے دروازے توڑے، بھاگ جائے ـــــ یہ رونے کا کیا تماشہ ہے۔"

عبدالرحمان مسکرایا "وہ تمہارے جیسا جری نہیں رنگے۔"

"جری نہیں تو کیا ہوا۔ مرد تو ہے۔"

"اب جیل میں رہ کر وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"نہیں کر سکتا تو مت روئے۔"

"رنگے تمہیں اپنی بہن سے پیار نہیں۔"

"میری بہن ہی نہیں۔"

عبدالرحمان کے دل میں پھر سے رنگے کو کریدنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ "اچھا یہ تو بتاؤ رنگے۔ تم نے کبھی کسی عورت سے پیار کیا ہے؟"

"چھوڑو بابو یہ باتیں۔" رنگا کھرپہ چلانے لگا۔

"نہیں رنگے۔ سچ سچ بتاؤ۔"

"مگر کیوں بتاؤں۔ کوئی زبردستی ہے۔"

عبدالرحمان نے پینترا بدلا۔ "رنگے میں نے سُنا ہے کہ تم نے کئی قتل کیے تھے۔ بہت سی لڑکیوں کو اغوا کیا ہے اور ڈاکے ڈالے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں تو کیا ہے ـــــ مرد ہی ایسا کام کرتے ہیں۔"

"مگر تم یہ کیوں کرتے تھے؟"

"مشکل کا دن ہے ؟"

"آخر دنیا بھی تو کوئی چیز ہے ——— کمانے کے اور بھی تو کئی ڈھنگ ہیں ۔"

"مگر میرے باپ نے تو مجھے یہی ڈھنگ سکھایا اس میں میرا کیا قصور ؟"

"تمہارا باپ بھی یہی کرتا تھا ؟"

"واہ" رنگا فخر سے بولا "میرے باپ کے ڈر سے تو دو ضلعوں کے لوگ کانپتے تھے۔ بڑا تکڑا بدمعاش تھا وہ سب کے کرتا تھا ۔ رنگے تو چار زمیناں لے لے۔ تب بھی اتنے سر نہ کاٹ سکے کا جتنے میں نے کاٹ سے ہیں ۔"

رنگا کھرپہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اب موڈ میں آرہا تھا ۔

"اللہ قسم جب میں نے پہلا ڈاکہ ڈالا تھا تو میرے باپ نے بڑی تگڑی دعوت کی تھی اور میں نے بھی تو زروں کی طرح دن دہاڑے بس کو روکا تھا۔ صرف دو ساتھی میرے ساتھ تھے ۔ وہ پستول تانے کھڑے رہے اور میں نے ساری بس والوں سے گھڑیاں، زیورات اور نقدی دھروالی ——— ایک عورت نے زیور دینے میں ذرا چوں چراں کی۔ تو میں نے گود میں سے بچہ چھین کر زور سے سڑک پر پھینک دیا سالا ایک ہی چیخ مار کر ٹھنڈا ہو گیا۔

عبدالرحمان اندر ہی اندر کانپ گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے رنگے کے چہرے پر خوشی کی فتح مندانہ چمک دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"رنگے۔ تم اگلے جہان میں خدا کو کیا جواب دو گے ؟"

رنگے نے کھرپہ ہوا میں چلایا اور تیزی سے عبدالرحمان کی طرف گھوم کر بولا "میں جواب دوں گا یا مولا مجھے جواب دے گا ؟ ——— میں ؟ ؟ ——— ڈاکو کے گھر پیدا ——— کیوں کیا تھا ؟ ——— اس کا کیا جاتا جو مجھے کسی مولوی کے گھر پیدا کر دیتا۔ میں خواہ مخواہ ہی ساری عمر نمازوں میں ٹکریں مارتا ——— ڈاکو کا بیٹا تو ڈاکو ہی ہو گا نا ——— کبھی گندم کی بٹی پر باجرہ بھی اُگتے دیکھا ہے بابو ——— میں نے ایک دو دفعہ مزدوری کی کوشش بھی کی۔ مگر لوگوں نے بدمعاش جان کر اعتبار ہی نہ کیا۔"

عبدالرحمان لاجواب سا ہو کر چپکا بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا "بڑے سنگدل ہو رنگے۔ قتل تو اتنے کیے۔ مگر پیار کبھی بھی نہیں کیا۔"

رنگا ایک دم جوش میں آگیا "تو کیا میں بالکل ہی جانور ہوں ——— کیا کیوں نہیں ——— میں بھی تو انسان ہوں ——— مرد ہوں ——— مرد ہی پیار کیا کرتے ہیں۔"

"جھوٹ" : عبدالرحمان نے اُسے چھیڑا۔

رنگے نے کھرپہ ایک دم زمین میں پورا گھسیڑ دیا۔ اور زور سے تھوکتے ہوئے بولا "جھوٹ بولنے والے کی ماں ———"

"تو پھر بتاتے کیوں نہیں ؟" وہ بات کاٹ کر بولا

رنگا کھرپہ نکال کر کیاریاں بنانے لگا۔ پھر سر اٹھائے بغیر کانپتی آواز میں بولا "کیاریاں بنا لوں۔"

رنگے کے ہاتھ چل رہے تھے۔ کبھی بہت سست اور کبھی بہت تیز۔ چہرے کے آثار بدلتے جا رہے تھے۔ اور سر کام میں

جتا جاتا تھا۔ وہ کام میں مگن اور گہری سوچ میں غرق تھا۔

کام ختم ہوا تو دونوں درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے۔ عبدالرحمان کے پوچھے بغیر بڈھے نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ اس کے چہرے پر نرمی تھی اور آواز کی کرختگی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

"چودھری مہر علی نے ایک دن مجھے بلایا اور کہا ملک معراج دین کی گھوڑی نکالنی ہے اور تھل میں جا کر چھوڑ دینی ہے ——— بول کیا رائے ہے؟ ——— میں نے کہا چودھری کیوں اس سے ٹکر لیتے ہو۔ بڑا جابر آدمی ہے ——— مگر چودھری نے کہا تو اپنے پیسوں سے مطلب رکھ ——— میں نے کہا چودھری کام بڑا ہے . . . تم خود ہی دیکھ لو۔ جان کا بھی خطرہ ہے۔ جیل بھی سامنے ہے ——— بات چلتی رہی۔ آخر دو ہزار پر فیصلہ ہوا۔ چودھری نے ہزار اسی وقت دیا اور کہا باقی ہزار کام پورا ہونے کے بعد دوں گا ——— میں تیار ہو گیا۔ ان دنوں بارسی کی گھوڑی کا نکل جانا بہت بدنامی کی بات تھی اور چودھری ملک کو کسی رنجش کی وجہ سے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ ہمیں کیا ——— ہمیں تو اپنے مال سے غرض تھی۔

میرا باپ ان دنوں جیل میں تھا۔ اسے پھانسی ہونے والی تھی۔ میں نے کہا نگے چل ذرا۔ یا تو نام بن جائے گا اور باپ چھڑا سکے گا۔ یا پھر باپ بیٹا اکٹھے ہی چلیں گے ——— ماں میری بوڑھی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ذرا جیل جا رہا ہوں، ملاقات کرنے۔ دو تین دن لگ جائیں گے ——— اور خود اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر سیدھا ملک معراج کی ڈھوک کو چل دیا۔

تیں دن کو پہنچا۔ تاکہ گھوڑی نظر سے گزار لوں۔ کسی نے بتایا کہ گھوڑی کو گھمانے گئے ہیں۔ میں بھی اسی راستہ پر چل دیا۔ دور سے گھوڑی نظر آئی ——— مگر قریب گیا تو گھوڑی کو دیکھنا بھول گیا ——— کیا بتاؤں بابو کیا ہوا ——— ایمان سے وہ بلا کی چھوکری تھی جو گھوڑی کے ساتھ چل رہی تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا ——— خیر!! ایک نظر گھوڑی پر ڈالی اور ہزار نظریں چھوکری پر ڈالیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔ پتہ لگا کہ وہ ملک معراج کی لڑکی ہے اور آج کل ڈھوک پر آئی ہوئی ہے۔

رات کو گھوڑی کھولنے پہنچا تو دیکھا کہ ساتھ ہی چارپائی پر لڑکی بھی سوئی ہے۔ دوسرے گھر والے ذرا ہٹ کے تھے۔ طبیعت تو بڑی للچائی۔ مگر دل نے کہا پہلے وہ کام کر جس کی زبان دے آیا ہے۔ چنانچہ گھوڑی کا رسہ کاٹا۔ اسے ٹھکانے لگایا۔ اگلے دن چودھری سے بقایا پیسے وصول کیے۔ اور پھر اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر سیدھا اسی ڈھوک پر۔

ان دنوں میری عمر ہو گی کوئی پچیس برس کی۔ بڑا گبھرو جوان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چھوکری راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ رات پھر وہیں جا کر دیرا پھیلا گیا۔ قسمت اچھی تھی اور وہ اکیلی وہاں تھی۔ ملک شاید گھوڑی ڈھونڈنے باہر گیا تھا۔ اور ایک دوسری چارپائی پر خالی بستر تھا. . . . . ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ میں نے کہا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آگے بڑھ کر پہلے لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر جگایا ——— بے چاری نے چیخ مارنی چاہی مگر آواز کہاں سے نکلتی۔ میں نے اسے بتایا کہ کل گھوڑی لینے آیا تھا تو وہ پسند آ گئی اور اب اسے لینے آیا ہوں ——— مگر وہ کشتی کرنے لگی۔ تب میں نے اسے بازو وغیرہ دکھائے مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ جبھی آ اس کے ہاتھ باندھ کر منہ میں رومال ٹھونسا اور کندھے پر ڈال کر لے اٹھا۔

دس پندرہ میل دور جا کر ایک پہاڑی غار میں اسے بٹھایا۔ ٹھکانے کر دیا۔ جیب سے چودھری کے دیے ہوئے ہزار روپے نکال کر

اس کی جھولی میں ڈال دیتے۔ مگر وہ تیسرے منقبلات ہی دیکھتی تھی ——— کبھی مٹھیں، کبھی گالیاں، کبھی بد دعائیں۔ پھر ایک دن میں نے کہا ایسے ٹھیک نہیں۔ چنانچہ زبردستی اس کے کپڑے اتار دیے اور جب پہننے لگا تو نے واقعہ ہو گئی ——— میں نے کہا جادو کام کر گیا۔ اس نے منہ سے دو ایک شبدے بھر پور پیار کیے۔ مگر اس نے لپک کر انگوٹھے کے بیچ میں دانت گاڑ دیے اور زور سے کاٹا ——— قسم سے اتنی تکلیف ہوئی کہ میں بلبلا اٹھا۔ جھماکا ایک سیدھا جیسا نکال کر اس کے پہلو میں گھسیڑ دیا ——— سالی ایک دم چت ہو گئی۔

" بابو ——— مر گئی۔ پر کیا بتاؤں کیا شے تھی۔ خون نکلنا بند ہوا تو میں نے پانی سے زخم صاف کیا اور اُسے دھو کر صاف ستھرا بچھونے پر لٹا دیا ——— پھر جی بھر کر اُسے چوما۔ جب دل سیر ہو گیا تو سامنے بیٹھ کر دیکھتا رہا ——— اور لگاتار دو دن اور دو رات دیکھتا رہا۔ تیسرے دن جسم سے تھوڑی تھوڑی سی بو آنے لگی۔ تو میں نے رات کے وقت اُسے چادر میں لپیٹا اور صبح تڑکے اپنے گھر پہنچ گیا۔

" میری ماں بھی بہت کام کا مال رہا ہوں۔ وہ شوق سے بیٹے بیٹے میرے کمرے میں آنے لگی۔ تو میں نے جاکر ایک لات ——— اور وہ جا گری ...... اپنے کمرے کے پاس پہنچ کے بیٹھ گئی ——— ٹوٹ گئی تھی پسلی اُس کی۔ میں نے بعد میں علاج تو کیا۔ مگر چند دن بعد ادھر وہ مری اور ادھر میرا باپ پھانسی چڑھ گیا

" ہاں تو میں اُسے کمرے میں لے گیا۔ اندر سے کنڈی لگا لی۔ اپنی چارپائی ہٹا کر بیٹ گڑھا کھودا ——— اُسے خوب چومنے کے بعد قبر میں لٹا دیا اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔ پھر میں نے کمرے کی کھڑکی توڑی اور چھلانگ لگا کر باہر گیا۔ وہاں سے چکنی مٹی اٹھا اٹھا کر اندر لایا۔ اور اس سے قبر کی بجائے ایک چبوترہ بنا لیا۔

" اس دن کے بعد سے میں چارپائی پر کبھی نہیں سویا۔ بلکہ اسی چبوترے پر سوتا ہوں۔ جب جیل سے چھوٹتا ہوں سیدھا وہاں جاتا ہوں اور زندگی کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے دو چار روز تک وہیں پڑا رہتا ہوں ——— مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے بازوؤں میں ہو اور ایک سکون سا مل جاتا ہے ——— اس دن کے بعد سے عورت میری نظروں میں نہیں جچ سکی۔"

رنگے کی آنکھوں میں ایک مستی کی سی کیفیت تھی اور وہ بالکل بے خود سا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی اور ملائمت تھی اور آنکھوں کی لالی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی ——— عبدالرحمان چپکے سے اٹھ کر کنوئیں کی طرف چلا گیا۔ اُس کا دل نفرت سے ابل رہا تھا اُسے رنگے سے وحشت ہو رہی تھی ——— وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ انسانیت کے نام پر دھبہ۔ ایسے لوگوں کو جتنی سزا دی جائے کم ہے ——— وہ کتنی دیر ایسے ہی سوچتا رہا۔ مگر کبھی کبھار اس کے کانوں میں رنگے کی آواز گونج جاتی۔

" خدا نے مجھے ڈاکو کے گھر پیدا ——— کیوں کیا تھا؟ اس کا کیا جاتا جو مجھے کسی کوری کے گھر پیدا کر دیتا۔"

کئی دن گزر گئے۔

عبدالرحمان کی مشقت آج کنوئیں پر تھی۔ وہ گدی پر بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ گول چکر کاٹتے ہوئے وہ بیلوں کے پچھلے سموں کے نیچے سے برآمد ہونے والے مختصر راستے کو دیکھتا جاتا جو گول پگڈنڈی کی طرح کنوئیں کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور کبھی کبھار بیل کی دم میں چھڑی چبھو دیتا۔ کوئی گھنٹہ بھر کام کرنے کے بعد بیلوں کو ستانے کا موقع دیا اور خود کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں قیدیوں کا افسر ادھر آن نکلا۔

عبدالرحمان اُسے بالکل پسند نہ کرتا تھا اس لیے جب وہ قریب آکر کھڑا ہوگیا تو بھی اُس نے کوئی توجہ نہ کی۔

"آج کنوئیں پر ڈیوٹی ہے۔" اُس کی آواز میں درشتی کی بجائے نرمی کا احساس کر کے عبدالرحمان قدرے حیران ہُوا۔ مگر اُس نے صرف سر ہلا دیا۔

"بابو ——— تم پڑھے لکھے آدمی ان سوروں میں کہاں سے آن پھنسے۔ تمہیں میں اس طرح دیکھتا ہوں تو میرا دل کڑھتا ہے۔"

نفرت کے باوجود عبدالرحمان کو اُس کی ہمدردی اچھی لگی اور وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

ہیڈ وارڈر نے کہا ہے کہ بابو کا خاص خیال رکھا کرو۔ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو قواعد وغیرہ کے چکر میں نہ ڈالو۔ بلکہ دے دیا کرو۔"

عبدالرحمان نے اُسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا ——— اُس کا چہرہ چیچک زدہ تھا۔ آنکھیں بھینگی تھیں اور لمبوترے چہرے پر نوکدار ٹھوڑی تھی ——— مگر اس وقت وہ عبدالرحمان کو بُرا نہیں لگا۔

"ہیڈ وارڈر نے مجھے بولا تھا کہ اگر بابو کو بیوی سے ملاقات کرنے میں دقت ہوتی ہے تو بابو سے پوچھنا۔ اگر وہ چاہے تو اُسے باہر کوٹھڑی میں مل لیا کرے۔"

"ہاں - ہاں ضرور۔" عبدالرحمان بولا "اگر کوٹھڑی میں انتظام ہو سکے تو بہت بہتر ہے۔" اُس نے سوچا کہ جیل کی دُنیا میں رنی نشان تو انسانیت کا بھی ملتا ہے۔

"میں اُسے بول دوں گا کہ بابو راضی ہے ——— ویسے وہ آدمی بڑا اچھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تو اس پر بھی راضی ہو جائے گا کہ کبھی کبھار تم دونوں رات بھی اس کوٹھڑی میں گزار لو۔ وہاں کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

عبدالرحمان کا دل اُچھل پڑا۔ شرماتے ہوئے وہ مُسکرایا اور کہنے لگا "پوچھ لینا اُس سے اگر وہ راضی ہو جائے تو"

نمبردار نے عبدالرحمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "تم فکر نہ کرو بابو۔ میں سارا انتظام کر لوں گا ——— ہیڈ وارڈر کو منانا میرا کام ہے۔"

پھر قریب ہو کر بولا "بس تم ذرا اپنی بیوی کو سمجھا دینا۔"

"کیا؟"

"یہی ہی" وہ ہنسا "یہی کہ وہ بُرا نہ منائے۔"

"نہیں نہیں بُرا کیوں منائے گی ——— ہم تو تمہارے بہت مشکور ہوں گے۔"

"نہیں ——— میرا مطلب ہے کہ وہ جھگڑا نہ کرے۔ اگر کبھی کبھی ہیڈ وارڈر ——— اور ——— میں ——— تھوڑا پیار کر لیں۔"

عبدالرحمان ایک دم جھپٹ کر اُٹھا کہ اُس کا مُنہ نوچ لے۔ مگر وہ پلٹ کر ایسا بھاگا کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔

عبدالرحمان غصے سے بے دم ہو کر وہیں گھاس پر لیٹ گیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "او خدا ——— میرا گناہ تو ان لوگوں

سے زیادہ تو نہیں جو دُنیا میں سب گناہ کر رہے ہیں ــــ مجھے کیوں اتنی سزا ملی ہے ؟ یہ ــــ کہاں ہے تیرا انصاف۔"

پھر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اگلے دن ملاقات تھی ــــ بیگماں پر نظر پڑتے ہی عبدالرحمان چلایا۔ "بیگماں تُو خدا کے لیے گاؤں چلی جا ــــ آئندہ نہ آیا کر یہاں۔"

"مگر میں کیسے جاؤں؟"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ تو بس نہ آیا کر یہاں ــــ میں جو کہہ رہا ہوں ــــ سیدھی گاؤں چلی جا ــــ اور جب بھی یہاں آئے کسی کو ساتھ لے کر آنا۔"

بیگماں بحث کرنے لگی تو عبدالرحمان غصے سے بولا۔ "حرامزادی ــــ اگر میری بات نہیں مانے گی۔ تو میں کبھی بھی تم سے نہیں ملوں گا۔"

بیگماں حیرت زدہ سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

اس کے بعد قیدی افسر سے کبھی اس کی تو تکرار کی نوبت نہیں آئی۔ ہیڈ وارڈر سے کہہ کر اس نے اپنی ڈیوٹی تبدیل کروا لی تھی ــــ ویسے اس دن کے بعد بیگماں بھی نہیں آئی اور عبدالرحمان کو تسلی ہو گئی کہ وہ میکے چلی گئی ہے۔

وارث بڑا بے چین تھا۔ پچھلے دو ہفتوں سے اس کا ماموں ملنے نہیں آیا تھا۔ اسے اپنی بہن کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ وہ ہر روز کسی معجزے کا انتظار کرتا۔ مگر بے بس ہو جاتا۔

چند دن بعد جیل کا معائنہ تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی کمشنر جیل کمیٹی کے غیر سرکاری ممبروں کے ساتھ دیکھنے آ رہے تھے۔ سب قیدی صحن میں قطار بنا کر بیٹھے تھے اور اپنے ہاتھوں میں کارڈ پکڑے تھے جن پر ان کے نام، جرم، سزا کی میعاد اور دیگر کوائف درج تھے۔ ابھی ان کے آنے میں دیر تھی اور اکا دکا قیدی اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسروں سے بات کر کے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ وارث اور عبدالرحمان اکٹھے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک قیدی دوڑا ہوا آیا اور ان دونوں کے سروں کے درمیان اپنا سر گھسیڑ کر بولا۔

"وارث۔ کل میرا ایک ملاقاتی آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تیرے ماموں نے پارٹی کے ساتھ برات پر حملہ کیا تھا۔ اور جھگڑے میں تیرا ماموں مارا گیا ہے۔"

وارث کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس نے اور کوئی تفصیل نہیں پوچھی۔ صرف سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد معائنہ کرنے والے آئے تو سپرنٹنڈنٹ نے جیلر کو خاص طور پر ہدایت کی کہ وارث کا طبی معائنہ کرائے کیونکہ وہ بہت زرد ہو رہا تھا ــــ جیلر وارث کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس رات عبدالرحمان نے محسوس کیا کہ وارث بالکل نہیں سویا۔ بلکہ کروٹیں بدلتا رہا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید رات وہ پھر اس کے پاس آ کر اپنا دکھ روئے گا مگر یہ خیال غلط نکلا۔

صبح جب کھانا لینے گئے تو وارث بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ واپس کمرے میں آکر جب تینوں نے اپنے اپنے برتن سامنے رکھے اور کھانے لگے تو وارث بولا۔

"رنگے تو سچ ہی کہتا تھا۔ کہ میں رہائی کے بعد دوبارہ واپس آؤں گا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" رنگا منہ میں نوالہ ایک طرف سے دوسری طرف کرتے ہوئے بولا۔

وارث روٹی کو ہاتھ میں مسلتا ہوا مضبوط آواز میں بولا "میں نے جاکر اپنے باپ اور بہن کے خاوند کو قتل کرنا ہے۔"

"اوئے شاباش" رنگا چلایا اور زور سے وارث کی رانوں پر ہاتھ مارا "یہ بات ہوئی نا زوروں والی ——— مرد ہے تو بھی۔"

اُس نے آگے بڑھ کر وارث کو ساتھ لپٹایا اور کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولا "غم نہ کر۔ قتل کے طریقے میں بتاؤں گا۔"

وارث نے پُرخلوص مسکراہٹ سے سر ہلاتے ہوئے اس نئی دوستی کا آغاز کیا۔

دو تین روز بعد کھانا لینے کے لیے باہر قطار لگی تھی کہ اتنے میں قیدی افسر ۱۳ آکر عبدالرحمان سے اگلے قیدی سے سرگوشی میں بات کرنے لگا۔ اُس نے شاید عبدالرحمان کو دیکھا نہیں تھا۔ مگر جیسے جیسے عبدالرحمان اُسے دیکھتا گیا۔ اُس کے دل میں غیض و غضب کھلنے لگا۔ نمبر ۱۳ نے سرگوشی کرکے آنکھ ماری اور دونوں مسکرا دیے۔ اس پر نہ معلوم عبدالرحمان کو کنوئیں والا لمحہ شدت سے یاد آگیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر نمبر ۱۳ کو زوروں سے پکڑا اور دو چار گھونسے لگا دیے ——— قیدیوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر نمبر ۱۳ کو چھڑایا تو وہ سیدھا جیلر کے کمرے کی طرف بھاگا۔

معاملہ سب کے سامنے ہوا تھا۔ انکاری کی گنجائش نہ تھی۔ جیلر نے فقط اتنا کہا "پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں ——" اور پانچ دن کے لیے بیڑی لگانے کا حکم دے دیا۔ عبدالرحمان نے کوئی صفائی پیش نہ کی ——— گھونسے مار کر اُس کے دل کو بہت اطمینان ہو گیا تھا۔

آسمان کی ستیلی میں چاند چمک رہا تھا۔ اُس کی روشنی سیدھی عبدالرحمان پر پڑتی۔ اور بیڑیوں کے بعض حصے چمک رہے تھے۔ لوہے کے کڑے اور سلاخیں اُس کو جگہ جگہ چبھ رہی تھیں۔ پاؤں کے گرد ٹخنے ابھی سے چھل چکے تھے۔ وہ جس کروٹ بھی بیٹھتا۔ رانوں کے گرد کے چھلے چبھنے لگ جاتے۔ وہ کبھی لیٹ جاتا، کبھی بیٹھ جاتا۔ بالآخر اُس نے کمبل تہ کرکے دیوار کے ساتھ رکھا اور اس سے ٹیک لگا کر چاند دیکھنے لگا۔

..... نہ معلوم اُسے کالج کے زمانے میں پڑھا ہوا شیکسپیئر کا فقرہ کیوں یاد آنے لگا۔ کہ جس طرح شریر بچے کیڑوں کو مار کر کھیلتے ہیں۔ اسی طرح دیوتا انسان سے کھیلنے میں مزہ لیتے ہیں۔

وہ سوچنے لگا کہ ہم واقعی خدا کے کھلونے ہیں۔ دُنیا بالکل کھلونوں کی دُکان ہے۔ جس میں بعض کھلونوں کو خوبصورت رنگ دے کر چمک دار کپڑے پہنا کر اونچی جگہ پر سجا دیا گیا ہے اور دُوسروں کے نہ تو رنگ بھڑکیلے ہیں نہ چہرے پر چمک ہے۔ بعض کا کام صرف قلابازیاں لگانا ہے۔ بعض کی قوت صرف اتنی ہے کہ ہاتھ ہلا سکیں یا آنکھیں مٹکا سکیں۔ یا ٹانگیں چلا سکیں ——— دکاندار جب چاہتا ہے۔ ایک کھلونے کو ہٹا کر اُس کی جگہ دُوسرا رکھ دیتا ہے ——— ان کی اپنی قوت عمل کوئی نہیں۔ وہ فقط اس انتظار میں ہیں

کر کوئی اُدھر سے آ کر کھیلے۔ اسی طرح ہم سے بھی حالات کھیلتے ہیں۔ کبھی معاشرے کی اقدار کھیلتی ہیں۔ کبھی مذہب کھیلتا ہے اور کبھی خود ہماری طبیعت اور فطرت ہم سے کھیلتی ہے ــــــ حالات ہمیں چابی دے کر کسی طرف رُخ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ انھوں نے صاف راستہ چُنا تو ہم بے روک ٹوک نکل گئے۔ ورنہ کسی رکاوٹ سے ٹکرا کر اُلٹ جاتے ہیں اور ہوا میں ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے اپنی چابی ختم کر دیتے ہیں کبھی سینوں سے بھینچ لیے گئے۔ کبھی نظر انداز ہو گئے اور کبھی تو زنگ کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے ــــــ وارث بھی کھلونا تھا، اُس کی پیدائش سے پہلے کے حالات اُس سے کھیلتے ہیں اور پھر جیل کے قیام میں باہر کے حالات کھیلتے ہیں ــــــ زنگا اپنی پیدائش کے حادثے کو بننے سے قاصر ہے اور جس ماحول میں پیدا ہوا اُس کا کھلونا بن گیا ــــــ خود مجھ سے قسمت کھیلتی رہی ہے۔ میری رضامندی کے بغیر گھڑ کر مجھے نکالا اور عجیب غریب حالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اگر اللہ رکھے کی جان چاہیے تھی تو کوٹھے سے گرا کر مار دیتا ــــــ پھوڑا نکالنا کوئی ضروری تھا۔ مگر وہ تو مجھ سے کھیلنا چاہتا تھا ــــــ یہ سب قیدی دانستہ جرم کرنے کے لیے جیل میں ڈالے گئے۔ محض حالات کے کھلونے ہیں۔ . . .

. . . . . فلسفی سپائی نوزا (Spinoza) کہتا تھا کہ اگر ایک اینٹ کو ہوا میں اُچھال دیا جائے اور گرتے وقت اُس سے پوچھا جائے کہ تم کیا کر رہی ہو تو وہ یہی کہے گی کہ میں اپنی مرضی سے گر رہی ہوں حالانکہ اُسے زمین کی کشش کھینچ رہی ہے ــــــ اسی طرح ہم جو کچھ بھی ہیں اور جہاں بھی ہیں۔ اُن حالات کی وجہ سے ہیں جن پر ہمارا کوئی قابو نہیں ــــــ ہم محض خدا کے کھلونے ہیں جو اسباب اور نتائج کے لامحدود چکر میں ہمارے اندر مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور ہم ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں جو ہماری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن دراصل ہماری نہیں ہے . . . . . .

چاند سلاخوں میں اپنی جگہ سے سرکتا رہا۔ سلاسل کی چھت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی اور عبدالرحمان بیٹھا سوچتا رہا۔

ڈیڑھ سال گزر گیا۔

سڑک پر بہار کی دُھوپ بہت پھیلی تھی۔ خوانچے والے اپنے اپنے خوانچوں میں چیزیں سجائے بیٹھے تھے۔ لوگ اُجلے چہروں سے دفتروں اور سکولوں کو جا رہے تھے۔ سڑک پر سائیکلوں کا ریلا تھا۔ فٹ پاتھ پہ پیدل لوگوں کا رش تھا۔ اور دُنیا بغیر کسی تبدیلی کے رواں تھی۔

مگر عبدالرحمان ہر ایک چیز کو دیکھ کر عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ ہر شے ایسے ہی تھی جیسی ہونا چاہیے تھی۔ مگر پھر بھی وہ چونکتا سا ہر چیز کو مڑ مڑ کر دیکھتا۔ شاید حیران ہو کر کہ یہ ابھی تک ویسا ہی ہے۔ وہ جیل کے باہر کی دُنیا کو اپنے پرانے اور اصل روپ میں دیکھنے کا متوقع تھا۔ مگر توقع کے عین مطابق دیکھ کر اُسے اچنبھا، حیرانی اور ایک بے نام سی خوشی گھیر لیتی ــــــ جب وہ مین بازار میں پہنچا تو سبزی والا مراری بالکل پہلے کی طرح سبزی کا ترازو لیے گاہکوں کی بھیڑ میں گھرا تھا۔ گلی کے کنارے پانی کے نل پر بالکل اُسی طرح بالٹیاں اور گھڑے پڑے تھے۔ بجلی کے چار کھمبوں کے بیچ پیپل تلے حجام اپنی دری بچھائے حسب معمول کسی کا شیو کر رہا تھا اور چہرے پر سفید صابن میں ایک آدھ خون کا قطرہ بھی تھا۔ اور جب وہ چوڑی گلی میں مڑا تو پان والے کی دُکان پر ریڈیو سیلون کے گانے کی آواز ویسی ہی تھی۔ اور جو دو چار جواری لنڈے دھوتیاں اُٹھائے اُسی طرح چوکڑے مار کر پھٹے پر بیٹھے تھے۔

"ارے اس عرصہ میں تو کچھ بھی نہیں بدلا" اُس نے بڑے ہی ملے جلے جذبات کے ہجوم میں سوچا۔

گلی میں مکانوں کی لمبی دو رویہ قطاروں میں سامنے ایک مسجد کے میناروں پر صبح کی سنہری دھوپ پڑ رہی تھی اور اُن کی آدھی گولائی سنہری ہو رہی تھی۔ دُوسرے آدھے حصے پر ٹھنڈا پُرسکون سایہ تھا۔ جیسے جیسے وہ مسجد کی جانب چل رہا تھا۔ اُس کے دل میں ہچکچاہٹ ابھر رہی تھی ... ادے سر اُٹھانے لگے۔ گھما کر اُس نے اپنے کپڑوں کو دیکھا ——— وہ صاف نہ تھے اور شاید پاک بھی نہ ہوں۔ مگر کیا حرج ہے میں تو فقط دُنیا میں دُوسری دفعہ داخل ہونے سے پہلے خُدا سے دُعا مانگنا چاہتا ہُوں کہ وُہ صاف ستھری اور نیک زندگی بسر کرنے میں میری مدد کرے۔ کپڑے اگر خراب ہیں تو کیا ہوا۔ میری نیت تو صاف ہے۔ ایک دفعہ اپنے گھر میں داخل ہونے کے بعد دُعا مانگنے میں وُہ بات نہیں۔

مسجد کے دروازے پر جُوتا اُتار کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ بڑے صدقِ دل سے وضو کیا۔ صبح کی نماز کے دو سنّت اور دو فرض پڑھنے کے بعد کچھ دیر دُرود شریف پڑھا۔ پھر دو نفل پڑھے اور سجدے میں گر کر بڑے ہی عجز و انکسار سے دعا مانگی کہ خدا اُس کی مدد کرے۔ دُنیا کی بے چینی کا مقابلہ کرنے کی ہمت دے۔ مُشکل آزمائش سے بچائے۔ نیکی کی ہدایت اور توفیق عطا کرے اور ایمان مضبوط کرے۔

مسجد سے نکلا تو اُس کا دل بڑا ہلکا تھا۔ خراماں خراماں چلتا جب وہ اپنی گلی میں مُڑا تو اُس کا دل مُنہ کو آنے لگا۔ بیگماں ضرور گاؤں سے آگئی ہوگی۔ میں نے پچھلے ہفتے اُس کو جیل سے خط لکھا تھا کہ میں آج آ رہا ہوں اور وہ گاؤں سے واپس آجائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کِھل جائے گی۔ آنسوؤں سے میرا کندھا بھگو دے گی۔ پھر گلے شکوے کرے گی کہ میں نے اُس کو مشکلات میں ڈال دیا۔ اور میں ہنس کر کہوں گا بھاگی میں سیدھے راستے سے بھٹکا تو مجھے کتنی سخت سزا ملی۔ اب مجھے پہلے کی طرح ہرگز مجبور نہ کرنا کہ میں دُوسرے لوگوں کی طرح رشوت لوں۔ اور نہ ہر وقت میری حیثیت کے لوگوں کی مثالیں دینا کہ اُن کے پاس مجھ سے زیادہ روپیہ ہے اور وہ ٹھاٹھ سے رہتے ہیں اور وہ میری آنکھوں میں جھانک کر کہے گی کہ میں سب سمجھ گئی ہُوں۔ یہ ہمارے بس کا روگ نہیں۔ پیسے پیسے تو جو کچھ ہو۔ تم ہی ہو۔ تم آگئے تو ——— مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔ تمھارے ساتھ مجھے ہر قسم کی روکھی سوکھی پسند ہے اور میں اُسے لپٹا لوں گا . . . . .

اُس نے دیکھا وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا ——— گھر وہاں سیڑھیوں پر ایک نوکر کسی بچے کو لے کر بیٹھا تھا۔ پُوچھنے پر پتہ چلا وہاں کوئی اور رہتا ہے۔ چند لمحے توقف کر کے اُس نے سوچا کہ پارو کی ماں کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

پارو کی ماں نے جیسے ہی اُسے دیکھا وہ پلو مُنہ پر ڈالے پردے میں سے جھانکنے لگی۔

"ہائے بھرا جی۔ آپ کب آئے؟"

"بس ابھی سیدھا واپس آ رہا ہُوں۔"

"ہائے بڑی خوشی ہوئی دیکھ کر آپ کو۔ پارو کے ابا تو گھر میں ہیں نہیں ——— اری پارو جاؤ ذرا بھاگ کر بازار سے شربت لے آ۔"

مگر عبد الرحمٰن نے منع کر دیا کہ مجھے پیاس نہیں۔ دراصل وہ بیگماں سے ملنے کے لیے بے کل ہو رہا تھا۔ مگر پارو کی ماں حسب معمول باتوں کے لگاتار سلسلے میں مصروف تھی۔ جس میں اُس کی غیر حاضری میں پاس پڑوس کی خبریں تھیں۔ مع اُن شوہروں کے جو وہ ان واقعات میں ملوث

کر دیتی رہی تھی۔ ایک دفعہ جب وقت ٹلا تو عبدالرحمان نے بالآخر سیدھا سوال کر ڈالا۔

"بیگماں نہیں آئی گاؤں سے؟"

"بھرائی۔ صحت تو اچھی رہی آپ کی ——— اپنے کتنے دُبلے لگ رہے ہیں۔ ورنہ پہلے تو اللہ کے فضل سے اچھے تھے آپ۔"

عبدالرحمان نے ہوں ہاں کر دی۔ اور دل میں سمجھا کہ اس نے بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے پھر کہا کہ اب گھر جا کر بتاؤں گا۔ مگر وہ بات ٹال گئی۔ عبدالرحمان نے سمجھا شاید میرے بعد ان کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔ مگر جب اس کی باتیں جاری رہیں تو ذرا ہوا۔ "جیل میں بیگماں جب بھی میرے پاس آئی۔ آپ کی بہت تعریف کی کہ آپ نے اس کا بہت خیال رکھا۔ ورنہ اکیلی عورت کا گزر تو بہت مشکل ہوتا ہے۔"

پارو کی ماں خاموش ہو گئی۔ پھر بولی "اچھا تو جیل میں اکثر جاتی رہتی تھی آپ کے پاس۔"

"ہاں شروع میں تو باقاعدہ آتی تھی۔ مگر بعد میں میں نے منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اب تم گاؤں چلی جاؤ۔"

پارو کی ماں نے پھر خاموشی سادھ لی۔

عبدالرحمان نے تھوڑا انتظار کیا۔ پھر بولا "اب میں چلتا ہوں۔"

"کہاں جائیں گے بھرائی؟"

"معلوم ہوتا ہے۔ بیگماں یہاں نہیں پہنچی۔ اب اسٹیشن چلتا ہوں اور وہاں سے گاؤں جاؤں گا۔" اس نے کریدنے کی آخری کوشش کی۔

"بھرائی ——— گاؤں جا کر کیا کرو گے؟"

"کیوں؟"

پارو کی ماں پر ایک تکلیف دہ خاموشی طاری ہو گئی جیسے بات کرنے سے ہچکچا رہی ہو۔

"کیا بات ہے؟" وہ بولا۔

"وہ جنم جلی گاؤں گئی ہو تو آپ جائیں نا۔"

"کیوں؟ کہاں گئی؟" عبدالرحمان حیران رہ گیا۔

وہ بڑے دبے لہجے میں بولی "اس نے عاقل سے شادی کر لی ہے۔"

عبدالرحمان ایک دم تڑپ گیا "کیا کہا؟"

مگر وہ خاموش رہی۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے ——— میں نہیں مانتا۔" اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔

"اب تو آپ ہی کچھ حوصلہ کریں بھرائی۔" اس نے [illegible] کر دیا۔

عبدالرحمان بالکل سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ پارو کی ماں نے اسی عرصہ میں خواہ مخواہ پردے کو درست کیا۔ اپنے چہرے کا پسینہ

دفعہ ٹھیک کیا۔ وہ ایک دفعہ پھر جبے اور کنکھیوں سے عبدالرحمان کو دیکھتی رہی۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے ششدر کھڑا رہا۔

"مگر یہ ہوا کیسے؟"

"پارو کی ماں کا جیسے بند ٹوٹ گیا" ہونا تو تھا ہی۔ اُس نے میری بات جو نہ مانی۔ میں نے بہت سمجھایا تھا کہ میری سُن لیتی تو کیوں یہ ظلم کرتی۔ عاقل تو ایک چالباز ہے۔ پہلے دو تین روز تو گلی کے بچاؤ بتانے آتا رہا۔ پھر ایک دن آ کر اُسے اڑھائی سو روپے دے دیے کہ گر دی رکھ دی ہے۔ اس کے بعد ہفتہ دس دن بعد چکر لگانے لگا —— بڑی خیر خواہی جتاتا تھا کہ عبدالرحمان تو خواہ مخواہ مجھ سے ناراض ہے۔ مگر میں تو دوستی کا حق نہیں بھولا۔ اس لیے آپ کو کوئی تکلیف ہوا کرے تو مجھے بتایا کریں۔ جب آتا فروٹ اور مٹھائی لے کر آتا۔ میں نے بیگاں سے بہت کہا کہ اسے مُنہ نہ لگائے۔ اُس نے بھی کئی دفعہ بے رُخی دکھائی۔ مگر وہ تو بس جونگا ڈر کی طرح چپٹا ہی رہا۔ حتیٰ کہ مجھے اصل بات کا تب پتہ چلا جب اس کے گھر سے مولوی کی آواز سُنی جو نکاح کا خطبہ پڑھ رہا تھا۔"

عبدالرحمان بُت بنا کھڑا تھا۔ پارو کی ماں ابھی تک کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو میری بیوی ہے اور بغیر طلاق کے دُوسرا نکاح کیسے کر سکتی ہے۔"

"یہی تو میرا جی میں نے اُس سے پوچھا تھا۔ وہ تو چُپ کر گئی تھی۔ مگر مجھے لوگوں نے بتایا کہ مولوی صاحب کے سامنے اُنھوں نے طلاق نامہ پیش کیا تھا جس پر آپ کے دستخط تھے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ یہ غلط ہے۔"

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ عاقل کے لیے جعلی طلاق نامہ بنانا کون سا مشکل کام ہے۔"

عبدالرحمان غصّے سے کانپنے لگا "میں اس حرامزدے کو اس دھوکہ بازی کے لیے جیل بھجواؤں گا۔ یہ سراسر دھوکہ ہے —— میں ابھی عدالت میں جا کر استغاثہ پیش کرتا ہوں . . . . ."

"ذرا حوصلہ کرو۔ میرا جی۔ جو بات ہونی تھی ہو گئی۔ اب کیوں اپنا جی جلاتے ہو۔ خواہ مخواہ عدالت میں جا کر پیسے برباد کرو گے جب بیگماں ہی راضی نہیں ہے۔"

اُس نے تھوڑا سوچا۔ پھر بڑے ہی زخمی انداز میں پوچھنے لگا "کیوں وہاں وہ زیادہ خوش ہے کیا؟"

"لو میرا جی۔ وہ تو خوشی سے دیوانی ہو رہی ہے —— اور خوش کیسے نہ ہو۔ دونوں بازوؤں میں سونے کی بارہ بارہ چوڑیاں ہیں۔ دو تولے کے کنگن علیحدہ ہیں۔ گلے میں بھی زیور ہی زیور۔ وہ تو سونے سے پیلی ہو رہی ہے۔ ٹیکسی یا کار کے بغیر ایک دم نہیں چلتی —— جس چیز پر اُنگلی رکھتی ہے۔ عاقل دو منٹ میں خرید دیتا ہے —— مجھے کہہ رہی تھی پارو کی ماں۔ زندگی کا مزہ بس اب ہی ملا ہے۔ پہلے تو صرف خواری تھی۔ وہ تو خالی پیٹ سے اصولوں کے پکڑ دیتا خود جیل میں جا بیٹھا اور میری جوانی کو یہاں زنگ لگتا چھوڑ گیا۔

عبدالرحمان کا چہرہ اُتر گیا۔ اُسے ایسے لگا جیسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا گیا ہو۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"پارو کی ماں۔ تم اُسے چند گھڑی کے لیے مجھ سے ملا سکتی ہو؟"

"مجبوری ہے۔ وہ تو اب ہم لوگوں سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی۔ کہاں بے عزتی کرانے جا رہے ہو۔"

مگر عبدالرحمان نے اصرار کیا تو وہ برقعہ پہن کر چلی گئی۔ وہ اس کے گھر کے سامنے بنے چبوترے پر بیٹھا بیٹھا انتظار کرنے لگا۔ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے اور سارے جسم پر ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ایک ایک گھڑی بھاری ہو رہی تھی اور وہ بہت سوچنے کی کوشش کرتا رہا کہ اُسے اب کیا کرنا ہے مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

اتنے میں پارو کی ماں آئی تو اس نے سر جھکا کر بالکل ہی حوصلہ توڑ دیا۔ جب عبدالرحمان نے زیادہ پوچھا تو کہنے لگی "وہ تو سو سو بہانے بناتی ہے۔ کبھی کہتی ہے طبیعت ٹھیک نہیں۔ کبھی کہتی ہے ابا کو پتہ چل جائے گا ——— بھائی چھوڑ دو اسے تم۔ وہ تمہارے قابل شے نہیں۔"

عبدالرحمان تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر خاموشی سے چل دیا۔

"اب کیا کرو گے بھائی؟" پارو کی ماں کا تجسس عود کر آیا۔

اُس نے ہاتھ ہلایا۔ "کیا پتہ ——— اللہ کو کیا منظور ہے ——— میرے کرنے کے لیے اب رہا ہی کیا ہے۔"

پارو کی ماں عبدالرحمان کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی ——— سر کی پشت سے نیچے جھکی سی گردن جس میں کوئی اعتماد نہیں ——— بلکہ پریشانی اور صدمے سے کپکپاتی ہوئی ——— پیٹھ پر بے چارگی ——— کمر میں تناؤ کا نام نہیں ——— ناہموار قدموں میں پاؤں کی ایڑی اینٹ روڑوں سے ٹکراتی ہوئی اور سیدھا چلنے کی بجائے پاؤں کبھی دائیں پڑتا۔ کبھی بائیں ——— موڑ مڑنے لگا تو کندھا جھول کر کھمبے سے جا ٹکرایا۔

پارو کی ماں کی آنکھیں بھر آئیں اور اندر کو مڑتے ہوئے وہ بڑبڑائی "اللہ کرے بیگماں۔ تجھے بھی وہاں سکون نہ ملے۔"

اندر جا کر اس نے اپنے خاوند کے کرتے کو زور سے سینے پر بھینچا اور اس کی میلی قمیص اٹھا کر خوب مل مل کر دھونے لگی۔

رہائی کے وقت جیلر نے اپنی گہری آنکھوں سے عبدالرحمان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ اب واپس جا کر برے کاموں سے بچنا۔ اس نے بڑی صاف دلی سے وعدہ کیا تھا اور اسی لیے مسجد میں جا کر دعا بھی مانگی تھی۔ مگر رشیدے نے چلتے وقت کہا تھا کہ بابو جا رہے ہو۔ مگر اس گھر سے جانے والوں کو دنیا میں سکون نہیں ملتا۔ وہ لوگ ہم لوگوں کو بیٹھنے نہیں دیتے۔ عبدالرحمان اس کی بات کو اہمیت دیے بغیر ہی ٹال کر چلا آیا تھا۔ رشیدے نے ہاتھ ملاتے ہوئے مغموم آواز میں کہا تھا "بابو میرے لیے تو اب دوبارہ یہاں آکر ساری زندگی گزارنا مقدر ہو گیا ہے مگر ..... تم کبھی نہ آنا ——— پھر وہ اس سے لپٹ گیا تھا۔

سڑک پر چلتے چلتے عبدالرحمان سوچ رہا تھا کہ کیا میرے پاس اتنی خود مختاری ہے کہ ان میں سے کسی بھی منصوبے پر عمل کر سکوں ——— میرے آئندہ پروگرام میں میرے اپنے ارادے کا کیا دخل رہا ہے؟ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میرا اگلا پروگرام ہے کیا؟؟

وہ سارا دن گلیوں اور بازاروں میں بلا مقصد گھومتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کرے ——— وہ ان دکانوں کے سامنے سے گزرا جہاں بیگماں نے سرگوشیوں میں۔ میٹھے میٹھے انداز میں۔ شرماتے ہوئے اس سے مختلف چیزوں کی فرمائش کی تھی۔ اس سڑک سے گزرا جس پر

وہ بیگماں کے ساتھ گڈو کی پیدائش کے بعد ہسپتال سے واپس آیا تھا——— چلتے چلتے گھومتے گھومتے اُس نے کتنی ہی حسین یادوں کو اپنے ذہن میں دُہرایا۔ جو بند کمروں میں اُس کے بیگماں کے درمیان محفوظ تھیں اور جن کا کوئی گواہ نہ تھا——— مسلسل چھ سال وہ اُس کی بیوی رہی تھی۔

باجوں کی آواز سے بازار گونجنے لگا۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کالی پتلونوں اور لال کوٹوں والے اپنی پگڑیوں پر جھالر جھلاتے باجے بجاتے دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے دولہا کا گھوڑا۔ ساتھ دوست یار ہنسی مذاق کرتے ہوئے اور اُجلے دُھلے دُھلائے براتی لاپرواہی سے چلتے ہوئے ——— کوٹھوں سے عورتیں دیکھ رہی تھیں۔ گلیوں کے بچے کھیل چھوڑ کر بارات دیکھنے جا رہے تھے۔ دُکاندار تماشا دیکھ کر گردنیں اُٹھا اُٹھا کر نظارہ کرنے لگے۔ اور گاہک واپس ملنے والی ریزگاری گننا بھول گئے۔

عبدالرحمان ساکت و جامد دم سادھے دیکھتا رہا۔ ذہن میں یادوں کے دھوئیں بھرتے گئے۔ برات چلی گئی اور وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا ——— حتیٰ کہ کوئی پکارا "ہٹ کے بابو!!" ٹھیلے پر لکڑیاں لادے ہوئے ایک مزدور راستہ مانگ رہا تھا——— وہ سرد آہ بھر کر آگے چل دیا۔

دن بھر گھومنے کے بعد وہ تھکا ہارا سا کمیٹی کے باغ میں بجلی کے کھمبے کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا——— "او خدا تو کبوں نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ اگر دُنیا میں ہر طرف بُرے لوگ پھلتے پھولتے ہیں ——— جو کچھ میں نے کیا اس سے کئی ہزار گنا جرائم اور گناہ عاقل نے کیے ہیں۔ مگر وہ اس وقت میری اپنی بیوی کے ساتھ عیش کر رہا ہے اور میں در بدر بے خانماں دھکے کھا رہا ہوں ——— کیا تیرا قہر صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو تجھ سے ڈرتے ہیں؟؟ ——— یہ تیرا نظام کیا ہے؟؟؟"

لیمپ کے گرد بھنورا بھوں بھوں چکر کاٹ رہا تھا۔ کسی وقت دم لینے کو بیٹھتا تو ایک چھپکلی کھمبے پر دبے پاؤں آگے بڑھتی۔ بھنورا پھر اُڑ جاتا اور وہ پھر دبک جاتی۔ ایک دفعہ چکر کاٹنے میں بھنورا بالکل اُس کے پاس سے گزرا۔ چھپکلی نے جھپٹ کر سر اُٹھایا اور اُسے منہ میں دبوچ لیا۔ مگر ساتھ ہی اُس کے اپنے قدم اُکھڑ گئے اور وہ فضا میں اُلٹ کر گری۔ نیچے باڑ کی خاردار تاریں لگی تھیں۔ وہ سیدھی ایک کانٹے میں پرو دی گئی اور بھنورا اُس کے مُردہ منہ میں تڑپتا ہوا ٹھنڈا ہو گیا۔

اس دُنیا میں کوئی آزاد بھی ہے؟؟ ایک عظیم پہلنے پر ہر طرف تخریب جاری ہے۔ اُس نے سوچا اور بنچ پر لیٹ گیا——— ساری رات کروٹیں لیتے لیتے اُس نے فیصلہ کیا کہ کل دن کے وقت بیگماں کو گھر جا کر ملے شاید وہ راضی ہو جائے۔

اگلے دن صبح ہی صبح وہ اُس کے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک محفوظ جگہ میں بیٹھ گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عاقل نکلا اور دفتر کو چلا گیا۔

"شاید اور بھی کوئی گھر میں ہو"——— وہ انتظار کرتا رہا۔ پڑوس میں سے ایک لڑکا گھر میں داخل ہوا اور دس پندرہ منٹ کے بعد وہ بھی باہر آ گیا——— مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ اُس نے سوچا کہ اب وقت ہے اندر جائے۔ مگر اس کی نظر ایک بھکشو پر پڑ گئی۔ جو ایک مکان سے نکل کر دوسرے میں گھس رہا تھا اور وہ ایک دم رُک گیا "ابھی وہ اس گھر میں بھی تو آئے گا"۔ اور وہ دبک گیا۔ بھکشو واقعی کچھ دیر بعد عاقل کے گھر میں گھسا اور عبدالرحمان کو گھنٹہ بھر اور انتظار کرنا پڑا۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی ——— مگر کچھ سوچ کر پھر کھول دی کہ شاید بھاگنا پڑے۔ گھر میں اندھیرا لگ رہا تھا۔

وہ ڈیوڑھی سے آگے بڑھا۔ سامنے کمرے میں ایک عورت کی پیٹھ دکھائی دی۔ جو فریج کھول کر اندر سے کچھ نکال رہی تھی۔ وہ چپکے چپکے آگے بڑھا اور دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

اس نے فریج بند کیا۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں انڈیلی۔ جس میں پہلے ہی شربت بنا تھا اور گلاس ہاتھ میں پکڑے واپس مڑی۔

بیگماں کا منہ ایک دم کھلا رہ گیا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور شربت سارے فرش پر پھیل گیا۔

دونوں بالکل خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

بیگماں کا رنگ سرخ تھا۔ چہرہ اور جسم بھر گیا تھا اور وہ بشاش نظر آتی تھی ——— عبدالرحمان سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ بڑھے بال اور بڑھی ہوئی داڑھی سے اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

جذبات کے ہجوم اس کے گلے تک آ گئے۔ دو چار دفعہ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز گلے سے نہ نکلی۔ صرف گھونٹ نگل کر رہ گیا۔ بغیر پلک جھپکے وہ سیدھی تیز نظروں سے بیگماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی ٹکٹکی باندھے تھی۔ ایک آدھ دفعہ اس کے ابرو ہلے۔ چہرے نے فق ہونے کے بعد تھوڑا رنگ بدلا اور پھر پیلا پڑ گیا۔

بالآخر عبدالرحمان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر اس کی مرضی کے خلاف یہ الفاظ نکلے۔

"بیگماں تم نے یہ کیا کر دیا ———"

وہ بازو پھیلا کر ایک قدم آگے بڑھا۔ مگر عورت نے پیچھے ہٹ کر فریج کا سہارا لیا اور عبدالرحمان وہیں زمین پر بے اختیار بیٹھ گیا۔ ——— وہ ابھی تک عورت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ صبح سے اس نے کتنی ہی باتیں سوچی تھیں۔ ڈرانے دھمکانے کے کئی منصوبے بنائے تھے۔ مگر اس وقت بیگماں کی سیدھی نظر، فق چہرے اور اس کے اپنے اندر کے جذبات کے ہجوم سے سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ بھکاریوں کے انداز میں بیٹھے دیکھ کر بیگماں کے چہرے کی پیلاہٹ اڑتے ہوئے بادل کی طرح غائب ہونے لگی۔ غالباً اس کا ڈر دور ہو رہا تھا۔ مگر عبدالرحمان یہ سب کچھ محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ خوشامد سے بولا۔

"آؤ بیگماں ہم ابھی نکل چلیں یہاں سے ——— میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔"

بیگماں کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا ——— یہ آدمی کوئی نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ——— سہمی ہوئی عورت کا نقاب اترنے لگا اور اندر سے اصل بیگماں برآمد ہونے لگی۔ مگر اس نے ابھی کچھ نہیں کہا۔

"بیگماں!" عبدالرحمان چلایا ——— دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ ان تمام حالات کا تناؤ اس کے منتشر اعصاب کی برداشت سے باہر تھا۔

بیگماں آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس نے عبدالرحمان کے سر پر ہاتھ رکھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی "تم ابھی سے گھبرا،

اب تو جو ہو چکا سو ہو چکا۔"

عبدالرحمان نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنی گیلی آنکھوں سے لگایا اور نفی میں سر ہلا کر کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔
بیگماں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ عبدالرحمان نے قمیص کے پلّو سے آنسو صاف کیے اور سسکی دباتے ہوئے بولا۔
"بیگی!!"

—— عورت کے آنسو مرد کو بے بس کر دیتے ہیں۔ وہ دُنیا کی ہر چیز بھُول کر اُسے راضی کرنا چاہتا ہے۔ مگر مرد کے آنسو کا عورت
[پر] اثر ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو فاتح سمجھ کر اس کی انا اور پندار مست سانپ کی طرح سر اُٹھانے لگتے ہیں۔ جنس کی دُنیا میں وہ مطلوب ہے
[ج]ب کے آنسو مطلوب کو اپنی بے پناہ اہمیت کا احساس دلا دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو انمول سمجھنے لگتی ہے۔ اُس وقت جب دو بھیگی بھیگی
[آنکھو]ں میں ڈوبی ہوئی مرد مند آنکھیں بیگماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں تو اُس پر غرور اور فخر اُبھرنے لگے۔ بیگماں کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی
[اور کھڑک]ی سے باہر دیکھنے لگی جو اُس کے قدموں کے پاس فرش پر گھٹنے ٹیکے کھڑا تھا۔

"بیگی۔ تم سوچو تو کیا کر رہی ہو؟؟"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی "چھ سال پہلے سوچتی رہی ہوں۔ ڈیڑھ سال اب سوچا ہے۔ اب اور کیا سوچوں" اُس کی
[آواز] اب بالکل لرزش نہ تھی بلکہ صاف اور واضح تھی۔ جس میں درشتی کا رنگ غالب تھا۔

"مگر میں نے تمہیں کیا دُکھ دیا تھا؟" وہ خوشامد سے بولا۔

"اور سکھ کون سا دیا تھا؟" وہ نفرت سے بولی۔

اُس کے گلے میں غصّہ پھانس سا آیا مگر اُس نے ضبط کیا۔

"جو کچھ میں تمہارے لیے کر سکتا تھا۔ میں نے کیا۔"

"کیا ہوگا۔" وہ طنز سے بولی "مگر اب میرے لیے وہ زندگی دوبارہ اختیار کرنا مشکل ہے۔"

"کیوں؟؟"

جواب دینے کی بجائے بیگماں نے کندھے اُچکائے اور لٹکے ہوئے گلاس کے اُس ٹکڑے کو دیکھنے لگی جو اُس پر عبدالرحمان کا گھونسا لگا
[او]ر اُس میں سے لہو رس رہا تھا۔ مگر عبدالرحمان کو پتہ بھی نہ تھا۔ وہ بھی کچھ نہ بولی۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر وہ بڑے درد
سے بولا

"بیگی! تم میرے ساتھ سوئی ہو۔ میں نے بچوں کی طرح تمہیں اپنی گود میں اُٹھایا ہے —— مگر اب میں اتنی دیر سے تمہارے قدموں
[میں بیٹ]ھا ہوں اور تم نے مجھے اتنا نہیں کہا کہ اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

فقرہ ختم کرتے کرتے اُس کی آواز غصّے سے لرزنے لگی۔

بیگماں نے اُسے غور سے دیکھا "میں نے تمہیں کب کہا تھا آنے کے لیے؟"

اور وہ اُٹھ کر باہر جانے لگی۔

عبدالرحمان کے دل میں جیسے نشتر سے تیر لگا۔ بے عزتی اور شرم کے احساس سے اس کا گلا بند ہونے لگا۔ مگر پھر بھی اس نے لپک کر بازو پکڑا۔

بیگماں بازو چھڑاتے ہوئے ڈپٹ کر بولی "چھوڑ دو مجھے"۔

اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی — وہ اس بازو کو پہلے بھی کئی دفعہ پکڑ چکا تھا۔ مگر آج وہ پہلے کی نسبت بہت سڈول اور چکنا لگ رہا تھا۔ اس میں ابھرا ہوا جنسی تناؤ تھا اور ایک وزنی سا لمس تھا۔ اس کی نظریں زیور پر جم گئیں۔

بیگماں کی ہنسی سنائی دی اور پھر آواز:

"یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔"

اس کے جسم کا تار تار غصے اور نفرت سے جھنجھنا اٹھا۔ — ایک لمحہ ہی کو تو پہلے کے فیصلے کی سفید چادر اس کے ذہن میں [illegible] بیچارہ رشوت لی، جیل گیا، زندگی تباہ کی اور اب وہ کہتی ہے کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔

اس نے زخمی سانپ کی طرح سر اٹھایا.....

.......بیگماں طنز بھری مسکراہٹ سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حقارت اور تمسخر تھا۔ جیسے کسی بہت ہی گری ہوئی معمولی اور حقیر شے کو دیکھ رہی ہو۔ عبدالرحمان دیکھتا رہا۔ مگر ان آنکھوں کے تاثرات ویسے ہی رہے.....

غصے سے ایکدم پاگل ہو کر اس نے دونوں ہاتھوں سے بیگماں کا گلا دبا لیا۔

"حرام زادی... کمزور ہوں" اس کی غراہٹ کانپی۔

بیگماں نے گلے سے خرخر کرتے ہاتھ پاؤں چلائے تو گلا چھوٹ گیا۔ وہ مڑ کر بھاگنے لگی۔ تو عبدالرحمان غصے سے پھر لپکا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہتھوڑی آئی اور دوسرے میں سر۔ بیگماں نے چھٹنے کے لیے زور لگایا اور اس نے گرفت مضبوط کرنے کے لیے۔ دونوں کی اس کشمکش میں گردن کو ایک موڑ آیا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ اور......... بیگماں بے جان ہو کر گر پڑی۔

عبدالرحمان دہشت کھا کر پیچھے ہٹا۔ کچھ دیر فاصلے سے دیکھتا رہا۔ پھر ڈرتا ڈرتا قریب آیا اور جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کی انگلیوں کے نشان گلے پر جمے ہوئے تھے۔ ہتھوڑی والی تھی۔ گردن دوہری ہو رہی تھی — اور سانس کا نشان بھی نہ تھا۔

"بیگی"

چلا کر وہ اس کے اوپر گرا۔

عین اسی وقت عاقل دو دوستوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

عبدالرحمان کو پیش کیا گیا تو تھانیدار صاحب اس کے کیس کے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ ان کا پھولا پھولا چہرہ اور بڑی بڑی

ین بالکل ساکت تھیں۔ تھوڑا تھوڑا اُٹھتے رہے اور پھر موٹی موٹی آنکھیں اُٹھا کر عبدالرحمان کو دیکھا

"ہوئے" وہ اونچی آواز میں بولے "تم نے قتل کیوں کیا؟"

مگر عبدالرحمان سر ہلاتے ہوئے بولا "قتل میں نے نہیں کیا جی ——— بالکل نہیں کیا۔"

"سب لوگوں کا کہنا ہے کہ قتل تم نے ہی کیا ہے ——— ہیں؟" وہ آگے کو جھک کر دھاڑے۔

"تھانیدار جی۔ میں نے نہیں کیا ——— میں تو صرف ایک کھلونا ہوں۔"

"تو جس نے کیا ہے اوئے" وہ اسی طرح گھورتے ہوئے بولے۔

عبدالرحمان نے ہتھکڑیوں والے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیے۔

تھانیدار جی کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"تجھے اوئے ——— وہ کیسے؟"

عبدالرحمان بڑے درد سے بولا "اُس نے میرے پتے کو پھندا نکالا تھا۔"

تھانیدار نے موٹی سی گالی دی "ادھر آ اوئے ——— عمردین۔" وہ دہاڑا۔

"جی صاحب۔" اردلی اندر آیا۔

"ادھر جو بیٹھا ہے۔ ان کا خصم مست ورد ہی ہوتا ہے ——— جو لٹکا ہے پیر بن جاتا ہے ——— ابے میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔ بلا اُس حرامزادے چکوال والے کو۔"

اردلی کانپ کر بھاگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک یم شحیم سپاہی اندر آیا۔

"شیر بخش سے جاؤ اس حرامی کو اور نکلواؤ اس کا بیان۔"

شیر بخش کا منہ اُتر گیا۔ وہ ابھی چھٹی کی درخواست دے کر اندر آنے ہی والا تھا۔ سینما میں بڑی اچھی فلم لگی تھی اور ٹینیفر نے خاص طور پر ٹیلیفون کیا تھا۔

"جناب آپ نے کچھ پوچھ گچھ کر لی؟"

"اوئے بے جا جناب کے بچے ——— ٹرز کرنے لگ گیا ہے۔"

شیر بخش نے قہر بھری نظروں سے عبدالرحمان کو دیکھا اور ہتھکڑی والے سپاہی کو ساتھ آنے کے لیے کہا۔ کمرے تک پہنچتے پہنچتے شیر بخش نے دو چار بھیڑ عبدالرحمان کو لگائے اور زیر لب بڑبڑایا۔

"ان کے خصم نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا ہے۔"

کمرے کا دروازہ کھول کر اُس نے عبدالرحمان کو زور سے اندر دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اندر آیا۔ جب سنبھل کر گرد دیکھا تو ....

چھوٹا سا کمرہ ـــــ درمیان میں چھوٹی سی میز ـــــ میز کے اوپر کنارے پہ ایک شکستہ ـــــ گلدستہ پہ چھت سے بندھی ہوئی دو رسیاں لٹک رہی تھیں.........

کچھ عرصہ پہلے اس نے اسی کمرہ میں پھانسی لگائی تھی اور بعد میں بیوی سے بحث کی تھی۔ یہ سب ایک شعلے کی طرح اس کے ذہن میں کوندا ـــــ اور وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شیر بخش مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ "یہ قیدی سالا تو بالکل ہی بے جان نکلا۔ ابھی کب سے ٹنگا ـــــ آج کی عمر گھڑی کا ہو گئی۔"

جوش صاحب

محمد طفیل

جوش صاحب

محمد طفیل

ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میں نے نیاز فتحپوری پر اپنے "تعصبات" کا اظہار کیا تھا۔ آج جوش صاحب پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں جو بلاشبہ "تعصبات" ہی کے ذیل میں آئیں گے۔

ان دونوں بزرگوں کو پڑھنے میں مجھے ان کی کئی رگیں ایک ہی جگہ جا کر ملتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ میرے مطالعہ کا قصور ہے یا ان اکرم فرماؤں کا، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اردو کے ان جیالوں کو اپنے اپنے رنگ میں دکھانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔

دونوں ہی شاہباز، دونوں ہی مذہب کا کافر، دونوں ہی قلندر، اور سب سے بڑا عیب دونوں کا یہ کہ تقاضائے انسانیت سے آشنا، نہ صرف آشنا بلکہ پیغمبرانہ حد تک پرچارک!

یہ صرف انسان ہی نہیں، شاعر بھی ہیں۔ دوہری تہری "خوبیاں اور خرابیاں" اس لیے یہ اچھے کام بھی کریں گے اور بُرے کاموں کی اوسط بھی خراب نہ ہونے دیں گے۔ اس اعتبار سے یہ مجھے مکمل انسان نظر آتے ہیں۔ دونوں رُخ مکمل!

نواب محمد علی خان ان کے چچا تھے۔ آمدنی کوئی لاکھ روپے سالانہ کی ہوگی۔ کچھ اتنی ہی آمدنی ان کے والد بزرگوار (نواب بشیر احمد خان) کی تھی۔ جو ان صاحبِ حوصلہ بزرگوں نے بدانتظامی، مقدمہ بازی اور دل کے ارمان نکالنے کی نذر کر دی۔ تلچھٹ میں جو کچھ انہیں ملا، انھوں نے بھی خاندانی روایات کو شرمسار نہ ہونے دیا۔ خُوب خوب عیش کیے۔ خُوب خوب جیے۔

ملیح آباد کے پٹھان، شبیر حسن خان نام، تخلص جوش، نواب ابن نواب کے بعد صرف جوش، شبیر حسن خان بھی نہیں۔

اجداد میں شعر و شاعری کے چرچے، بلکہ شاعر بھی، وہی ملتے جلتے جاتے ان تک پہنچی۔ مگر ان کے بزرگ رُسوا کن حد تک بدنام نہ تھے جتنے کہ یہ ہیں۔ اگر ان کا ذکر ہوا بھی تو اس لحاظ سے کہ گویا اور بشیر، جوش کے اجداد میں اچھے شاعر تھے۔

کئی معاملات میں یہ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ کبھی اتنے خود غرض کہ آپ بکا بکا رہ جائیں، کبھی اتنے مخیر کہ عقل زمانے۔ ان کے مزاج کی دھوپ چھاؤں، انسانی فطرت ہی کی غماز ہے۔ ایک رُخ کے اظہار سے بونے، اور دوسرے رُخ کے اظہار سے، عام انسانوں کے قد سے اونچے نظر آئیں گے۔ اس لیے پھر دیکھیے اس قصے کو!

جوش صاحب نے اپنی شخصیت پر کوئی نقاب نہیں ڈال رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی ستر پوشی کے باوجود ڈھکے چھپے نہیں رہتے۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں دنیا کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ مگر جوش صاحب کو یہ ملمع بازی پسند نہیں۔ یہ مصلحت آمیز قسم کی قیود سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔

میں کئی ایسی شخصیتوں سے واقف ہوں۔ جنھوں نے اپنے اوپر شرافت کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو جھانکنا

...ت مشکل ہے۔ پر جا بیٹھ پڑھ لیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر اگر ایک غلاف اُتار دیا جائے تو وہ بالکل آدمی کی صورت میں نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ بعض کے دو غلاف اُتارے جائیں تو، بعض کے تین اُتریں تو ——— اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں جتنے غلاف، اُتار ڈالیں۔ ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔

یہ چھوٹے بڑوں کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ دوست ہو تو، دشمن ہو تو، وہ آپ بھی ہے اور جناب بھی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ جوش صاحب بڑے مودب ہیں۔ جناب! یہ بڑے جھکڑ بھی ہیں۔ ان کے نزدیک جو زیادہ محترم نہیں۔ وہ تو آپ اور جناب کے کھاتے میں، جو دوست ہے یار ہے۔ وہ ہے دُوسرے کھاتے میں، بیچ والا راستہ ان کے یہاں نہیں۔ ابے تبے، توں تڑاں ان کے ہاں نہیں چلتا۔

جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں۔ ان کے الفاظ میں یوں تھا:

ایک بڑے کڑیل پٹھان، بڑے ہی رُعب داب والے، ہمارے والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو ہمارے والد آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ہم بڑے پریشان ہوتے تھے کہ ہمارے میاں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایک دن پوچھ ہی بیٹھے "میاں کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا، ہم ان سے ڈرتے ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ یہ صاحب فلاں محلے کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ بڑے بہادر اور مال دار تھے۔ مگر اب کچھ عرصے سے ان کے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ زندگی کے دن کاٹنے کے لیے اب یہ مجھ سے گزارہ لینے آتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں تاکہ نہ آنکھیں چار ہوں اور نہ انھیں شرمساری ہو۔"

بچپن کی ایک بات اور بھی سناتے ہیں:

عہدِ طفلی میں ہم پر بڑی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اُونچا نہ بولیں۔ ننگے سر نہ پھریں۔ کوئی چیز بازار میں نہ کھائیں۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے نہ چلیں۔ ایک دن شامتِ اعمال، ہم دونوں بھائی اپنے ایک ہمجولی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے۔ کسی طرح اس کا علم والد صاحب کو ہو گیا۔ انھوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ دریافت کیا۔ کیا تم دونوں آج فلاں لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے؟ ہم نے اقرار کر لیا۔ کیا کرتے۔

جس وقت والد صاحب یہ پوچھ رہے تھے۔ اس وقت وہ حُقّہ پی رہے تھے۔ انھوں نے حُقّے پر سے چلم اُتاری۔ دیکھتے ہوئے انگارے ہم دونوں کے ہاتھ پر رکھ دیے ——— خبردار جو آئندہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلے

اس کے بعد جوش صاحب نے یوں تبصرہ کیا۔ والد صاحب نے بھی ہمیں بچپن میں سنوارنے کی کیا کیا ترکیبیں نہ کیں۔ مگر جو ہوا ہی ازل بدمعاش بھلا وہ کیسے سدھرتے!

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "انگارہ بازی" ان کے والد کے مزاج میں شامل تھی۔ ایک واقعہ اور بھی ہیں نے انہی کی زبانی سنا

سنا تھا اور تمہید کے بعد وہ بھی سناتا ہوں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ جوش ملیح آبادی کو زبان کی غلطیاں پکڑنے کا بڑا شوق ہے۔ دیر سے پاس بیٹھے ہوتے تو ابھی کہتے "ارے نالائق! غلطی کی بھی انتہا ہے۔ غلطیاں نہیں (چھوٹے کٹھور کر) یوں تو بنا کے رکھ دیں گے۔ یہ جو ایک سلسلہ جوش نمبر چل رہا ہے وہ انہی کے اسی شوق کے صدقے میں تو نکل رہا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے میرے مالدار کے جہاں ادب کی کتابوں میں سے غلطیاں نکالیں سکھا انھیں بھی جوش صاحب کی غلطیاں نکالنے کے لیے پورا ایک نمبر چھاپنا پڑ رہا ہے۔

یہ خوبی جوش صاحب کی اکتسابی نہیں۔ بلکہ انھیں ورثے میں ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ کہا —— "پان لگاؤں؟" تو ابا جان نے اسی وقت اُگالدان نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور کہا کہ غلط زبان بولنے پر اس طرح سزا ملے گی۔ پان بنایا جاتا ہے۔ لگایا نہیں جاتا۔

جوش صاحب سے خط و کتابت تھی۔ تکلف کی سی فضا میں واجبی سے تعلقات تھے۔ جب لاہور سے دلی پہنچا۔

"جی ہاں!"

"زندہ ہوں!"

"بہت اچھا، بہت اچھا —— اچھا ——"

"آہاہا! واہ وا، بھئی خوب آئے۔ بیٹھو بیٹھو!"

"میرے ایک دوست پاکستان سے آئے ہیں۔ ان سے کہہ رہا تھا۔"

"کہہ دوں گا۔"

"تم تو اچھے ہو!"

"کہہ تو دیا ہو جائے گا!"

"جی ہاں! میں نے کہہ دیا تھا کہ جب وہ کپڑے پہن لیتی ہیں تو بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں!"

"آہاہا!"

"آداب عرض!"

جوش صاحب سے ملنے جب میں ان کے دفتر میں پہنچا تو وہ ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے جو اور جس قسم کی باتیں ہوئیں وہ آپ نے بھی سن لیں۔

چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی۔ میں نے بنائی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا —— "بہت پی ہے۔ خدا کے لیے مجھے نہ پلائیے!"

"چائے پی لو میاں! خدا وا کوئی نہیں ہے۔ خدا کا لفظ تو بزدلی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ جنگلوں میں

رہتے تھے۔ راتوں کو سانپ سونگھ جاتے تھے۔ وہ کوشیر کھا جاتے تھے۔ بجلی چمکتی تھی تو لرز جاتے تھے۔ لوگوں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دل کو سہارا دینے کو کسی طاقت کا سہارا لیا ہے جو ہمیں ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ اُمید، بزدلی، احتیاط اور ناطاقتی کا نام خدا ہے۔ جب آباؤ اجداد غائب ہی ہونے لگے تو سوچا کہ مرنے کے بعد بھی رُوح باقی رہتی ہے۔ اس سے سمجھ دار لوگوں نے بیوقوفوں کی بے بسی سے فائدہ اُٹھا کر خدا کو حقیقت منوا لیا۔"

اس بھرپور وار کے بعد ان صاحب کو چائے پینی پڑی۔ بلکہ اُنھوں نے پہلے ہی دو ایک فقروں میں چت ہو کر چائے پینی شروع کر دی تھی۔ یہ تقریر کر رہے تھے وہ چائے پی رہے تھے۔ جب یہ چائے پینے لگے تو اُنھوں نے ایک سوال اور جھاڑ دیا۔

"جوش صاحب آپ کچھ بھی کہیں۔ مگر آپ لوگوں کے دلوں سے خدا اور مذہب کے تصور کو ختم نہیں کر سکتے۔"

"جناب ایک بات تو ذہن میں رکھیں کہ رسولؐ نے خدا کو پیدا کیا۔ ورنہ اللہ تھا کہاں، کوئی بھی رسولؐ سے پہلے "ان صاحب" سے واقف نہ تھا۔ رسولؐ نے مذہب کی آڑ میں لوگوں کو لالچ بھی دیا۔ ڈرایا بھی، دھمکایا بھی ——— لالچ یہ دیا اگر تم اللہ کے بتائے ہوئے دین پر چلو گے تو مرنے کے بعد جنت میں جاؤ گے۔ جنت میں شراب ملے گی۔ حوریں ملیں گی۔ دُودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ چونکہ اہلِ عرب شراب کے رسیلے تھے اور عورتیں اُن کی کمزوری تھیں۔ اس لیے وہ رسولؐ کے کہنے سننے میں آ گئے۔ (نقلِ کفر، کفر نباشد) اس لیے کہ رسولؐ نے موت ایسی خوفناک حقیقت کو بھی لذیذ ترین شے بنا دیا تھا۔ محمدؐ واقعی دُنیا کا سب سے بڑا انسان گزرا ہے۔ جس نے عرب ایسی جاہل قوم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ اسی لیے میں نے کہا ہے ؎

ہم ایسے منکرِ حق کو ثبوتِ حق کے لیے   اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ورنہ مذہب تو فطرتِ انسانی کے ساتھ ایک گستاخی ہے۔

میں نے بھی ذرا چھیڑا۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے ہاں مذہب کی بنیادیں لرز رہی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو مذہب ہی سب کچھ ہے (یہ باتیں اُن دنوں کی ہیں، جب جوش صاحب بھارت کے شہری تھے۔)

جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بھی کیا ہے۔ آپ کے ہاں کا جو سب سے بڑا مولوی ہے۔ وہ اور میں بھوپال میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت تو وہ بالکل آدمی تھے۔ اب مولوی بن گئے ہیں۔ لیڈر ہو گئے ہیں۔ پیٹ بُری بلا ہے۔ اگر ان کے معاشی حالات اچھے ہوتے تو وہ ہرگز مولوی نہ بنتے۔ بدستور آدمی بنے رہتے۔ مجھے ان سے اور کوئی شکایت نہیں بجز اس کے کہ وہ پڑھے لکھے ہو کر مولوی بن گئے۔ خُوب پہچانا ہے اُنھوں نے بھی مسلمان قوم کو، مذہب کے نام پر کوئی جتنا چاہے اسے بے وقوف بنائے۔

باتوں کا سلسلہ بڑا طول پکڑ گیا تھا۔ اس لیے حاضرین میں سے کسی نے کہا "جوش صاحب ان باتوں کو چھوڑیے۔ کوئی رُباعی چھیڑیے۔"

"بہت اچھا ڈارلنگ" کہہ کر، سامنے رکھی ہوئی ڈبیا سے پان لے کر شعر و شاعری کا آغاز کر دیا۔ بہت سی رُباعیاں پڑھیں۔ ان میں سے دو چار آپ بھی سن لیں۔

تحقیق کو جس وقت بصیرت نکلی   پردہ میں ذہانت کے خباثت نکلی

جب علم کی سطح کو ذرا سا کھرچا   تہہ جو کی ساخت پہ جہالت نکلی

اللہ میں حکمت جو نہیں پاؤں گا   میں حشر میں ہنگامے سے ٹھہراؤں گا
ہوگی جو بجائے عدل رحمت مجھ پر   تو اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا

چونکہ اس وقت ان کا موڈ مذہب اور علم کے دھارے کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے رُباعیاں بھی ویسی ہی پڑھیں۔ یہ بحث بعد میں کریں گے کہ مذہب کے معاملے میں ان کے اصلی خیالات کیا ہیں اور ان کی باتوں میں زیبِ داستان کے لیے کتنا کچھ ہوتا ہے اور کیوں ؟

یہاں ذرا ” ذہن کا ذائقہ بدلنا چاہیے اور جوش صاحب کے خاص رنگ کی بھی ایک دو رُباعیاں سُن لینی چاہئیں۔ جو اُنھوں نے اسی وقت آنکھیں بند کر کے اور لہرا لہرا کر پڑھی تھیں۔

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں   گھڑیاں روکیں مگر گزرتی ہی رہیں
اُمید کا رخسار میں بھرتی رہیں رنگ   اور یاس کی جھریاں اُبھرتی ہی رہیں

کاکل کھل کر بکھر رہی ہے گویا   ندی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تری جھپک رہی ہیں مجھ سے مل کر   دیوار سے دھوپ اُتر رہی ہے گویا

یہ تھی میری پہلی تفصیلی ملاقات جو ہوئی تھی ۱۹۵۰ء میں !

میں ان کے پاس وہاں کوئی دو گھنٹے بیٹھا ہوں گا۔ ان کی باتیں ایسی مسحور کن تھیں کہ مجھے ان کے تکلم کی سحر انگیزیوں میں گم ہو جانا پڑا۔ یہ ہر بات کو اس انداز میں نہیں سوچتے۔ جس طرح سوچا جاتا ہے بلکہ ان کے سوچنے کا انداز بھی اپنا ہے۔ جو عجیب و غریب ہونے کے باوجود غور و فکر پر آمادہ کر دیتا ہے۔

شام کو پھر جوش صاحب نے اکٹھے مل بیٹھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کھانے کی دعوت دی اور یہ بھی نوید سنائی کہ شعر و شاعری بھی ہوگی۔

اندھا کیا چاہے ” دو آنکھیں “! میں پہنچا۔ مختصر سی نشست تھی۔ چپٹی بوتل سامنے رکھی تھی۔ بس شعلۂ مار دو سے سبھی کو شوق فرمانے کی دعوت دی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق سبھی نے ہاتھ بڑھائے۔ جو میری طرح کے ازلی بزدل تھے۔ وہ تشنہ لب رہے۔

یہ پیتے جاتے تھے اور شراب پر وعظ فرماتے جاتے تھے اور ہم بزدلوں کو سمجھا رہے تھے کہ اسلام کی رو سے بھی شراب پینا ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں آیا ہے کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز مت پڑھو۔ مگر نشے کی حالت میں شعر کہنے، پڑھنے اور سننے سے تو نہیں روکا گیا۔ میرے نزدیک تو یہ بھی ایک عبادت ہے۔ نماز روزہ تو انسان اپنے لیے پڑھتا اور رکھتا ہے۔ مگر شاعر اپنا خونِ جگر اللہ کے بندوں کے لیے صرف کرتا ہے۔

یہ ماحول تھا، جس میں جوش صاحب نے اپنی نظم ” محمد متی برسات “ شروع کی اور ایسے جذب کے ساتھ پڑھی کہ لطف آ گیا۔ اس میں

ایک چیلنج کی بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھی۔ ترنم تو خیر پٹھانی قسم کا تھا۔ لیکن اس ترنم میں بھی ذرا سی ایک بات ضرور تھی۔ میں اس نظم کے کئی مصرعوں پر کھو سا گیا۔ میں شعر بڑے بے ڈھنگے طریقے سے سنتا ہوں۔ وہ یوں کہ شاعر پڑھ رہا ہوتا ہے اور میں چپ بیٹھا ہوں۔ کبھی کسی شعر پر واہ کہہ دیا تو کہہ دیا۔ ورنہ چپ، وہ بھی اتنی مدھم آواز میں کہ شاعر سُن نہ سکے۔ لیکن اُس دن نظم سُنتے ہوئے میں نے اپنی روایات کو توڑ دیا تھا۔ میں بے خود ہو گیا، سرشار ہو گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے دل کھول کر داد دی۔ میرے جاننے والے حیران تھے کہ میں موج میں ہوں۔ حالانکہ میں موج میں نہ تھا۔ بلکہ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی کتنا ہی بدذوق کیوں نہ ہو وہ اچھے شعروں پر وجد میں آ سکتا ہے۔

اس ضمن میں مجھے ایک بات یاد آئی۔ نواب جعفر علی خاں اثر لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ مجھے دُوسرے شعرا کے اچھے شعر سنائیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اُن دنوں فراق گورکھپوری اور اثر لکھنوی میں ٹھنی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دُوسرے کے خلاف لکھنا نقوش ہی سے شروع کیا تھا ——— اور اثر صاحب مجھے فراق پارٹی کا آدمی سمجھتے تھے۔

اثر صاحب نے بڑے بڑے پائے کے شعر سنائے۔ میں بے حد لطف اندوز ہوا۔ مگر اُنھوں نے ایک شعر ایسا سُنایا کہ میں تڑپ اُٹھا۔ بے اختیار ہو گیا۔

اثر صاحب نے میرا رنگ دیکھا تو فرمایا: "اب تو بے قابو ہونا ہی تھا۔"

میں نے سنبھل کر کہا: "جی!"

"میں نے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر سنائے۔ مگر آپ چلے تو فراق کے شعر پر۔"

میں نے عرض کیا۔ "آپ مجھ سے جیسی کی چاہے قسم لے لیں۔ مجھے اس سے پہلے علم نہ تھا کہ یہ شعر فراق کا ہے۔"

معلوم ہوا کہ اچھا شعر ہو تو وہ پتھر ایسے آدمی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

ہاں تو بات جوش کی نظم "مجھو نتی برسات" کی ہو رہی تھی ——— اس کے بعد میں نے دوبارہ یہی نظم ایک ایسی رنگین محفل میں سُنی کہ جس کا ماحول ہی شاعرانہ تھا۔ متعدد مجسم شعر اور متعدد مجسم مصرعے بہ نفس نفیس موجود تھے اور راجہ اندر یعنی کہ جوش صاحب لہرا لہرا کے پڑھ رہے تھے:۔

ہاں، دیکھ، ذرا مرے سرو لب جُو
گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہوا جادو
ندتار ڈھچوں سے یہ اُڑتے ہوئے جُگنو
یہ کُنج میں رنمان سیہ مست کی یاہُو

اے دولت پہلو

ہاں، آن اُڑا آن، قرپا دو گُل رُو

اے دولت پہلو

ساحل پہ یہ اُٹھتی ہوئی جنّت کے نظارے
افلاک پہ یہ سُرخ دوشالوں کے کنارے
بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشارے
اُلجھے ہوئے میلے، اُبھرتے ہوئے جھالے
ماحول میں گہری ہوئی اٹکتے ہوئے چہرے

اے دولت پہلو

ہاں، آن کا آن، قرابہ و گُل رُو

اے دولت پہلو

ذرا سوچ، وہ لے ہوئی کس ٹھٹ سے لات
جب ناز سے اُلجھے ہوئے گرے پہ دھرے ہات
دل کو ہو فروشندہ و رقصندہ جواں رات
کیا بات ہے، برکت ہے، برسات ہے، ہیہات
مر جاؤں اسی بات پہ، چل جائے جو تب بُو

اے دولت پہلو

ہاں، آن کا آن، قرابہ و گُل رُو

اے دولت پہلو

اُس ماحول نے اس نظم کو بہت دُور پہنچا دیا تھا۔ ہر مصرعہ پر جوش صاحب کے اشاروں اور قدموں سے ایک عجیب غضب طاری تھی۔ تصوّر فرمائیے۔ جب زرتار دوپٹوں کے ذکر پر، زرتار دوپٹوں کی طرف اشارے ہوں، گنگنی میں ننھے بسے ست کو ہاتھ کے وقت یا اُٹھ کے غشے اٹھیں۔ بجلی کی لپک میں حسینوں کے اشاروں پر اشارے ہوں —— اور پھر ناز سے اُبھرے ہوئے گرے پہ دھرے ہات —— پر ان کا گوشوں پہ ہاتھ دھر کر ایک لپک کرنا، سمجھنے والوں نہیں اور یہ سب کچھ مخصوص دوستوں ہی کی محفل میں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس ماحول میں ہر شئے ڈول رہا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر آپ کو جوش صاحب کی ظریفانہ سوچوں سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ میں نے کوشش اس امر کی کی کہ آپ کو جوش کا یہ رُخ بتانے تاکہ آپ کا دل بہلا ہے۔ اس لیے کہ انسان ہو تو خدا کے نزدیک ہونے میں خوش رہ سکتا ہے یا پھر —— یا پھر ——!

اللہ کا شکر کہ بعد میں بھی جوش صاحب سے ملنا جلنا رہا اور نہ میری بھی ان کے بارے میں ذہنی رائے جوں کی توں رہی جو اس وقت آپ کی

ہے۔ یہ کہ "بد تمیزی کی حد تک مذہب دشمن ہیں۔"

مذہب کے معاملے میں پختہ عمر تک سبھی ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند، چہرے پہ نورانی داڑھی۔ غرض مجھ جیسے اور آپ جیسے مسلمان تھے۔ جو زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہتے ہوں اور خدا اور رسولؐ کا نام آتے ہی گردن جھک جاتی ہو۔ مگر ہمارا عمل؟ سراسر غیر اسلامی، نماز روزہ بھی دکھاوا، اس لیے کہ جب تک مذہب کی روح کو سمجھا نہ جائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال نہ لیا جائے۔ اس وقت تک تمام نعرے سیاسی اور کاروباری ہوں گے۔ آج کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کو دھیان میں رکھ لیجیے اور اس کا مقابلہ رسول اللہؐ کے کسی ادنیٰ سے صحابی سے بھی کر کے دیکھ لیجیے۔ عقل و ہوش کی ساری سیڑھیاں کھسکتی نظر آئیں گی۔

جوش صاحب جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ میں ان کا ہمنوا نہیں۔ قطعاً نہیں اور میں ان مولویوں کا بھی ہمنوا نہیں جو خدا اور رسولؐ کا ذکر بھی معاوضے پر کرتے ہوں بلکہ میرے دل میں ان درویشوں اور بوریہ نشینوں کا احترام ہے جنھوں نے مذہب کی خدمت اس انداز سے کی جس میں نمائش کا کوئی پہلو نہ تھا۔ بلکہ عاجزی ہی عاجزی تھی۔

جوش صاحب آج بظاہر دہریئے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کٹر شیعہ بھی تو رہ چکے ہیں۔ کیا کوئی شیعہ دہریہ ہو سکتا ہے؟ آپ کہیں گے ہو سکتا ہے۔ جوش صاحب ہی کو دیکھ لیجیے۔ مگر یہ جواب تسلی بخش نہیں۔ اس لیے کہ دہریہ کبھی بھی شیعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حضرت علیؓ کی اور امام حسینؓ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ رسولؐ کی عظمت کو بھی دل و جان سے مانتے ہیں۔ بس ذرا خدا سے دل گیر رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ہم جیسے ہی مسلمان ہیں۔ یہ جو مسلمان نہیں ہیں تو اس قلابازی کی بھی ایک وجہ ہے۔ جب یہ حیدرآباد دکن میں ملازم تھے تو انھیں ایک دن یک لخت یہ آرڈر ملا کہ پندرہ دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیے۔ اس وقت ان کا ساتھ، کوئی دس بارہ آدمیوں کا تھا، دو بچے تھے۔ بیوی تھی اور اس کے ساتھ عزیز و اقارب، حیدرآباد سے نکلے تو تین برس تک ذہنی اذیت میں مبتلا رہے۔ پیٹ کی مار کے ہاتھوں عاجز رہے۔ تن کا رشتہ روح سے برقرار رکھنا محال ہو گیا۔ اس وقت جو ڈگمگائے تو آج تک نہیں سنبھلے۔ کہتے تھے کہ خدا کہتا ہے۔ میں رزاق ہوں اور میں ہوں کہ نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہوں۔ اگر خدا ہوتا تو اپنے بندے کو یوں عاجز نہ بناتا۔ یہ تھے وہ واقعات و حالات جن میں یہ خدا سے ناراض ہو گئے۔ خدا کے منکر تو آج بھی نہیں۔ زبان سے کچھ ہی کہتے رہیں مگر خدا کے وجود کا اقرار قدم قدم پہ کرتے ہیں۔ اس وقت بھی کیا۔ جب یہ افتاد پڑی تھی۔

اس طلسم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزدِ باری

جوش صاحب خدا سے ناراضی کا ایک اور واقعہ بھی سنایا کرتے ہیں:

"میں ایک دن صبح ہی صبح سیر کے لیے نکلا کر دیکھتا ہوں کہ ایک بڑھیا پھٹے حالوں، لاٹھی ٹیکتی چلی آ رہی ہے۔ مجھے ترس آیا۔ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کے دیا۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا۔ ابھی میری بہو زندہ ہے وہ مجھے پانچ روپے مہینہ گزارے کے لیے دے دیتی ہے۔ جیسے تیسے کر کے گزارہ کر لیتی ہوں۔ جس دن وہ مر گئی شاید اس دن مانگنے کی نوبت آ جائے۔ مگر ابھی نہ لوں گی۔"

میں نے سوچا کتنی خود غرض ہے یہ بڑھیا۔ اس کی حالت پر مجھے ترس آرہا تھا کہ سب صاحبوں کو اس بڑھیا کی خاطر
مجھ سے بغاوت پر آمادہ کیا۔ وہ دین اور آج کا دل' اپنی خطا سے نہیں بچی۔

ایک مولوی خدا کے پاس ہیں' اپنے ایسے ہی "ارشادات عالیہ" سے حاضرین کو مستفید فرما رہے تھے کہ بہت ---- جہالت کر کے خدا کا وجود ظاہر ہی آگیا ہے ---- اس پر میں نے کہا۔ "جوش صاحب اگر خدا سچ مچ نکل آئے تو پھر آپ کا کیا بنے گا؟"

کہنے لگے۔ "ایسی صورت میں اللہ میاں مسکراتے بغیر بغلگیر ہو جائیں گے اور کیا ہوگا۔ خدا جسے ہم سب رحیم اور کریم کہتے ہیں وہ ظالم نہ ہوگا کہ اپنے بندوں سے انتقام لے۔"

یہ عام تو ہیں سے ذرا مختلف طریقوں سے سوچتے ہیں۔ خواب سے نفرت تھی! اگر مندرجہ ذیل واقعہ کسی اور کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو وہ جانے خود کو ولایت کی کونسی منزل پر پہنچا دیتا۔ کہتے ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے ایک نعت لکھی تھی۔ بڑے ہی جذب کے ساتھ۔ اسی رات خواب میں ایک بزرگ شخصیت کو دیکھا۔ احساس ہوا رسول اللہ ہیں۔ کمرا بھی معطر ہو گیا۔ صبح جاگ اٹھا تو مجھے کمرہ ویسا ہی معطر ملا۔ خوشی اور حیرت کے ساتھ بیگم کو آواز دی۔ وہ آئیں تو کہنے لگیں۔ کمرا بڑا معطر ہے۔ اس کے بعد میں نے نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا تو وہ بھی کہنے لگا کہ کمرے سے خوشبو آ رہی ہے۔

میں سوچنے لگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ یہ سب جذبے ہی کی شدت کا تصرف تھا اور اس میں کوئی کراماتی پہلو نہ تھا۔

واقعی اگر یہی خواب کسی مولوی کو آجاتا اور میں کچھ وہ محسوس کرتا تو وہ اپنا بھی دماغ خراب کر بیٹھتا اور اوروں کا بھی!

جس حیدرآباد سے نکلے۔ وہاں جانے کا وسیلہ عماد الملک بنے۔ انہوں نے ہی نظام سے انہیں روشناس کرایا تھا۔ عماد الملک نے یہ کہہ کر ان کی تعریف کی کہ اس وقت جوش ہی ہندوستان کا منفرد شاعر ہے جو اپنے اندر جان رکھتا ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ میں نے آج تک کسی شاعر کی تعریف نہیں کی۔ مگر مجھے جوش کے کلام نے اتنا متاثر کیا ہے کہ آپ سے عرض کروں کہ انہیں یہاں بطور خاص بلایا جائے۔ اس وقت عماد الملک کی بڑی پوزیشن تھی اور جوش صاحب اتنے بڑے شاعر نہ تھے۔ بس ستاروں پہ کمندیں پھینکنے والے ایک ابھرتے شاعر تھے۔ چنانچہ ان کا تقرر نظام کے حکم سے ہوا۔ کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر انہیں (بقول شاہد احمد دہلوی) انگریزی ادب کے شعبۂ تراجم میں دھانس دیا گیا۔

بعد میں تو حیدرآباد میں ان کا خوب طوطی بولا۔ امرا اور رؤسا سے یہ ایسے ملتے تھے جیسے وہ کوئی ان کے ذیل ہوں۔ ماتحت ہوں۔ نظام کے ہاں بھی انہیں درباری ضابطوں کی رعایتیں تھیں۔ مثلاً نظام کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے ایک خاص قسم کے لباس کی ضرورت ہوتی تھی جس سے جوش صاحب مستثنیٰ تھے ---- اور پھر یہ واقعہ بھی اسی حیدرآباد میں پیش آیا کہ جب یہ نظام کے حکم سے پندرہ دن کے اندر حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو وہ لوگ جو انہیں روز گھیرے رہتے تھے اور ان سے طرح طرح کے فائدے اٹھاتے تھے۔ وہ سب کے سب پرے ہٹ کر رہ گئے۔ جس وقت انہوں نے حیدرآباد کو چھوڑا۔ اس وقت اسٹیشن پر ایک شخص بھی خدا حافظ کہنے والا نہ تھا۔

نظام کے منجھلے بیٹے معظم جاہ سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ پہلے یہ پیتے تو تھے۔ مگر اتنے باقاعدہ نہ تھے۔ وہاں کی روزانہ نشست میں معززانہ چلی اور خوب چلی۔ معظم جاہ ابا جان کے چہیتے بیٹے تھے۔ چنانچہ اس عالم میں ان کے منہ میں جو آتا کہہ گزرتے۔ وہ کہتے ابا جان کنجوس ہیں تو یہ کہتے ابے کنجوس! بڑا کنجوس! وہ کہتے ابا جان بڑے تھرڈ کلاس انسان ہیں تو یہ کہتے تھرڈ کلاس! اتنا چھوٹا آدمی تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

نشے ہی کی حالت میں معظم جاہ نے کہا۔ اچھا تو پھر ابا جان پر نظم ہو جائے۔ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اور اسی حالت میں نظم فرما دی۔ وہ زتا بیٹا اس سے چھوٹ نہ سکا۔ یہ تھے شاعر دھکیل دیے گئے۔

ہاں صاحب! شراب پینے کا تو لطف ہی یہ ہے کہ خود بھی بہکے، اپنے ہم نشین کو بھی بہکائے۔ انشا نے جو کہا ہے "تو بھی بہک مجھے بھی بہکا" تو کچھ غلط نہیں کہا۔

جوش صاحب نے بھی، حیدر آباد سے بھاگنے کی بات کچھ یوں بتایا تھا۔

"ہم نے نواب صاحب کی ملازمت جتنا بھی عرصہ کی۔ خوش نہ رہے۔ بلکہ اپنی بدبختی پر، گھر آ کر اپنی بیوی کے سامنے رویا کرتے تھے۔ نواب کی سی تنائی۔ ڈبی زدوں پر ہوتی تھی۔ کسی نے بات نواب صاحب تک پہنچا دی کہ جوش صاحب آپ کی نوکری کو بدبختی کی علامت سمجھتے ہیں اور گھر جا کر رویا کرتے ہیں۔

دوسرے ہم نے نواب کے خلاف نظم لکھ ڈالی ——— اور اُسے امرا اور وزرا کی محفل میں پڑھ ڈالا۔ سب سناٹے میں آ گئے۔ کسی نے کہا۔ جوش صاحب آپ نے یہ کیا غضب کر دیا۔

مجھے اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا کہ مجھے نوکری سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جنگل کی آگ کی طرح، ایک ہی دو گھنٹوں میں میرا استعفیٰ نواب صاحب تک پہنچ گیا۔ نواب صاحب اور بھنائے کہ ایک تو ہمارے خلاف نظم پڑھی۔ اُلٹا استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ یعنی برطرف کرنے کا حق بھی، ان کے استعفیٰ نے باقی نہیں چھوڑا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ لکھ دیجیے، استعفیٰ منظور اور ... دن کے اندر خارج البلد کیا جاتا ہے۔ اس پر نواب صاحب خوش ہوئے کہ ہاں ہاں بات بن گئی۔

جوش صاحب کہتے ہیں کہ میری اتنی گستاخی پر بھی نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح سے معافی مانگ لیں اور نوکری بحال کر دی جائے۔ مگر میں نہ مانا اور میں نے حیدر آباد کو خیرباد کہہ دیا۔ حالانکہ میرے دوست، میری بیوی کہتی تھی۔ نوکری کا معاملہ ہے۔ معافی مانگ لیجیے۔ مگر میں نے اپنی خودداری کو چند سکوں کے عوض نہ بیچا۔"

اب یہ روزانہ پیتے ہیں۔ باقاعدگی سے پیتے ہیں۔ گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں۔ گھڑی اتنی باقاعدہ نہیں چلتی۔ جتنے یہ باقاعدہ چلتے ہیں۔ ایک بار جب گاندھی جی نے انھیں شام کا وقت ملنے کے لیے دیا تو انھوں نے کہا۔ "گاندھی جی کوئی اور وقت دیجیے یہ وقت تو میرے شراب پینے کا ہے۔"

جوش صاحب کے جو دوست شراب نہیں پیتے۔ اُن پر پھبتیاں کستے ہیں۔ نابالغ قرار دیتے ہیں۔ بچہ پارٹی کہتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جوش صاحب پینے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ مگر جب بیٹے نے پینی شروع کر دی تو انھیں دلی صدمہ ہوا۔

کہا۔ "وہ عروسِ مجاز کی تقی جس میں میں اس انداز کا شکار ہوا تھا۔ مگر میں نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا مگر تم جا کا کیا ہوگا؟"

ابھی ابھی بھٹکنے اور بہکانے کے سلسلے میں انشا کا ذکر آیا تھا۔ انشا کے ذکر سے ایک اور بات ذہن میں ابھرتی ہے کہ کیا وہ شاعر کے ماتھے پہ انشا نہ ابھرا ہوتا تو جوش پیدا ہی نہ ہوتے۔ یہ انشا ہی شخص ہیں جنہوں نے ایک ایک لفظ کو دو دو کر کے برتا۔ نئے نئے الفاظ گھڑے، نئی نئی تشبیہات تراش لیں، جوش کے ہاں ورثہ ہے انشا کا، جوش کی قدرِ الکلامی مسلم، مگر جوش کے مصرعوں میں انشا جھلکتے ہیں۔ میں تو جوش کو انشا سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ مگر یہاں ذکر اس ذہنی فضا کا ہے جو انشا کے توسط سے جوش تک پہنچی۔

میں نے یہاں انشا اور جوش کا جو دو بدو کا ذکر کر ڈالا۔ ایسا صرف میں نے ایک نکتے کی وضاحت کے لیے کیا ہے، ایسے میں میر اور غالب کے مقابلے دوسرے شاعروں کو نیچا دکھانے کا قائل نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ جوش کو جوش کی حیثیت سے اور انشا کو انشا کی حیثیت سے لیں۔ یہ دونوں صرف ایک پڑاؤ پہ اکٹھے نظر آتے ہیں۔ ورنہ شعری زندگی کے میدان میں دو طرف دُور دُور کھڑے ہیں۔

جوش صاحب کو شاعرِ انقلاب مان لیا گیا ہے۔ مگر میں انہیں شاعرِ جمالیات ہی سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ شاعرِ انقلاب اگر کوئی ہوا ہے تو وہ صرف خدا اور اسلام ہے۔ ہاں کسی حد تک اقبال کو بھی شاعرِ انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اقبال نے سوچے سمجھے انداز میں انقلابی سا سُروں کو اپنایا۔ مگر جوش نے جوش میں آ کر بھی ایسا نہیں کیا۔ گھن گرج اور توڑ پھوڑ والی شاعری تعمیری نوع کی انقلابی شاعری نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے ہاں بھی انقلابی شاعری کا صرف جسم ملتا ہے۔ رُوح نہیں ملتی۔ انقلابی شاعری کی رُوح اگر کسی کے ہاں ہے تو وہ صرف خدا اور اسلام ہے۔ اقبال بنیادی طور پر صرف شاعرِ ملت ہیں۔ اس میں ان کے ہاں جسم بھی ہے۔ رُوح بھی ہے۔

انقلاب ذہنوں کو کتنا ہی لبھائے۔ مگر وہ کلیتاً تعمیری نہیں ہوتا۔ تعمیری ارتقا تو ایک تدریجی عمل کا نام ہے۔ جس سے فکر و عمل کا ایک مخصوص سانچا تشکیل پاتا ہے اور انقلاب محض نفی ہے۔ جس سے بگاڑ کے تو بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔ مگر بناؤ کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ محض داخلی شاعری پوری شاعری نہیں ہوتی۔ خارجی شاعری کی چاشنی کے بغیر پورا شاعر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ جوش کے ہاں یہ دونوں پہلو ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ کبھی ان پر خارجی شاعری کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی داخلی کا۔ دونوں چیزیں بیک وقت اور ایک ہی تخلیق میں ان کے ہاں نہیں ملتیں۔ یا کم ملتی ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ بات اچھی بھی ہے کہ ان کی تخلیقات کا ایک موڈ اور ایک آہنگ ہوتا ہے۔ یہ نظم کو غزل کی طرح ملغوبہ بنانا نہیں چاہتے۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ آج کل ان کی چھوٹی چھوٹی اور پیاری پیاری سی جو نظمیں سامنے آ رہی ہیں۔ وہ کچھ غزلِ مسلسل ہی کے سے انداز کی ہیں۔ جیسے "دعوتِ سفر" اور "مقدمِ بہار"۔

غزل کے بارے میں ان کے تاثرات تو آپ نے سُنے ہی ہوں گے۔ ایک حکایت یہ بھی ہے۔ الفاظ بھی انہی کے ہیں۔

"ایک مرتبہ دہلی میں جگر، فراق وغیرہ سے غزل کے متعلق بحث ہو گئی۔ انھوں نے پوچھا۔ "آپ غزل کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "یہ بحث اس وقت نہیں۔ کل صبح آپ کے ہوٹل میں آ کر بتاؤں گا۔" چنانچہ دوسرے دن دس بجے پیدل وہاں پہنچا۔ انھوں نے پوچھا۔ "جوش صاحب اتنی دیر کہاں لگا دی؟" میں نے کہا۔ "قبلہ! کیا عرض کروں۔ کوئی سواری ہی نہیں ملی۔ پیدل چلتے

چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور جو ہر مس کا بیان بھے بڑا پسند آیا۔ ویسے اشا من قابل آدمی تھا اور پکاسو کا آرٹ میری سمجھ سے باہر ہے مگر میرا کلام سراپا الہام ہے۔ بل جو چینے کے قریب گاڑی کا لڑکا ہے۔ اتنا بڑا حادثہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ ـــــ ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ جگر نے بیچ میں ٹوک کر کہا: "جوش صاحب آپ کیا اول فول بک رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا: "حضور اول فول نہیں بک رہا ہوں، غزل کہہ رہا ہوں۔"

ملاحی ایک بات اور بھی عجیب دیکھی کہ آپ غزل کے بڑے دشمن ہیں لیکن شعر و شاعری کے سلسلے میں جب کسی سند کی ضرورت پیش آئے گی تو پرچمین کے غزل کے شعر۔ آپ خدا کے بھی خلاف ہیں لیکن قدم قدم پر خدا کے وجود کا بھی اقرار کرتے جائیں گے۔ اب ان کے بارے میں رائے فیصلہ کرے تو کیا کرے ـــــ واقعی یہ ایک چکرا دینے والی شخصیت ہیں۔

جگر کے انتقال کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ان سے استفسار کیا: "جگر کی شاعری کے بارے میں حضور کی رائے کیا ہے؟"

"اپنا مسلک چھوڑ دوں تو بات کروں۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ میں صنفِ غزل کے خلاف ہوں اور جگر غزل کے شاعر تھے۔"

"آپ اپنے مسلک سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹ جائیں۔"

"یہ بات ہے تو جگر غزل کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ بڑا رچا ہوا مذاق پایا تھا۔ ڈوب کر کہتے تھے۔ مگر آخری دنوں میں جذبے کی وہ شدت نہیں رہی تھی۔"

"یہ بات تو نہیں۔ ان کی آخری دور کی شاعری میں زیادہ غور و فکر ملتا ہے۔ زیادہ جاندار غزلیں ملتی ہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ والہانہ پن جاتا رہا جیسے ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں ـــ تو کتاب اٹھا

دوسرے جگر کے ساتھ فراق بھی غزل کے شاعر ہیں۔ فراق کے ہاں W ۱۲۲ زیادہ ملتی ہے اور جگر کے ہاں تغزل۔

میں نے شرارتاً کہا۔ "جگر کے ساتھ فراق کا نام نہ لیں۔ فراق تو شعر کہتے چلے جاتے ہیں خواہ وہ بحر میں ہوں یا نہ ہوں۔"

"فراق جگر کے نہیں اور کے آدمی ہیں۔ مگر دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور بڑا اونچا مقام ہے۔ بہر حال جگر کے انتقال سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنہائی میں اضافہ ہو گیا ہو۔"

میں نے کہا: "آپ کو چاہیے کہ ان پر ایک بھرپور مضمون لکھیں۔"

"ہاں لکھوں گا۔ میں جو اپنی سوانح (یادوں کی برات) لکھ رہا ہوں۔ اس میں اپنے سارے دوستوں کا ذکر تفصیل سے کروں گا اور اس میں اپنے اٹھارہ معشوقوں کا بھی ذکر کروں گا۔"

"سب کچھ سچ سچ لکھ دیں گے؟"

"فی الحال تو شاعری کروں گا۔ مگر لکھ کے رکھ جاؤں گا۔ کہہ دوں گا کہ میرے مرنے کے بعد وہ حصہ بھی شائع کر دیا جائے۔"

"بہت ہے تو بھی چھپوا دیجیے نا؟"

"بھئی میرا تو کچھ نہیں۔ جن کا ذکر کروں گا۔ ان کے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ ان کے قصے تو چھپیں گے ——— اچھا آ تو جوش کے ساتھ پھبتی ہوئی تھی۔"

دوسری مرتبہ جب میں دلی گیا تو جوش صاحب اپنے کمرے میں نہ تھے۔ ایک صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ وہ بار بار گھر پہ ٹیلیفون کر کے معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ جوش صاحب گھر پہ ہیں یا نہیں۔

وہیں بیٹھے بیٹھے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھایا۔ آواز آئی: "یہاں کون صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں؟"

میں نے کہا: "مجھے تو معلوم نہیں کہ کون ہیں۔ مگر آپ کون بول رہی ہیں؟"

جواب ملا: "بیگم جوش بول رہی ہوں۔"

اس پر میں نے کہا: "بھابی آداب عرض!"

بیگم جوش نے اس وقت نہ جانے مجھے جوش کا کون سا دوست سمجھ کر کہا: "جوش صاحب کے کیریکٹر کا خیال رکھنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ میں تو گھر میں رہتی ہوں۔ مجھے کیا پتہ کہ وہاں کیا گل چھرے اڑا رہے ہیں۔"

اب میں ان گل چھروں کا جواب کیا دیتا۔ چپ ہو رہا۔

جوش صاحب نے ایک جگہ اپنے اولین عشق کا حال مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ دلچسپ ہو تو اسے پڑھ لیں۔ ورنہ ویسے بھی تو ایک دو ورق الٹ کر آگے چل دیں۔

"فراغت کی ریل پیل اور شباب رعنائیوں کا دور دورہ تھا۔ اس پر یہ کیسے ممکن تھا کہ میری "مونچھوں کے کونڈے" کا جشن بڑے دھوم دھڑکے سے نہ منایا جاتا۔

تمہیدات سے قطع نظر کر کے صرف دو مجروں کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔

رات ہوتے ہی جگ مگ جگ مگ کرنے والے شامیانے میں جا علی جان کشمیرن نے جب قدم رکھا تو سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر یوں گڑ کر رہ گئیں گویا ہر نظر میں ایک زنجیر ڈال دی گئی ہے۔

علی جان، نام خدا، خوب رو، خوش گلو، شیریں حرکات اور کم سن کاشمیری تھا۔ جس کے چہرے کی شکر میں تھوڑا سا نمک بھی گھلا ہوا تھا اور اسی وجہ سے جب وہ اپنے چہرے کی مرصع آب و تاب کے ساتھ قناتوں کے حصے سے نکل کر سامنے آیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جلے سے گھرے کی چھاؤں میں صبح بنارس طلوع ہو رہی ہے۔

سامنے آتے ہی پہلا وار اس نے یہ کیا کہ اپنی انگلیوں کی جھنکار، بپھرتے ہوئے، جھکاؤ کے ساتھ گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا اور گھٹنے پر ہاتھ کے رکھتے ہی ایسا نظر آیا جیسے کوئی ہوا پر رقص کرنے والا کبوتر چھتری پر آ کر بیٹھ گیا یا دریا کے ساحل پر ایک محل تعمیر کر دیا گیا۔ گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہی بجلی کی کڑک آئی اور یکایک علی جان نے اپنی سرمگیں آنکھوں کو آدھا بند کر کے اپنی صراحی دار گردن کے ڈورے کو کیا جو ناچ شروع کر دیا جیسے جس کے عالم میں شنگی ہوا دفعتہً چلنے لگتی ہے۔ یا چاند کے ابھرتے ہی دریا کی نبضیں چلنے لگتی ہیں۔ گردن کا ڈورا ماہتے

ہی سارنگیوں کے گرد ایک مدھ آمیز انبساط آفریں جھن جھناہٹ کے ساتھ درخشاں تاروں پر یوں کروٹیں بدلنے لگے۔ جیسے برکھا کی برستی ستی راتوں میں کسی برہا کی ستائی الھڑ کے ارمان مچلنے لگتے ہیں۔

ڈھولک، طبلے کی، دل پر ضرب مارنے والی 'گمک'، سارنگیوں کی فضا میں تیرنے والی جھن جھن، مجیروں کی رگوں میں چٹکیاں بھرنے والی کھن کھن، دھیمے سازوں کی دھن دھن پر آڑی تانوں کی گونج، ان سب نے ہم آہنگ ہو کر ایک ایسا متحرک منظر پیش کر دیا گویا کسی خواب کے جزیرے سے پریوں کی برات گزر رہی ہے۔ جل جان کا مجرا ختم ہوا تو دیر تک سناٹا بجتا رہا۔

اس کے بعد چار طوائفیں مجرے کو آئیں۔ رنگ جما نہ سکیں۔ ہر مجرا پھیکا پھیکا سا رہا۔

البتہ جب پانچویں طوائف جھجکتی آئی۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی، کانوں میں بالیاں، گلابی ساری، شہابی مکھڑا، تو دیکھنے والوں کی نگاہیں الف ہونے لگیں، بزرگوں نے، خوردوں سے نظر بچا کر کن انکھیوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اُن کی آنکھوں کے سپنے میں بالوں کی سفیدی کا غم چکر کھانے لگا اور آسمانوں سے یہ صدا آنے لگی کہ:

انیست کہ دل بُردہ و خوں کردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

اس کافرہ نے ابھی مشکل سے زندگی کی پندرہ سولہ بہاریں دیکھی تھیں اور اس کی چنچل جوانی میں وہ زور تھا جیسے کوئی اس کو پیچھے کی طرف ریلے لے رہا ہو۔

وہ ہری کونپل اور مدھ ماتی تھی، راگ، نرت اور ناچ میں ابھی خام تھی لیکن اس کی کچی جوانی کا رس، اس کی خامی کو یوں سہارا دیے ہوئے تھا گویا کرشن جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رادھا مشقِ خرام کر رہی ہے۔

جب نرت کے دوران میں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تو ایسا دکھائی دیا۔ جیسے کالی زلفوں کے اوپر دھنک نکل آئی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس نے دادرا چھیڑا تو سارے گانا کی جلت پھرت اُس کے گلے کے کوٹے پٹے میں یوں گھومنے لگی۔ جیسے تیز ہوا کی رو میں دھان کے کھیت سرسرانے لگتے ہیں اور جب گاتے گاتے، ناچتے ناچتے وہ میرے قریب آئی اور یکایک جھک گئی تو ایسا محسوس ہوا گویا گلاب کی نرم شنی چپت سے لوٹ کر دوہری ہو گئی۔

الآخرکار جب داد کی خاطر وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گئی تو اس کے کمسن سے مہکتے جسم نے کوٹے پٹھے کی لپٹوں نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ جب اس کی نذر پیش والے کے نرم پوروں نے میرے ہاتھ کو دفعتاً چھو لیا تو اس لمس اولین نے ایک ایسا تازیانہ مارا کہ میرا خون تیزی سے اچھلنے لگا۔

یہ سب سے پہلا عشق، آدھی رات کی شبنم کے مانند گرا اور میرے خوابیدہ وجود میں جذب ہو کر مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر نکہت کی طرح رخصت ہو گیا۔ لیکن آگے چل کر اس نے بڑے گل کھلائے اور میری کشتِ حیات میں عشق کے بہت سے درخت پیدا کر دیے۔ آج بھی جب میں اپنے اس بائیں ہاتھ کی پشت پر نظر ڈالتا ہوں، تو اس کی ماہ و سال کی ابھاری ہوئی موٹی موٹی رگوں اور اس کی درازیٔ عمر کی بنی ہوئی

تحریروں سے نیچے وہ شاہانہ، وہ جوش، وہ کھلا اور میٹھا کاٹ اس شیریں لب میں نظر آتا ہے اور دل سے غصہ کا لفظ نہیں نکلتے
لگتے ہیں۔

رہے نام اللہ کا!

یہ تھا جوش صاحب کے عشقوں کا "ابتدائیہ" میں جوش صاحب کے اس پہلے عشق پر اس لیے بات کر رہا ہوں کہ بغیر شدید جذبے کے اس قسم کی تحریر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ واہ وا کیا خوبصورت نثر لکھ گئے۔

یہ دوستوں سے وعدہ خلافی یا ان کے جا و بے جا تقاضوں سے بچنے کے لیے بیوی کی شمشیر مزاج کی پناہ بھی لیتے ہیں۔ دوستوں میں بیٹھ کر جب بیوی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ عموماً یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کی سب بیویاں، بڑے بڑے جابر بادشاہوں مثلاً فرعون، چنگیز خان، ہلاکو اور نیرو کی بہو ہوتی ہیں۔

یہ واقعہ تو ہے کہ یہ شاعر انقلاب اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں۔ کچھ ان کی کمزوریاں ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں ڈرنا پڑتا ہے کچھ وہ سخت گیر ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی گھگھی بندھی رہتی ہے۔ یہ ہر وہ بات جو بیوی سے چھپانے والی ہوتی ہے۔ چھپاتے ہیں۔ مگر یہ بیوی سے چھپانے والی باتیں اس تواتر سے کرتے ہیں کہ وہ چھپ نہیں سکتیں۔ اس لیے ان کی گتی دبتی رہتی ہے اور وہ شیریں سے شیریں تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ان کے بھائیوں میں، اولاد میں، کوئی ایسا نہیں ہے۔ جسے جوش صاحب سے تھوڑی بہت نسبت دی جا سکے۔ ان کا بیٹا جب کوئی بی۔ اے پیدا ہوتا ہے تو وہ اوپر کی اور نیچے کی دو تین پشتوں کی ذہانت کو نچوڑ لیتا ہے۔

جوش صاحب سگریٹ کبھی کبھار پیتے ہیں۔ مگر سگار اور حقہ برابر پیتے رہتے ہیں۔ پچھلے برس لاہور آئے تو ایک حقہ بھی خرید لیا۔ کہتے تھے کراچی میں یہ حقہ بیس روپے کا ملتا ہے۔ یہاں بائیس روپے کا ملا ہے۔ لاہور والے بڑے شریف لگتے ہیں۔ (میرزا جی) اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ لاہور میں خیال رہتا ہے اور کراچی میں جوش۔

جوش صاحب نے حقہ خرید کر تانگے میں رکھوایا اور خود کو اس زاویے سے رکھا جیسے تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہو۔ جس میں سے لگتا تھا کہ اس وقت آپ کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کوئی آپ کی تصویر لے لے۔"

"ہاں بھئی ہاں، اگر کوئی اس وقت میری تصویر لے لے تو مجھے بڑی خوشی ہو۔ مگر یہ حقہ والی بات ہماری خاندانی ہے میرے والد صاحب بھی جب باہر نکلتے تھے تو وہ بھی گاڑی میں حقہ رکھوا لیتے تھے۔ میں ان سے ذرا مہذب ہوں۔ اس لیے کہ میں حقہ صرف گھر پر پیتا ہوں۔"

راستے میں مجھ سے پوچھا۔ "یہاں پر پہلے کا بھی ایک ہوٹل ہوتا تھا۔ تقسیم سے پہلے میں اس کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔ اب وہ غریب دلی میں ہے اور برے حال ہے۔ اس ہوٹل سے میری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ فلاں فلاں اور فلاں میرے پاس ہوٹل میں آیا کرتے تھے
ان دنوں لاہور میں سیدہ نامی ایک رنڈی تھی۔ بلا کی حسین تھی اور پھر
میں نے عرض کیا" اور پھر آگے بھی کچھ کہیے۔"

معلوم ہوتا ہے۔ تم بڑے کند ذہن ہو۔

ادبی دُنیا کے سامنے جوش صاحب کا باقاعدہ تعارف سب سے پہلے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کرایا تھا۔ "رُوحِ ادب" پر "معارف" میں بڑا اچھا تبصرہ لکھا۔ مولانا اُن دنوں اپنے دلکش اور فلسفیانہ مضامین لکھنے کی وجہ سے بڑے ہی ہر دلعزیز تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ مولانا نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ یعنی ان کا الحادی دور ختم ہو چکا تھا۔ جب کوئی نیا نیا مسلمان ہو تو وہ دو ہزار رکعت پڑھنے کو بھی کوئی بڑی بات نہیں سمجھتا۔ پھر ایسے زاہد، جو ہر وقت مثنوی مولانا روم بغل میں دابے رکھتے ہوں۔ وہ اگر اس رندِ خراباتی کی تعریف کریں تو اپنی جگہ بات کچھ کم اہم بھی نہ تھی۔

بات یہ ہے کہ مولانا ماجد علم اور ادب کے رستے سے مذہب کی طرف لوٹے تھے۔ اس لیے انھوں نے ادیب کو ادیب کی حیثیت سے پہچانا۔ آج مولویوں کا دکاندار طبقہ ادیب کو جس طرح مسلمان بنانے کی فکر میں ہے۔ اُس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔

مولانا ماجد ہی نے سب سے پہلے انھیں مصورِ جذبات لکھا اور شاعرِ انقلاب مولانا ظفر علی خاں نے کہا۔ شبابیات پر لکھا تو یہ شاعرِ شباب بھی بنے۔ انھیں سب سے پہلے شاعرِ شباب کس نے کہا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

جوش صاحب جلسے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ چند بے تکلف دوست ہوں تاکہ برجستہ اور بے ساختہ بات کہی جا سکے۔ باتیں کرنے کی حد تک، شعر سنانے کی حد تک، ان کی نگاہیں صرف بے تکلف دوستوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ حاضرین میں غیر مانوس شکلیں ہوں گی تو انھیں شعر سنانے میں ہچکچاہٹ ہو گی۔ بعض اوقات غلط قسم کے ماحول میں کلام سنانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اصرار ہو گا تو ایسے جملے بھی کہہ گزریں گے جو دلآزاری کے ذیل میں آتے ہوں۔

ایک دفعہ یہ اپنے چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھے چہک رہے تھے۔ لہک رہے تھے۔ بڑے اچھے موڈ میں تھے اور اپنا کلام ترنم سے سُنا رہے تھے (ان کا کلام گھن گرج والی آواز میں تو سب نے سُنا ہو گا مگر ترنم کے ساتھ سننے کا اتفاق کبھی کبھار ہی ہوتا ہے)

ایسے میں دو تین صاحب آن وارد ہوئے۔ جن سے جوش صاحب واقف نہ تھے۔ پہلے تو انھوں نے عینک میں سے ان حضرات کو بڑے غور سے دیکھا۔ جب انھوں نے السلام علیکم کہا تو انھوں نے بڑے زور سے لاحول ولا قوۃ! کہہ کر اپنی بیاض بند کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ جوش صاحب چپ کیوں ہو گئے؟

پھر کہنے لگے۔ "میں اس وقت تک شعر نہیں سناؤں گا۔ جب تک کہ فاسد مادہ نکل نہیں جاتا۔"

حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ شعر نہ سنائیے مگر اس شعر کا مطلب تو سمجھا دیجیے۔ غالب کے نسخۂ حمیدیہ میں ایک شعر ہے۔

جوش صاحب نے پوچھا۔ "کونسا بدمعاش شعر ہے وہ!"

شعر ہے:

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت ایک ہوائے تُند ہے خاکِ شہیداں پر

جوش صاحب نے کہا: "یہ شعر غالب کا ہے تو ہوا کرے۔ ہم اس [illegible] صاحب [illegible] ہوں گے۔ مگر یہ شعر دلالت معنی کے لحاظ سے بہت کمزور، یہ دلالت معنی کے اعتبار سے اس شعر کو کمزور کہتا ہوں جس کا مفہوم پہلے ذہن میں آ چکا ہے۔ اور آپ کے ذہن میں کچھ آئے یہ شعر مکمل نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ غالب فارسی میں سوچا کرتے تھے اور اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ مگر غالب اس شعر کو فارسی میں کہتے تو وہ اپنے مفہوم کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کر جاتے۔ مگر تقاضا ہی [illegible] ہی نہیں — غالب کے اردو کے متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جو نامکمل ہیں۔ جن میں معنا اپنا مفہوم ادا کر سکے اور ہم لوگ خواہ مخواہ ایسے میں مفہوم ڈال رہے ہیں۔

حیدرآباد کے دوران قیام (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۴ء) فانی مرحوم نے جوش صاحب کو ایک عجیب سی بات لکھوائی تھی کہ یہ گھنٹوں غائبانہ رُوحوں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ پہلے کچھ پڑھا۔ درمیان کو عیسوی جنتری تو روحیں موجود ہو جاتی تھیں۔ اب یہ بیٹھے ان سے مختلف سوال کر رہے ہیں۔

"میں نے ان سے پوچھا — آپ نے کسی شاعر کی رُوح کو بھی بلایا تھا؟"

"ہاں غالب کو بلایا تھا۔"

"پھر کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

"میں نے پوچھا۔ آپ کا نام؟"

کہنے لگے۔ "غالب مغلوب!"

"پھر آپ کے مزار پر گیا تھا۔"

"میرا قیام مزار میں نہیں۔"

"بادہ نوشی کا کیا معیار ہے آپ کے نزدیک؟"

"اسے میاں ظرف لازم۔"

"آزاد انصاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میرے پوتے ہوتے ہیں، ان میرے شاگرد کے شاگرد جو ہوئے۔"

"ساری عمر آپ وصل کی تمنا کرتے رہے۔ اب تو معشوقہ مل گیا ہوگا۔"

"اسے جوش، ہم تو یہاں بھی یاد جاناں کے مشغلے میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے پوچھا ——— اور کسے بلایا تھا؟"

ٹیگور کی رُوح کو بلایا تھا۔ اس نے مجھے سارے جواب ہندی میں دیے۔ حالانکہ میں ہندی نہیں جانتا۔ ایک دن فانی نے رنڈیوں کو بلایا تھا۔ کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ سب کہتی تھیں۔ ہم مزے میں ہیں۔"

پھر اس واقعہ پر تبصرہ یوں کیا: "یہ سب فریب کا فریب ہے۔ ہر انسان کے اندر خوابیدہ حالت میں سب کچھ موجود ہے۔ دیکھ لینا کچھ عرصے کے بعد اندرونی علوم کی باقاعدہ سیٹیں قائم ہوں گی۔ استاد بھی اپنے شاگرد کے اندر کی گرہیں کھولتا ہے۔ جس میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے

وہ میرؔ، غالبؔ اور انیسؔ بن جاتا ہے۔ جس میں کم صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ نوح ناروی بن جاتا ہے۔

نگار کے صفحات پر، جوش ملیح آبادی کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر نیاز صاحب کے قلم سے' میں یہاں جوش صاحب کا ایک خط (جو نگار ہی میں چھپا تھا) اور ایک اخبار کا تراشہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ تاکہ ان دونوں کی ناراضی کا تھوڑا بہت پس منظر سامنے آجائے ـــــ اور اس کے ساتھ ان دونوں کے کرداروں پر بھی روشنی پڑے۔ بشرطیکہ آپ کا بھی ایمان ہو' کہ تحریریں بھی صاحب مضمون کی باطنی کیفیات کا اظہار ہوتی ہیں۔

خط بھی پڑھیے۔ مگر اس پر جو نوٹ نیاز صاحب کا ہے۔ وہ بھی قابل توجہ ہے۔ دیکھیے بڑے آدمی لڑتے بھی ہیں تو کس شائستگی کے ساتھ!:-

○ حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک طنزیہ شاہکار

○ نثر میں جواہر ریزوں کا ایک عدیم المثال نمونہ

یہ تو تھے عنوان اور ضمنی عنوان! ـــ اب نوٹ ملاحظہ ہو:

رُوح وُہی ایک ہے پاک و شرافت مآب
نظم میں زیر حجاب' نثر میں بے نقاب

پہلی جولائی ۱۹۵۵ء کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا۔ جس پر میرا پتہ "نیاز محمد خاں فتحپوری دفتر نگار لکھنؤ" درج تھا۔ دیکھ کر حیرانی ہوئی کیونکہ مجھے نیاز محمد کے نام سے پکارنے والوں میں اب میری صرف بڑی بہن باقی رہ گئی ہے۔ جو یہاں نہیں پاکستان میں ہیں۔ لفافہ کھولا تو ایک مضمون نظر آیا۔ جس کے آخر میں جناب جوش کے دستخط ثبت تھے۔ اس کو پڑھ کر حیرت مسرت میں تبدیل ہوگئی کیونکہ مضمون کیا تھا ایک آبشار جواہر تھا اور بے اختیار سعدی کا یہ شعر زبان پر آگیا ــ

لبت بدیدم و لعلم بیوفتاد از چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لؤلؤ را

لیکن اس کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ہم اپنی کم مائیگی کے باعث شایانِ شان اس کی داد نہ دے سکے ــ

ہیہات کہ چو نقش ہبازے'
تشریف دہد در آشیانم

ہمیں امید ہے کہ حضرت جوش آئندہ بھی اپنے "انشائے عالیہ" اور "افکارِ نادرہ" سے اسی طرح نگار کو زیر بارِ کرم فرماتے رہیں گے۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ خورائے تو بود
سر نہ چیزے ست کہ شایستۂ پائے تو بود

نیاز

"ہمارے سپاہیوں میں' یادش بخیر' ایک تھے۔ ستر بہتر برس کے ناتواں، لیکن جوان سے تیکھے اور کڑوے۔ نو مسلم ٹھاکر" اللہ بخشے

ہدایت اللہ خان اور ہمارے قرابت داروں میں ایک تھے (جو ہمارے کاؤں کی ادارے ریاست کے کارندے پر خلیل اللہ خان)

خلیل اللہ خان تو ابھی زندہ ہیں لیکن چونکہ ان کی وہ طاقت باقی نہیں رہی جو بھی وہ لوگوں کو ہنسایا کرتی تھی اور اسی بنا پر وہ عجب ۔۔ وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اُڑایا کرتے تھے ۔ کے زمرے میں آچکے ہیں۔ اس بیان ایک تھے خلیل خان، چنانچہ ایک روز سر پہ شتملہ ہدایت اللہ خان کے چند دشمن کا تماشا دیکھنے کی خاطر ان کے بڑے سے ایک سپاہی نے ان سے کہا۔ "ہدایت اللہ خان تمہاری مرگھٹ سے تو چھپکلیاں ناچ کرتی ہیں۔ مگر تمہیں اپنے پستے کا بھی کچھ خبر ہے۔"

"ہم سے پستے کی کیا بات کرتا ہو" (ہمارے پستے کی کیا بات کرتے ہو) ہدایت اللہ خان نے خوش خفا کر جواب دیا۔ اس پر اس سپاہی نے اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھما کر کہا کہ "خلیل خان اللہ تمہارے پستے کو بڑے باغ کی ہوا کھلاتے پھرتے ہیں۔"

"ہم سے پستے کا ؟ (ہمارے پستے کو ؟) ہدایت اللہ خان نے، تیوری چڑھا کر کہا اور ان کی سفید داڑھی کے بال، سیاہی کے کانٹوں کی طرح یکایک کھڑے ہو گئے۔

ابھی ان کے اعصاب کی کمانیں کم نہیں ہونے پائی تھیں اور ان کے چہرے کی جھرّیاں آپس میں گتھی ہوئی تھیں کہ اتفاق سے خلیل خان محل کے پھاٹک پر نمودار ہوئے اور ہدایت اللہ خان نے، جوانوں کی سی چستی کے ساتھ، سامنے کھڑے ہو کر خلیل خان سے، اپنے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا کہ "خلیل کھان ہم تم سے، یہ پوچھتا ہیں کہ یہ تم کا ہمارے کا لے پستے میں کا مزا آتا ہے کہ تم اس سالے کو باغوں کی ہوا کھلاتے پھرتا ہو" (خلیل خان ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم کو ہمارے کالے پستے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اس سالے کو باغوں کی ہوا کھلاتے پھرتے ہو)

اور قبل اس کے کہ مسکراتے ہوئے خلیل خان کچھ جواب دیں۔ ہدایت اللہ خان نے اپنے سوکھے ہاتھ میں لاٹھی بلند کر لی۔ یہ دیکھتے ہی دوسرے سپاہی اور خدمت گار دوڑے اور ایک نے ان کی لاٹھی پکڑ کر کہا۔ "کمانس کیا کرتے ہو ہدایت اللہ خان، اگر خان صاحب بہادر کو خبر ہو گئی۔ تو جانتے ہو کہ اس بڑھاپے میں تمہاری کیا گت بنا دی جائے گی۔"

غرض کہ اس روز کا یہ ہنگامہ رفت گزشت ہو گیا۔ لیکن ناعاقبت اندیش وکینہ پرور بڑھا تھا کہ بھول جانے یا معاف کر دینے والا انسان ہی نہیں تھا۔

چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن وہ بڑھا بیٹا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا، بڑے باغ پہنچ کر "کاٹے" پر بیٹھ گیا ۔۔۔۔ اور جب اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ خلیل خان، حسب دستور، ہدایت اللہ خان کے "کالے" پستے کو لیے ہوئے، بڑے باغ میں نمودار ہوئے تو اس پر جلنے بھنے ہوئے بڑھے نے ڈپٹ کر آواز دی کہ "ٹھار ہو خلیل کھان، بڑے بہادر ہو تو آؤ، اور دو دو بات کر لیو" (ٹھہر جاؤ خلیل خان، بڑے بہادر ہو تو آؤ اور دو دو بات کر لو۔)

والد کا یہ تھر تھراتا نعرۂ جنگ سنتے ہی ان کا پوتا تو، غزالِ وحشی کی طرح ہو کڑیاں بھرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا اور خلیل خان نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہدایت اللہ خان تم بوڑھے آدمی ہو۔ میں تم پر کیا ہاتھ اٹھاؤں ہاں تم اپنا حوصلہ نکال لو۔"

"اچھا بڑے جوان بنتے ہو" (اچھا بڑے جوان بنتے ہو) کہہ کر ہدایت اللہ خان نے اپنی داڑھی دانتوں میں دبائی اور اپنی پوری

جسمانی و رُوحانی طاقت کے ساتھ یہ یقین کر کے بھرپور لاٹھی ماری کہ پہلی ہی ضرب میں خلیل خاں کا بھیجا بہتا نظر آنے لگا۔

اس "بے پناہ" ضرب کو بڑی ہی آسانی کے ساتھ اپنی لاٹھی پر روک کر خلیل خاں نے کہا "فِش!"

اس غیر متوقع حیرت ذلت آمیز سے بل کھا کر ہدایت اللہ خاں نے پھس پھس کیا کرت ہے اورے (فِش فِش کیا کرتا ہے اورے) کا نعرہ بلند کر کے دُوسری لاٹھی ماری۔

خلیل خاں نے اس وار کو بھی روک کر کہا۔ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرت ہے اورے۔ گستاخ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرت ہے اورے۔ گستاخ "فِش!"

اے پھس پھس کا کرت ہے اورے۔ گستاخ "فِش!"

الغرض خلیل خاں کی "فِش" اور ہدایت اللہ خاں کی "پھس پھس کا کرت ہے اورے" نے اس قدر طول کھینچا کہ ہدایت اللہ خاں کا دم پھول گیا۔ اس دم پھُولنے میں بھی آخری بار "پھس ——— پھس ——— کا ——— کرت ہے" کہہ کر وہ بے چارے دھڑام سے گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔

سُنتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ بالکل اُسی طرح ایک فتح پُوری نیاز محمد خاں عرف "نگار" ایک ملیح آبادی شبیر حسن خاں عرف "نگار باز" بھی پچیس تیس برس تک یہی فِش اور "پھس پھس کا کرت ہے اورے" کا کھیل کھیل کر ابھی چند ماہ ہوئے کر فارغ ہوئے ہیں۔

اور اس وقت صُورتِ حال یہ ہے کہ نئے فتح پُوری ہدایت اللہ خاں، "نقاد کے" بھرے باغ" میں چاروں شانے چت بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور نئے ملیح آبادی خاں "شکر خورے کو شکر" اور موذی کو ٹکر" کی زندہ مثال بنے ہوئے فتح پوری کی نند دردِ شہرت انتقاد کو ہدایت اللہ خاں کے کاسے پر تے" کی طرح "ہاتھوں ہاتھوں" کی ہوا کھلانے پھر رہے تھے۔

جاہلانہ انتقاد ——— مُردہ باد!

غیظِ ناتوانی ——— مُردہ باد!

احساسِ کمتری ——— مُردہ باد!

بغض و قلبی ——— مُردہ باد!

"پھس پھس کا کرت ہے اورے" ——— مُردہ باد!

والسلام جوشؔ

اس خط میں نیاز صاحب کا بھی کردار واضح ہے اور جوش صاحب کا بھی، نیاز صاحب کا اس لیے کہ انھوں نے اس خط کو ایک ادبی شاہپارہ سمجھ کر اپنے پرچے میں جگہ دی اور یہ نہ سوچا کہ جیتی ہوئی۔ جوش صاحب کا کردار یہ کہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں بھی

... منقبت کا سہرا لیا۔

اس خط میں جوش صاحب کا کمال اتنا ہے کہ انھوں نے اپنی شکایت کو خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ مگر نیاز صاحب کا ظرف دیکھیے کہ انھوں نے اس گالی نامہ کو اپنے پرچے میں جگہ دی۔

نیاز صاحب نے جس بڑائی کا ثبوت ۱۹۴۸ء میں دیا تھا، ویسی ہی بڑائی کا ثبوت، جوش صاحب نے ۱۹۵۲ء میں آکر دیا۔ جوش صاحب کی وہ تحریر بھی ملاحظہ فرمائیں، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا:

"یادش بخیر! یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "روح ادب" شائع ہوئی تھی اور میں اس زمانے میں آگرے گیا ہوا تھا۔ جہاں لطیف اللہ ... صاحب کے دولت کدے پر حضرت نیاز سے مجھ کو پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں بھرپور جوانی کی طرف جا رہا تھا اور نیاز صاحب آغازِ پیری کی طرف مڑنے والے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شاہزادی" کی بے دل کھول کر داد دی تھی۔ اور "روح ادب" پر تبصرہ کا بھی وعدہ کیا تھا جو کبھی ایفا نہ ہو سکا۔

اس زمانے میں نیاز صاحب داڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے منہ پر داڑھی مجھ کو اچھی نہیں لگی تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے؟ اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا اور تھا ہی کیا۔

میری جھولی میں تو آج بھی بقدر حوصلہ علم و فکر کی پونجی نہیں ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پر علم و فکر کی چھاؤں تک نہیں پڑی ہوگی۔ نیاز کا سا آدمی مجھ کو منہ کیوں لگاتا۔

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدرآباد (دکن) میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی اور میں نے ان کو ان کے میزبان ہوش صاحب ... کی معیت اپنے گھر مدعو کیا۔

ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ بدمستی اور شرمناک فحش کلامی کی بنا پر غارت ہو کر رہ گئی۔

وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بنا پر نیاز اور ہوش دونوں کو میری جانب سے بدگمانی پیدا ہو گئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا تھا۔

اس بدگمانی کی شکایت نیاز صاحب سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ جس نامراد قوم کے ہم افراد ہیں وہ اس قدر اوچھی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر کمینگی کا ارتکاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس رات کے بعد ہمارے تعلقات کی دنیا میں سویرا ہو گیا۔ نیاز صاحب مجھ سے بگڑ گئے۔

نیاز صاحب پٹھان آدمی ہیں۔ میں بھی خیر سے پٹھان ہوں اور ظاہر ہے کہ مشتعل ہو جانے کے بعد پٹھان کے امکان سے یہ بات خارج ہوتی ہے کہ وہ علتِ اشتعال تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائے

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک نگار کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر طنز کرتے رہے اور اس کے بعد ہر چند، ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا لیکن جب بھی ان کو موقع ملا۔ انھوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک بار بھی تساہل سے کام نہ لیا۔

ہر چند میں اس وقت جوان اور سریع الاشتعال جوان تھا۔ لیکن نیاز صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی۔ لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا۔ اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے مہمل خط لکھے۔ جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن کر دیا جاتا۔

پھر بھی نہایت واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرط غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی۔ کون معاف کر سکتا ہے کہ ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود اپنے گھر لا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا شخص تسلیم کر لیا تھا اور اس لیے انھوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی کیا۔ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سن لیجیے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فی صد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے تو دنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان ہی نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا سراسر تضیع اوقات ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس اٹھتی جوانی اور اس ابلتی جوانی کے گرجتے برستے اشتعال میں کس کی مجال تھی کہ گمبھیری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دھوپ میں آ کر بیٹھ جاتا۔

اس فصل میں اس درجہ رہا ہے خرد دسہ رشار
ے خانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

اس لیے میرے جواب نہ دینے کو براہ کرم میری شرافت پر محمول نہ فرمایا جائے کہ:

بنیاد تھی اس کی نوجوانی میری

بہر حال اب وہ طوفانی دور باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم دونوں مضارب و مضروب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ناقابل برداشت بوڑھے سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں۔ لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا انکھوا پھوٹ آیا ہے۔

اس منزل میں ہمارے واسطے یہ نازیبا اور شرمناک حد نازیبا ہے کہ ہم اپنی پرانی یادوں اور طفلانہ جذبات کی بنا پر امر حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لیے کامل ذہنی سکون اور دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت نیاز چند اُنے گنے استثنائی افراد میں سے ہیں۔ جو کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دوں پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آ رہا ہے۔

جب یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلاقی کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور

ماحش و رنگ کی تنہا بے شمار باتیں اُتری ہوئی ہیں تب بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کی عظمت کو سلام

کاش نیاز فتحپوری کا سا خالق طرز انشاپرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے

اسے وہ عشق جو زمانے میں ہے دیوانوں سے"

یہ مضمون کچھ "موازنہ جوش و نیاز" قسم کی چیز بنتا جا رہا ہے۔ میں نے اس مضمون سے بچنے کی کوشش تو کی مگر بچ نہ سکا۔ پیچ پیچیدہ جان بوجھ کر اس "زیادتی" کا مرتکب ہوا۔ مجھے جانے جانے سے نیاز اور جوش کی شخصیتوں کو کسی حد تک واضح کرنے کے لیے ایسا کرنا ہی تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ نگار میں جوش صاحب کے خلاف خوب خوب لکھا گیا ـــ یہ سب جانتے ہیں کہ غصّہ اور ضد کی بنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر نمک کی دیواروں سے زیادہ زندگی نہیں پا سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب نے جوش صاحب کے خلاف جتنے بھی حصار باندھے وہ ان کی شہرت کے سیلاب کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

اللہ کا شکر کہ ۴۲ برس کی ناچاقی کے بعد کہیں اب جا کر کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھوٹا! ـــــــ اور یوں دونوں جی ملے ملے ـــ

جوش صاحب کی ایک کمزوری لغات بھی ہے۔ ذرا ذکر چھیڑیئے تو پھر دیکھیں کہ کیا گہر افشاں نہیں ہوتا۔ کیا کچھ رونا نہیں روتے۔ مثلاً: "بڑا ابا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آکسفورڈ ڈکشنری کی طرز پر لغت تیار ہو۔ پچاس برس میں تو وہ لغت تیار ہوئی تھی۔ پھر اس میں ۲۵۰ اسکالروں نے بلا معاوضہ کام کیا تھا۔

میں چاہتا ہوں۔ ہر لفظ کا صحیح استعمال بتایا جائے۔ مثلاً۔ رونے کی کئی کیفیتیں ہیں جیسے سسکی، سُبکی، ہچکی، جب تک ان کی آواز کے فرق کا پتہ نہ چلے۔ بات نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ایک لغت کے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر مشین بھی ہو جو سسکی، سُبکی اور ہچکی کا فرق بتلائے۔

پھر ابھی بے شمار نئے الفاظ کی ضرورت ہے۔ جو ابھی تک بنے ہی نہیں۔ مثلاً آزار بند ڈالنے والی لکڑی کا کوئی ایک نام نہیں ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ آزار بند ڈالنے والی لکڑی دینا۔ اس کے لیے میں نے "کرلی" کا لفظ بنایا ہے یا "آزار کش" بھی ہو سکتا ہے۔

پھر سونے کے لیے ایک لفظ خواب ہے۔ اس ایک لفظ کی مختلف کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے ۵۲ لفظ بنائے ہیں مثلاً پڑھتے ہوئے نیند آ جائے تو اس کے لیے میں نے "خواب مطالعہ" کا لفظ بنایا ہے۔ ریل میں نیند آ جائے تو اس کے لیے "خواب حرکت"۔ مطلب یہ ہے کہ اردو کو اتنے الفاظ دیے جائیں کہ اس کی ہر ہر کیفیت کو ظاہر کریں۔

پھر الفاظ میں بھی خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں۔ نئیں الفاظ کو آپس میں جوڑ کرتے ہوئے، اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی لفظ نیچ خاندان کا تو نہیں۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا گیا تو خاندانی الفاظ کی نسل تباہ ہو جائے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ بعض الفاظ پردہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ بڑے پیار سے ساتھ گھونگھٹ اٹھا دیا جائے۔"

میرے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ جو بیٹری سے چلتا ہے۔ جوش صاحب ترنگ میں تھے۔ میں نے اُسے آن کر دیا اور انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ آواز ملاحظہ ہو:

"مسلمانوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ جنت ملے گی۔ اس تاجرانہ ذہن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اچھے کام اس لیے کرنے چاہئیں کہ اس سے اپنا اور دُوسروں کا بھلا ہوتا ہے۔

"اللہ کی معرفت بڑا زہر پلایا گیا ہے۔ جہاں تک ہو سکے آدمی کو مذہب سے دُور رہنا چاہیے اور اگر کوئی مذہب قبول کرنا پڑے تو اسلام قبول کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں سب سے کم وہم ہیں۔

مادی اور رُوحانی پہیوں کے ساتھ ساتھ جب تک ایک پہیہ نفسیات کا نہ لگے گا۔ اس وقت تک بات کُھل کر سامنے نہ آ سکے گی۔ ایسے رسول نے جو "کن فیکون" کہا تو بہت بڑی بات کہی۔ رسول کی بڑائی سے کوئی بھی انسان منکر نہیں ہو سکتا پر رسولؐ نے جو باتیں کہیں۔ وہ اُس وقت کے لوگوں کے ذہن اور اُن کی بساط کے مطابق کہیں۔ مگر وہ باتیں آج بھی اتنی ہی اہم ہیں۔ یہ بڑائی ہوتی ہے ایک پیغمبر کی:"

کسی نے ٹوکا۔ "جناب قرآن کی باتیں رسول کی باتیں تو نہیں ہیں۔ انہیں آپس میں گڈ مڈ نہ کریں۔"

اس پر جوش صاحب نے یہ شعر پڑھا:

کُھل کر کہوں تو کفر کے فتوے لگائے خلق
وہ ارتقائے نوعِ بشر دیکھتا ہوں میں

اور اس کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت یوں فرمائی ——— "جانو! کچھ عرصے کے بعد انسان موت پر بھی قابو پا لے گا۔ اس لیے کہ جتنی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ وہ اگر بحال رکھی جا سکیں تو موت کا وجود نہ رہے گا۔

وہ جو آپ کے ایک دوست پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ ادب پڑھاتے ہیں۔ موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ مجھے ایک دن کہنے لگے: "جوش صاحب میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے انہیں ڈانٹ دیا کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ سوال کیا جاتا ہے۔ پوچھا نہیں جاتا۔"

پھر اُنھوں نے کسی بات پر کہا ——— "پھر؟"

میں نے کہا۔ "پھر کا جواب پھر!"

پھر تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے کسی بات پر کہا: "کیوں؟"

میں نے کہا۔ "کیوں کا کوئی جواب پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ کی نوبت آئی ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد، جوش صاحب نے فرمایا۔ "ایک علامہ یہ ہیں۔ ایک علامہ وہ تھے۔ یعنی علامہ عبداللہ عمادی! جو بات کسی ترازو کا تول، ہر مشکل کا حل موجود! ——— ایک دفعہ ہم علامہ کو رنڈی کے کوٹھے پر لے گئے۔

مولانا سے جیسے موقع بن کر عرض کیا۔ "مولانا! میرے ایک دوست کے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ تشریف لے جائیں گے تو میری اور میرے دوست کی عزت افزائی ہوگی۔"

مولانا نے بڑی معصومیت سے فرمایا۔ "اگر یہ بات ہے تو ضرور چلوں گا۔"

مقررہ وقت پر، میں مولانا کو لے کر چلا۔ رنڈیوں کا بازار آیا تو کھٹکنے لگے۔ "ارے جوش یہ تو رنڈیوں کا بازار معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں ہاں! مگر میرے دوست ذرا گھبراتے ہیں۔" اس طرح میں نے کچھ دیر گلیوں کے اندر میں سے گزرا۔ لمبی لمبی سفید نورانی داڑھی، چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، چلنے میں بھاگنے کی سی کیفیت دیکھ کر سب ہی متوجہ تھے۔

ایک جگہ میں نے رک کر کہا: "مولانا! گیا میرے دوست کا مکان!"

"الحمد للہ"

میں نے ایک مکان کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "چلیے!"

مولانا کو شک گزرا کہ یہ مکان بھی اسی علاقے کا حصہ ہے۔ چونکہ وہ کسی پر بدگمانی کرنی جانتے نہ تھے اس لیے فوراً ہی کے بعد سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ آگے آگے وہ، پیچھے پیچھے میں! پہلی منزل پر پہنچ کر مولانا نے کھنکارا تاکہ صاحب خانہ کو علم ہو جائے کہ کوئی آیا ہے۔ ادھر سے نسوانی آواز آئی "بے تکلف چلے آئیے۔"

مولانا آگے بڑھے تو نائکہ نے نورانی شکل دیکھ کر طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا: "تشریف لائیے۔"

بوکھلاہٹ میں مولانا نے کہا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"آپ پُتر یا لاکر پوچھ رہے ہیں؟"

اس پر مولانا لاحول پڑھتے ہوئے نیچے اترے۔ اب میں آگے آگے تھا اور وہ پیچھے پیچھے۔ راستہ بھر کہتے رہے۔ "میں تم سے سمجھوں گا ——— میں تم سے سمجھوں گا ——— رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا ——— رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا!"

ان کے علاوہ ——— جوش صاحب کی اور بھی بہت سی باتیں ٹیپ ریکارڈر میں موجود ہیں۔ مگر وہ ایسی نہیں کہ انھیں لکھا جاسکے۔ جو کچھ یہاں تحریر میں آگیا ہے وہی قدرے زیادتی والی بات ہے۔ اس لیے کہ نشے کی حالت میں ان کی جتنی باتیں ہوتی ہیں۔ انھیں کوئی سنجیدہ صورت تو نہیں دینی چاہیے۔

جوش صاحب اپنے دوستوں کی مدد بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ بلکہ اس سلسلے میں دوست دشمن، اپنے پرائے میں کوئی تمیز نہیں رکھتے۔ یہ شوق اس حد تک ہے کہ ایک اسامی کے لیے متعدد سفارشیں کر گزریں گے۔

متعلقہ صاحب کہیں گے۔ "جوش صاحب کل آپ نے ایک اور صاحب کی سفارش کی تھی۔ آج اسی شد و مد سے اور اُسی جگہ کے لیے ایک اور صاحب کے لیے کہہ رہے ہیں۔ جگہ ایک ہے۔ لہٰذا یہ فرما دیجیے کہ دونوں میں سے کسے قابلِ توجہ سمجھا جائے۔"

اس سلسلے میں میرا بھی ایک تجربہ ہے۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ "لکھنؤ میں فلاں ادارے نے ہماری کتابیں بلا اجازت چھاپ رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیا جائے۔"

"ہاں ہاں ضرور کرو۔ میں تمھیں کمشنر کے نام خط لکھے دیتا ہوں۔ آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ اور واپسی پر بتانا کہ کیا ہوا۔ خطاب بہ اخی العزیز!

حامل رقعہ ہٰذا طفیل صاحب مدیر نقوش لاہور کو اگر آپ کی اخلاقی امداد کی ضرورت ہو تو وہ انھیں میسر ہوگی۔ اس یقین کامل کے ساتھ یہ چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

موسم برشگال کی دھوم دھام بیان کم ہو رہی ہے۔ لیکن اولیائے خرابات نے اپنی دریا دلی سے اس گونہ بھرا ابر و باراں کو جیرونِ نزم سے بھی بڑھا دیا ہے۔

آپ کا پرستار
جوش

صہبا گسار، محبوب پاک پروردگار، مردود دم چار یار "

اس خط کے چھپوانے کی بہ ظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ خط میں کوئی خاص بات بھی نہیں۔ مگر جہاں جوش صاحب نے دستخط فرمائے اُن کے ساتھ جو لکھا " محبوب پاک پروردگار ——— مردود دم چار یار " یہ دونوں باتیں قابلِ غور ہیں۔

یہ خط لیتے وقت، میں نے جوش صاحب سے عرض کیا تھا۔ اب ایسا نہ کیجیے گا کہ وہ صاحب جن کے خلاف آپ نے مجھے یہ خط لکھا ہے۔ اگر آپ کے پاس پہنچ جائیں تو انہیں بھی اسی طرح کا خط لکھ دیں کہ اس کی مدد کی جائے۔

اس پر ہنسے، مگر بات بنا گئے ——— " اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر میں متعلقہ صاحب سے کہتا ہوں ——— ان میں سے جو زیادہ خوبصورت ہو۔ میری سفارش اُس کے لیے ہے۔ "

ہندوستان میں، ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ سبھی سے برابری کا ملنا جلنا تھا۔ جواہر لعل نہرو اور ابو الکلام سے جب چاہتے مل سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ایک مرتبہ مولانا آزاد سے ملنے گئے تو وہ جواہر لعل سے باتیں کر رہے تھے۔ انہیں انتظار کرنا پڑا۔ چند منٹ انتظار کیا تو ان کو چٹا بیٹھنے وہاں مزید رکنا گوارا نہ کیا۔ کاغذ کے ایک پرزے پر یہ شعر لکھ کر واپس آنے لگے ؂

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر اور وقت مولانا

مولانا اور پنڈت جی کی گفتگو ختم ہو چکی تھی یا کیا کہ وہ دونوں کاغذ کا پرزہ پڑھتے ہی ہنستے ہوئے باہر آ گئے اور جوش صاحب کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔

اصول کی خاطر، یہ بڑے بڑے آدمیوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔ تکلف نہیں برتتے، ان کی کامیابی کا راز یہی ہے۔ اس کی مثال ان کے خطوط میں بھی ملے گی۔ جو انھوں نے وعدہ فراموش اور تغافل شعار افسروں اور بڑے آدمیوں کو لکھے۔ مثلاً۔ لکھنؤ کا ڈپٹی کمشنر کسی سے نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے اُسے ڈانٹ کے خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ مجھے بھی آپ سے ملنا تھا۔ چونکہ آپ اہلِ دل سے نہیں ملتے اس لیے میں آپ سے کیوں ملوں۔ اس خط کا صاحب بہادر پر اچھا اثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے سب سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔

یہی بڑوں سے ملنا انہیں مہنگا بھی پڑا۔ سکندر مرزا سے ان کے تعلقات تھے۔ چیف کمشنر سے ان کے تعلقات تھے۔ انھوں نے انہیں سبز باغ دکھائے کہ پاکستان آ جائیے ہم آپ کے لیے یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ جب یہ اُن کی ترغیب پر پاکستان آ گئے تو یہاں کے اخبارات نے شور مچایا کہ جوش صاحب جو کچھ کر رہے ہیں۔ غلط کر رہے ہیں اور حاکمانِ وقت بھی جو کچھ سوچ رہے ہیں۔ غلط سوچ

سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکندر مرزا (اس وقت کے صدرِ پاکستان) کچھ کر سکے اور نہ چیف کمشنر اور مجلس تاج پوشی جوش صاحب آ
کر "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" والی بات ہوئی۔ یہ غلطی انھوں نے اتنی بڑی کی تھی کہ زندگی بھر بھلا نہ سکیں گے۔

غرض یہ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کے شہری ہو گئے۔ ان کے اور دوستوں کی طرح مجھے بھی تکلیف ہوئی۔ میں کراچی گیا دانستہ ان سے نہ ملا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کراچی گیا تھا اور انھیں ملے بغیر واپس چلا آیا تو انھوں نے مجھے بڑے دکھ سے لکھا:

حضرت!

آپ کراچی تشریف لائے اور میرے وجود کی نفی کر کے مجھ سے ملنے تک نہیں آئے۔

آپ جب دلی آتے تھے تو ایک خورد کی حیثیت سے میرے پاس ہمیشہ آتے تھے۔ لیکن اب چونکہ میں پاکستانی ہو چکا ہوں اس بنا پر آپ کی نظروں میں اپنی توقیر کھو چکا ہوں۔

آپ اپنے ذی قدر پرچے میں ایسے شخص کا کلام شائع فرما کر رسوائی کیوں مول لیں۔ جس سے اسلامی دنیا منہ پھیر چکی ہے۔

جاؤ! ایسے ہٹو بھی موت کو آنے تو دو
چین سے جینے نہیں دیتے مر جانے تو دو

جوش

اس خط سے معلوم ہوا کہ جوش صاحب کے دل میں اپنے ملنے والوں کے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے کتنی جگہ ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پاکستان آ کر کتنے افسردہ ہوئے۔

ایک بار میرے دل میں جوش صاحب کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی۔ خط لکھ مارا۔ جواب آیا:-

بندہ نواز!

"آپ کو شاید علم نہیں کہ میری ہستی ایک ایسے شیشے کے مانند ہے۔ جس میں نگاہ آر پار ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس امر واضح ہے کہ اگر میرے دل میں آپ کی جانب سے ذرہ برابر بھی کدورت ہوتی تو میں اس کو آپ پر ظاہر کیے بغیر چین سے بیٹھتا ہی نہیں۔

اس منفی گفتگو کے بعد آپ کو مثبت رخ بھی دکھانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ وحشت کے عوض میں اپنے دل میں آپ کی جانب رغبت و انس محسوس کرتا ہوں۔

اب رہی میری کوتاہ قلمی اور "جواب خوری" سو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں مراسلت کے باب میں ہمیشہ وہ رہا ہوں جو "مرفوع القلم" کہا جاتا ہے۔

چونکہ اس افتادِ طبع کے دوش بدوش میری ہولناک مصروفیت بھی ایسی جان لیوا ہے کہ ہمیشہ سر پر دوستوں کے خطوط کے بیسیوں ہوئی تلواروں کے مانند لٹکے رہتے ہیں۔ لیکن جواب لکھنے کی فرصت ہاتھ نہیں آتی۔

آپ کو کاش معلوم ہوتا کہ اس وقت کس قدر اہم فرائض کا خون کر کے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں اور وہ بھی محض اس خیال سے کہ میری مزید خاموشی کہیں آپ کو مجھ سے مزید بدظن نہ کر دے۔

ہاں ان دنوں ایک خاصی طویل نظم "آدمی" کہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بھیج دوں اور ضرور بھیج دوں گا۔ بشرطِ فرصت!
میری تمنا ہے کہ یہ خط آپ کو تن درست مطمئن اور شاد کام پائے۔

نیاز مند

جوش

اپنے نام جوش صاحب کے خط چھپوانے کا مجھے کچھ شوق نہیں۔ متعدد خطوں میں سے چند خط اس لیے چھانٹے کہ ان میں جوش صاحب بنفسِ نفیس موجود ہیں۔ اس لیے میں نے انھیں آپ سے چھپانا مناسب نہ جانا۔

جوش صاحب مجلسی اخلاق و آداب میں اُوپنے نظر آتے ہیں۔ (بشرطیکہ وقت شام کے بعد کا نہ ہو)۔ مثلاً کسی شہر میں جائیں گے تو اپنے دوستوں سے ملنے خود جائیں گے۔ یہ امید نہیں رکھتے کہ وہ خود ملنے آئیں۔ اسی ذاتی ضابطے کی بنا پر ایک بار مجھ سے کہا:

"دیکھو بھئی۔ تم جو کل ہمیں اپنے ہاں بلا رہے ہو تو اس میں فیض اور صوفی تبسم کو ضرور بلانا۔ اس لیے کہ ہم ان سے خود ملنے نہ جائیں گے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ دونوں حضرت کراچی گئے تھے اور مجھ سے مل کر نہیں آئے تھے۔ اس لیے ہم ان کے پاس خود نہ جائیں گے۔ مگر ہمارا دل ملنے کو چاہتا ہے۔"

ابھی چند مہینے ہوئے کہ لاہور آئے تھے اور اسی دن یہ اعلان فرما دیا کہ کل واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ان کے آتے ہی چلے جانے کا سن کر افسوس ہوا۔ میں نے جواباً کہا۔ کل کی بجائے آج ہی چلے جائیے۔ بلکہ ابھی چلے جائیے۔"

میرے یہ کہنے پر دو منٹ تک خاموش رہے۔ پھر کہا۔ "اچھا کل نہیں جائیں گے۔ ایک دن تمھاری خاطر سے رک جائیں گے۔"

یہ اس شخص کی باتیں ہیں۔ جس نے بڑے بڑے رئیس صاحبوں کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھا۔

اس سے بھی پہلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ جوش صاحب لاہور آئے تھے۔ قائد اعظم کی برسی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ کو پتہ چلا کہ جوش صاحب بھی لاہور آئے ہوئے ہیں تو وہ مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے ان کے پاس پہنچے۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دیا ——— "میں شرکت سے معذور ہوں۔"

کسی نے کہا۔ "قائد اعظم کی برسی کے سلسلے میں مشاعرہ ہے انکار نہ کیجیے۔ سو باتیں ہوں گی۔"

"باتیں ہوں گی تو ہوں۔ میں بلا معاوضہ نہ جاؤں گا۔ خود قائد اعظم نے مسجد شہید گنج کا مقدمہ لڑا تھا تو مسلمانوں کے لیے رعایت نہ کی، مسلمانوں سے دس ہزار روپیہ معاوضہ طلب کیا تھا۔ میں بھی تو قائد اعظم کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہوں۔"

بانیانِ مشاعرہ بلا معاوضہ بلانا چاہتے تھے قائد اعظم کا نام لے کر سامنے کی اونچ نیچ سمجھاتے تھے۔ مگر یہ طرح ہی نہیں دے

رہے تھے۔ مگر اس وقت جوش صاحب کے ایک دیرینہ دوست مولانا ابو الخیر مودودی نے مسعود صاحب سے چپکے سے یہ کہہ دیا۔ "آپ وقت مقررہ پر آ جائیے گا۔ جوش صاحب مشاعرے میں شرکت کریں گے اور باصرار کریں گے۔"

مشاعرے کا وقت قریب آیا تو مسعود صاحب آن پہنچے۔ جوش صاحب نے ان کی شکل دیکھتے ہی کہا: "بھئی مجھے چھپاؤ، شاعرے والے تو پھر آ گئے۔"

مولانا ابو الخیر نے فرمایا: "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ انھیں میں نے بلایا ہے۔"

"کاہے کو بلایا ہے؟"

"تاکہ آپ کو مشاعرے میں لے جا سکیں۔"

"دوستی کا امتحان نہ لو۔"

"جو کچھ کہیں، اب تو آپ کو جانا پڑے گا۔"

"ابو الخیر تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جانا پڑے گا۔"

دیکھا آپ نے اس رندِ خراباتی کا یہ رُخ، جو کتنا حسین ہے۔ جس میں دوستوں کے لیے قابلِ رشک جگہ ہے۔

ساری دنیا میں یہ مشہور ہے کہ جوش صاحب لالچی ہیں۔ میں نے بھی یہ باتیں سن رکھی تھیں۔ مگر میرے ساتھ انھیں مخلصانہ تعلقات کا دعویٰ بھی تھا۔

جشنِ نقوش کے سلسلے میں (جو انجمن ادبی مسائل (پاکستان) نے منایا تھا) [illegible] صاحب کے علاوہ میں نے بھی خط لکھا کہ آپ تشریف ضرور لائیے ——— اور یہ بھی واضح کر دیا کہ انجمن صرف آمد و رفت کا کرایہ پیش کرے گی۔ کوئی معاوضہ پیش نہ کر سکے گی۔

جوش صاحب کا جواب آیا:

"عزیزم!

"آپ بار بار کرائے کو کیوں لکھتے ہیں۔ بے شک میں لالچی ہوں، بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ اگر آپ کرائے کی حقیر رقم نہ مرحمت فرمائیں تو میں آپ کی تقریب میں شریک ہوں۔

یہ بھی کہہ دوں کہ اگر آؤں گا تو آپ ہی کی خاطر لیکن آپ کا مہمان نہیں بنوں گا۔ دو ایک روز اپنے پاس سے ہوٹل میں ٹھہروں گا جس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہو گا اور یہ بھی کہہ دوں کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں آپ سے کرایہ بھی نہیں لوں گا۔ بابا کیا میں کرائے کا ٹٹو ہوں۔"

نفس: جوش

اس خط کے ملنے پر میرا خیال یہ تھا کہ جوش میں آ کر خط تو لکھ دیا ہے۔ مگر اتنی گرمی میں آ نہ پائیں گے۔ جون کا مہینہ، جوش سا نازک مزاج پھر سفر یا فضا کا بھی نہ تھا۔ مگر دیکھا کہ تقریب سے ایک دن پہلے جوش صاحب لاہور میں موجود ہیں۔ ٹیلیفون کیا ——— "مردود! مردار یا آتی گرمی میں ..." میں ان کی آواز سن کر خوش ہو گیا ——— انھوں نے نقوش کی تقریب میں پورے دل جمعی سے دلچسپی لی۔

لاہور سے رخصت ہونے لگے تو میں نے انھیں آمد و رفت کے سلسلے میں روپے دلائے۔ مگر انھوں نے واپس کر دیئے ———

کہا —— "اس تقریب میں شامل ہونا تو میرے فرائض میں سے تھا۔ روپے پیسے کا کیا سوال!"

ایک اور مشاعرے کے سلسلے میں ان کے ایک دوست نے' جو اتفاق سے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ پہنچے۔ دیکھا تو ڈپٹی کمشنر صاحب اسٹیشن پر موجود نہیں۔ ان کے نمائندے موجود ہیں۔ انھوں نے پوچھا —— "بھئی خود کیوں نہیں آئے؟"

"ایک ضروری کام میں اُلجھ گئے ہیں۔"

"اچھا تو اسٹیشن پر آنا' غیر ضروری تھا۔"

یہ کہتے ہی اپنا سامان پھر گاڑی میں رکھوا دیا اور اس مشاعرے میں شرکت نہ کی۔ جہاں سے ایک ہزار روپیہ اور آمد و رفت کا کرایہ ملنا تھا۔

دیکھا آپ نے جوش صاحب روپے کے سامنے بھی کتنے اونچے ہیں۔

درختوں کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہوگا۔ اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے یہی حال اشخاص کا ہے۔ جو شخص جیسا نظر آتا ہے۔ وہ وہی کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُسے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا' شخصیت سے آگاہی کے ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔

اقبال ایک مستقبل شناس سیاستدان

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا۔ وہ تاریخ اسلام کا عظیم ترین المیہ تھا۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمانوں کی قوم ایک بے اثر اقلیت بن کر رہ گئی۔ یہ بھی ایک المیہ تھا۔ یعنی ہونی اقلیت اپنی جاندار اور موثر قیادت سے محروم ہو گئی۔ یہ بھی ایک المناک پہلو تھا۔ بہر حال جو ہو چکا وہ ہو چکا کیونکہ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی اور اس کا قدم ہمیشہ مستقبل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ تاریخ کے طالب علم ہوتے ہیں وہ ماضی کے واقعات کو کرید کر دیکھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور حالات کا جو المناک موڑ ہے۔ کیا اس سے گریز ممکن تھا یا نہیں اور مستقبل میں بھی پھر اسی قسم کا تجزیہ کے درپے ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت علامہ اقبال برعظیم کی وہ پہلی شخصیت تھے۔ جنہوں نے ایک آل انڈیا سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے برعظیم کے مسلم اکثریتی علاقے پر مشتمل ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا تصور پیش کیا۔ اور نہ صرف ایک تجویز سامنے رکھی بلکہ اس آئیڈیالوجی کے بھی خدوخال ہمارے سامنے رکھے۔ جو اس تصور میں کارفرما تھے۔ گویا ملت کی ڈوبتی ہوئی قسمت کو ایک نئی راہ دکھائی جس پر چل کر وہ نہ صرف سیاسی آزادی حاصل کر سکتی تھی بلکہ اپنی آئیڈیالوجی کو عمل میں لانے کے لیے اس سے ایک تجربہ گاہ کا کام بھی لے سکتی تھی۔ اور یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس کے لیے آنے والی نسلیں بھی ان کی ممنون احسان رہیں گی۔

لیکن میرے نزدیک علامہ اقبال کے کارنامے کا ایک اور پہلو ایسا ہے جو اس لحاظ سے اس سے بھی عظیم تر ہے کہ ان کی دوربین نگاہ نے مستقبل کے پردوں کو چیر کر ان پہلوؤں کو بھی بھانپ لیا جو اپنے جلو میں المناک حادثات اور واقعات کا ایک طویل سلسلہ لیے ہوئے تھے اور نہ صرف بھانپا بلکہ اس کی طرف واضح اشارے بھی کیے اور نہ صرف اشارے کیے بلکہ ایسے عملی قدم بھی اٹھائے۔ جن کی اہمیت کو اگر لوگ پہچان لیتے تو شاید خون کی ندیاں نہ بہتیں۔ شاید سرحد کے اس پار دھرتی شہدا کے خون سے لالہ رنگ نہ ہوتی اور شاید ہندوستان کی عظیم مسلم اقلیت اتنی بے بس نہ ہوتی۔ جتنی بے بس وہ آج نظر آ رہی ہے۔ مستقبل شناسی قیادت کا حقیقی جوہر ہے اور علامہ اقبال میں یہ جوہر بدرجہ اتم موجود تھا۔

اگر ہم ماضی سے نقاب اٹھائیں اور ذرا غور سے حضرت علامہ اقبال کی زندگی کے آخری آٹھ سالوں کا جائزہ لیں تو یہ نکتہ ابھرتے ہیں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضرت علامہ کے نزدیک برعظیم کے مسلمانوں کے لیے واحد طریق کار یہ تھا کہ ان کی جدوجہد کے دو رخ ہوتے

اول: مسلم اکثریتی صوبوں کی جدوجہد اس مقصد کے لیے کہ وہ ایک آزاد مملکت کا روپ دھار لیں۔ گویا ان کی تحریک آزادی کی تحریک ہوتی۔

دوم: مسلم اقلیتی صوبوں کی جدوجہد اس مقصد کے لیے کہ باقی ہندوستان میں مسلمانوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں جو ایک موثر اقلیت کے شایان شان ہوں۔ گویا یہ تحریک اقلیتی حقوق کی تحریک ہوتی۔ لیکن ہوا کیا؟ ہر تحریک نے ایک ہی رخ لے لیا یعنی آزادی کی تحریک۔ اگر یہ سمجھا کہ برعظیم کی تمام مسلمان آبادی بذریعہ آزادی کے ذریعے سے ایک جا ہوتی تو اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ لیکن ہماری قیادت جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں

اس کے باوجود مسلم اکثریتی صوبوں کے پہلو بہ پہلو مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے بھی پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور بہت بہادری اور شجاعت سے لگایا۔ بلکہ یہ نعرہ اسی تسلسل اور قوت سے جاری کر رکھا کہ عین تقسیم کے وقت تک بلند ہوتا رہا۔ ظاہر ہے اس کے فوراً بعد ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے گلے سے نہیں نکال سکتے تھے اور ان کا ردِ عمل وہی تھا جو ایک ایسی بپھری ہوئی قوم کا ہونا چاہیے جو جس ملک کی بلا شرکت غیرے ملکیت کی دعویدار تھی۔ اس کے ایک اچھے خاصے حصے سے محروم ہو گئی۔ اگر اقلیتی صوبوں کے مسلمان اپنی تحریک کو ایسے نعروں پر استوار کرنے جو اقلیت کو زیب دیتے تو شاید ۴۷ء کے قتل عام اور اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی میں وہ شدت نہ ہوتی۔ جو ہم نے دیکھی اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کے بنیادی تضاد کو حضرت علامہ نے ۱۹۲۸ء ہی میں بھانپ لیا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اقلیتوں کو ویٹیج (we i gh t a g e تناسب آبادی سے زیادہ حقوق) دینے سے جہاں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ وہاں اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل جاتی تھی اور وہ اپنے گھر میں ہی بے اثر ہو جاتے تھے۔ تو وہ اس سیاست سے بے زار ہو گئے اور انھوں نے مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش سے چند مضامین "انقلاب" میں لکھوائے۔ جن کا عنوان تھا: ہندی مسلمانوں کے لیے الگ وطن"۔ جن میں تجویز پیش کی گئی کہ شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ جب مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنما بعض شرائط پر مخلوط انتخاب کا اصول قبول کرنے پر راضی ہو گئے تو انھوں نے اس متوازی آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری بننا قبول کیا جس کے صدر سر محمد شفیع تھے اور جو نہ صرف جداگانہ انتخاب کی تائید و حمایت میں پیش پیش تھی بلکہ اس امر کا بھی شدت سے مطالبہ کرتی تھی کہ اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت دستور میں تسلیم کی جائے۔ ۱۹۳۰ء کے وسط میں حضرت علامہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اگر برعظیم کے مسلمانوں کی سیاست کو صحیح خطوط پر چلانا ہے تو مسلم اکثریتی صوبوں کو اپنے مخصوص مسائل حل کرنے کے لیے الگ تنظیم درکار ہے چنانچہ انھوں نے "مسلم آؤٹ لک"، "سیاست" اور "انقلاب" کے ایڈیٹروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس کی تجویز اپنے اداریوں کالموں میں پیش کریں۔ تاکہ حضرت علامہ کے ہاتھ مضبوط ہوں اور وہ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے عملی قدم اٹھا سکیں۔ چنانچہ

۱۰ نومبر ۳۰ء کے شماروں میں تینوں اخباروں نے مقالاتِ افتتاحیہ لکھے۔ جن میں اس رائے کا اظہار کیا کہ:

"جب تک صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار کمزور نہ ہوگا۔ جب تک سندھ اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کو کامل اصلاحات نہیں ملیں گی اور جب تک پنجاب کے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے ذریعے سے اکثریت حاصل نہ ہوگی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کی زندگی معرضِ خطر میں رہے گی۔"

ان اخباروں نے درد مندانہ حضرت سے اپیل کی کہ وہ:

"جلد سے جلد شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کر کے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے عملی تدابیر کا فیصلہ کریں۔"

جیسا کہ پہلے طے پا چکا تھا۔ ۲۳ نومبر ۳۰ء کو حضرت علامہ کی دعوت پر برکت علی اسلامیہ ہال میں اکابر ملت کا ایک اجتماع منعقد ہوا جس کی صدارت خود حضرت علامہ نے کی۔ اس اجتماع میں یہ حضرات شریک ہوئے: ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین۔ سید محسن شاہ۔ مولوی غلام محی الدین

قصوری، سید حبیب اللہ، سید مراتب علی شاہ، مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ، میاں عبد العزیز بیرسٹر، مسٹر عبد الحمید ملک مدیر "مسلم آؤٹ لک" سید حبیب مدیر "سیاست"، غلام رسول مہر اور عبد المجید سالک مدیران "انقلاب"، خان سعادت علی خان، حاجی میر شمس الدین، ڈاکٹر خورشید میاں حق نواز، مولوی فضل الدین، ملک محمد دین، فضل کریم، عبد اللہ، حبیب اللہ، [illegible] اور خان صاحب خیر الدین۔ علامہ اقبال نے کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ مجوزہ کانفرنس میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے مسلم ممبران مجالس قانون ساز، میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلمان ممبران، مختلف اسلامی جماعتوں کے نمائندوں اور دیگر معززین کو شرکت کے لیے بلایا جائے۔ ایک مجلس استقبالیہ بنائی گئی جس کے صدر حضرت علامہ تھے۔ سیکرٹری کے عہدے پر عبد الحمید ملک مقرر ہوئے اور خان سعادت علی خان فنانشل سیکرٹری بنے۔ ایک ہفتہ بعد حضرت علامہ کی کوٹھی پر ایک اور اجتماع ہوا۔ جہاں کانفرنس کا نام اپر انڈیا مسلم کانفرنس قرار پایا۔ اور مسٹر عبد الحمید ملک کے ساتھ مولانا سید حبیب کو بھی سیکرٹری بنا دیا گیا۔

یہ تحریک مقبول ہونے لگی۔ سندھ میں سیٹھ عبد اللہ ہارون اس کے حق میں زمین ہموار کرنے لگے اور پنجاب کے مسلمان اخبار زور شور سے پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اس پروپیگنڈے کے انداز کو سمجھنے کے لیے اس دو کالمی چوکھٹے کا متن ملاحظہ ہو۔ جو "انقلاب" میں ہر دو تین دن کے وقفے کے بعد چھپتا تھا۔

پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ملک ہیں

ان میں اسلام کا علم بلند رکھو

شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس عنقریب ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس میں پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچی مسلمان جمع ہو کر ان تدابیر پر غور کریں گے۔ جن سے ان کے علاقوں میں مسلمانوں کے حقوق اکثریت محفوظ کیے جا سکتے ہیں اور اسلام کا جھنڈا بلند رکھا جا سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں اسلام کی بقا چاہتے ہو تو شمالی ہند کی کانفرنس میں آؤ۔

اتنے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا الہ آباد سیشن ہوا۔ جہاں حضرت علامہ نے وہی تجویز اپنے تاریخی خطبے میں پیش کی۔ جس کو عمل میں لانے کے لیے یہاں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چند مہینے یہ ہنگامہ جاری رہا۔ لیکن جب حضرت علامہ نے محسوس کیا کہ علیحدہ اسلامی مملکت کے حق میں کسی بڑے مسلمان رہنما نے ایک لفظ تک نہ کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور کانفرنس کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسٹر جناح کے چودہ نکات میں ایسے امکانات موجود تھے کہ علیحدہ اسلامی مملکت کا نعرہ حالات ساز گار ہونے پر دوبارہ بلند کیا جا سکتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ نے حضرت قائد اعظم کے نام جو خطوط لکھے۔ ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ نے جو کچھ ۱۹۳۰ء میں کہا۔ وہی زیادہ شد و مد سے کہنے لگے۔ میں چند اقتباس پیش کرتا ہوں:

اوّل: "اسلامی قانون کے ایک طویل اور گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو صحیح طور پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم قوت لایموت کا حق محفوظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کا نفاذ اس

وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک کہ یہاں ایک آزاد اسلامی ریاست یا آزاد اسلامی ریاستیں وجود میں نہیں آ جاتیں۔ (۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

دوم : ان حالات میں ظاہر ہے کہ ایک پُرامن ہندوستان اسی صورت میں ممکن ہے کہ نسلی، مذہبی اور لسانی بنیادوں پر اس ملک کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔ (۲۱ جون ۱۹۳۷ء)

سوم : پنجاب کے بعض مسلمان پہلے ہی سے یہ تجویز پیش کر رہے ہیں کہ ایک نارتھ ویسٹ انڈین مسلم کانفرنس منعقد کی جائے اور یہ خیال تیزی سے پھیل رہا ہے۔

چہارم : آخر شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو کیوں نہ ایسی قومیں قرار دیا جائے جو ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوموں کی طرح حقِ خود ارادیت کی مستحق ہوں؟

پنجم : میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو اس مرحلے پر مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے یہ قدم مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی ———— دونوں قسم کے صوبوں کے بہترین مفاد میں ہے (۲۱ جون ۱۹۳۷ء)

نارتھ ویسٹ انڈین مسلم کانفرنس، شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو قومیں قرار دے کر اُن کے لیے حقِ خود ارادیت کا مطالبہ اور مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کرنے کی تجویز میرے اس موقف کو ثابت کرتے ہیں کہ حضرت علامہ مسلم اکثریتی صوبوں کی جدوجہد کو الگ خطوط پر چلانا چاہتے تھے۔ میرے اس خیال کو اس وجہ سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ کہ جب اگست ۱۹۳۷ء کے وسط میں ہم لوگ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے حضرت علامہ سے ملے۔ تو انہی کے مشورے پر اس جماعت کا نصب العین شمال مغربی ہند میں مسلم نیشنل سٹیٹ کا قیام قرار پایا اور انہی کے کہنے پر ہم نے سرحد اور سندھ کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشنوں کا الحاق قبول کیا۔

حضرت علامہ نے جو کچھ کیا اُس کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کی منظوری کے فوراً بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے دو حصے ہو جاتے۔ ایک اکثریتی صوبوں کی لیگ، دوسری اقلیتی صوبوں کی لیگ، دونوں ایک دوسری کا دست و بازو بنتیں۔ لیکن ان کے مقاصد مختلف ہوتے۔ طریق ہائے کار مختلف ہوتے اور نعرے بھی مختلف ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید بعد کے المناک حادثات سے گریز ممکن ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت علامہ زندہ رہتے۔ تو برِ عظیم کے مسلمانوں کی جدوجہد کے دو رُخ ضرور متعین ہوتے۔

اقبال کی اِنسان دوستی

ڈاکٹر عبد المغنی

اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں، اس میں نہ کوئی امتیاز ہے اور نہ انفرادیت، اقبال کے علاوہ بھی بہت سارے شعرا و ادبا کا موضوع انسان ہی رہا ہے، اور آج کل تو ہر شخص ہی ہر حالت کا موضوع انسانیت ہی قرار دے رہا ہے اور جب بات اتنی عام ہو گئی ہے تب اس میں تخصیص کرنی ہی پڑے گی، چنانچہ جہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ بہت سارے افراد زندگی کے بہت سارے گوشوں میں اپنی کوششوں کا مقصود انسان کو بتلاتے ہیں اور اگر وہ نہ بھی بتائیں تو بہرحال، بعض اوقات غیر شعوری طور پر ہی سہی اگر کوئی انسان اپنی حدود سے باہر تو جا سکتا نہیں کسی نہ کسی طور پر اس نے جو شغل قاطع نظر آخری تجزیے میں، اس کی اپنی ہی ذات ثابت ہوگی. لہٰذا ہمیں اس عمومیت سے صرف نظر کرنا ہی پڑے گا اور موضوع انسانیت کو چند سخت حدود میں باندھنا ہی پڑے گا، اس بندش کے بعد اس معروف حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا نے اب تک چند عظیم ہستیاں واقعی ایسی ہیں جنہوں نے فطرت انسانی کے سر کو اپنے جذبہ و احساس سے فاش کرنے کی کوشش کی اور کچھ نہ کچھ روشنیاں ہمیں وجود انسانی کے متعلق دے گئے، مثلاً رومی، دانتے، شکسپیئر، گیٹے اور اقبال انہیں میں سے جس بات سے اپنے مضمون کا افتتاح کیا ہے وہ اتنی عام نہیں ہے کہ اس میں ہر اس شخص کا ذکر کر دیا جائے. جس نے انسان کے متعلق چند بصیرت افروز نکتے دریافت کر لیے ہیں، حضرت انسان کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتے کی باتیں تو وہ ہر کسی لوگ ہی کہہ نکلتے ہیں جن کا مقصد کسی بھی شکل سے اپنی مربیانہ شخصیت کو آشکار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بات دراصل انسان، پورے انسان کو، جیسا کہ وہ ہے اس کی تمام داخلی و خارجی کیفیتوں کے ساتھ، شعوری طور پر موضوع سخن بنانے، اس کی تمام کمزوریوں اور توانائیوں، مشکلوں اور صلاحیتوں کو زیر بحث لانے کی ہے، تاکہ کائنات اور حیات کے ساتھ اس کے رشتوں کو واضح کر کے اس کی حدود اور امکانات پر روشنی ڈالی جا سکے اور اس طرح اس کے مقصد وجود اور نصب العین کو اجاگر کیا جائے، پھر اس کے ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لے کر اس کے مسائل کے ساتھ ساتھ حل پر بھی تبصرہ کیا جائے. ظاہر ہے کہ ان وسیع معنوں میں اب تک دنیا کے کسی شاعر نے انسان کو موضوع نہیں بنایا، بجز اقبال کے، اور ایسا ہونا قدرتی بھی ہے، اتنی تشریح اور تنظیم کے ساتھ انسان کیا، کسی بھی موضوع سے بحث کرنا کسی شاعر کے بس کا روگ بھی نہیں، یہ کام تو ایک فلسفی اور عالم ہی کر سکتا ہے، اور اقبال جو ایسا کر پائے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ صرف عالم اور فلسفی بھی تھے، بلکہ انھوں نے اپنی عالمانہ اور فلسفیانہ حیثیتوں کو اپنی شاعری میں جذب کر دیا تھا، اتنا ہی نہیں، وہ فکر اور فن دونوں دائروں میں مجتہد تھے، صرف قرآن سے رہنما اصول لے کر اپنے زمانے تک دریافت شدہ علوم و افکار کی تحقیق و تنقید کر کے انھوں نے اپنا ایک مستقل نظام فکر مرتب کیا، اور اس نظام فکر کا بہترین اظہار انھوں نے اپنی شاعری ہی میں کیا اور اس مقصد کے لیے شاعری کے نقوش و علائم اور اسلوب و آہنگ کی بھی تجدید کی، اس کی مثال دنیا کے ادب میں کہیں اور نہیں ملتی، لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا موضوع انسان ہے تو یہ آ

نہ صرف خاص بلکہ خاص الخاص ہو جاتی ہے، یعنی اب عبارت اس طرح ہوتی ہے کہ پورے صفحے میں انسان عموماً ہو یا شخص اقبال صرف بنایا ہے۔

ظاہر ہے کہ اقتباس کے پہلے پیرا میں انسان سے شغف گہری انسان دوستی کا اشارہ ہے۔ اقبال کی انسانیات کسی ماہرِ حیوانیات یا ماہرِ نفسیات کی دل چسپیوں پر مبنی نہیں، اس میں خشک سائنسی انداز اور اعداد و شمار کے سرد تجزیے کو دخل نہیں، اسے فلسفیانہ نظریہ بازی اور موشگافی کی بھی کار فرمائی نہیں، اس میں سیاسی نعرہ بازیوں اور اقتصادی اُلجھنوں کا بھی گزر نہیں ——— اقبال کی انسانیات کا محرک و مقصود صرف ایک جذبہ ہے، بنی نوعِ انسان کی ہمدردی اور یہ چیز سراسر اخلاقی یا زیادہ گہرائیوں میں جائیے تو ایک رُوحانی جوہر ہے اور اگر اس جوہر کو کوئی مخصوص نام دینا چاہیں یا اسے ایک ضابطے کے تحت لا کر دیکھنا چاہیں تو کہیں گے کہ اس ہمدردی کا سرچشمہ مذہبی ہے، خاص کر اقبال کے سلسلے میں تو مذہب کی تخصیص اسلام کے نام سے بھی کر دی جا سکتی ہے، یعنی آخری تجزیے میں اقبال کی انسان دوستی دراصل ان کے اس اجتماعی شعور کا مظہر ہے جس کے تار و پود اسلام کے نظریۂ زندگی سے مرتب ہوئے ہیں۔ اقبال کا اجتماعی شعور بجائے خود ایک مستقل اور نہایت وسیع موضوع ہے۔ یہاں ہم بہت اختصار کے ساتھ چند نمایاں نکتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک کائنات و حیات کسی حیوانی ارتقا کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ سراسر ایک الٰہی تخلیق ہے، پوری کائنات کا خالق ایک باشعور اور با اختیار ہستی ہے اور پوری نوعِ انسان ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے، اور حیاتِ انسانی کا ایک واضح مقصد ہے، جس کی تکمیل کے لیے ہی یہ پورا نگار خانۂ ہستی سجایا گیا ہے اور اس تکمیل کے لیے خالقِ ہستی نے خود ایک ضابطہ، ایک نظامِ فطرت تجویز کیا ہے اور اس کا نام بھی خود اُسی نے اسلام رکھا ہے، اس طرح اسلام درحقیقت کسی فرقے کا پیدائشی دھرم، یا کسی نسل و قوم و ملک کا سرکاری مذہب نہیں بلکہ یہ نام ہے زندگی کے ایک نظریے اور ایک نظام کا، اس کے کچھ اصول اور کچھ ضابطے ہیں، جو انھیں تسلیم کرے اور بجا لائے وہ مسلم ہے اور جو ان سے انکار کرے وہ غیر مسلم۔ چناں چہ اسلام خاص اصولی بنیاد پر ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کے تحت تمام بنی آدم کی ایک نئی وحدت قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں رنگ، نسل، وطن، رتبہ اور اثاثہ وغیرہ کی تنگ اور غیر فطری بنیادوں پر کسی قسم کی تفریق و تمیز روا نہیں رکھی جائے گی، ہر شخص کی حیثیت صرف اس کے انفرادی عمل و کردار کے مطابق متعین ہوگی، اور اس عمل و کردار کا معیار ہوگا ——— خدمتِ خلق، یعنی ذاتی خوبیوں کا اعتبار اسی وقت قائم ہوگا جب وہ اجتماعی فلاح و بہبود کے معاون ہوں، اس لیے کہ خالق نے ہر انسان کو انفرادی طور پر، اس زمین پر اپنا نائبِ سلطنت مقرر کیا ہے، لہٰذا ہر فرد کی یہ خلقی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق عالمِ انسانیت کی درستی اور بہتری کے لیے انتہائی حد تک کوشش کرے اور اگر اس کوشش میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کا خسارہ اس کو برداشت کرنا پڑے گا، یہ دُنیا دار العمل ہے، یہاں عمل اور ردِ عمل کی بنیاد پر ایک قانونِ مکافات جاری ہے: اور انسان کی زندگی صرف اسی خاک دان تک محدود نہیں، موت اک زندگی کا وقفہ ہے، اور اس دُنیا کی زندگی بس ایک مہلت کا عرصہ ہے، اس کے بعد ایک دُوسری دُنیا ہے، جہاں ہر شخص کی حیثیت اُس کے ان افکار و اعمال کی بنا پر متعین کی جائے گی جو اس نے اس دُنیا میں رہتے ہوئے کیے ہیں، اور وہ دنیا ایک پائیدار دُنیا ہوگی جس کے ایام کی کوئی حد متصور نہیں، چناں چہ جو کچھ غلط یا صحیح ہم یہاں کریں گے اُس کے بُرے یا اچھے نتائج ہمیں ایک مدتِ دراز تک بھگتنے پڑیں گے۔

اس طرح اقبال کی انسان دوستی اپنے اندر ایک حقیقت اور فریضے کی گرم جوشی اور سرگرمی رکھتی ہے۔ اقبال انسانوں کے دوست اس لیے نہیں کہ وہ خود اپنے دوست ہیں، انسان دوستی ان کا مقصد وجود اور وظیفۂ حیات ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کا فلسفۂ خودی ان کے اپنے اظہار کی عملی شکل انسان دوستی ہی میں پاتا ہے اور خودی کا مفہوم یہ متعین ہوگا کہ انفرادی شعور کی تربیت اور اس کی تہذیب سے اجتماعی کام لینے کی، یعنی ایک فرد اپنے دل و دماغ اور دست و بازو کی جملہ طاقتوں کی پرورش اس مقصد سے کرتا ہے کہ ان قوتوں سے ان تربیت یافتہ قوتوں سے عام انسانیت کی خدمت جاری رہے، ورنہ اقبال نہ تو اس کے قائل ہیں کہ کوئی فرد کسی خانقاہ میں چلے پر چلے کھینچ کر اپنے نفس کو زیادہ سے زیادہ عرش آشیاں کرتا چلا جائے، اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ کوئی فرد اپنی قوتوں کو ابھار کر دوسروں پر غالب آ جائے اور حاکم مطلق بن بیٹھے۔ اقبال کی خودی کی معراج ہے خلافت فی الارض، اور اس خلافت کا جو معیار اقبال نے تجویز کیا ہے وہ فقر ہے نہ کہ شہنشاہی اور اس فقر کے نمونے اقبال نے اسلامی تاریخ کے عہد زریں یعنی خلافت راشدہ سے پیش کیے ہیں ـــــ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ ـــــ وہ سب کے سب جس اصول پر عمل پیرا تھے وہ یہ تھا: "سید القوم خادمھم" (قوم کا حاکم، قوم کا خادم)۔ اس طرح انسان دوستی اقبال کے تصور میں فقط دردمندی کا ایک انداز نہیں، بلکہ درحقیقت انسانیت کا معیار کمال ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ صاحب قوت اور صاحب اختیار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس پر انسان دوستی کا فرض عاید ہوتا ہے، اور اس فرض کی کما حقہ ادائیگی اسی وقت ہوگی جب انسان کو دنیوی وسائل کے مطابق کمال درجے کی قدرت حاصل ہو جائے اور اس قدرت کے صحیح استعمال اور صاحب قدرت کی کامیابی یا ناکامی کی جانچ بھی اسی کسوٹی پر ہوگی کہ اس نے انسان دوستی کا حق کہاں تک ادا کیا۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا　　مروت حسن عالم گیر ہے مردان غازی کا

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز　　یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی　　سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ　　فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی　　کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری　　میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم

انسان دوستی کے اس بلند معیار سے جب اقبال نے اپنے زمانے کے عالمِ انسانیت پر نگاہ ڈالی تو انھیں بہت صدمہ اور بڑی تشویش ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ سترھویں صدی سے بیسویں صدی تک، صرف دو ڈھائی سو سال کے اس عرصے میں، جب دنیا کا انتظام اہلِ مذہب سے نکل کر ملاحدہ کے پنجے میں آگیا، انسانیت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی، مشرق سے مغرب تک پورا انسانی معاشرہ ایک سڑی ہوئی لاش کی طرح پھٹنے لگا، انسان اور انسان کے درمیان سارے اخلاقی رشتے ٹوٹ گئے، اصولوں کی جگہ اغراض نے لے لی، مفادات کو مفاسد کا درجہ دے دیا گیا، سائنس کی ترقی اور مشین کے فروغ نے تمام انسانی قدروں کو تباہ کر دیا، ناقص فلسفوں اور استبدادی نظاموں نے آدمی کو حیوانی سطحوں میں گرا دیا ——— ڈیماکریسی، کیپٹلزم، نازی ازم، فاشزم، کمیونزم سبھوں نے مل کر اپنے اپنے طور پر آدمیت کو متعدد قومیتوں میں تقسیم کر دیا، اور ایک طرف تو اپنی قومی ریاستوں کے دائرے میں انھوں نے خلقِ خدا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور دوسری طرف عالمی سطح پر ایک قوم کو دوسری قوم سے درندوں کی طرح لڑا دیا۔ اس طرح فکر و عمل کے ان خود ساختہ نظاموں نے خدا کی زمین ظلم و ستم سے بھر دیا۔ کہیں انسان کو رنگ و نسل کے اعتبار سے گورے اور کالے میں بانٹ دیا گیا، کہیں معیشت کے اعتبار سے سرمایہ دار اور مزدور، ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ کے الگ الگ خانوں میں بند کر دیا گیا، کہیں عورت اور مرد کو ایک میدانِ جنگ میں لا کر دونوں کو ایک دوسرے سے وحشیوں کی طرح بھڑا دیا گیا اور اقبال نہ صرف سطح کے ان احوال و واقعات کو دیکھ دیکھ کر کبیدہ تھے، بلکہ ان کی نگاہیں تہوں کو چیر رہی تھیں اور خرابی کے ان سرچشموں کا سراغ لگا رہی تھیں جہاں سے ہلاکت کے زہریلے دھارے پھوٹ پھوٹ کر انسانیت کو مسموم کر رہے تھے، چنانچہ اقبال اپنے زمانے کے حالات کو محض عارضی و ہنگامی حوادث نہیں سمجھ رہے تھے جو وقت کے ساتھ گزر جانے والے ہوں، بلکہ یہ حالات ان کے نزدیک گہرے امراض کی علامات تھیں جن کی گرفت جسمِ انسانی پر وقت کے ساتھ ساتھ اور سخت ہونے والی تھی اور اس لیے اقبال انسانیت کے مستقبل ہی کی طرف سے پُرتشویش تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان فکری نظاموں اور عملی اداروں پر سخت تنقید کی جو ان کی نگاہ میں خرابیٔ احوال کے ذمے دار تھے اور اپنی حد تک فاسد عنصر کو الگ کر کے چشمۂ انسانیت کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نگاہ میں ڈارون، ہیگل، مارکس، فرائڈ، نٹشے سب کے سب انسانیت کے مجرم تھے، اس لیے کہ جدید تمدن اور تہذیب کی بنیاد انھی جیسے دوسرے مفکروں کے نظریات پر ہے اور وہ تمام تحریکیں جنھوں نے عالمِ انسانیت میں ظلم و ستم کا بازار گرم کیا اور وہ تمام نظام جو ان سے متعلق تھے، سب کے سب انھی کے نظریات کے پروردہ تھے۔ اقبال کے نزدیک وہ طاقتیں جو انسانی معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں ان میں سرِفہرست یہ ہیں: الحاد، نسل پرستی، وطنیت، لادین سیاست، جنسی انتشار۔

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(طلوعِ اسلام)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(خضرِ راہ)

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا! — طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا — کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں — یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل — کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم — گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

بلکہ تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی — کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

---

* خضرِ راہ * طلوعِ اسلام * وطنیت (بانگِ درا)
* ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام * فلسفہ * مکہ اور جنیوا * مقصود * زمانۂ حاضر کا انسان * مغربی تہذیب * مردِ حر * حکیم نطشہ * مردِ فرنگ * عورت کی حفاظت * فنونِ لطیفہ * جمہوریت * مسولینی * انتداب * لادین سیاست * دامِ تہذیب (ضربِ کلیم)
* آزادیٔ افکار * ماہرِ نفسیات * فلسفی * ابلیس کی عرضداشت * سینما * فلسفہ و مذہب * دین و سیاست

"میں خدا کے حضور میں" (بال جبریل)

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" (ارمغان حجاز)

عالم انسانیت کے موجودہ حالات سے یہ بے زاری، مستقبل کے متعلق یہ تشویش اور تہذیب حاضر اور اس کے تمام اداروں اور نظاموں سے نفرت ـــــ یہ ساری باتیں قنوطیت یا کلبیت کے باعث نہیں اور نہ ایسی بات ہے کہ اقبال جدید سائنس کے تمام انکشافات و ایجادات کے منکر ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جدید علوم سے انسانیت کے جو امکانات روشن ہوئے ہیں اور انسانی ارتقا کی جو امیدیں ابھری ہیں ان کا بیان و ادراک جس اقبال سے زیادہ شان دار طریقے پر دنیا کے کسی شاعر نے نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی سطح پر اقبال عصر حاضر کے وہ یکتا شاعر ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کے تہلکہ خیز اور عنایت در شت افکار و علوم کو اپنے کلام میں اس درجہ جذب کر لیا (یہاں تک کہ ان ہی حقائق سے نوع بہ نوع استعارات تراشے) کہ وہ جزو شاعری بن گئے۔ سائنسی، سیاسی، معاشی اصطلاحات کو انھوں نے اپنے آہنگ میں سمو لیا اور مسائل وقت پر اس قدرت اور شدت سے گفتگو کی کہ وہی ان کی شاعری کے تار و پود بن گئے۔ بعض وقت تو ان کے فکر و گفتار کی شوخیاں اس نقطے کی طرف پرواز کرتی نظر آتی ہیں جس پر پہنچ کر فطرت کی جناب میں گستاخیوں کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ بلکہ بہت سارے اشعار تو فطرت کو للکارتے نظر آتے ہیں اور وہ کسی کم ظرف کی خیرہ سری کا انداز نہیں رکھتے، اس میں ایک والہانہ ناز کا نتیجہ ہے، شاعر اپنے دور کے انسانی کمالات کے تصور میں سرشار نظر آتا ہے، اور ایسا لگتا ہے جیسے تھوڑی دیر کے لیے وہ ان کمزوریوں کو بھول گیا ہو جن کا نہایت بھیانک نقشہ وہ بارہا پیش کر چکا ہے۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشت سادہ، وہ تیرا جہان بے بنیاد

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

"روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"

لیکن یہ سارا نشاط و انبساط محض برائے نشاط و انبساط نہیں، اور نہ رجائیت کا سرچشمہ محض دانش حاضرہ کی تابانیاں نہیں۔ انسانیت کے مستقبل کے متعلق تشویش یا اس کے امکانات کی توقع، نیز انسان کی انسانی دستبرد [illegible] ان دونوں رخوں کو میں نے یہ دکھانے

کے لیے پیش کیا ہے کہ ان کی اہمیت محض تاریخی اور روشنی کے درمیان تمیز اور توازن کر سکتے ہے اور یہ کہ ان کی شائستگی ایک حقیقت پسندی پر مبنی ہے، وہ جدید انسان کی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اس کی قوتوں سے بھی واقف ہیں کہ اگر آدمی بھٹک جائے تو اپنی باقی ہوئی چیزوں سے اپنا گلا آپ برداشت نہ کر سکتے اور تاریخ کے طویل ادوار میں وہ ایسا کرتا رہا ہے۔ اس لیے ہمیں جدید علوم نے جو طاقتیں انسان کے ہاتھوں میں دے دی ہیں، وہ بہت ہی خطرناک ہیں، ان کے برتاؤ میں ذرا سی بھی لغزش ہے ایک ذرا سی چوک سطح زمین پر آدمیت کا خاتمہ کر دے سکتی ہے۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام　　　وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا　　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو　　　اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

اقبال کے تصورِ انسانیت کی یہ جامعیت اور ان کے کلام کی شائستگی و مرکزیت دراصل نتیجہ ہے ان کے اس نظریۂ حیات اور اجتماعی نصب العین کا، جس کا تذکرہ ابتدائی صفحوں میں کیا جا چکا ہے۔ اقبال نہ صرف یہ کہ ایک صاحبِ پیغام شاعر ہیں، بلکہ وہ ایک الہامی شاعر بھی ہیں، یعنی ان کا فلسفہ محض کتاب خوانی اور ذہنی ریاضت کا ثمر نہیں، اس کے پیچھے قوت کو ایک الوہی جذبہ ہے۔ اقبال نے اپنے وقت کے فلسفیوں پر جو تنقید کی ہے اور ان فلسفیوں کے متضاد اور متقابل جو ایک نظام فکر پیش کیا ہے وہ اسی الہامی موقف کا ہے انھوں نے اسلام کو شعوری طور پر انسان اور انسان، اور انسان اور کائنات کے درمیان ارتباط کا سب سے فطری، معقول اور مکمل طریقہ سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک جدید انسان علم و عقل کی فراوانی کے باوجود جو اس درجہ پریشان اور ناروا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اسلام کے اصولِ فطرت اور طریقِ حکمت سے بہت دور ہٹ گیا ہے، اور اگر آج بھی وہ اپنے عقل و علم کی اطاعت کی باگ اسلام کے ہاتھ میں دے دے تو عقل و علم کی لغزشیں اور زیادتیاں ختم ہو جائیں اور ان کی جگہ ان کی برکتیں اور رحمتیں دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیں۔ دراصل یہی وہ مقامِ معرفت ہے جہاں پہنچ کر اقبال اوصافِ آدم کے اس درجہ شیدا و شیفتہ ہو جاتے ہیں کہ بار بار خالقِ آدم سے مخاطب کر کے کبھی تو شکوہ سنج ہوتے ہیں اور کبھی مناجات سرا، اور یہی وہ مقامِ عشق ہے جس میں اقبال کا درد انسانیت، ان کی مجبوریاں اور آرزومندیاں پورے طور پر آشکارا ہوتی ہیں، اور انسان دوستی خدا پرستی سے مل کر اس اونچائی پر پہنچ جاتی ہے اور اس میں اتنی گہرائیاں اور پہنائیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس کا تصور بھی ایک نرا انسان پرست نہیں کر سکتا، مگر وہ انسان پرستی تو بس ایک خلا کی چیز ہے اور اس کا رخ ہمیشہ پستیوں کی طرف ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ فرقے اور قوم اور وطن اور نسل، وہ خود اپنی ذات کی تنگ حدود ہی میں سو جاتی ہے

اہ وہ مادی طور پر انسان کو اشرف مخلوقات سمجھتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی آفاقی حیثیت سے بھی واقف ہیں۔

ے۔ اس لیے کہ انسان پرستی کا کوئی ٹھوس معیار اور کوئی واضح موقف اور کوئی متعین اصول نہیں ہوتا، یہ ایک سیال کی طرح موقع و محل کے اعتبار سے کبھی ذات، کبھی قوم اور کبھی وطن کے مختلف ظروف میں ڈھلتی رہتی ہے، اس کے برخلاف خدا پرست انسان دوستی ایک دین اور ایک شریعت کی ٹھوس بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور اگر وہ دین اور شریعت آفاقی ہے، جیسا کہ اسلام ہے، تو اس پر مبنی انسان دوستی بھی آفاقی ہے، یعنی یہ متدین انسان دوستی واضح طور پر چند متعین قواعد و ضوابط کے ساتھ ایک عالمی اخوت کا قیام عمل میں لاتی ہے، ایسی مضبوط اور مستحکم اخوت جس کے سامنے رنگ و خون اور زمین و زر کی ساری حد بندیاں گرد ہو کر رہ جاتی ہیں، یہ اخوت کسی بھی حالت میں کسی بھی قیمت پر انسانیت کو نہ تو مذہبی و سیاسی فرقوں اور جماعتوں میں بانٹتی ہے اور نہ نسلی و معاشی قبیلوں اور طبقوں میں تقسیم کرتی ہے، یہ اخوت پورے معنے میں عام انسانی حریت اور مساوات کو بروئے کار لاتی ہے اور قانونِ قدرت کے مطابق انسانی معاشرے میں عزت و امتیاز کا صرف ایک معیار قائم کرتی ہے، یعنی حسنِ عمل، ایسے انسانی معاشرے میں ہر فرد صرف اپنے ذاتی کردار کی بنا پر پست یا بلند ہوتا ہے: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اقبال اسی معنے میں انسان دوست تھے، انسان پرست نہیں تھے، اور اسی لیے ہی وہ ایک آفاقی شاعر تھے، نہ کہ وطنی و قومی شاعر اور یہی انسانی آفاقیت اقبال کی شاعری کا مشن اور پیغام تھا۔ اس مشن کو روبہ عمل لانے کے لیے اقبال کے ذہن میں ایک پورا نقشہ، ٹھوس اور عملی نقشہ، مرتب تھا، وہ ایک تدریج کے ساتھ سب سے پہلے جہان، پھر مشرق اور پھر پوری دنیا کو مخاطب کرتے ہیں، یہاں تک کہ وطنیت کے مخالف ہونے کے باوجود وہ اس تدریجی نقشۂ عمل میں ایک نمایاں مقام اپنے وطن ہندوستان کو بھی دیتے ہیں، اس لیے کہ اپنے دور کے مشرق میں وہ غیر منقسم برصغیر ہندوستان کو ایک اہم مقام پر فائز دیکھتے ہیں۔

"روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"

آدم کو ثبات کی طلب ہے　　دستورِ حیات کی طلب ہے

دین مسلکِ زندگی کی تقویم　　دین سرِ محمد و براہیم

———　(ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام)

نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی　　بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

———

وہ ایک کام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں　　کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

———　(شبِ معراج)

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند۔

———　(احکامِ الٰہی)

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

———

تُجھے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا! خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی، استغفراللہ!
یہ دردِ سر نہیں، دردِ جگر ہے

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ ہے اقبال کی انسان دوستی کا وہ ایورسٹ جہاں سے وہ تمام عالمِ انسانیت پر ایک سی نگاہ ڈالتے ہیں اور خالص اخلاقی سطح پر فروغِ آدم کے لیے چند اصول و عقاید اور ضابطے تجویز کرتے ہیں جن کی رُو سے انسان خلافتِ ارضی کے اس مقام کا اپنے آپ کو ثابت کر سکتا ہے جس سے بڑھ کے کسی مقام کا تصور کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ چناں چہ اس مقامِ بلند پر فائز ہونے کے لیے اقبال نے مردِ کامل کا ایک آئیڈیل پیش کیا ہے جس کو اپنے کلام میں انھوں نے بیشتر "مومن" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور اس مردِ مومن کی خصوصیات انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ در اصل یہی انسانِ مومن اقبال کا مرکزی تصور ہے اور خدا کے بعد یہی وہ ذات ہے جس کی شان میں شاعر نے اپنے دل کا پورا سرمایہ صرف کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس کی مثالیں ذاتِ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر آپ کے اصحاب اور اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والے تاریخ کے مختلف ادوار کے متعدد رجال و اشخاص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک مردِ مومن کسی نسل یا فرقے کے روایتی فرد کا نام نہیں، بلکہ یہ سر تا سر ایک مثالی شخصیت ہے، جس کے چند عام اوصاف ہیں، جس شخص کا بھی جی چاہے وہ ان اوصاف کا اتباع کر کے مردِ مومن بننے کی کوشش

کر سکتی ہے، اس لیے کہ یہ شخصیت ہر دور اور ہر مقام کے لیے یکساں اپیل رکھتی ہے، اور یہی شخصیت انسانیت کا نقطۂ کمال ہے، خالق انسان نے جتنی بھی قوتیں انسان کو عطا کی ہیں، وہ سب اسی کی ذات میں مرتکز ہوتی ہیں، چناں چہ یہی شخص روئے زمین پر خالق کے تخلیقی منصوبے کو بروئے کار لانے والا ہے اور اس طرح خالق کا معتمد علیہ ہے، اور یہی شخص عصر حاضر کا وہ مہدی و ناجی ہے جس کا اقبال کو انتظار رہا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن　　گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

(مرد مسلمان)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(مومن)

دُنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت　　ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

(مہدی برحق)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

(کافر و مومن)

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز　　تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

(تن بہ تقدیر)

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے　　دُنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

(مرد مسلمان)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
خاکی و نُوری نہاد، بندۂ مولا صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں　　اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ　　حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

(مسجد قرطبہ)

اپنی انسانیت دوستی کا یہ مرکز تعلق قائم کرنے کے بعد اقبال نے اپنی ہمدردیاں پورے عالم انسانیت میں بکھیر دیں اور بڑی وسیع نظری کے ساتھ انھوں نے جدید و قدیم، مشرق و مغرب، یہاں تک کہ اسلام اور غیر اسلام کے تمام اداروں اور اشخاص سے دل چسپی لی

ان کے اعمال کا تجسس کیا، ان کے اوصاف کو پرکھا، انسان کی اقدار کو زیرِ بحث لا کے اپنے معیار کی روشنی میں کچھ رد کیا اور کچھ کو قبول۔ یعنی حکمت و دانائیت کو مومن کی متاعِ گم شدہ سمجھ کر بلا امتیاز فرقہ و مذہب ہر جگہ سے اٹھا لیا۔ اس میں مسلم و کافر کی تمیز کی اور نہ مشرق و مغرب کی، بلکہ اسلام کے علاوہ قدیم مذاہب ——— عیسائیت، ہندو دھرم، بدھ مت ——— اور جدید نظام ہائے فکر ——— مغربی جمہوریت اور روسی اشتراکیت، سبھی کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا، ان کی اچھی باتوں کو سمجھا اور اپنایا۔ فلسفہ، ادب اور سائنس کی بے شمار شخصیتوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح اقبال نے اسلام کو ایک کیمیا اور ایک جوڑنے والی طاقت کے طور پر سمجھا اور اس کو ایک نیوکلیس بنا کر اس کے گرد عالم کے تمام اجزائے پریشاں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے چند اہم پہلوؤں کی طرف ہم ذیل میں کچھ اشارے کیے دیتے ہیں۔

اقبال دوسرے مذاہب کی مقدس شخصیتوں کا بے حد احترام اور تکریم کرتے ہیں، بلکہ عقیدت مندانہ انداز میں ان کے پیغام و نصائح کو اس طرح پیش کرتے اور ان کی تحسین کرتے ہیں جیسے یہ پیغام اور نصائح ان کے دل کی آواز اور ان کے لیے جزوِ ایمان ہوں۔ اس طرح وہ اپنے قاریوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان پیغام و نصائح کا اتباع بھی انھیں اسی طرح نجات کا رستہ دکھائے گا جس طرح اقبال کا وہ محبوب پیغام جسے وہ اسلام کہتے ہیں۔ یہ واقعہ جہاں اقبال کی عام انسان دوستی اور رواداری کا ثبوت مہیا کرتا ہے وہیں ان کی اصول پسندی کو بھی شہادت دیتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے پیشِ نظر کسی قوم اور فرقے کی مصلحت اندیشی نہیں بلکہ ایک آفاقی نصب العین کا فروغ ہے اور وہ اس نصب العین سے موافق مواد کو 'جہاں بھی ملے' اختیار کر لینے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں اور اس طرح ایک عالمی برادری کے لیے فضا ہموار کرتے ہیں، جس میں تحسین و تردید خالص اوصاف کی بنا پر ہوگی اور کسی گروہ یا حلقے کے خلاف تعصب کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ اسی اصول پسند وسیع القلبی کی ایک علامت اقبال کی گہری دلی دوستی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی تڑپ ہے۔ بعض سیاست داں اور بعض شاعر و ادیب تحریکِ پاکستان کے بعد اقبال کو فقط ایک فرقے کا شاعر سمجھنے اور سمجھانے لگے ہیں، لیکن کلامِ اقبال کی پوری اسکیم اور اسپرٹ اس مغالطے کی زندہ تردید ہے۔ "رام"، "گوتم"، "نانک" وغیرہ شخصیتوں کے متعلق اقبال نے جو خیالات کا اظہار کیا ہے اور "صدائے درد"، "تصویرِ درد" اور "شوالہ" وغیرہ نظموں میں جو جذبات انھوں نے ظاہر کیے ہیں پھر ان کا عام اصول سر تا سر جہاں کی پوری شاعری کا محور ہے، یہ سارے حقائق اقبال کو ایک ایسا وسیع النظر مفکر ثابت کرتے ہیں جس کا خطاب بلا امتیاز قوم و ملت تمام انسانوں سے یکساں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ساری سطح پر ایک اصولِ وحدت کی طرف بلاتے ہیں اور اگر اس اصولِ وحدت ہی کو بنائے تفرق سمجھا جائے تو پھر اس غیر اصولی انداز میں سوچنے والوں کو انسانی ضدوں میں سمجھانا محال ہے۔

اقبال کی نہایت گہری ہمدردی پس ماندہ عوام کے ساتھ بھی ہے۔ انھیں تمام دنیا کے محنت کشوں سے محبت ہے اور ان کی بہبود پر مصر رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی انقلاب ایسا رونما ہو جو مزدوروں کو سماج میں ان کی حقیقی جگہ دلائے۔ اقبال انسانی شرف و مساوات کے شدت کے ساتھ قائل ہیں اور معاشی جبر یوں اور پیشوں کو ایک فطری چیز سمجھتے ہیں لیکن ان کی بنا پر سماجی جبر یا اونچ نیچ کو قطعی مردود اور مصنوعی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اقبال کے نزدیک پیشے اور طبقے وہ ثانوی ہیں، قطع نظر ہر فرد کی اپنی ایک منفرد قدر و قیمت

ہے جو سراسر اس کے کردار پر منحصر ہے اور کردار کو وہ معاش کی بجائے اخلاق پر مبنی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اقبال کا مقصود یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ایسی اخلاقی بنیادوں پر قائم ہو کہ مزدور کو بھی اپنی شخصیت کے ارتقا کے ویسے ہی مواقع حاصل ہوں جیسے سرمایہ دار کو ہوں، دولت مواقع کو کم اور بیش کرنے والی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بڑے حد پر اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ مساوات اسی وقت ممکن ہے جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا استحصال (ایکسپلائٹیشن) کرنے کی اجازت نہ ہو، سرمایہ کو غلط راہوں میں جانے کی رخصت نہ ہو، اور کم سے کم ضروریات ہر شخص کی بہ آسانی پوری ہو سکتی ہوں، یعنی بہ حیثیت مجموعی معاشی نظام انصاف پر مبنی ہو۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے اہم موضوعات میں ایک 'سرمایہ و محنت' بھی ہے۔ "خضر راہ"، "فرمانِ خدا (فرشتوں کے نام)" وغیرہ مستقل نظموں یا ان کے مستقل حصوں کے علاوہ بھی بے شمار مقامات پر متعدد عنوانوں سے اقبال نے اس موضوع کو چھیڑا ہے۔

یہ معاملہ محض پس ماندہ عوام اور مزدوروں کا نہیں تھا، بلکہ پوری انسانیت ہی مبتلائے عذاب تھی۔ صرف سرمایہ دار مزدور کو استعمال نہیں کر رہا تھا، بلکہ ہر انسان دوسرے انسان کو استعمال کرنے کی تاک میں تھا۔ ایک خدا کو چھوڑ کر انسان کی پیشانی بے شمار آستانوں پر جھکی ہوئی تھی۔ انسان ہی انسان کا خدا بنا ہوا تھا۔ نتیجۃً انسانوں ہی کے درمیان ایک طبقہ اتنا بلند ہو گیا تھا کہ اپنی خدائی کا ڈنکا بجا رہا تھا اور دوسرا طبقہ اتنا پست ہو گیا تھا کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کر رہا تھا۔ اقبال انسان کی اس تذلیل پر سخت مضطر تھے، چنانچہ جہاں کہیں انہیں اس تاریکی کے پردے کو پھاڑتی ہوئی کوئی ہلکی سی کرن بھی نظر آ جاتی تو وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اقبال نے وسیع مطالعے، راست مشاہدے اور گہرے تجزیے سے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ دنیا کی کل اس لیے بگڑی ہوئی ہے کہ مغربی استعمار، فرنگی الحاد اور کلیسائی اخلاق دنیا کی اجتماعیت پر مسلط ہو گیا ہے اور اپنی ہوس رانیوں اور جفاکاریوں سے تہذیبِ انسانی کے پورے سرمائے کو غارت کیے دے رہا ہے۔ اس طرح اقبال کے سامنے نقشہ یہ تھا کہ ایک طرف اہلِ کلیسا کا استعمار پوری انسانیت پر ظلم کر رہا تھا اور دوسری طرف تمام بنی آدم مظلوم تھے ۔۔۔۔۔ اس صورتِ حال میں روس کے افق سے اشتراکیت ابھری، اس نے ایک طرف کلیسا کی غارت گری کو چیلنج کیا، تو دوسری طرف عام حریت اور مساواتِ انسانی کا دعویٰ کیا۔ اقبال جو ایسی ایک تحریک کے منتظر تھے اور خود اپنی حدود میں ایک انقلاب کا راستہ ہموار کرنے میں لگے ہوئے تھے، انہوں نے نہایت پرجوش طریقے پر اور بڑی توقعات کے ساتھ اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کیا۔ "کارل مارکس کی آواز"، "اشتراکیت"، "فرمانِ خدا"، "سرمایہ و محنت" (خضر راہ)، "بلشویک روس" جیسی نظمیں لکھیں، یہاں تک کہ "جاوید نامہ" میں جمال الدین افغانی سے ملتِ روسیہ کو ایک پیغام دلوایا۔ لیکن اشتراکی روس کی دہریت اور مارکس کی تحریک کے الحاد نے اقبال کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا، یہاں تک کہ بنیادی طور پر انہیں مغربی جمہوریت اور مارکسی اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں معلوم ہونے لگا۔ اقبال کی اشتراکیت سے ابتدائی توقع اور اس توقع کی شکست کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے، جاوید نامہ میں ملتِ روسیہ کے نام افغانی کا پیغام تو سراسر اسی احساسِ شکست پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ بعض شذرے ضرب کلیم میں "اشتراکیت" کے فرضی محاسن اور بنیادی نقص کا بھرپور جائزہ ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" بھی اسی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے۔

اقبال کے پیشِ نظر انسان کی دوستی و بہبود کا جو آئیڈیل تھا اس نے ان کی نگاہ میں اپنے وقت کی تمام اجتماعی قوتوں کو قرار دیا۔ وہ ایک طرف ہم عصر سیاستدانوں اور جنگی مشینوں سے بے زار ہو گئے، تو دوسری طرف ملاؤں اور صوفیوں کو بھی انہوں نے ہدفِ تنقید بنایا تھا۔

کے مسلمانوں کی مدافعتی میں مشرقی جماعتوں کی آماجگاہ تھا، تو مغرب خواہشات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایشیا اور روح سے محروم ہو کر مادہ پرست ہو گیا تھا اور یورپ روحانی اقدار سے خالی ہونے کے سبب فساد انگیزی کا پتلا ہو گیا تھا۔ اس طرح گویا کلیسا اور ملا دونوں کا انحطاط اور مدرسہ دونوں ہی اپنے اپنے انداز میں اسلام کے اصلی نصب العین سے باغی ہو گئے تھے اور ان سے انسانیت کی تعمیر ناممکن ہو چکی تھی، وہ خود گمراہ اور غلط کار ہو گئے تھے، دوسروں کے فکر و عمل کی اصلاح ان سے کیا ہوتی۔ علامہ اقبال عالم انسانیت کی اصلاح کے لیے فکر و نظر میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ گیر انقلاب کے داعی تھے۔ انھوں نے اس بات کی پوری وضاحت اپنے کلام میں کی ہے کہ وہ انسانی سماج کے تمام دائروں میں اسلام اور اس کی کتاب قرآن کی بنیاد پر ایک کلی انقلاب چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان اپنی غلط اندیشیوں اور بداعمالیوں کی بدولت جو ہمہ گیر بیگانہ نار ہو گیا ہے اس سے رہائی اسی وقت ممکن ہے جب تمدن کی عنان ان کے مشرقی و مغربی علمبرداروں سے چھین کر اسلام کے حقیقی علمبرداروں کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ تب ہی انسان کی آئندہ نسلوں کی بقا اور ارتقا ممکن ہے، ورنہ انسانی تمدن کی گاڑی جس رخ پر جا رہی ہے وہ ہلاکت کے کھلی تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی انسان دوستی کسی تعصب اور جذباتیت پر مبنی نہیں، بلکہ یہ ایک خاص اصول اور فکری نصب العین سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں افراط و تفریط نہیں، کامل توازن اور اعتدال ہے۔ یہاں عشق کی بھی اہمیت ہے اور عشق کا پیغام یہاں جلال بھی اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے جس کا دوسرا رخ جمال ہے۔ یہاں لطافت اور صلابت دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی وہ توازن ہے جو اقبال کے فلسفۂ قوت اور فلسفۂ خودی کی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ بعض مستشرقین نے اقبال کے فلسفے کو نٹشے کے تصورات سے ماخوذ قرار دے کر اس میں فقط جبر و قہر کے عناصر دریافت کیے ہیں، یہاں تک کہ اس کو فاشزم سے ملحق کر دیا ہے۔ اس غلط فہمی کی شروعات اقبال کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی، چنانچہ اس موضوع پر ان کا ایک وضاحتی خط 'مکاتیب اقبال' میں موجود ہے، جس میں انھوں نے مستعار الزام کی پر زور تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفۂ خودی کی ترتیب اس وقت کی تھی جب نٹشے کے افکار کی بھنک ہم کو بھی نہیں لگی تھی۔ اس کے علاوہ اپنے کلام میں انھوں نے متعدد مقامات پر نٹشے کی سخت تردید کی ہے۔ وہ اسے 'مجذوب فرنگی' کہتے ہیں اور اپنی ایک غزل میں اس نظریہ پر تبصرہ یوں فرماتے ہیں کہ نٹشے اپنے قلبی واردات کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا اور اس لیے بعض حکیمانہ نتائج دریافت کرنے کے باوجود مرد مومن سے بھٹک گیا۔ اسی طرح اقبال کا تصور شاہین خود اس نظم سے آشکار ہے جو اس عنوان سے 'بال جبریل' میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی شاہین کی تصریحات کلام اقبال میں جابجا ملتی ہیں۔ پھر مکاتیب اقبال میں ان کا وہ مشہور خط ہے جس میں انھوں نے شاہین کی صفات ——— توکل، غیرت، حمیت، بے نیازی وغیرہ ——— گنائی ہیں اور ان صفات کی بنا پر اس پرندے کے ساتھ اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔ خودی اور شاہین کے متعلق اقبال کے تصورات کا ماحصل صرف یہ ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ دوستی کو بھی انسانیت کا ایک ضروری عنصر قرار دیتے ہیں، کیونکہ کائنات کی ترتیب جس نظام پر ہوئی ہے اور فطرت کا جو اصول ہے، اس کی روشنی میں افراد و اقوام دونوں کی زندگی میں رحمت و شفقت کے ساتھ قوت و طاقت کا وجود بھی اگر نہ ہو تو انسانیت عدم توازن کا شکار ہو جائے گی۔ چنانچہ اقبال کی انسان دوستی میں عدم تشدد کے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کی نگاہ میں یہ چیز انسانوں کے حق میں نادان دوستی ہوگی، وہ اس چیز کو کمزوری اور بزدلی کی علامت سمجھتے۔ یہ لوگ گوسفندی [illegible]

سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ ایک مکمل فرد اور معاشرے کے اندر سختی اور نرمی دونوں اوصاف برابر برابر موجود ہونے چاہئیں اور موقع کے مطابق ایک مناسب اعتدال میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے کا استعمال ہونا چاہیے، اور یہ کہ نرمی بھی اُسی کی معتبر اور مفید ہے جو سختی کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔

بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(شعاعِ اُمید)

———

مسکینی و محکومی و نومیدیِ جاوید — جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

(ہندی اسلام)

———

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال — مُلا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار

(مستیِ کردار)

———

یا مُردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار — جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

(فلسفہ)

———

دُنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

(مہدیِ برحق)

———

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

———

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر — یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

(اقوامِ مشرق)

———

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں — پُرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

(ضمیرِ مشرق)

———

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ رُوح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

(مغربی تہذیب)

———

مُردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق — عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

(عصرِ حاضر)

———

اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی — ترس رہی ہے مگر لذّتِ گنہ کے لیے

(حکیم نطشہ)

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

ـــــ (جلال و جمال)

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

ـــــ (اشتراکیت)

جہان مغرب کے بت کدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں — ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقل عیار کی نمائش

ـــــ (کارل مارکس کی آواز)

یہ وحی دہریت روس پر ہوئی نازل — کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

ـــــ (بلشویک روس)

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی — کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

ـــــ (مشرق)

نہ شرق اس سے بری ہے نہ غرب اس سے بری — جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

ـــــ (مشرق و مغرب)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے — فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

ـــــ

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

ـــــ

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

ـــــ

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو — یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

ـــــ

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

ـــــ (صدائے درد)

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

ـــــ (تصویر درد)

عالم حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے — اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

ـــــ (خضر راہ)

المختصر، اقبال کی انسان دوستی چند مبہم خواہشات اور آوارہ جذبات کا مظاہرہ نہیں، یہ ایک واضح مقصد اور معین اصول کا اظہار ہے، اس کا تعلق زندگی کے ایک نصب العین سے ہے۔ یقیناً اس کا محرک ایک فطری اور بے اختیار درد دل ہی ہوگا مگر اس کا مقصود عالم انسانیت کی منظم اصلاح ہے۔ اقبال شاعر اور فن کار ضرور تھے اور پورے طور پر تھے، لیکن وہ ایک باشعور اور حقیقت پسند فن کار اور شاعر تھے، اور فن شعر ان کے کلام کی ثانوی حیثیت ہے۔ زیر موضوع، موضوع ان کا انسان ہے، اپنی تمام عصری وسعتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ، اقبال کے مطالعہ و تفکر نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی انسان دوستی کے قیمتی روحانی تقاضے کو محض چند خوابوں اور تصوروں میں تحلیل کر کے نہ اڑا دیں، بلکہ اسے ایک ٹھوس فکری و عملی شکل دیں، تاکہ فی الواقع انسان کی نجات اور فروغ کے امکانات پیدا ہوں۔ اقبال نے اپنے عہد کی انسانیت کے جو امراض تشخیص کیے ہیں وہ بنیادی طور پر تین ہیں: بے یقینی، بے عملی، باہمی تنافر، اور ان امراض کا جو علاج انھوں نے تجویز کیا ہے وہ یہ ہے: محکم یقین، پیہم عمل باہمی محبت ——— اور یہ باتیں محض مجرد اور مبہم اوصاف نہیں، بلکہ ایک معین اجتماعی نصب العین یعنی اسلام کے واضح اصول و اقدار ہیں۔
——— اور یہ امراض اور ان کا علاج کسی ہنگامی آفت کا وقتی دفیعہ نہیں، بلکہ دراصل یہ انسان کی ان بنیادی و آفاقی کمزوریوں کا، جو تاریخ کے ہر دور میں شکلیں بدل بدل کر ابھرتی رہی ہیں، وہ اساسی و دائمی تدارک ہے جو ابتدا انسانیت سے مختلف شکلوں میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

(ارتقا)

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی — علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا — بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مذہب سے ہمارے نوجوانوں کی بے رُخی

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

یورپ کے ایک صاحب دل ادیب ڈبلیو ٹرائن کا قول ہے:

"Religion, in true sense, is the most joyous thing the human soul can know. The real religion is an agent of peace, of joy and happiness. Let our places of worship grasp these truths and then such crowds will flock to them that their very walls will seem almost to burst." **(In tune with the Infinite P. 208.)**

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب ہے کیا چیز؟ اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہدایت، قوت، مدد اور نور کا منبع ذ
ایک ہستی خدا ہے۔ ذات باری سے اپنا ربط پیدا کرنے کی کوشش کا نام ایمان ہے۔ اس کوشش کی تکمیل عمل کے ذریعے ہوتی ہے اور ایمان و عمل کا مجموعہ
مذہب کہلاتا ہے۔ مذہب دل میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرتا اور روح پر لامحدود مسرتوں کے پٹ کھول دیتا ہے۔ یہ کائنات ایک ساز
ہے جس سے شاہد کائنات کی تجلیاں پھوٹ پھوٹ کر ہر چہار سو پھیل رہی ہیں۔ جب مسلمان حجاب ظاہر سے پرے جھانکتا ہے تو اس کو حسن ازل
جذبۂ شوق کو اور بھی اکسانے لگتی ہیں۔ حریم دل میں بے پایاں گداز کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ نظر میں وسعت آتی ہے، ہر منظر پیکر نور اور ہر ذرّہ
جو جمالیات اور اس عالم کیف و سرور کے سامنے زمان و مکان کی ہر وقت بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حکیم مشرق
نے فرمایا تھا:

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے، مرحلۂ شوق نہ ہو طے

قدرت کے بے شمار مظاہر میں دو ہیں کائنات اور دل۔ کائنات کی مختلف توانائیوں کے نام ہیں شیم، بجلی، نور، روشنی، مقناطیسیت
وغیرہ، جن کی تسخیر صرف علم سے ہو سکتی ہے اور دل اس مہیب مقناطیسی چشمہ ہے جو بیرونی قوتوں کو وہ نیم کر سکتا ہے۔ چٹانوں سے چشمے نکال
سکتا ہے، سیلاب موڑ سکتا ہے، سمندر پاٹ سکتا ہے، جان فروشوں سے عرب کے ایک نہتے چھیدا ہو کر ریا شکست جیسے جابر سے کر چکا ہے
اور سب کچھ ہو کر خود بے پایاں جلوہ نمائی کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ یہ توانائی عشق سے حاصل ہوتی ہے اور یہ عشق ملتا ہے حقیقی مذہب سے
جو علم و عشق ہر دو کا حسین امتزاج ہو۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ او دلِ درد آشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

...مغرب کے پاس علم تو ہے لیکن عشق موجود نہیں، نتیجۃً اس کا علم کائنات کے لیے لعنت بنا ہوا ہے۔

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام

آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب اے انقلاب

۱۴ جنوری ۱۹۶۱ء کو رہبرِ انقلاب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان کی نو سائنٹفک کانگرس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اور خوب فرمایا:

"I believe that real fullness of life can be achieved only by bringing about a workable and effective balance and co-ordination between the forces of religion, philosophy and science. If the first two (religion and philosophy) fail to assert their full weight, the chances are that the uncontrolable monster of science will submerge mankind under stark materialism attended by complete moral and spiritual anarchy leading perhaps to total destruction. It is only religion, backed by a rational and pragmatic philosophy, that can save the world from such a harrowing destiny."

انسانی روح ایک پراسرار تخلیق ہے۔ جس کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا پورا علم ابھی تک نہیں ہو سکا۔ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ روح ایک لامکانی عنصر ہے جو قیودِ زمان و مکان کو پسند نہیں کرتی۔ اگر ہم اسے خواب و خور کی عارضی لذتوں میں الجھانا چاہیں تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عیش پسند جنہیں تمام مادی وسائلِ طرب تو حاصل ہیں لیکن ان کا رشتہ سرور و کیف سے ٹوٹ چکا ہے، یعنی جنت سے ٹوٹا ہوا ہے، ان کی روح میں اضطراب کی آگ سدا سلگتی رہتی ہے۔ حواسِ خمسہ کی نارسائی ... ارتقا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو لامتناہی، لامحدود اور دائمی ہے۔ روح دراصل ایک مسافر ہے جو اس خاکدان سے گزر کر منزل بہ منزل روحانی بلندیوں کی طرف جا رہی ہے۔ اور:

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی (نجم)

(تمہاری آخری منزل اللہ ہے)

یورپ کا ایک صاحبِ فکر کیا پتے کی بات کہتا ہے:

"The individual existence begins on the physical plane and then rises through successive gradations of ethereal and celestial spheres to a destiny of unspeakable granduer and glory."

یہ اقتباس جن آیت کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے :

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا
اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝ (۸۴ : ۱۶ — ۱۹)

(شفق شام کی قسم رات کی اور ان ستاروں کی قسم جنہیں رات فراہم کرتی ہے نیز چاند کی قسم
جب وہ بدر کامل ہو جاتا ہے کہ تم زینہ بزینہ اور منزل بمنزل اوپر کو جاؤ گے ۔)

اس آیات میں ایک عجیب انداز سے کام کیا ہے ۔ [illegible] جو پہلے ادنیٰ ہیں ... ہیں قرآن سیاب میں اضطراب اور شباب
مستقر ہوا ہے ۔ ... نے ... آیت ... سے ... و سلام ... کے ... دیا تھا ... نے ... وشیب کی ... کا ہیرت
انتظام کیا تھا ... ہیں ... ہیں ۔ جو ... کے ... کر ... انداز ... ہیں ۔ ... کی ... کر ... لیے
ہیں ... پہنچنے کی ... تسخیر ... اور ... میں ... جاتا ہے
بقول ڈاکٹر ... :

"By yielding to Nature we can conquer it" (The projection of
he Astral self.)

تسخیر ... قوت ... بقول اقبال :

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

... نے ... ان کے ... سے ... کہ ... کی ... سے ... (
ہے ان کے پاس ... بہت زیادہ ہے ... ہے ... کا ... ہو ... دی :

« ... لهم ... »

کہ اگر ہم ان پر تفوق کے ... اتنے توانا و قوت ہے انھیں بھی شکست نہ
کر سکے ۔

اس قوت کا ایک ... ہوا ہے ... امریکہ کی بعض حرکات سے ... ہو کر واشنگٹن پہنچے ۔ ا
قوم علم ، دولت اور سائنس اور فوجی طاقت کے لحاظ سے اتنی عظیم ہے کہ ساری کائنات اس کی ہیبت سے لرزہ براندام ہے ۔ ...
... قوت کا ... کہ ... کی ... قوم ... اور ... ایک ... تھا :

"Ayub was like a tiger in a village and no body knew where he
ould strike next."

... ہے کہ کشمیر کا ... امریکہ کی مدد سے حل ہوگا اور نہ ... قوم کی ... سے ... کا فیصلہ ...

اس تلوار سے ہوگا جو بندۂ مومن کے ہاتھ میں ہوگی۔ ایران اور روم کی مہیب قوت کو عربوں کی تلوار نے نہیں، بلکہ اُن کے ایمان نے شکست دی تھی۔ اگر پاکستان کی مختصر آبادیاں اسی بے پناہ قوت سے مسلح ہو گئے تو ان کے عقابی جھپٹ کے سامنے ہندوستان کے کبوتر کبھی نہیں ٹھہر سکیں گے:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شان بے نیازی
کنجشک و حمام کے لیے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری (اقبال)

پاکستان عالم اسلام کی سب سے بڑی سلطنت ہے جو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کی تھی اور دنیا کے سامنے بار بار اعلان کیا تھا کہ ہم صحیح اسلامی طور پر اسلامی اقدار و تصورات کو وہ رنگ چڑھائیں گے کہ دنیا کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور کیپٹلزم، کمیونزم اور دیگر "ازموں" سے تنگ آئی ہوئی انسانیت ہم سے نور و ہدایت کی طالب ہوگی۔ اس حسین خواب کے پورا ہونے کی صورت اب یہی تھی کہ جیسے جیسے ہم خود مسلمان ہوتے، سینے میں جذب و شوق کی قندیلیں جلاتے، کائنات پر عمل کی کمند پھینکتے اور شوق کے پر لگا کر رب کائنات تک پہنچتے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے سرمایہ دار زر اندوزی میں منہمک ہو گئے۔ کارندگان حکومت کا ایک خاص طبقہ رشوت میں ڈوب گیا۔ ہمارے اکثر ادیب و شاعر سوشلزم اور کارل مارکس کے فلسفے کا شکار ہو گئے اور ہمارے نوجوان طلبہ یعنی ہمارے کل کے رہنما الحاد و عیش کوشی، جس کی بدترین صورت ہپی ازم ہے، کی طرف نکل گئے۔

یوں تو معاشرہ کا کوئی حصہ بگڑ جائے تو قومی ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ لیکن نوجوانوں کا بگاڑ قوم کی ہستی ہی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اس لیے ہمارے مفکرین کا فرض ہے کہ وہ ان کی گمراہی کے اسباب کا سراغ لگائیں اور علاج بتائیں۔ میری ناقص رائے میں چند اسباب یہ ہیں:

اوّل: ہمارے نظام تعلیم میں تہذیب و اصلاح نفس کا کوئی شعبہ موجود نہیں۔ گو اب ابتدائی مدارس میں چند فقہی مسائل بتانے اور ارکان اسلام سکھانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ لیکن نوجوان دماغ میں اسلامی اقدار کا نقش راسخ کرنے، اللہ کی محبت پیدا کرنے اور تمام نظام ہائے حیات پر اسلام کو برتر و بلند تر ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ از اوّل تا آخر نصاب تعلیم میں کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آتی، جو ہمارے اسلاف کے علمی، سیاسی اور ثقافتی کارناموں پر روشنی ڈالے، ہمیں ان کے ایثار و تسلیم و رضا، نیاز اور ذوق و شوق کی داستانیں سنائے، دنیائے غیب و شہود میں تعلق قائم کرے اور بتائے [illegible]۔ [illegible] ایک صاحب عقل و فکر قوت ہے۔ جو فلسفیانہ دلائل ہی سے قابو میں آتا ہے۔ دنیائے اسلام میں ایسے سینکڑوں فلسفی و مفکر تھے اور کچھ اب بھی موجود ہیں، جن کی تحریرات نے ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دیا تھا، مثلاً رومی، غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی، علامہ جوہری طنطاوی، فرید وجدی، علامہ اقبال وغیرہ۔ جب تک ان حضرات کے فلسفے کو جزو نصاب نہیں

بنایا جائے گا ذہنوں کی آزادی و داری کی پرستش کی جائے گی۔ مگر ایک کارل مارکس اور ایک سارتر دنیا کے سوچنے کا انداز بدل سکتے ہیں تو زمانہ طالب علمی میں اگر ہم اپنے چند ایک عظیم مفکرین کے افکار کو اپنے طلباء تک پہنچانے کا انتظام کریں تو نتائج بہت خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

اس وقت تک ہماری تمام تر توجہ کلرک اور دفتری افسر پیدا کرنے تک محدود رہی ہے۔ ہمارے ماہرین تعلیم اور دانشوروں کی تحقیق میں ان میں سے بیشتر کو یہ معلوم ہی نہیں کہ انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے اور روح کے تقاضے جسمانی ضروریات سے جدا ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم مادی ضروریات کے گرد ہی چکر کاٹ رہا ہے اور دیکھنے والے جو حقیقی عظمت و توانائی کا منبع ہے بے خبر ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں سے شعراء اور افسر تو بے شمار نکلے۔ لیکن ایک بھی صاحب شعور پیدا نہ ہوا۔ بجا کہا تھا حکیم مشرق نے:

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحب سرور نہیں

ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے اہل دل اور ارباب جذب و جنوں نے بڑے بڑے ادارے سر انجام دیے تھے۔ آج برصغیر ہند و پاک میں ان کے مزار مرجع خلائق موجود ہیں۔ اور یہ فیض ہے تقریباً آٹھ سو برس پہلے اہل دل کا۔ ان میں سے حضرت خواجہ اجمیری، نظام الدین اولیاء، داتا گنج بخش، فرید الدین گنج شکر اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جیسے شہروں میں بیاباں کے وقت کہیں بڑے بڑے قمقمے نظر آتے ہیں اور کہیں پانچ اور دس قندیلیں یا اس کے چھوٹے چھوٹے لیمپ۔ اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں سے زندہ و فعال جیسے بڑے بڑے ادارے پیدا نہیں کر سکتے تو کم از کم چھوٹے چھوٹے قمقمے ہی سہی لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے اساتذہ کے دلوں میں عشق و محبت کے چراغ روشن ہوں اور پھر یہ روشنی طلبہ کے سینوں میں منتقل ہو۔ ساٹھ برس کی عمر میں ایک ہی حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی ہے کہ سوز ساز حیات ہے اور اگر یہ چیز نہیں تو پھر:

ع : مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔

دوم: نوجوانوں کی گمراہی کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ہماری درسگاہوں میں ہماری ثقافت اور فکر و فلسفہ کا تذکرہ ہی نہیں اور مغربی [illegible] مغرب کے غیر ذمہ دار لٹریچر کا سیلاب تند ہماری اخلاقی و روحانی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کے یورپ کا مذہب عیاشی اور پیشہ رہزنی و سفاکی ہے۔ اس کے اہل قلم سے ہم عصمت و پاکیزہ ادب کی توقع کر ہی نہیں سکتے۔ ہماری درسگاہوں میں یہی لٹریچر زور شور کرتا ہے اور وہ راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

انگریزی ادب کا حصہ تاریخ ہمارے لیے خصوصیت سے توجہ طلب ہے۔ وہ لوگ ہمارے بادشاہوں کو عیاش، ہمارے اولیا کو مکار، ہمارے علماء کو تنگ نظر اور ہمارے خلفاء کو [illegible] سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ اسلام کو عیاشوں اور رہزنوں کا مذہب قرار دیتے ہیں اور [illegible] نوجوانوں کا سامنا اسی تاریخ سے پڑتا ہے۔ ہماری لائبریریوں میں تلاش کی سیرت پر کتابیں تو شاید ہی کہیں نظر آئیں لیکن ولیم میور، سر [illegible]، مارگولیوتھ [illegible] کی زہریلی تحریریں ہر جگہ ملیں گی۔ اس وقت میرے پیش نظر دو بڑے بڑے آرگن ہیں جن کی اشاعت کروڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ ٹائم اور ریڈرز ڈائجسٹ ہیں۔ یہ رسائل ہماری ثقافت و تہذیب، ہمارے ماضی

وصال اور ہمارے اسلاف پہ تاثر توڑ کے کرتے ہیں۔ اور ہمارے نوجوان انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

دنیا میں خوش قسمتی سے واقع ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے والدین پھر اساتذہ اور اس کے بعد دیگر لوگوں کی نقل کرتا ہے۔ جو والدین خدا پرست اور خدائی ہدایات پر کاربند ہوں۔ ان کے بچے عموماً اثر بد سے محفوظ رہتے ہیں۔ اُستاد کی زندگی سے بھی شاگرد گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ مقام تاسف ہے کہ اکثر والدین اور خصوصاً وہ جن کی آمدنی ایک ہزار ماہانہ سے بڑھ جاتی ہے، اور بیشتر اساتذہ اسلامی انداز فکر و نظر سے نا آشنا ہیں۔ جذب و شوق کی مستیاں تو رہیں ایک طرف، رب قدوس کے سامنے ایک سجدہ تک اُن پہ گراں گزرتا ہے۔ ایسے والدین اور اساتذہ سے متاثر ہونے والے بچے کیا نہ ہوں تو اور کیا ہوں۔ جب شام کے وقت کسی تفریح گاہ میں کوئی جوڑا ایک خوبصورت کار سے نکل کر کسی قمار خانہ یا سینما کا رُخ کرتا ہے تو بعض دیکھنے والے کہتے ہیں: "یہ ہے زندگی" اور اس سچ زندگی تک پہنچنے کے لیے وہ ناجائز و ناجائز وسائل استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہی جوڑا کار سے نکل کر پارک میں جائے نماز بچھاتا اور کئی آنکھوں کے سامنے نماز عصر یا مغرب ادا کرتا تو اس کے نتائج کتنے ہی دُور رس اور خوشگوار ہوتے۔

یہ ایک سجدہ جو تجھ پہ گراں گزرتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات (اقبال)

سوم: نوجوانوں کی بے راہ روی کا ایک سبب ہمارا سینما ہے۔ جہاں ناجائز مُعاشقہ، دنگہ فساد، چوری چکاری اور لُوٹ کھسوٹ کے انوکھے طریقے سکھائے جاتے ہیں اور عُریاں رقص و نغمہ سے جوانی جذبات میں ہیجان پیدا کیا جاتا ہے۔ فلم تعلیم و تدریس کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو فلمیں ہماری تہذیب، روایات اور اقدار کی آئینہ دار نہ ہوں۔ انھیں ممنوع قرار دیا جائے۔ اگر ہمارے پورنے نوکروڑ دیہاتی سینما کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو ہم شہری بھی ان بدآموز فلموں کے بغیر جی لیں گے۔

بالآخر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ نوجوانوں کی راہ راست پر لانے اور ثابت قدم رکھنے کی ذمہ داری والدین، اساتذہ، ارباب تعلیم، ڈاکٹرز، جرنلسٹس، عُلما، شعرا، ادبا سب پر عاید ہوتی ہے اور اس کا راستہ صرف ایک ہے کہ ان کا رابطہ اللہ سے قائم کیجیے۔ ان کے تاریک سینوں میں ایمان کی شمعیں جلائیے۔ انھیں عظیم بنانے کے لیے ان کے سر رب عظیم کے سامنے جھکائیے اور انھیں علم و عرفان کے ایسے دیا بنا دیجیے کہ ان کی روشنی سے شاہراہ حیات جگمگا اٹھے اور ہر جا رُشد و ہدایت پھیلے۔ انسانیت کی فلاح اسلام کے رفیع و روشن نظام کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ہمارے قائد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب بھی یقیناً متفق ہوں گے۔ جو خود اب بھی کتاب کے سینے میں جاگزیں ہے اور جس کا اظہار گذشتہ عیدالاضحیٰ کی تقریب پر آپ نے یوں فرمایا تھا۔

'Dear Countrymen!

.........**The secret of real progress is that we should comprehend the basic principles of Islam, hold fast to them and under the search-light of the past discover fresh avenues for their application in the present**

and the future. If we fail to do this, there is no doubt that Islam will certainly live but the Muslims as such will probably languish away. ....Our Country was founded in the name of Islam and it can subsist only on this name. There is no other basis for our national cohesion and solidarity except Islam. This basis cannot be sustained by vociferous professions of our idealism alone. We must translate our idealism into action for our sheer survival. The greater the harmony between our faith and practice, the greater will be the strength of Pakistan.......... unless we rise to the occasion and make an honest search to discover صراط مستقیم, I am afraid, our spiritual, moral, material and national existence will be seriously imperilled."

(Pakistan Times 26/5/61)

آپ نے حکیمِ مشرق کے الفاظ میں حضرت باری سے دعا کی:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

———

فنِ تحقیق

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ہماری بہت سی تاریخی کتابیں ایسی بھی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے شروع کی جاتی تھیں۔ یعنی حمد و نعت کے بعد سلسلہ انبیا علیہم السلام کے مختصر حالات بتایا کرتے تھے۔ پھر تمام خلفائے اسلام اور مختلف سلاطین کا تذکرہ ہوتا تھا اور جب مؤرخ اچھی طرح تھک کر چور ہو جاتا تو وہ بیشتر اپنے زمانے کے حالات تک پہنچتا تھا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے معاصرین کا سرسری جائزہ ہی لے سکتا تھا اور اکثر پھر بعض کے لیے رک جاتا تھا۔ قریب قریب یہی انداز آج کل کے اکثر تحقیقی مقالات کا ہوتا ہے جن میں اس موضوع سے متعلق بہت کم مواد ہوتا ہے ان غیر ضروری مباحث کے لیے کوئی ایک دو نہیں بلکہ متعدد ابواب مختص کرتے ہیں اور غیر متعلق اقتباسات سے مقالات کا حجم بڑھایا جاتا ہے۔ بعض مقالے ایسے بھی ہیں کہ ان میں نثر و نظم کی پوری داستان تو موجود ہے لیکن موضوع سے متعلق صفحات بہت کم ہیں۔ گویا وہ اپنی وسعت اور پہنائی میں داستانِ امیر حمزہ بن جاتے ہیں لیکن تحقیق اور جانچ پڑتال سے ان کا بہت کم واسطہ ہے۔ ایسی سرسری تحقیق عام ہے۔ اسی طرح ہماری تنقید بھی سرسری اور ہوائی ہوا کرتی ہے یعنی تنقید کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ پہلے کتاب کے موضوع سے متعلق چند تمہیدی جملے لکھے جاتے ہیں پھر کتاب کے ابواب کی تفصیل دے دی جاتی ہے۔ اور اگر زیادہ کرم فرمایا تو یہ بھی کہہ دیا کہ فلاں باب زیادہ اچھا یا زیادہ کمزور ہے۔ پھر اس کتاب کی چند نمایاں خوبیاں یا خامیاں جو سرسری مطالعے ہی سے نظر آ جاتی ہیں، بیان کر دی جاتی ہیں۔ لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ خوبیوں کا مختصر تذکرہ کر کے خامیوں کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ:

> "امید ہے کہ یہ خامیاں آئندہ ایڈیشن میں دور کر دی جائیں گی۔ نیز یہ کہ کتاب بہرحال اچھی ہے اور مصنف کے حسنِ ذوق کی شاہد ہے۔"

ہمارے ہاں عملی تنقید کا عام انداز یہی ہے۔ اسی طرح بعض تنقید نگار جب کسی "فرمائشی" تنقید کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں تو ان کی ایسی تنقید میں مدح و تعریف کی طرح مبالغے کے علاوہ کچھ خصوصیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً انگریزی کے ایک "اردو" نقاد ایک مصنف صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "وہ نظم و نثر دونوں میں کافی (یعنی ناکافی نہیں) شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا انشا پردازی کی طرف رجحان بہت نمایاں ہے افسانے کے طرز میں ایک انفرادیت ہے جو ان کی دل کشی بڑھاتی ہے"

٭ یہ توسیعی لیکچر سندھ یونیورسٹی میں ... اکتوبر ۱۹۶۶ء کو پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے کل پاکستان اردو تدریس کانفرنس منعقدہ ... دسمبر ۱۹۶۰ء) میں اجمالاً پیش کیا گیا تھا۔

گیا دور ہے۔ انھوں نے شاعری کو حرف آخر سے زیادہ تو تجدید ہے اسی لیے ان کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جو قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک نیا رنگ لا چکے ہیں ...... ان کے یہاں پرانے اثرات کا وجود ضرور تھا مگر جدت سے زیادہ ان کی شاعری میں فطرت نمایاں ہے اور ان کا احساس مزاج ان کی شاعری کو خصوصی طور پر پُر اثر بناتا ہے ۔۔۔ اُردو ادب پر ان کے اہم احسانات ہیں۔[۱]

یہ ایک محمد مشتق بیگم مرحومہ کے "زیر مشق" نقاد نے ایک دیبا ادب پر ہیں دونوں کو فرق کرنے کے لیے تنقید لکھی ہے جو شاید پہلے بہت کم لکھی گئی یا ایسی پہچان رکھی ہوئی تھی اور صرف دستوری تعلق تھی بعنوان "جدید بود حکایت" دراز ترگفتم ——— ایسا تنقید اور تحقیق کے ذکر سے مقصود صرف یہ ہے کہ ہم کو تو کس کہاں ہیں۔

تحقیق بظاہر تنقید سے مختلف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فن ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے پچھلے سالوں کے پہلے ان دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے "تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال" کے سلسلے میں صحیح لکھا ہے کہ

"تاریخی تنقید میں کسی ادیب کے احوال کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر تاریخ ہی کی طرح بیان کیا جاتا ہے اور یہ انداز سائنسی تحقیق کا بھی ہے کیونکہ ایسی تنقید میں ادب کی پہچان عقل اور تجربے کے معیار سے ہوا کرتی ہے۔ اشارتی تنقید میں بھی مزاج ذوق اور انفرادی تجربہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ اس کی راہ میں ایسے مقامات بھی آ جاتے ہیں جہاں اجتماعی پیمانوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ بہرحال تنقید کسی طرح کی ہو اُسے تاریخ، عقلیات، اجتماعیات یا نفسیات سے قریب تر ہونا پڑتا ہے اور جب تنقید کے یہ رشتے قائم ہو جاتے ہیں تو پھر تحقیق اور تنقید کے درمیان بہت کم تفریق رہ جاتی ہے۔"[۲]

اس جاننے کے ساتھ ہی دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے کیا کچھ کر لیا ہے اور اس مقصد کے لیے اب کیا کرنا ضروری ہے۔

اسلامی طرز تحقیق

قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے علم حدیث کے بارے میں روایت اور درایت کے لیے جو اصول منضبط کیے ہیں اُن پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ روایت کے بارے میں ان کے حزم و احتیاط کا عالم یہ تھا کہ سرسری معاملہ تو بہت بڑی چیز ہے، وہ عام خلفا اور سلاطین کے حالات اس وقت تک بیان نہیں کرتے جب تک کہ ان کے پاس آخری راوی سے کسی چشم دید گواہ تک مسلسل سلسلہ روایت نہ ہو، یعنی جو واقعہ بیان کیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریک واقعہ رہا ہو اگر وہ خود شریک واقعہ نہیں تھا تو اس سے لے کر اس تک تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کی جائے کہ وہ لوگ کون تھے؟ کیسے تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ کہاں تک تھے؟ کج ذہن تھے یا نکتہ رس تھے؟ عالم تھے یا جاہل؟ اور

۱۔ رسالہ "نگار" حیدرآباد۔ جولائی ۱۹۶۵ء

۲۔ رسالہ "اُردو نامہ" کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۶۰ء

تمام جزئی باتوں کا پتا لگانا بہت مشکل تھا لیکن بزرگان محدثین نے اس کام کے لیے اپنی عمریں وقف کر دیں۔ اور ان تحقیقات سے اسماء الرجال[۱] کا ایک بے مثل فن ایجاد کیا گیا جس کی بدولت کم از کم ایک لاکھ شخصیتوں کے صحیح حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، بدعت، فسق، جہالت، ثقات کی مخالفت یا حافظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام ہے تو محدثین نے بے تکلف اس کو مجروح اور اس کی روایت کو مردود[۱] قرار دیا ہے۔ مرفوع، موقوف، قولی و فعلی و تقریری، نیز آحاد و متواتر، مشہور و عزیز و غریب۔ اسی طرح صحیح و حسن اور مقبول و مردود وغیرہ مختلف اقسام حدیث میں ہو گئی[۱] تقسیم خود اپنی جگہ اس امر کی شاہد ہے کہ علمائے اسلام کی نظر کس قدر گہری تھی اور ان کا معیار تحقیق کس قدر بلند تھا۔ فن روایت کے بعد درایت کا نمبر آتا ہے۔ یعنی ایک حدیث کے تمام راوی (شروع سے آخر تک) ثقہ اور مستند تو ہو سکتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ عقلاً اس روایت میں کوئی خامی موجود ہو۔ چنانچہ ایسی روایت بھی غیر معتبر قرار دی جائے گی۔ محدثین نے درایت یعنی عقلی حیثیت سے روایتوں کو پرکھنے کے لیے یہ اصول قائم کیے ہیں۔

۱۔ واقعہ مذکورہ کیا اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا عام میلان کیا واقعے کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ اگر واقعہ کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش ضروری ہے کہ واقعے کے متعلق راوی کے قیاس اور رائے کو کہاں تک دخل حاصل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعے کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے وہ واقعے کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس واقعے کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا۔ اور اس کی تمام خصوصیات کا جائزہ نہیں لے سکا؟

۶۔ اس امر کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقۂ ادا نے واقعے میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں۔

۱۔ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زبان مبارک سے فرمایا وہ حدیث قولی ہے، جو کچھ خود کیا ہے وہ حدیث فعلی ہے اور جو کچھ آپ کے سامنے ہوا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا تو وہ حدیث تقریری ہے۔ جس حدیث کو ہر زمانے میں بکثرت لوگوں نے روایت کیا ہو کہ احتمال کذب نہ رہا ہو اسے متواتر کہتے ہیں اور آحاد وہ ہیں جن کی روایت میں اتنی کثرت نہ ہو۔ پھر آحاد کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ مشہور جس کو ہر زمانے میں تین یا زائد راویوں نے روایت کیا ہو۔ ۲۔ عزیز جس کو ہر زمانے میں دو راویوں نے روایت کیا ہو اور ۳۔ غریب جس کو کسی زمانے میں ایک ہی راوی نے روایت کیا ہو۔ آحاد کی وہ روایت جس کے راوی کی سچائی مسلّم ہو وہ مقبول کہلاتی ہے ورنہ مردود۔ پھر آحاد مقبول میں سے وہ حدیث جس کو بہرحال خوب یاد رکھنے والوں نے بہ تسلسل روایت کیا ہو اور اس میں کوئی عیب پوشیدہ نہ ہو اور منکر لوگوں کی مخالفت بھی نہ ہو تو اسے صحیح کہتے ہیں اور اگر ایسی آحاد مقبول جس کے راویوں کا حافظہ کم ہو تو اسے حسن کہتے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مرفوع وہ حدیث ہے جو حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو۔ اور موقوف وہ حدیث ہے جو کسی صحابی کا قول یا فعل ہو۔

۲۔ مولانا شبلی نے بھی سیرۃ النبی اور الفاروق کے مقدموں میں درایت کے ان اصولوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ کوئی حدیث اگر عقل کے خلاف
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

روایت کو عقلی حیثیت سے دیکھنے کے یہ اصول اس قدر اہم ہیں کہ راوی کا ثقہ اور دیانت دار ہونا [illegible]
ہوتا ہے اور صداقت کی منافقین کی قوت پرداز کا اثر بھی کم ہو جاتا ہے۔ شیعہ سنت کے ایک [illegible] میں [illegible] سے
حالات بیان کیے ہیں جو روایات کتب احادیث میں منقول ہیں اس سب کی سند [illegible] چنانچہ [illegible]
سے الگ راوی اور روایت کو پرکھا ہے اور جرم و احتیاط کے حدیث میں کسی ثقہ روایت کو جگہ نہیں دی۔ امام وکیع کا مشہور قول ہے کہ
حدیث [illegible] روایت نہیں کرتا ہوں کہ اس کی تائید میں کسی ثقہ سے روایت کو مزید دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے علاوہ سرکاری فرائض تھے۔
حافظ [illegible] کا واقعہ ہے کہ [illegible] میں امام معاذ بن [illegible] جب ان کے نسیان کا اندازہ کیا تو دونا ان کے حافظے سے مشہور
اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی۔ لیکن یہ حالات دیر تک ایک ہی شکل پر قائم نہ رہے اور خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم کے مصداق
معاشرے کے معاملات میں زوال آ گیا۔ چنانچہ جب علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) نے فلسفہ تاریخ پر بحث کی پائی تو انہیں یہ اعتراف
کرنا پڑا کہ روایات کی تصریح میں بے احتیاطی کا جو اظہار ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عموماً اپنی سلف سے منقولہ روایت رکھنے والی چیزوں کو بغیر جانچے ہوئے
بلا قبول کر لیتا ہے اور پہنچانے والوں کی روایات کو حالات کے تقاضے کے مطابق جانچنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں حالات کے تحت
ایسا واقعہ کیا ہو بھی سکتا تھا یا نہیں۔ اصول عادت، قواعد سیاست، طبیعت تمدن اور اجتماع انسانی کے حالات پر نظر رکھنی بہت لازمی
ہے کیونکہ انسان کے ذہن و معاشرت کا ان معاشی چیزوں سے جو تعلق ہے اور ان کے بغیر کوئی تاریخ تاریخ نہیں ہو سکتی۔

مغربی فکر تحقیق

مسلمانوں کے اصول تحقیق اور آج کے بہت قریب قریب ہیں۔ یہی اصول اب مغرب کی کتابوں میں بھی بیان ہونے لگے ہیں۔
The methodology of Education کی کتاب Carter V. Good
Research [illegible] میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:[۲]

کسی واقعے کو پرکھنے کے لیے خارجی اور داخلی شہادتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مواد کہاں سے
حاصل ہوا؟ راوی کون تھا؟ اس کے ذاتی حالات یعنی مزاج، مذاق، کردار و گفتار کی نوعیت
کیا تھی؟ اس کا تعلق ان واقعات سے کیا تھا؟ واقعہ نگار کی نوعیت کیا ہے؟ پھر اس خاص
واقعے کے کتنے عرصے کے بعد راوی نے اسے نقل کیا؟ روایت محض حافظے کی بنا پر بیان
کی گئی ہے یا کسی اور راوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟ اصل واقعہ کتنا ہے اور تحریف یا
اضافہ کس حد تک ہے؟

مطلب یہ کہ اگر خبر قرآن پاک، سنت مشہورہ یا مسلمہ عقلی عادت کے خلاف ہو یا کسی ایسے شخص کی روایت ہو جس سے کسی اور نے
روایت نہ کی ہو، روایت میں راوی کی ذاتی رائے شامل ہو یا جس کے سمجھنے میں راوی سے غلطی کا احتمال ہے تو ایسی روایت پایۂ اعتبار
سے ساقط ہو جاتی ہے۔

[۱] مقالات [illegible] ندوی مضمون تاریخیت [illegible] مقدمہ ابن خلدون
[۲] [illegible] صفحہ ۲۵۰۔۲۵۹

...سل ... ۷ ... نے ہی کر لیے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سب کے سب اور
عمومی طور پر مسلمانوں کے اصول حدیث سے ماخوذ ہیں اور ایسے ہیں کہ اُن پر خود مغربی مستشرقین کا حق کم ہی جتا سکتے۔ چنانچہ یہ اصول "فکری
تحقیق" یا "نظریاتی تحقیق" کے ذیل میں آ سکتے ہیں لیکن "عملی تحقیق" کے دائرہ عمل سے باہر ہیں اور یہ محض اس لیے ہے کہ ان کے یہاں بلکہ اب
ان کے یہاں بھی وہ احتیاط برتی نہیں جاتی جو مسلمانوں کے قرون اولیٰ میں تھی۔ موجودہ دور کا محقق صرف اس بات سے خوش ہو جاتا ہے کہ اس
نے اپنے موضوع سے متعلق کوئی معاصر شہادت ڈھونڈ نکالی۔ اب اسے مزید تحقیق و تنقیح سے سروکار نہیں۔ اور اس کے لیے اُس کے
پاس کوئی گنجائش بھی تو نہیں۔ وہ کہاں سے اور کس طرح معلوم کر سکتا ہے کہ معاصر راوی ثقہ ہے یا غیر ثقہ؟ نکتہ رس ہے یا سطحی الذہن؟ حافظہ
میں پختہ ہے یا نسیان کا شکار؟ بے جا عقیدت رکھتا ہے یا بغض پرور ہے؟ ملازمت یا خدمت گزاری کی وجہ سے خوشامدی اور ذہنی پستی
میں گرفتار ہے یا حق گو اور بے غرض ہے؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات اگر اٹھائے بھی جائیں تو اُن کا حل کہاں اور کیونکر مل سکے گا؟
دور ... ات پر اکتفا کا مطلب ہے کہ جس شخصیت پر کام کیا جائے اُس کے احوال اور معاشرے کا جائزہ لے لیا جائے اور اُس کی "باقیات"
کا مطالعہ کیا جائے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ ہم لوگوں نے اس انداز سے بھی بہت کم کام کیا ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ اس
نقص کا احساس بھی بہت کم ہے۔ ایک موٹی مثال "عالمگیریات" کی ہے۔ یعنی اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق جو ہمارے فضلا کا یہ دعویٰ
ہے کہ ہمارے برصغیر میں اس پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے تو کیا وہ انصاف سے بتا سکیں گے کہ عالمگیر کی مذہبی پالیسی کے پیچھے اُن اسباب
پر بھی غور کیا گیا ہے جو اخلاقی اور روحانی طور پر اُن کو متاثر کیے ہوئے تھے؟ میری مراد ہے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کے صاحبزادگان
... افسوس کہ ان کے پوتے یعنی حضرت خواجہ محمد نقشبند ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ سے۔ انھوں
نے اپنے بکثرت مکتوبات سے اور خود اپنی صحبت بابرکت سے اُس کو متاثر کیا تھا۔ افسوس کہ ہم نے عموماً اُن خانقاہوں سے ہنوز رجوع
نہیں کیا جہاں اس قسم کے بکثرت جواہر پارے موجود ہیں۔ ان بزرگان دین کے بارے میں وقائع نعمت خاں عالی کا یہ شعر آپ نے بارہا
پڑھا ہوگا:

افزاود نقد و بہتان، قال و خواب خواجگان ... شیدہ و خدمہ دعوت شیخان سرہند ہم ... من

لیکن کیا اس شعر پر ہم نے غور بھی کیا ہوتا کہ وہ حقیقت نگار ہے یا حقیقت سوز؟

پھر عالمگیر کے مقربین میں سے قاضی شیخ الاسلام، شائستہ خان، عاقل خان، سیف خان، بختاور خان، مکرم خان، مصطفیٰ خان،
میر کی گرز بردار وغیرہ بکثرت لوگ ایسے ہیں جن کے نام ان بزرگوں کے متعدد مکتوبات موجود ہیں کیا یہ مکتوبات تصوف کے ساتھ
ساتھ تاریخ کا بیش بہا خزینہ نہیں؟ ان بزرگوں کے اعزا اور خلفا میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کی تصانیف موجود ہیں اور ان سے بعد
کے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی حالات کے لیے بہت کچھ مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ خود سرہند کے مختلف بزرگان دین کے ملفوظات اور
منوّرات بھی اس لحاظ سے بہت اہم ہیں اور ان جواہرات کی قدر کے لیے کسی شاہ کی نہیں بلکہ کسی جوہری کی ضرورت ہے

1979 : Towards improving Ph.D programme

خارجی شہادت

غیر ذات کہاں سے کہاں جا پہنچی؛ یہی وجہ ہے کہ ہمارا تمام مطالعہ سے مہیا محل تحقیق، زیادہ تر بلکہ تحقیقی مسائل کے حصول سے ماخوذ ہیں۔ لیکن چونکہ اس دور میں ان کا [illegible] سخت دشوار ہے اس لیے ہم صرف چند سرسری باتیں پیش کی ہیں۔ مشکل یہ آیا ہے کہ موضوع ایسا ہو جس میں پھیلاؤ ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ [illegible] تمام عمر ایک سرسری جاننے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور دقت نظر کے فقدان کی وجہ سے کسی لحاظ سے بھی تحقیقی سرمایہ نہیں بن سکتے۔ بعض حضرات کسی خاندان یا کسی شخص کی تاریخ لکھواتے ہیں تو وہ تاریخ بھی گہرے مطالعے سے محروم رہتی ہے اور اسناد سے مستند نہیں ہو سکتی۔ بہر حال کام کسی نوعیت کا ہو سب سے پہلے ایک موضوع کا تعین کیا جاتا ہے اور کتابیات کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کی جاتی ہے تاکہ موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم ہو سکیں۔ امریکا والوں نے Documentation Cent- ۱۰۱ . بنائے ہیں جو ہمارے یہاں یقیناً مفقود ہیں۔ تاہم اگر ہمارے ملک میں ایسے مراکز نہیں ہیں تب بھی آپ جیسے فضلا کی نگرانی میں طلبہ بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی مختلف صلاحیتوں کے پیش نظر ان کے لیے مختلف اہم موضوعات منتخب کیے جا سکتے ہیں ___ مثلاً ہمارے کسی طالب علم کو اگر شعر و شاعری سے زیادہ لگاؤ ہے تو اس سے ہم یہی کہیں گے کہ کسی بڑے موضوع کے بجائے اپنا کام کسی ایک شاعر تک محدود کر کے خارجی مواد سب سے پہلے تلاش کرو۔ یعنی اس شاعر کے متعلق تمام ضروری تذکرے اور تاریخیں دیکھ لی جائیں اور حالات میں جہاں کہیں اختلاف نظر آئے اسے خاص طور پر نوٹ کر لیا جائے تاکہ دیگر معلوم داخلی شہادتوں کے ذریعے اس کی تحقیق و تنقیح کی جا سکے۔ شاعر کے اساتذہ اور تلامذہ کے حالات اور تصانیف کا بھی پتا چلایا جائے اور دیکھا جائے کہ اس نے اپنے اساتذہ نیز معاصرین سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کیا ہے اور کیوں؟ اگر فنی اختلاف ہے تو اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا پس منظر اور پیش منظر واضح ہو سکے۔ اسی طرح اس شاعر کے مختلف تلامذہ کی تصانیف اور مختلف صلاحیتوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے تاکہ استاد اور شاگردوں کی امتیازی خصوصیات ابھر کر سامنے آ سکیں۔ یعنی جس طرح یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ شاعر یا مصنف اپنے اساتذہ یا معاصرین سے کہاں تک متاثر ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے تلامذہ یا معاصرین کو متاثر کرنے کی کس حد تک صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر اس شاعر کے ماحول کا مطالعہ بھی ضروری ہے کیونکہ اس کی ذہنی تخلیق اسی کے ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ معاشی، معاشرتی، ادبی اور سیاسی حالات بھی بہت کچھ متاثر کرتے ہیں۔ پھر اس کے والدین، اعزا اور احباب کے مزاج اور مذاق کا اندازہ لگانا بھی بہت مفید ہوگا کیونکہ وراثت بہت دور رس ہوتے ہیں اور فنکار کی تخلیقات کے ایسے گوشوں تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا کھوج لگانا بغیر [illegible] ممکن نہیں۔ بلکہ خارجی شواہد کا داخلی شواہد سے صحیح انطباق ہی سونے پر سہاگہ ہوتا ہے۔ پھر اگر وہ کوئی "ہمہ دان" [illegible] ہے تو اس کی ذہنی سطح سے متعلق ان علوم اور [illegible] کیفیات کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو کسی نہ کسی طرح اسے متاثر کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے معاملات کے سلسلے میں کسی طرح کا غفلت [illegible] روا رکھنا سخت ظلم ہے کیونکہ

نمود خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — بے رنگ [illegible]

[illegible] کے زمانے کا یہ واقعہ آپ کو یاد ہے کہ کیسے مرتبہ محقق ڈاکٹر محمد شفیع صاحب مرحوم[1] نے غالب شاعر کے سلسلے میں ایک ایسی نادر قلمی کتاب کے مطالعے کی خواہش

۱؎ افسوس کہ اس فاضل اجل نے [illegible] سال کی عمر میں [illegible] ۱۹۶۳ء کو [illegible] رخصت پائی۔

دیا جس کا ایک نسخہ جرمنی میں تھا۔ میں نے اُس کے حصول میں اپنی معذوری ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا کہ حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا کے میسر نہ ہونے پر کوئی دُوسری دوا تجویز کر سکتا ہے لیکن ریسرچ کے سلسلے میں جو کتاب تجویز کی جائے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنی ہو گی کیونکہ اُس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔

خارجی شہادت کے لیے تذکروں اور تاریخوں کے علاوہ بعض مرتبہ معمولی معمولی رسائل بلکہ اخبار بھی بہت اہم ثابت ہوتے ہیں یعنی ان میں کسی شخصیت کے متعلق کوئی اشارہ بھی مل جاتا ہے تو اُس سے اتنا تو ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں وقت تک اُس نے کیا کیا لکھ دیا تھا۔ اکثر معاصر تذکروں یا کلام کے مجموعوں میں تھوڑے بہت حالات کے ساتھ کسی شاعر کے جو اشعار بطور نمونہ پائے جاتے ہیں اُن سے اُن کی غزلوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو ویسے مجموعوں کی ترتیب کے وقت تک تیار ہو چکی تھیں۔ پھر داخلی شہادت سے ایسے کلام کی تعیین میں بڑی مدد ملتی ہے اور شاعر کے ذہنی ارتقا کے سمجھنے کے لیے یہ کام بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ معاصرانہ چشمک اور بحث سے متعلق چھپے بلکہ بُرے اشعار یا ہوئے بھی کسی شخصیت کے سمجھنے میں مُمد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے ابہام و تفہیم کے لیے بالعموم اجتہاد کی یقیناً ضرورت ہے اور آپ جیسے فضلا کی رہبری میں یہ بات کچھ مشکل نہیں۔

خارجی مواد کی خاطر اگر ممکن ہو تو شاعر یا مصنّف یا جس شخصیت پر کام کیا جائے اُس کے وطن اور مقامات قیام کو بھی دیکھا جائے کیونکہ گرد و پیش کے حالات اور واقعات کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے سفر سے بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح اُس شخص کی استعداد کے متعلق مختلف علوم و فنون سے بھی متعارف ہونا ضروری ہے کیونکہ جو چیز بلا واسطہ حاصل ہو سکتی ہے وہ زیادہ اہم ہوا کرتی ہے مزید یہ کہ مختلف ماخذوں کے لیے ترجموں سے کام لینا صحیح نہیں کیونکہ ترجمے اصل نہیں ہو سکتے اور تحقیقی نکتہ شناسی اور ژرف رسی کے اہم مقصد کو پورا نہیں کر سکتے۔

داخلی شہادت

داخلی شہادت سے متعلق پہلی چیز تو یہ ہے کہ اُس شخصیت کی تمام تخلیقات کا جائزہ تدریجی ترتیب و توقیت کے ساتھ لیا جائے تاکہ اُس کے ذہن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ دیکھیے زبان، اندازِ بیان اور خیالات یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی شخصیت کے عجیب و غریب پہلو دکھاتی ہیں۔ ایک زمانے میں وہ شخص کس طبقے کی زبان بولتا تھا؟ کیا کیا تشبیہات و استعارات استعمال کرتا تھا؟ کون سے جذبات و خیالات اُس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے؟ زمانے کی پسند یا ناپسند سے اُس کا تعلق کس حد تک تھا؟ کون سے اصنافِ سخن اُسے پسند تھے؟ کن موضوعات سے اُس کا تعلق تھا؟ یہ تمام باتیں خود اُس کے کارناموں یا شہ پاروں میں مل سکتی ہیں۔ اگر ان باتوں کے ساتھ ہی ان کے اسباب پر بھی غور کیا جائے تو اُس شخصیت کی نفسیات کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔ قصیدہ گو شاعر کی مدح سرائی جسے خوشامد سے تعبیر کیا جاتا ہے، ادیب اور ممدوح دونوں کی نفسیات کا نقاب کشا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک ہجو نگار وہ کو یا کسی اپنے معاصر کی کسی دُکھتی ہوئی رگ کو اس طرح پکڑتا ہے کہ معاشرے کے بہت سے ناسُور بہتے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مذہب کے بعد میں مثنویاں لکھنے والا اپنے اُس ماحول کی ترجمانی کرتا ہے جس میں جنگ و جدل کا چرچا تھا، خواہ وہ میدانِ کارزار ہو، خواہ مجلسِ مرثیہ نگاری۔ اسی طرح عشق و محبت کو گرما دینے والی مثنویاں اور ناٹک وغیرہ بھی اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ گویا ایسے مطالعے سے فنکار اور تخلیق کار دونوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ مختلف اصناف فن ایک

ان ذرائع کے علاوہ کلام کا تجزیہ بھی ایک ایسا عنصر ہے جس سے کسی شاعر کی شناخت ہو سکتی ہے جس نے ہر عیب یا جس کو ٹھیک کیا اور صحت افکار کے بجائے شہرت شاعر کو وسعت دی۔

داخلی شہادت کے لیے سب سے پہلے کسی مصنف یا شاعر کی تخلیقات کا مطالعہ ہوتا ہے اور اس کے کلام سے سوانحی پہلو یا ایسے معاملات نکل آتے ہیں کہ اجمال کے باوجود تفصیل ہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ شاہ ولی (م ۱۱۵۰ھ) کے دیوان کی پہلی غزل میں سے یہ چار اشعار ملاحظہ ہوں:

کہتا ہوں ترے ناؤں کو میں ورد زباں کا — کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا
جس گرد اپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں — اُس گرد کوں میں کُحل کروں دیدۂ جاں کا
ہے صدق کی حرف عقل سوں اے اہل حیا دیکھ — تجھ ظلم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا
ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی — یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

ان اشعار سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ اشعار کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ ان کا کہنے والا کوئی دکنی سو سال پہلے کا ہے۔

۲۔ دوسرے شعر (نعتیہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے فارسی شعرا کی تقلید کو اپنا شیوہ بنایا ہوگا، جیسے اس شعر میں عرفی کا یہ مضمون ملتا ہے:

بہ نیستے کہ نشان کف پائے تو بود — سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

۳۔ شاعر نے تیسرے شعر میں چاروں خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کی منقبت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ منقبت کے ایسے ایسے لطیف نکتے ہماری شاعری میں شاذ ہی نظر آئیں گے۔

۴۔ شاعر نے چوتھے شعر میں وحدت الوجود کے عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت شیخ علی رضا سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۳۳ھ) سے بیعت تھا۔[۱]

۵۔ اس چوتھے شعر کے دوسرے مصرع سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا کہنے والا غزل کا شاعر ہے۔

ان پانچ باتوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے کہ یہ حمد و نعت والی غزل جو خانہ پری کے لیے دیوان کے شروع میں رکھی جاتی ہے ------ ظاہر ہے کہ شاعر کے آخری عہد میں لکھی گئی ہوگی۔ چنانچہ اس غزل میں وہ دکنی پن باقی نہیں ہے جو ولی نے دلی آکر حضرت شاہ گلشن علیہ الرحمہ کے مشورے پر شعرائے متاخرین فارسی کی تقلید میں اختیار کیے تھے۔ اور وہ رفتہ رفتہ کم ہو گئے۔

اشعار کا یہ تجزیہ ایک حقیر کوشش ہے۔ آپ حضرات اس سے بہتر طریقے پر اپنے طور پر کام بہتر فرماتے ہوں گے۔ داخلی شہادت

۱؎ یہ بزرگ بقول شاہ احمدی (مآثر سرہند) نقشبندیہ بھی تھے اور چشتی بھی۔ چشتی ہونے کا اشارہ ولی نے اس شعر میں کیا ہے جس میں اپنا نام بھی دیا ہے:

بعد شاہ نجف ولی اللہ — پیر کامل علی رضا پایا

کے سلسلے میں آپ نے اپنے طلبہ کو ان کے نصاب کے شعرا کا مطالعہ کراتے وقت کلام کی توقیت اور ترتیب بھی سکھائی ہوگی۔ شعر کے دواوین میں مختلف اصناف سخن کی تاریخ تصنیف شاذ ہی ملتی ہے اور غزلیات میں تو معدوم ہی ہے۔ (سوائے حاتم یا حسرت جیسے دو چار شعرا کے) لیکن طلبہ کے لیے اس کی شناخت از بس ضروری ہے۔ چنانچہ عرض ہے کہ اگر کسی خارجی شہادت سے یہ تعین نہ ہو سکے شاید اس طرح ضرور کامیابی ہو سکتی ہے کہ شاعر کے ایک مخصوص عہد سے متعلق تمام اشعار یک جا کر لیے جائیں، پھر ان کے اسالیب کی باہمی مناسبت پر غور کیا جائے۔ اگر یہ مناسبت قریب تر ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شعر یا ان اشعار والی غزلیں قریب العہد ہوں گی۔ اسی طرح ہر عہد سے متعلق شاعر یا مصنف کے الفاظ، محاورات، تلمیحات، مصطلحات، تشبیہات و استعارات، نیز مختلف خیالات وغیرہ اگر یک جا کر لیے جائیں تو جس شخص کے کلام (———) سے ان کا اظہار ہوتا ہے اس کی گفتار و کردار دونوں کی قلمی تصویر کھینچی جا سکتی ہے اور اس خود گفتہ تاریخ سے بڑھ کر اس شخصیت کے حالات کے لیے اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی سبک شناسی یقیناً مشکل چیز ہے لیکن اگر ہم میں سے کوئی شخص ایک سال میں صرف ایک طالب علم بھی اس طرح کا تیار کر سکے تو وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ : ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

طلبہ میں جب اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ آسانی سے اصلی اور الحاقی کلام کے درمیان حد فاصل قائم کر سکتا ہے اور یہ تمیز نہایت ضروری ہے کیونکہ ہم نام اور ہم تخلص شعرا کا کلام اکثر آپس میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ امر موجب افسوس نہیں کہ ہم نے ابھی تک فارسی میں حضرت ابو سعید ابوالخیر، حضرت احمد جام ژندہ پیل، عمر خیام، عثمان مختاری، ظہیر فاریابی، عمادی غزنوی، حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت معین الدین چشتی، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، زیب النسا وغیرہ کے الحاقی اور اصلی کلام کا تجزیہ کما حقہٗ نہیں کیا۔ اسی طرح اردو میں سودا، قائم، امیر مینائی نیز میر اور یقین وغیرہ کے کلام میں ہم نے ابھی تک حد فاصل کا کوئی خط نہیں کھینچا۔ اگر ہمارے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر داخلی شہادت کا صحیح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

داخلی شہادت کے سلسلے میں ایک اور چیز بہت اہم ہے اور وہ کیفیت و آہنگ۔ ایک غزل یا ایک تحریر کا آہنگ شروع سے آخر تک ایک ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ بقول اقبال

دادم نقش ہائے تازہ ریزد ۔۔۔۔ بیک صورت قرار زندگی نیست

بات یہ ہے کہ لکھنے والا لکھتے لکھتے ہی مختلف حالات سے دو چار ہوتا ہے۔ شادی، غمی، بیماری اور پریشانی سبھی کے سائے آتی ہیں۔ پھر مختلف نوع کی مصروفیات بھی درپیش ہوتی ہیں۔ اسی لیے بڑے سے بڑا ادیب بھی تحریر کے عمومی سقم سے پاک نہیں۔ پہلے کے اساتذہ زیادہ تر اور آج کل کے اساتذہ کم تر اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ فلاں شعر بلند ہے یا فلاں شعر پست ہے اور ایسا کیوں ہے۔ اسی طرح نثر کی جہاں پختگی اور کہیں خامی کی شناخت کرنے سے ہم بہت کم واقف ہیں اور اگر اس انداز سے کوئی استاد تعلیم دیتا ہے تو اس کی مذمت کر کے ادب برائے ادب کہہ کر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ لیکن کیا موجودہ دور کے فاضل نقادوں میں سے کوئی ایسا ہے جو شعر کی پستی و بلندی یا نثر کے عیوب و محاسن کے اسباب کی صحیح تفہیم کر سکے۔ اگر اس شعر کی پستی کے اسباب کی تلاش کرنا مشکل ہے تو کم از کم صوتی زیر و بم کی ناموزونیت اور شکست ناروا کی شناخت کرائی جائے۔ ورنہ صحیح بندش اور صحیح صوت

بیسیوں اصطلاحات اصل میں کیسے معنی رکھتی تھیں اور آج کیا ہو گئی ہیں۔

ایک معمولی چیز ہو یا علمی شہادت کے ذیل میں، مذہب ہو یا قطعات تاریخ ہوں۔ ہمارے اکثر دواوین میں ہر صنف موجود ہے لیکن قصیدے کے علاوہ قطعات چند نہیں ہیں جن سے اس عہد کی تاریخ کا ذکر بھی شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ تاریخی اور معاشرتی معلومات کے لیے ان کی افادیت مسلّم ہے۔ ایک امر اور، جیسے کہ دیوان کا ہر جزو ادبِ عالیہ کا شاہکار ہو۔

چند مشورے

اب میں اپنی اس بحث کے مطابق اپنے طلبہ کے لیے چند مفید کام تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ شعبہ ہائے عربی، فارسی اور اردو کا بیک وقت میں اگر انھیں مفت کی بحث سے کام لیے جا سکتے ہیں۔ الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، اصطلاحات، تلمیحات، تشبیہات و استعارات پر مستقل مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ نیز ہر زبان کی اصل اور اشتقاق پر مفصل بحث کرائی جائے۔ پھر نظم و نثر سے کی مثالیں تلاش کرائی جائیں اور مختلف زمانوں میں لفظی اور معنوی حیثیت سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی مثالوں کے ساتھ ساتھ ان کے اسباب و علل پر بھی عمدہ روشنی ڈالی جائے۔ ہم نے قواعد زبان اردو، دہلی اور لکھنؤ کے مخصوص الفاظ و محاورات پر بھی مستقل مقالے تیار نہیں کرائے ہیں جن کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری پراکرتوں اور علاقائی زبانوں سے اردو زبان کے صرفی و نحوی روابط پر بھی کام کیا جا سکتا ہے تاکہ خود اُس زبان اور دیگر علاقائی زبانوں کی اصل اور ابتدا کو متعین کرنے میں سہولت ہو۔ صرف و نحو کے علاوہ عروض و قافیہ، بیان و بدیع، املا و انشا، تذکیر و تانیث وغیرہ مستند علوم ہیں جن کے قدیم اور ابتدائی نمونوں کی مدد سے بھی اردو کی عمر اور اس کی اصل کو متعین کرنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ صوتیات اور لسانیات سے متعلق بھی بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں اور یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اب دو ہزار اور مختلف مذہبی روایات کے اختلاف کی وجہ سے ایک ہی خاندان کے الفاظ کس طرح تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور خاص شخصیتوں اور خاص کتابوں سے اور متعارف ہونے کے تاثر سے ہم کو صرفی تبدیلیاں بھی آسانی سے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہیں۔ نجوم بنانے کا کام بھی طلبہ کو دیا جا سکتا ہے تاکہ ایک نظر میں یہ معلوم ہو سکے کہ ایک مصنف نے کہاں کہاں سے الفاظ، محاورات اور اصطلاحات وغیرہ کہاں کہاں استعمال کی ہیں۔ نیز افراد، مقامات اور مختلف تصانیف اور اقوال وغیرہ جن کا ذکر اس مصنف نے کیا ہے ان سے کیا مراد ہے۔ افسوس کہ ہم نے اپنے ادبی شاہ پاروں سے بھی ہنوز ایسا کام نہیں کیا۔ یہی حال فارسی کا ہے کہ سبک خراسانی، سبک عراقی اور سبک ہندی کے ابیات پر ہم نے ابھی تک کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ عربی زبان و ادب پر مختلف عربی اثرات سے متعلق بھی مستقل مقالات کی ضرورت ہے۔ پھر خود ہمارے ملک کے بکثرت عربی انشا ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ ان کی ترتیب و تہذیب کی بھی بڑی ضرورت ہے اور یہ کام اگر ہم نے اب بھی نہ کیا تو ان کا ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جانا ہے۔ دو کیوں جانیے خود ہمارے یونیورسٹی کے کتب خانے اور مخطوطات خراب و خستہ ہوتے جا رہے ہیں اور ان پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

بعض ذہین طلبہ سے نثر و نظم کی اہم کتابیں ایڈٹ (مرتب) کرائی جا سکتی ہیں اور مفید حواشی و تعلیقات بھی لکھوائے جا سکتے ہیں۔ یہ کام بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصحیح و ترتیب میں بڑی چھان بین کرنی پڑتی ہے کہ کسی کسی لفظ کی تعیین سے اختلاف قرأت

۱؎ محترم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے گیارھویں اجلاس منعقدہ حیدرآباد (دکن) کے خطبۂ صدارت میں تحقیق کے لیے جو مشورے دیے ہیں ان سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے۔

کام مرتب کا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ بعض کرم خوردہ نسخوں کے کٹے مٹے الفاظ کو ان کی کشید کے لحاظ سے درست کرنا اور خط شکستہ کو پڑھ کر صحیح نقل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اکابر محققین کے کاموں کو پیش نظر رکھ کر یہ کام سیکھا جا سکتا ہے۔ متن کی درستی اور حواشی کی فراہمی کے سلسلے میں کن منابع اور جامع و مانع مصادر سے استفادہ کرنا بھی بڑی سلیقہ مندی ہے۔ ایسے کاموں کے لیے صرف انھی اساتذہ سے رجوع کرنا چاہیے جنھیں اس فن کا خاص تجربہ ہو کیونکہ ع : ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں ؟

پھر رجوع کرنے میں کسی طرح کا تکلف یا اظہار تشکر میں کسی طرح کا بخل بھی روا نہیں۔ کئی موقعوں پر دیکھا ہے کہ بعض صاحبان کی پوری پوری کتابیں درست کی گئیں اور انھوں نے اظہار تشکر میں صرف اتنا کہہ دیا کہ فلاں صاحب سے بہت کچھ مشورہ لیا گیا ہے اور بس۔ اسی طرح ایک صاحب نے بڑی محنت سے حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کو مرتب کیا لیکن اس کے عربی ماخذوں کے سلسلے میں اساتذہ سے رجوع کرنے میں اپنی توہین سمجھی۔ چنانچہ ان کا بلند پایہ کام ادھورا رہ گیا ہے۔ پھر ایک خامی عام ہے جس کا ذکر شروع میں بھی کیا گیا ہے کہ تحقیقی مقالات کو بھی خواہ مخواہ طویل اقتباسات سے پر کیا جاتا ہے اور کتاب کے حجم کا رعب جمایا جاتا ہے۔ ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جو پانچ پانچ چھ چھ سو صفحات پر محیط ہیں لیکن اگر ان کا خلاصہ کیا جائے تو وہ صرف ۲۰۔ ۲۵ صفحات میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ ایسی کتابیں مصنف کے فوت ہونے سے پہلے ہی فوت ہو جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو ایجاز و اختصار کی مشق کرائیں تاکہ ضمنی طور پر بے سود فضول بحثوں میں پڑنے کے عادی نہ بنیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات بھی کم سے کم الفاظ میں کہی جا سکتی ہے لیکن شاید راقم الحروف بھی تطویل کلام کے جرم میں قابل مواخذہ ہے۔ ع

صلاح کار کجا و من خراب کجا

شعور کی رو اور ناول نگاری

ڈاکٹر احسن فاروقی

انگلستان کی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کی ناول نگاری میں ایک بالکل نیا طریقۂ قصہ گوئی نظر آتا ہے جس کو Stream of Consciousness یا شعور کی رو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ایک مدت سے ہمارے یہاں بھی تقسیم ہند کے بعد برتا جانے لگا ہے۔ ناول نگاری کے لیے یہ طریقہ عجیب ابہام، عجیب شکل، عجیب ہیئت رکھتا ہے۔ انگلستان کے نقاد اور تنقیدی ادب نے اس کی کمزوریاں ماننے سے انحراف کیا۔ ہمارے نقاد ہمارے سارے کے سارے تنقیدی ادب ہیں اس کو انگریزی ادب کی طرح پر بیشتر سمجھتے ہیں۔ اس کی اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے اور کم فہمی زیادہ آتی ہے اس کو اہم چیز کہہ کر ٹال دینا بہتر سمجھتے ہیں۔ بہرحال کافی عرصہ سے جو اس سے دلچسپی لیتا چلا آیا ہوں مجھ سے سوال کئے جاتے ہیں: آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کو کیسے کہا جائے؟ آخر یہ ہے کیا؟ آخر یہ دلچسپ کیوں نہیں ہوتا؟ اس سے بازی سے کیا فائدہ؟ اور میرے دل میں بھی یہ سوال اٹھاکر رہ جاتا ہے جہاں اب تک ناول نگاری کے سلسلے میں پہلے قدم ہی سے آگے نہیں بڑھا پایا ہے وہاں اتنے زیادہ ٹیکنیکی تجربوں کی کیا ضرورت ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی کی ناول نگاری کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں؟ ان سب تمام سوالات کا جواب پانے کے لیے میں یہاں اس نئے ٹکنیک کا ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

Stream of Consciousness کا فقرہ جس کا ہم نے شعور کی رو ترجمہ کر لیا ہے، امریکی ماہر نفسیات اور فلسفی ولیم جیمس کی ایجاد ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی شعور ایک سیال چیز ہے جو بغیر کسی منطقی ربط کے زندگی بھر برابر چلتا رہتا ہے۔ شعور سے مطلب یہاں محض حافظہ، ذہن، منطقی قوت، ادراکی حالت، تخیل یا اسی قسم کی وہ تمام قوتیں نہیں جو پرانے علم نفسیات میں الگ الگ سمجھی جاتی تھیں بلکہ ان تمام قوتوں کا اور دوسری قوتوں کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کے دماغ کا ہر وقت ایک پیچیدہ طریقہ پر چلتا رہتا ہے۔ شعور اس کو کہتے ہیں کہ انسان کو اس کے وجود اور اس کی رفتار کا علم رہتا ہے مگر اس کو پورے طور پر کسی دوسرے کے سامنے پیش کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ بات چیت یعنی زبان کے ذریعہ انسان اس کا کچھ حصہ ظاہر کرتا رہتا ہے مگر اس کے مقابلے میں زبان بڑی محدود چیز ہے۔ زبان کے قواعد اور روایات محض ذہنی یا تخیلی ہیں۔ شعور کے ایسی زبان اختیار کرنے سے پہلے جو تمام رنگ جم سکیں اس کی کچھ کیفیات ہوتی ہیں جن کی طرف نفسیات نگاروں نے خاص توجہ کی۔ یہ کیفیات ہی شعور کا رو کا خاص حصہ ہیں۔

ناول نگاری قصہ گوئی کا دوسرا درجہ ہے جبکہ قصہ گو نے محض تخیل کر جس کے ماتحت وہ دیو پری اور مافوق البشر چیزوں کے قصے سناتا تھا یا محض منطقیات کر جس کے ماتحت وہ اخلاقی قدروں کو اپنے قصے کے کردار بناتا تھا چھوڑ کر نفسیات انسانی پر ٹیکسل انیسویں صدی سے انفرادی نفسیات کا جو علم رائج تھا وہی ناول نگار کے لیے بنیادی ٹھہرا۔ اب بیسویں صدی میں شعور کی رو کو انسانی نفسیات

سے اہم بحث ثابت کیا گیا تو ناول نگار کے لیے یہ ضروری ہوا کہ وہ اپنے کردار کی انفرادیت دکھانے کے بجائے اس کے شعور کی رو کے نقشے بنے اور اس سلسلے میں ڈورتھی رچارڈسن Dorothy Richardson نے پہل کر دی۔ پہلے اس نے ایک ناول "پوائنٹڈ روفز" Pointed Roofs لکھی جو بڑھتے بڑھتے بارہ جلدوں تک چلی گئی اور سب جلدوں کا ایک نام اس نے پلگریمیج Pilgrimage رکھا۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتی ہے:

> "اس ناول کی تصنیف کے دوران میں مصنف کو یہ تجربہ ہوا کہ تصنیف کے ذریعہ حقائق کا اظہار کرنے میں کتنی دشواریاں ہیں کیونکہ جب کسی حقیقت کو ایک صورت دی گئی تو محسوس ہوا کہ اس کی سیکڑوں اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں۔"

ان الفاظ سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس کا مقصد نفسیاتی تجزیہ ہے۔ نفسیاتی زندگی کے پُراسرار محلوں میں وہ گم ہو جانا چاہتی ہے۔ ناول کا نام "پلگریمیج" بھی اس بات کا اشارہ ہے کہ مذہبی سفر پر یا دینی تلاش میں روانہ ہونے کا معاملہ یہاں درپیش ہے۔ حق کا متلاشی تمام نفسیاتی پیچوں میں گم ہے اور اس تک پہنچ جانا مطلب و منشا ہے۔ یہ ایک نئی راہ ضرور ہے حالانکہ اسے ابھی تک فنی کامیابی کے دائرے میں نہیں لایا جا سکتا ہے۔ اس پیرائے مرغ کے جو نفسیاتی تجربے ایک طویل تصنیف میں عجیب بے ربطی کے ساتھ لائے گئے ہیں وہ کسی طرح قاری کے لیے دلچسپ نہیں ہو سکتے۔ شعور کی رو کو نمایاں کرنے کی بنیاد تو پڑ جاتی ہے مگر ضرورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ اس کو فنی درجہ پر لایا جائے۔ اس کام کو ایک مرد جیمس جوائس James Joyce اور ایک عورت ورجینیا وولف Virginia Woolf نے پورا کیا۔ ان دونوں کے فن کو سمجھانے کے سلسلے میں کئی بڑی کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔ یہاں ان کو پورے طور پر واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ سوال ان اصولوں، طریقوں اور تکنیک کا ہے جو ان کے اور ان کے پیروؤں کے ذریعہ وجود میں آئے اور جن کو برتنے سے اُردو ناول نگاری میں نئے شگوفے کھلے۔

شعور کی رو والی ناول کا عام طریقہ یہ ہے کہ اس میں قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے جیسے کہ کسی فرد کے دماغ میں تاثرات کی بے ہنگم قطار چل رہی ہے۔ یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ انسانی شعور میں جو کچھ آتا ہے وہ نہایت درجہ بے ربط ہوتا ہے مگر جب کوئی شخص اپنے خیالات دوسرے کے سامنے ادا کرتا ہے تو زبان کے قواعد کا ربط اور منطقی ترتیب کا ربط اس پر حاوی کر لیتا ہے اور اسی بنا پر ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں آتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شخص اپنے ذہن میں منڈلاتے تمام خیالات کو جوں کا توں رقم کرتا چلا جائے تو ایسا ذخیرہ سامنے آئے گا جو کوئی سمجھ نہ سکے گا۔ مگر شعور کی رو والے ناول نگار اسی گڑبڑ جھالے کو پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال جیمس جوائس کی "یولیسس" کا آخری باب ہے جس میں میرین بلوم کے خیالات کی رو اس طرح قلم بند ہوئی ہے کہ ایک جملہ بغیر کامے یا فل سٹاپ کے پینتالیس صفحوں تک چلتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ کون کیا سوچ رہا ہے اور وہ کہاں اور کس وقت، اور کس حالت میں ہے۔ شعور کی رو سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ میرین بلوم سوچ رہی ہے۔ وہ اپنے میاں کے پاس بیٹھی ہے جو اس پر زندگی میں پہلی دفعہ خفا ہو کر سو گیا ہے۔ اس تکنیک نے اس کے خیالات کو ایک جذباتی رنگ دے دیا ہے اور وہ بگٹٹ چلے جا رہے ہیں حالانکہ ان کی بابت میاں بیوی کے تمام زندگی کے تعلقات کے واقعات سامنے آتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قاری اور فرد کے شعور کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے اور خیالات کا وہ عالم سامنے آ رہا ہے جو ان کے زبان کے ذریعہ ادا ہونے سے پہلے کا

ہوتا ہے۔ یہ عالم بھی شعور کی رو کے طریقے کی بنیاد ہے۔ یہی عالم ایک اور طریقے پر یوں سامنے آتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف بھی موجود ہے اور اس عالم کو قاری کے سامنے لا رہا ہے۔ ایک آدھ فقرہ جو یہ واضح کر دیتا ہے کہ شعور کی رو تو سامنے ہے مگر اس کے اوپر سے کوئی شخص بار بار پردہ اٹھاتا جا رہا ہے۔ اس کی بہترین مثال ورجینیا وولف کی ناول "مسز ڈلووے" کا شروع ہے۔ مصنفہ شروع یوں کرتی ہے کہ:

> "مسز ڈلووے نے کہا کہ وہ خود پھول خریدے گی۔ کیونکہ لوسی کے سپرد کام پہلے ہی ہو چکے ہیں۔ وہ خیال نہیں ہے۔ دروازے چوکھٹوں سے نکالے جائیں گے۔ رمپلمیئر کے آدمی آ رہے ہیں۔ پھر کلیریسا ڈلووے نے سوچا کیا ہی صبح ہے۔ ایسی تازہ جیسے کہ بچوں کے لیے سمندر کے کنارے کھیلنے کے لیے بنائی گئی......"

اسی طرح ناول چلتی چلی جاتی ہے۔ اس طریقے میں پہلے طریقے سے زیادہ ربط نظر آتا ہے۔ جملے بھی پورے پورے ہیں اور ترتیب بھی ایسی بے تکی نہیں مگر پھر بھی بنیادی طور پر اس میں بھی ذہنی ربط کا فقدان اور خیالات کے دھارے کا تسلسل ہے جو پہلے طریقے میں۔ یہ دونوں طریقے سب سے اہم ہیں حالانکہ ان سے استفادے کے مدارج رہتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ان مخصوص طریقوں کو چھوڑ کر پرانے یا بیانیہ منطقی طریقوں پر بھی آ گیا۔ مگر ان مقامات پر بھی سوال زیادتی یا کمی ہی کا رہتا ہے کیونکہ ربط اور بے ربطگی کا امتزاج ایک حد تک لازمی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس وقت بھی جبکہ اس طریقے میں کمال بے ربطی ہوتی ہے، ربط کا وجود ضرور رہتا ہے۔ ناول نگار کے سامنے شعور کی بے ربطی اور منطقی ذہن کے ربط کو اپنی مرضی اور اپنے مقصد کے موافق ملانے کا سوال ہوتا ہے۔

(۲) سارے عمل کا مقصد "رو" "دھارے" یا بہتے ہوئے حرکت کا تاثر قائم کرنا ہے۔ اس دور میں زندگی کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ زیادہ تر ہم کو رفتار ہی رفتار دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے فلسفے میں بھی مکان سے زیادہ زمان اہم ہو گیا ہے اور آخری نقطہ کوئی اٹل اور قائم حقیقت نہیں رہی بلکہ تبدیلی یا صیرورت ہو گئی ہے۔ کائنات تیزی کے ساتھ ارتقا کرتی بتائی جاتی ہے اور خالق بھی ہر لحظہ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے ناول میں بھی ذہنی واقعات نہیں بلکہ ذہنی رفتار کی طرف توجہ لازمی تھی یا یوں کہیے کہ ناول نگار رفتار کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ انسان کا ذہن بھی انھیں چکر کھاتی ہوئی چیز ہی دکھائی دیا۔ لہٰذا لندن اور ڈبلن [illegible] رہنے والوں کے لیے شعور کی رو ہی کو دکھانا قدرتی تھا مگر لکھنؤ جیسے پرسکون شہر کے رہنے والا [illegible] تو وہ [illegible] عیش اور دکھاوے سے زیادہ [illegible]۔ کراچی کی زندگی میں گھل مل جانے کے بعد شعور کی رو کی طرف توجہ ضروری ہو جاتی ہے۔ شعور کی رو کا نقشہ دکھانا اس دور کے ناول نگاروں کے لیے اتنا ہی قدرتی تھا جتنا کہ شاید پچھلی صدی کے ناول نگاروں کے لیے بعض تمثیلی شخصیتوں سے الگ ہو کر انفرادی نفسیات پیش کرنا۔ زیادہ تر لوگ ہمیشہ صدیوں پیچھے ہی رہتے ہیں اس لیے فیلڈنگ پر بداخلاقی کا الزام لگایا گیا اور اب جوئس پر "کنفیوژن" کا۔ بہرحال دور کے شعور کی رو کا احساس دلانا سب سے اہم فرض ٹھہرا۔ اس کے لیے جو طریقہ DEVICE خاص طور پر استعمال کیا گیا وہ FREE ASSOCIATION تھا۔ نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا ذہن کبھی ایک مقام پر نہیں ٹھہر سکتا مگر اس کا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف تیزی سے رجعت آزادانہ بلکہ کے ماتحت ہوتی ہے جو تین اصولوں سے جاری نظر آتا ہے۔ پہلا حافظہ دوسرا حسیات اور تیسرا تخیل یعنی

ہے کہ دماغ کو کچھ چیزیں یاد آتی ہیں کچھ محسوس ہوتی ہیں اور کچھ ہونے والی چیزوں کا وہ تصور کرتا ہے۔ دُوسری قسم کی چیزیں موجود ہیں۔ پہلی
قسم کی ماضی میں اور تیسری قسم کی مستقبل میں ہیں۔ یہ سب ایک دُوسرے سے وابستہ ضرور ہوتی ہیں حالانکہ منطقی طور پر یہ حد سے زیادہ
بے ربط ہوتی ہیں۔ ناول نگار ان میں سے ہر ایک کو ایک دُوسری سے وابستہ کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال میں میرین بلوم ہی کے
شعور کی تصویر کو لیجیے۔ اس کے آخری حصہ کو غور سے دیکھیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے گھڑی بجتی سنی اور اس کے تصور میں چینی لوگ
اور ویگیلس کی تصویر یاد آئی۔ اس نے نہ نوں کو سوتا تصور کیا اور پڑوسیوں کی گھڑی کے الارم کا خیال کیا۔ وہ گھڑی کے بجنے کو گننے لگی
اس کی نگاہ دیوار کے کاغذ پر پڑی اور چمکیلے تاروں کی سمت کے پھولوں کی طرف گیا اور اس کے ساتھ لمبارڈ اسٹریٹ پر گھر یاد آیا اور وہ کپڑے
یاد آئے جو اس کے میاں نے اسے دیے تھے۔ اب اس کی نگاہ اپنے میاں کی طرف گئی جو پاس ہی سو رہا ہے اس نے لیمپ بجھایا اور اسے
دیا کہ جلدی اٹھنا ہے اور اس نے آنے والے دن کے کاموں کا تصور کیا۔ بازار میں خرید و فروخت، روٹی کی دوکان کا نقشہ سامنے
اور خرید و فروخت کی طرف خیال گیا۔ ڈنڈاس کا تصور ہوا گھر کو صاف کرنے کا خیال آیا اور ڈنڈاس کو کھانا کھلانے کا۔ پیانو کو صاف کرنے
میز پر پھول رکھنے کا اسباب اسے محسوس ہوا کہ پورا کمرہ پھولوں میں تیرنے لگا۔ اس نے قدرت پر سوچنا شروع کیا اور مناظر قدرت سامنے
آئے۔ وہ منکروں کو خدا کے وجود کا ثبوت سورج کی رفتار سے دینے کی سوچنے لگی۔ اسے جبرالٹر کے سورج پر خیالات اپنی محبت
کے دور میں یاد آئے۔ جبرالٹر یاد آیا اور محبت کی باتیں یاد آئیں اور اس کے بعد وہ سو گئی۔ غرض اس پورے نقشہ میں اہم بات کوئی بھی
نہیں ہے باتوں کی ایک سے دُوسری کی طرف حرکت اور پورے شعور کی حرکت اہم ہے۔ حرکت ہی دکھانا مقصود ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار سینما کے تکنیک سے طریقے مستعار لے رہا ہے۔ قصہ گوئیوں نے ہمیشہ عام تفریحات
پر نظر رکھی۔ ناول کو پاکٹ ڈرامہ بھی کہا گیا ہے اور ڈرامے کے ٹیکنیک کا اس پر بہت گہرا اثر ہے۔ اب عام تفریحات میں ڈرامے کی
جگہ سینما نے لے لی ہے اور اس کے ٹیکنیک کا بھی ناول میں آ موجود ہو جاتا ہے۔ فلم کی ڈرامے پر برتری اسی بات میں ہے کہ وہ زندگی
کی روانی دوڑ اور تیزی سے مقام اور انداز بدلتی ہوئی دکھا سکتی ہے۔ اسی میں فلم کے قصہ کا بھی خصوصی مقصد۔ رفتار کا دکھانا ہوتا ہے۔ اگر
کسی فلم کو ٹیکنیکل نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، اس میں بھی مختلف قسم کے ٹکڑے ASC OL. OF. O. O OM ZOOMS
حساب سے جڑے ہوئے نظر آئیں گے جس تیزی کے ساتھ ایک تصویر دُوسری کے بعد آتی ہوئی کہیں ایک تصویر ایک دم دُوسری
میں جاتی ہوئی۔ اور کہیں ایک مرکزی تصویر سے وابستہ تصویریں جمع ہوتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ ایک موضوع کی تصویر مختلف پہلوؤں سے بھی
دکھائی جاتی ہے۔ واقعات کی رو دکھانے کے لیے بھی بہت سی نئی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں فلم بنانے والوں نے ان تمام ترکیبوں کے نام رکھے
ہیں جیسے ... BACK . CLOSE . UP CUTS . FADE . OUT . SLOW ... وغیرہ وغیرہ۔
یہ تمام ترکیبیں شعور کی رو والی ناولوں میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ورجینیا وولف کی ناول MRS. DALLOWAY میں شروع ہی سے احساس ہوتا
ہے کہ شعور کی رو سینما کے ٹیکنیک پر چل رہی ہے۔ پہلے کلیریسا ایک پارٹی میں شرکت کے لیے تیاری کا خیال کرتی ہے ہوا میں اور میدان حال کی طرف
آتی ہے اور وہ دیکھتی ہے مگر بڑی خوشگوار ہے اب ایک FLASH - BACK ہوتا ہے جو بیس برس پیچھے لے جاتا ہے اور وہ پش کے میں
سامنے آتا ہے۔ اس میں ایک (CLOSE - UP) ہوتا ہے جس میں اس کی چیڑ والش سے بات چیت درج ہوتی ہے۔ پھر چیڑ والش

مختلف طرف دھیان جاتا ہے جب MULTIPLE VIEW کی ترکیب استعمال ہوتی ہے اور کلیریسا کے شعور کو چھوڑ کر ایک طرف دھیان جاتا ہے جو سڑک پر کھڑا ہوا کلیریسا کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اس کے شعور کی رو سامنے آجاتی ہے اس میں وہ شنشر سے جنگ بری معلوم ہوتی ہے۔ اب پھر ایک FADE-OUT ہوتا ہے اور اس کی یاد میں کل شام کی جنگ کی بات چیت آتی ہے FADE-OUT ہوتا ہے اور وہ دنیا کی موجودہ حالت کا اپنے طور پر جائزہ لے کر خوش نظر آتی ہے۔ یہاں ایک CUT ہوتا ہے اور پھر وہ بہت ہی اس سے مل کر وہ اتنی کمزور نظر آتی ہے۔ پھر FADE-OUT ہوتا ہے اور کلیریسا کے شعور کی رو سامنے آتی ہے اور وہ بہت برے زمانہ کے لوگوں پر غور کرتی ہے۔ وقت تیزی سے بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ ماضی حال مستقبل FLASH میں اور کلیریسا اپنی بیٹی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ پھر CUT ہوتا ہے اور وہ حال میں آکر کسی طرف متوجہ نظر آتی ہے۔ پھر FADE OUT ہوتا ہے اور وہ ماضی میں اپنی قوت کا احساس کرتی ہے۔ اس طرح زیادہ تر شعور کی رو والی ناولوں میں وہ سب استعمال کرتی ہیں جو فلم بنانے والے MONTAGE کے دائرے میں رکھتے ہیں اور اگر فلم ٹیکنیک سے واقفیت ہو تو اس قسم کی ناول کو سمجھنے میں ویسی ہی مدد ملتی ہے جیسی پرانی ناولوں کو سمجھنے میں تنقید کے تعین سے۔

مگر فلم زندگی کی ظاہری رفتار یا رو دکھا سکتی ہے اور یہی صفات شعور کی رو والی ناول میں دکھانا ہوتا ہے اس حد تک فلم ٹیکنیک ساتھ دیتا ہے مگر ناول نگار کو شعور کا پوشیدہ اور پیچیدہ پہلو بھی دکھانا ہوتا ہے نہیں تو اس کی تصویر فلم کی طرح محض حسی چیز بنے گی۔ شعور کی رو کے ذریعہ ناول نگار کا اپنا شعور نہیں بلکہ کسی دوسرے فرد کا شعور سامنے لایا جاتا ہے۔ ہر شعور کچھ انفرادیت رکھتا ہے مگر یہ اس قدر پر اسرار ہوتی ہے کہ دوسرا اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ شعور کی رو دکھانا کوئی بے معنی اور بیکار کا کھیل نہیں ہے بلکہ فنی مقصد ہے یعنی یہ تخیلی نقشہ دکھاتا ہے جو معنی خیز ہوتا ہے۔ شعور کی رو والی ناولوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ناقد سامنے لائی جا رہی ہیں جو زیادہ سے زیادہ معمہ ہوتی جا رہی ہیں۔ آخر ان کے معنی کیسے سمجھے جائیں۔ کیا ان کے کوئی معنی ہیں بھی؟ لیکن وہ ناقد قرار دے کر ترک ہی کیوں نہ کر دیا جائے؟ اس میں شعور کی رو والی ناول معمہ ضرور ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ جدید میں ہر چیز معمہ ہے اور بہت زیادہ لوگوں کی تفریح بھی معمے حل کرنا ہے مگر ہر تفریحی معمہ کی طرح یہ حل بھی کی جا سکتی ہے اور حل کرنے کے یہ اشارے بھی دیتی ہے۔ یہ کچھ خاص قسم کے ہی ہیں جو اسے معمہ بناتے ہیں اور جن ہی سے اس کا حل بھی نکلتا ہے۔

(۱) ذہنی مواد کا آزادانہ تلازمہ کے مطابق آنا جس سے ابہام کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعور کی رو بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے اور ایسے امور سامنے لاتی ہے جو کردار کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو ہم یاد نہ رکھیں تو آگے چل کر اور بھی ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور ابہام کا اثر بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً یولیسس میں بیوپالڈ بلوم ڈبلن میں پھرتا ہوا ایک اشتہار دیکھتا ہے جس میں "ہیملٹ" نام کا ڈرامہ مسز بینڈمین پامر کی اداکاری کے ساتھ پیش ہونے کی اطلاع ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے "میں اسے پھر اس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کل رات اس نے ہیملٹ کا پارٹ کیا تھا۔ شاید ہیملٹ عورت تھا۔ اوفیلیا نے خودکشی کیوں کی؟ بیچارے پاپا ہمیشہ بیٹھے بیٹھے اس کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ... میں ... انتظار کرتے رہے کہ ... ہو جائے میری پیدائش سے برسوں پہلے کا قصہ ہے"۔ یہاں پاپا کا اوفیلیا سے تعلق بالکل ذاتی بات ہے مگر یہ تعلق کیا ہے؟ سامنے

ہ والدہ نے بھی اوفیلیا کی طرح خودکشی کی تھی۔ اس کی یاد بلوم کے ذہن پر طاری دکھائی گئی ہے۔ یہ ناول کے موضوعات
ی پیچیدگی سے متعلق ہوتی رہتی ہے۔ مندرجہ بالا ٹکڑے میں اس کی طرف پہلا اشارہ ہے۔

لی کا تاثر جو صنائع اور بدائع کے استعمال سے سامنے آتا ہے۔ مثلاً یولیسس میں اسٹیفن سمندر کے کنارے سوچتا
ہے۔ اس سلسلے کے حوالے میں کم از کم پچیس قسم کے صنائع استعمال ہوئے جن کے ذریعہ شعور کی بے ربطی کا عالم
ہے۔ اسٹیفن کا ذہنی عالم ایک معمہ ہو جاتا ہے جو آگے چل کر حل ہونے لگتا ہے۔

سے زیادہ استعارے کا استعمال ہوتا ہے جو اشاراتی یا رمزی سطح پر آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس اصول کو سامنے رکھا
سانی ذہن کا رجحان اشاراتیت اور اشارے سے [illegible] ہر قسم کے ادب کی روح رواں ہیں ہر
اور ذاتی اشارے استعمال کرتا ہے۔ شعور کی رو والے ناول نگار بھی کثرت سے اشارے لاتے ہیں جو بار بار دہرائے جاتے ہیں
مقامات سے سے یکجا کرنے سے ایک مکمل اور مربوط تصویر یا قصہ بنتا ہے۔ یولیسس میں اسٹیفن کی ماں کی موت اور
کی موت کے قصے مختلف مقامات پر اشاروں سے مل کر بنتے ہیں۔

ناول نگار شعور کی بے ربطی کا تاثر بھی قائم کرتے ہیں اور اس پر ایک پوشیدہ ربط بھی عاید کرتے ہیں جس تک پہنچنے کے
ہے جیسے معمہ والی تصویروں میں انسانی شکلیں پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتیں مگر ایک دفعہ غور کر لینے کے بعد پھر جب
سامنے آتی ہیں۔

ہم نے کہا وہ ناول کے بیانات یا جزوں سے تعلق رکھتا ہے مگر ناول اور ڈرامہ کا فن خاص طور پر کل تصنیف کا فنی بندی
سے سب سے اہم عنصر کردار ہے۔ اس سلسلے میں شعور کی رو والے ناول نگاروں کا فن سب سے زیادہ پریشانی کن نظر آتا
میں پہلے خیال عام قاری کی طرف جاتا ہے جس کی ناول میں دلچسپی قصے سے ہوتی ہے اور جو یہ چاہتا ہے کہ قصہ
کو بھی نہ چاہے اور بغیر کسی خلا اور تنوع کے چلتا رہے۔ ایسے قاری کو شعور کی روانی والے ناول میں کچھ نہیں ملتا۔
سین کے "میرے بھی صنم خانے" کو پڑھنے کے بعد کہا: "یہ ناول نہیں مضامین کا مجموعہ ہے"۔ ایک اور صاحب نے
نہیں دو سو صفحے پڑھ گیا کوئی قصہ تو شروع ہوتا ہی نہیں۔ ناول میں قصہ یا پلاٹ ہی ہر چیز کا اہم ترین بنیاد ہوتا
اول نگار اس سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ فارم یا پیٹرن بنانے سے بری الذمہ نہیں ہوتے ہیں۔ وہ مختلف طریقوں
کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً زمان و مکان کی وحدت، کردار اور عمل سے موضوعات کے انتخاب سے، فنی اصناف کی نقل سے
عمل کی ترتیب سے۔ مناظر قدرت میں تبدیلیوں سے، تاریخ کے تسلسل سے یا موسیقی کے انتخاب سے یا اسی قسم کے اور
اہم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ناول یولیسس کی تخلیق ہے جس کو تعمیری نمونہ شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ شاید اس سے
نگاری کی پوری تاریخ میں کوئی نہ ہو۔ اس ناول میں تین افراد کے شعور کی رو کے مناظر پیش کئے گئے ہیں: اسٹیفن، بلوم اور
مسز بلوم۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا مواد اتنی بے ترتیبی سے ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے بھی کوئی ربط نہیں
پیش کرنے کیلئے ایسا پیٹرن بنانا ہے جس سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ حقیقت پیٹرن سازی اہم ہو گئی ہے۔ اس حیثیت کی

ولیس کا پلاٹ یہ ہے کہ سارا قصہ ایک شہر میں ایک دن (اٹھارہ گھنٹے) میں ہو جاتا ہے۔ قصہ ایک ہی وقت میں دو شخصوں پر
ا ہے اور گھڑی کے حساب سے چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اسٹیفن کے مارٹیلو ٹاور میں اور دوسرے بلوم کے گھر میں۔ اس کے بعد قصہ
شروع ہوتا ہے اور گھڑی کے ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ اسٹیفن کے مدرسہ پڑھانے کا ہے جو دس بجے ہوتا ہے
تیسرے میں گیارہ بجے اسٹیفن سمندر کے کنارے سوچتا ہوا جاتا نظر آتا ہے۔ پانچویں تک بلوم سے تعلق رکھتا ہے جو دس بجے
ہوتا ہے۔ چھٹا ایک جنازے کا ہے جو گیارہ بجے نکالا جاتا ہے۔ ساتویں میں اسٹیفن اور بلوم دونوں ایک اخبار کے دفتر میں
ہیں۔ وقت بارہ بجے کا ہے۔ آٹھویں میں ایک بجے بلوم ایک ہوٹل میں کھانا کھاتا ہے۔ نویں میں اسٹیفن اور بلوم دونوں دو بجے ڈبلن
میں پھرتے ہیں۔ دسویں میں تین بجے دونوں کرداروں کی دو گھنٹوں میں ہاتھ دکھایا جاتا ہے۔ گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں بلوم کے
تجربات سے تعلق رکھتے ہیں جو چار بجے سے لے کر آٹھ بجے کے درمیان ہوتے ہیں۔ چودھویں میں اسٹیفن اور بلوم ایک اسپتال
میں۔ پندرھویں میں دونوں رنڈیوں کے محلے میں ملتے ہیں۔ یہاں بلوم اسٹیفن کو رنڈیوں کے پھندے سے بچاتا ہے اور اب سے
ایک دوسرے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ سولھویں میں دونوں رات کچھ قریب گاڑی کے اڈے پر پہنچتے ہیں۔ سترھویں میں دونوں
آتے ہیں۔ وقت صبح دو بجے کا ہے۔ آخری قصہ بلوم کی بیوی کے شعور کی رو ہے جو اس کے اپنے بیان سے زندگی بھر کے تعلقات کا
خلاصہ ہے۔ اس طرح تمام ناول ایک زمانے میں آگیا ہے حالانکہ اس کے اندر وہ چیزیں ہیں جو زمان و مکان کے تقاضے کے منافی
ہوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام ہنگامہ چیزوں کو دبا رہا ہے۔ ان کے لیے اشاراتی تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے جن کی گرفت میں سمندر تک اور
ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ناول نے امامت ہی نہیں بلکہ ہر ہر واقعے سے یہ کہ سب میں بڑی عظیم تصنیف ہی ہو کر
کے ستاروں کی ہو جاتی ہے اور اس عظیم ایپک کی پیروڈی ہے۔ مگر یہ محض پیروڈی ہی نہیں بلکہ تمام انسانی تاریخ کا نچوڑ ہے جس
میں مافیات ایک سی، سیدھا آدمی، اکیلا آدمی اور ایک عورت ہے جو تحریک اٹھانے سے ہوئے ہیں۔ ناول کا
مقصد یہاں بھی فیلڈنگ کی طرح "بلکہ فیلڈنگ سے بھی زیادہ معنے خیز طور پر پورا ہوتا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے
ناول کا طریقہ محض تجربہ نہیں رہا بلکہ فنی کامیابی تک پہنچ گیا۔

ورجینیا وولف نے اس طریقے کو کامیاب ہیئت تک پہنچانے کے لیے موسیقی اور شاعری کے پیرائے سے ہم آہنگ کر دیا اور
ناول نگار فاکنر نے دونوں کے طریقوں کا امتزاج کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ان کے طریقوں کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس
ان پر ناولوں نے ساتھ ہی اثر ڈالا۔ الزبتھ بوون E. BOWEN گراہم گرین GRAHAM GREEN کیتھرین این
پورٹر KATHRINE ANNE P... رابرٹ پین وارن ROBERT PENN WARREN
یوڈورا ویلٹی EUDORA WELTY اور ڈیلامور DELAMORE SAWAR... ۔ ہمارے یہاں قرۃ العین حیدر
نے اس تتبع میں قدم اٹھایا۔ مگر ان کی ناولوں کے حصے تو شعور کی رو پر چلتے ہیں مگر کسی ناول میں کوئی ہیئت وجود میں نہیں آتی۔
اس وجہ سے کہ وہ اس ہنگامہ خیزی کے لیے تیار نہیں جس نے جوائس اور ورجینیا وولف دونوں کی جان لے کر ہی چھوڑا۔ فن
کا بنا بنایا سانچہ ہے اتنا ہی زیادہ توجہ اور محنت کا متقاضی ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں شعور کی رو کو استعمال کرنے والے پڑھنے

صنعتی دور سے فرار کر کے اس کی بے ربطی میں پناہ لینے سے آگے جانے کی کوشش نہیں کرتے اور ان کے اول فول کو بھی آج کے پیغمبر نقاد سر دھننے کے لیے موجود ہی ہیں۔ اس لیے ہر بے ربطی اور بے ہنگمی کو فن کہہ کر عام پڑھنے والوں پر دھونس ڈال دی جاتی ہے۔ یورپ میں ۱۹۴۵ء کے بعد کے ناول نگار اس طریقہ کو ترک کر کے پھر پرانے طریقوں پر واپس جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کو پسند نہ کرنے والوں کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک وقتی ابال تھا۔ مگر جو لوگ ادب کو توجہ اور دلچسپی سے پڑھنے کے عادی ہیں وہ اس میں اس وقت کے ادب کی طرف پہلا قدم دیکھتے ہیں جبکہ زیادہ تر پڑھنے والے جیمس اور برگساں کے فلسفہ سے اسی طرح مانوس ہو جائیں گے جیسے کہ وہ ارسطو اور افلاطون سے شعوری یا لاشعوری طور پر اس وقت واقف ہیں۔

———

مدارالدولہ نواب علی نقی خاں

نادم سیتاپوری

ڈاکٹر اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

جعفر از بنگال و، صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

اودھ کے دربار میں بھی مختلف ایسی ہستیاں تھیں جو غداروں کی دوسری فہرست کہلانے کی مستحق ہیں۔ "زینت محل" کا نام بھی آتا ہے اور مرزا الٰہی بخش کا بھی۔ حکیم احسن اللہ خان بھی جس کی زد میں آتے ہیں اور "مدارالدولہ نواب علی نقی خان" بھی ہیں ــــ غیر منقسم ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ کتنی بھیانک ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی سرگرمیوں سے ملک و قوم کا دامن کبھی پاک نہیں رہا۔ غدار پیدا ہوتے رہے اور تاریخ ان کی پردہ پوشی کرتی رہی۔ کبھی کبھی ان کی غداری کا تاریخی ثبوت مع دستاویزات کے سامنے آ کر دوسروں کی طرف بھی موڑ دیا گیا۔ "فورٹ ولیم" کی بنیاد پڑتے ہی اس کے چاروں طرف "ملت فروش" "جینی بنیوں" کا جو سنہرا جال پھیلایا گیا تھا وہ کم ہی لوگوں کو معلوم ہو گا ــــ انہیں سو سال کے اندر ملک و قوم کا جتنا بڑا نقصان ہوا ان "جینی بنیوں" کے ہاتھوں ہوا اس کی مثال نہ بنگال کے "جعفر" کے یہاں ملے گی نہ دکن کے "صادق" کے یہاں! ان جینی بنیوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کی دکان چلانے کے لیے اول دن سے جو کردار ادا کیا تھا جسے سامراج کے عہد "تاریخ سازی" نے اس کا خاطر خواہ صلہ دیا ــــ اور آج کی تاریخ ان غداروں کے نام سے پاک صاف نظر آتی ہے ــــ اگر ہیسٹنگز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں لارڈ کلائیو وغیرہ کے خلاف مقدمات نہ چلائے جاتے تو آج یہ کہنا بھی دشوار تھا کہ یہ جینی بنیے وہ پہلے غدار ہیں جن پر (غیر منقسم) ہندوستان میں یورپی سامراج کے قدم جمانے کی غدارانہ ذمہ داری سب سے زیادہ عاید ہوتی ہے۔ اودھ کے غداروں میں "نواب علی نقی خان مدارالدولہ" کا نام تقریباً ایک صدی سے اودھ کے بچے بچے کی زبان پر ہے اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ فروری ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کا الحاق انہیں کی غدارانہ سازش کا رہین منت ہے ــــ ؟ لیکن اس کی تائید تاریخ کے اوراق سے جو ملتی ہے نہ انگریزوں کی کسی تحریر سے ــــ جو غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد "نواب علی نقی خان" کے ساتھ رہا ــــ یا انعام و اکرام کا تو ذکر ہی کیا؟ سلطان عالم واجد علی شاہ کے مٹیا برج سدھارنے کے بعد لکھنؤ میں نواب علی نقی خان کی جو درگت بنی وہ یقیناً اس بات کی غماز تھی کہ ان کو اصلی کردار "انگریز دوستی" سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا ــــ

مدارالدولہ ثانی علی نقی خان ابن اللہ ورد نواب امداد حسین خان کی معزولی وزارت کے بعد اگست ۱۸۴۷ء میں اودھ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ واجد علی شاہ بہادر نے اکتیس پارچہ کا خلعت اور دستور زمانہ کے مطابق ایک طویل خطاب سے سرفراز فرمایا ــــ

"دولت کے رئیس، خلاصۂ جانثاری، اعتماد سلطنت شہریاری، امیر الامرا مدار المہام ــــ"

وزیر الملک۔ معتمد السلطنت۔ تمکین السلطان سیف مسلول بازوئے شاہنشاہی۔ رمح مصقول معرکہ دشمن کاہی۔ مادہ مصادر یک رنگی و صفا ناسخ مناسخ صداقت و وفا۔ مرید مرشد پرست اخلاص گزین خانہ زاد حقیقت سرشت صفوت آئین مختار ذی اقتدار یار وفادار سپہ سالار رستم بند مدار الدولہ منتظم الملک علی نقی خان بہادر سہراب جنگ فدوی خاص جان نثار ابوالمنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زمان سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔

وزیر الملک مقرر ہونے کے بعد جتنا جتنا تقرب سلطانی علی نقی خان کو حاصل ہوتا گیا اتنی اتنی مخالفت بھی بڑھتی گئی یہاں تک کہ درباری سازشوں کا شکار ہو گئے۔ بادشاہ کی نگاہیں بدل گئیں ——— مگر جب یہ صاف ہو گئی اور وہ پھر سے آرام و اعزاز اضافے کے ساتھ یعنی وزیر الملک۔ مدار الدولہ ثانی کے خطاب سے ملقب کر کے سلطان عالم نے ان کو اپنے بہی خواہ ظاہر کیا۔

علی نقی خان کا خاندان دو سو برس ادھر ہندوستان کے ممتاز گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے دادا مدار الدولہ اوّل نواب یوسف علی خان خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی اولاد سے تھے۔ مدار الدولہ اوّل نواب یوسف علی خان کے والد خواجہ محمد موسیٰ کے باپ اور بھائی خواجہ محمد یعقوب بھی تھے۔ انھیں دونوں بھائیوں نے اس عظیم خاندان کی بنیاد ڈالی۔ تاریخ اودھ کے مصنف شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ نے تاریخی حالات کے ساتھ اس خاندان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

"خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ محمد موسیٰ دو حقیقی بھائی خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے۔ خواجہ محمد یعقوب کو شہزادہ مراد بخش ابن شاہجہان شہنشاہ دہلی کی بیٹی منسوب تھی اور خواجہ محمد موسیٰ شہزادہ روشن گہر المخاطب بہ نواب سربلند خان کی شادی سلطان معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ دہلی کی صاحبزادی جہاں آرا سے ہوئی تھی۔ یہ محمد موسیٰ کے پوتے تھے جو آگے چل کر نواب سعادت خان و برہان الملک کے خطابات سے سربلند ہوئے۔ ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۷۰۵ء میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ نواب سربلند خان کی سرکار میں ملازم ہو کر جاگیر پر فراغت میں ملازمت کی تھی۔"

مدار الدولہ اوّل انھیں خواجہ محمد موسیٰ کے بیٹے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ پوتے تھے چنانچہ سید غلام علی نقوی اپنی تصنیف عماد السعادت میں تحریر کرتے ہیں۔

"مدار الدولہ اوّل کے والد خواجہ محمد موسیٰ خان نے ہندوستان آ کر معز الدین جہاندار شاہ کی شاہزادی سے شادی کی۔ مگر نواب موصوف شہزادی سے نہیں ہیں شہزادی کی اولاد ہمیشہ قلعہ میں رہتی تھی اور وہ لوگ خواجہ زادہ کہلاتے تھے لیکن غلام قادر خان کی شورش کے بعد یہ لوگ قلعے

نکل کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ کچھ سیتاپور پہنچے۔ بعض راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ چلے گئے
اور دو یا تین لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ مختصر یہ کہ ان دو شہزادوں کے علاوہ خواجہ مُرتضیٰ خان کے چند
لڑکے اور لڑکیاں اور بھی ہیں ان میں سے ایک مدار الدولہ (اوّل) اور دوسرے عظیم الدولہ
اور بہاء الدین ہیں۔" (ترجمہ فارسی)

خواجہ مُرتضیٰ کا آبائی مذہب اہلسنت تھا مگر نواب سعادت خان برہان الملک کی صحبت میں مذہب قدیم ترک کر کے امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ برہان الملک نے موصوف کو علاقہ "پچھریٹہ[۱]" متعلقہ خیرآباد (ضلع سیتاپور۔ یو پی) جس کی سالانہ ہزار روپیہ سالانہ تھی، جاگیر میں "وکیل سلطنت مختار الدولہ بہادر، صمصام جنگ" خطاب بھی عطا کیا۔ . . . . نواب مختار الدولہ (یوسف علی خان) کی کل بیویوں سے اکیس بیٹے اور دو بیٹیاں حسب ذیل تھیں۔

(۱) اسد الدولہ نواب اسد علی خان (۲) حسین علی خان (۳) حسن علی خان جن کے بیٹے زین العابدین خان اور پوتے اکبر علی خان تھے (۴) عباس علی خان (۵) احتشام الدولہ رئیس الملک محمد علی خان جن کے ایک بیٹے "علی نقی خان" واجد علی شاہ کے زمانہ حکومت میں مدار الدولہ ثانی کے خطاب سے سرفراز ہو کر وزیر اعظم سلطنت اودھ ہو گئے تھے (۶) شریف الدولہ احمد علی خان جن کے دو بیٹے نواب علی خان اور اکرام الدولہ حسین رضا خان کرم الملک اور ایک دختر گوہر آرا بیگم تھیں، جو نواب علی نقی خان (مدار الدولہ ثانی) کو منسوب تھیں (۷) جعفر علی خان (۸) علی رضا خان (۹) قاسم علی خان (۱۰) مہدی علی خان . . . . . . (۱۱) علی محمد خان (۱۲) میر علی خان۔

منجملہ دو بیٹیوں کے ایک کی شادی زین العابدین خان کے بیٹے میر نقی خان سے ہوئی اور چھوٹی بیٹی افضل بیگم بعد وفات نواب شجاع الدولہ ان کے بیٹے نواب سعادت علی خان (۱۷۹۸-۱۸۱۴ء) کو بمقام بنارس بیاہی گئیں۔"

(تجلیات ۱۹۰۵ء مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ صفحات ۴۹-۵۲)

نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵-۱۷۹۷ء) کے عہد میں اس خاندان کو پہلی بار شدید زوال اور انحطاط سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے حقیقی وجوہ کیا تھے، تاریخوں میں اس کا صحیح جواب نہیں ملتا، صرف "احسن التواریخ" میں ایک واقعہ ملتا ہے جس کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید "آصف الدولہ" اور مختار الدولہ خواجہ مُرتضیٰ کے درمیان یہی بنائے نزاع بنا ہو۔ مصنف احسن التواریخ کا بیان ہے:

"عمدۃ الملک مدار المہام وزیر الممالک اعتماد الدولہ آصف جاہ برہان الملک ابو المنصور خان صفدر جنگ شجاع الدولہ یحییٰ خان "آصف الدولہ" ہزبر جنگ یار وفادار سپہ سالار رستم ہند، فدوی شاہ عالم بادشاہ فرزند نواب شجاع الدولہ بہادر عرش منزل نے

---

۱ قصبہ پچھریٹہ تحصیل صدر ضلع سیتاپور کا ایک مشہور تاریخی مقام ہے جسے مغل دور حکومت اور شاہان اودھ کے زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ اب ایک معمولی دیہات سا قصبہ ہے۔

"۱۱۸۸ ہجری میں بعمر بست و ہفت سالگی کے مسند ریاست اودھ کو زینت بخشی اور لکھنؤ کو ریاست گاہ بنایا۔ اور بطیب اپنے سرکار کمپنی کے گوروں کو جو لوازم ریاست اودھ تھے برطرف کیا اور بجائے اور حفاظت اپنی ملک اودھ کے کل علاقات متعلقہ راجہ چیت سنگھ یعنی بنارس جونپور اور متعلقات وغیرہ اس کے کہ ایک ملک وسیع معہ مال و سائر کے کمپنی کو دے دیا نسبت اس ملک کے بعض مورخین کا قول ہے کہ نواب سے اس ملک کو "مختار الدولہ" نے جو نائب تھا اپنی کارسازی سے لکھوا دیا خوشی یہ امر ظہور میں نہیں آیا تھا۔"

(احسن التواریخ مطبوعہ مطبع تنائی لکھنؤ ۱۸۷۹ء صفحہ ۲۴)

لیکن مختار الدولہ کی زندگی میں آصف الدولہ اس خاندان کے جبروت و اقتدار پر ہاتھ نہ ڈال سکے شاید اس کا سبب یہی ہو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ان کی پشت پناہی کر رہی ہو؟ لیکن مختار الدولہ کی وفات کے بعد آصف الدولہ نے ان کے بھتیجے مدار الدولہ یوسف علی خان کو چین نہیں لینے دیا۔ اعزاز و مناصب سے بھی محروم کیا "مچھریٹہ" کی جاگیر بھی ضبط کر لی۔ ہو سکتا ہے کہ آصف الدولہ کی اس ناراضگی اور خفگی کا سبب یہ بھی ہو کہ مدار الدولہ کی صاحبزادی نواب افضل بیگم کی شادی ان کے مختلف البطن بھائی نواب سعادت علی خان کے ساتھ ہوئی تھی جن سے آصف الدولہ کے تعلقات تمام عمر ناخوشگوار رہے۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف نے لکھا ہے:

"نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان میں بوجوہ چند در چند صفائی نہ تھی۔ اس لیے اوّل اوّل نے مدار الدولہ کی جاگیر "مچھریٹہ" ضبط کر لی جس پر انھوں نے بندیروں کی مدد سے فتنہ و فساد برپا کیا چنانچہ فوج شاہی و انگریزی تنبیہ کو روانہ ہوئی اور اسی معرکہ کارزار میں مدار الدولہ کام آ گئے۔"

(بیگمات اودھ صفحہ ۵۲)

آصف الدولہ کی وفات کے بعد جب نواب سعادت علی خان اورنگ آرائے صوبہ اودھ ہوئے تو انھوں نے بوجہ قرابت باہمی ان تلخیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ خدمت آبداری نواب سعادت علی خان (فرزند مدار الدولہ) کے سپرد ہوئی اور پرگنہ "مچھریٹہ" کی آمدنی مدار الدولہ کی اولاد میں بحصہ شرعی تقسیم ہونے لگی۔

"مچھریٹہ" (ضلع سیتاپور) سے اس خاندان کا تعلق برہان الملک کے عہد سے لے کر آصف الدولہ کے زمانے تک مسلسل قائم رہا۔ آصف الدولہ کے عہد میں جب یہ جاگیر ضبط ہو گئی تو "مچھریٹہ" سے اس خاندان کا بہت کچھ تعلق ختم ہو گیا۔ مختار الدولہ کے زمانے کے بنوائے ہوئے قلعہ کے آثار قصبہ "مچھریٹہ" کے پچھم طرف اب بھی پائے جاتے ہیں اور اسی خاندان کا بنوایا ہوا شکستہ امام باڑہ "مچھریٹہ" میں آج بھی موجود ہے۔

اودھ کے شاہی خزانے سے مدتوں اس خاندان کو حاصل جاگیر ملتے رہے لیکن سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں جب "علی نقی خان مدار الدولہ ثانی" مسند آرائے مسند وزارت ہوئے تو "مچھریٹہ" کی جاگیر سے دوبارہ ان کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا۔ یہ

کہا جا سکتا ہے کہ جاگیر کی بحالی کا معاملہ اسی لیے کھٹائی میں پڑا جیسا کہ بعد میں بادشاہ الملک تھا۔ یہ الگ قدری نوعیت تھی جیسی
کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پرگنہ "مچھریٹہ" کے بہت سے مواضعات (راجے پور وغیرہ) اس خاندان کے قبضہ و تصرف میں موجود
محکوم ہے "مستاجر و معاہدوں" کے تحت حاصل کیے گئے ہیں۔

انقلاب سن ۱۸۵۷ء سے پہلے علی نقی خاں کے خلاف جب خانۂ جہانگیری نے زور پکڑا تو صرف میں مچھر گراں کے ...
پاک رکھنے کے لیے انہیں "معشوق جز مثنوی" قرار دیا گیا بلکہ ان کا وطنی رشتہ "مچھریٹہ" سے جوڑ دیا گیا جو قطعاً خلاف واقعہ
"مچھریٹہ" گراں کی وطنیت سے دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔

مہاراجہ محمود آباد کے خاندان اور نوابین و سلاطین اودھ کے مابین قرابت داری کا آغاز نواب سعادت علی خاں ابن شجاع الدولہ (۱۷۹۸ - ۱۸۱۴ء) سے ہوا۔ مہاراجہ محمود آباد اوّل نواب یوسف علی خاں کی صاحبزادی افضل بیگم (یعنی مہاراجہ ثانی علی نقی خاں کی پھوپھی) کا نکاح نواب سعادت علی خاں "وزیر الملک" کے ساتھ ہوا اس کے بعد تقریباً کسی خاص قرابت کا پتہ نہیں چلتا۔

قرابت داری کا دوسرا دور "سلطان عالم واجد علی شاہ" کی تخت نشینی سے شروع ہوا جو مہاراجہ محمود آباد اوّل کے پوتے نواب علی خاں کی صاحبزادی نواب عالم آرا بیگم کے ساتھ شہزادگی کے زمانے میں ہوئی۔ یہ شادی تقریباً ۱۲۵۲ھ میں بعہد نصیر الدین حیدر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی۔ دولہن کو سسرال سے "نواب اعظم بہو" کا خطاب ملا۔ لیکن مشہور ہوئیں "نواب خاص محل صاحبہ" کے نام سے۔ نواب عالم آرا بیگم ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ عالم تخلص کرتی تھیں۔ ایک دیوان موسوم "بیاض عشاق" اور ایک مثنوی بنام "مثنوی عالم" ان کی یادگار ہے۔

واجد علی شاہ بہادر نے مسند آرائے حکومت ہونے کے بعد نواب عالم آرا بیگم کی موجودگی ہی میں ان کی حقیقی چچازاد بہن "نواب رونق آرا بیگم" سے رشتہ مناکحت کی خواہش کی جو مہاراجہ ثانی علی نقی خاں کی بیٹی تھیں۔ مشرقی تہذیب اور ہندوستانی رسم و رواج کے لحاظ سے ایک بہن کی موجودگی میں دوسری بہن کے ساتھ عقد مناکحت بہت ہی مکروہ بات سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ کی اس خواہش پر علی نقی خاں پس و پیش میں پڑ گئے۔ نواب عالم آرا بیگم پر بھی اس کا بہت ہی اثر ہوا۔ مگر راج ہٹ کے سامنے نہ بیگم کی کچھ چلی اور نہ علی نقی خاں کی۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں رونق آرا بیگم کے ساتھ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ نئی دولہن کو "اختر محل" کا خطاب عطا ہوا۔ پچیس لاکھ مہر قرار پایا۔ صاحب "قیصر التواریخ" کا بیان ہے۔

"ہر چند کہ حضور عالم (علی نقی خاں) کو پاس خاطر نواب مخدرۂ علیا (عالم آرا بیگم) اور بنا بر رواج ہندوستان زن ثانی بھی بہ کثرت ازدواج محرمات بہت ناگوار تھی مگر اطاعت و فرمانبرداری بادشاہ و قیام عہدۂ وزارت لازم تھا۔ علاوہ سوائے مخدرۂ علیا سب متعلقات محل اور جناب عالیہ (ملکہ کشور صاحبہ والدہ واجد علی شاہ بہادر) شریک ہو رہی تھیں۔ صاحبات محل برائے خوشنودی بادشاہ مثل خواص کام کرتی تھیں۔ بعد چند روز کے نواب مخدرۂ علیا کا ملال بھی حضور عالم (علی نقی خاں) سے رفع ہو گیا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ [illegible])

علی نقی خاں اپنے وسیع اخلاق، فطری رحم دلی، فروتنی، فراخ دلی، مروت، سیر چشمی کی وجہ سے لکھنؤ بھر میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ مذہب کی روایتی قدریں اور دینداری کے لوازم بھی پوری آب و تاب کے ساتھ ان کے یہاں پائے جاتے تھے لیکن ان کے ساتھ وہ "نرے مولوی" نہیں تھے۔ ان کے خاندان میں اس دور عیش و نشاط کی وہ تمام باتیں اپنی بھرپور رنگینیوں کے ساتھ رقصاں و جنباں تھیں، جن کی جلوہ سامانیوں سے کسی نواب یا رئیس کا گھر اس زمانے میں بھی خالی نہیں تھا۔ اس خاندان کی خداداد خوبصورتی اور حسن اس زمانے کے لکھنؤ میں مثالی سمجھا جاتا تھا اور ترنم تو اس بلا کا تھا کہ اس کے دامن میں سیکڑوں حکایات اور افسانے جنم پا گئے۔ "بیگمات اودھ" کے مصنف جناب شیخ تصدق حسین ایڈووکیٹ تحریر فرماتے ہیں:

> "مشہور ہے کہ نواب علی نقی خاں کا خاندان خوش گلوئی اور خوبصورتی کے لیے شہرہ آفاق تھا
> خود موصوف (علی نقی خان) کو موسیقی میں بہت دخل تھا۔ اسی ہم مذاقی کی وجہ سے واجد علی
> شاہ کو ان سے بہت موافقت اور مؤانست ہو گئی تھی۔"

(بیگمات اودھ صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۷)

موسیقی تو اس خاندان کے مزاج میں رچ بس چکی تھی۔ اس کے علاوہ شعر و ادب کی اعلیٰ قدروں سے بھی اس گھر کا بچہ بچہ بہرہ یاب تھا۔ خود علی نقی خاں "سید" تخلص فرماتے تھے اور لکھنؤ کے خاص رنگ میں اچھا خاصا لکھتے تھے۔ جب "قیصر باغ" کی ادبی صحبتوں کے اذکار ہی سے تاریخ و تذکرے خالی نظر آتے ہیں تو علی نقی خاں کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کہاں؟ اس تاریخی خاندان کے نوادر انقلاب سن ستاون کے بعد ہی گمنامی میں پہنچ چکے تھے۔ اب ایک صدی بعد تو شاید کچھ بھی صفحۂ عالم پر موجود نہ ہو۔ ایک چھوٹی سی کتاب "علم مجلسی" حصہ سوم مرتبہ عزیز الرحمن میر منشی قدم شریف دہلی (شائع کردہ مجیدیہ کتب خانہ کلاں دہلی) میں علی نقی خان کا صرف ایک شعر ملتا ہے ؎

قربان سادگی کے نگاہِ لطیف سے
کیا جانے آج کیا تھا سیّد خفا گیا

"الحاق اودھ" (فروری ۱۸۵۶ء) کے بعد نواب علی نقی خاں کے خلاف غداری اور انگریز دوستی کی جو داستانیں عوام میں مشہور ہوئیں، تاریخ کے واضح نقوش اس سے متفق نظر نہیں آتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "الحاق اودھ" کی جبریہ کارروائی سے نمٹنے کی ان میں ہمت نہ تھی اور نہ بحیثیت وزیر اعظم اودھ، عقل نے اس سے اتفاق کیا کہ موجودہ حالات میں انگریزوں سے نپٹنے کے لیے اودھ کی فرسودہ غیر منظم فوجی طاقت کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا جائے۔ وہ جنھیں اپنی منتشر اور کمزور فوجوں کی جنگی طاقت کا بھی اندازہ تھا اور ان سازشی کارروائیوں سے بھی بے خبر نہیں تھے جو بیلی گارد سے لے کر قیصر باغ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنگ کا انجام بھی ان کی نگاہوں میں تھا اور میسور کا زوال بھی، جھانسی کی انقلابی جنگ اور رانی لکشمی بائی کی شکست ان کے سامنے تھی اور شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کی وہ بے بسی بھی، جس نے معاہدۂ لیک (۱۸۰۳ء) کے بعد انھیں لال قلعہ دہلی میں محصور کر رکھا تھا۔ علی نقی خاں یقیناً یہ جانتے تھے کہ اودھ کی فوجی طاقت میں اتنی جان نہیں ہے کہ وہ جم کر سینہ در سینہ بھی انگریزوں کا مقابلہ کر سکے۔

تاریخی حیثیت سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ علی نقی خان نے اس معاملے میں بجز معمولی دلچسپی لی تھی کہ بادشاہ "الحاق نامہ" پر دستخط کر دیں! ہو سکتا ہے اس کے اسباب وہی ہوں جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے یا پھر اس کا تعلق ان کی خود غرضی اور سیاسی مصلحت سے ہو! لیکن کسی مستند تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انگریزوں سے اس سلسلے میں انھوں نے کوئی ساز باز کی تھی کیونکہ واجد علی شاہ کے کلکتہ روانہ ہونے کے بعد انگریزوں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ انھیں بادشاہ کے ساتھ کلکتہ جانے سے بھی روک دیا کہ ابھی ان کے دورِ وزارت کی حساب فہمی ہونا ہے؟

یہ تاریخی حقائق ایسے نہیں ہیں جنھیں سامنے رکھے بغیر ان کے مفروضہ غدارانہ کردار پر مہر تصدیق ثبت کرنا دشوار ہے۔ پھر ہم ان تاریخی حقائق کی چھان بین کے دروازے اب تحقیق و تدقیق پر بند نہیں کر سکتے ہیں جو علی نقی خان کے صحیح کردار تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ الحاق اودھ کے بعد جب معزول بادشاہ انگریزوں کے پہرے میں کلکتہ روانہ کیے گئے تو وابستگانِ دولت میں سے کچھ لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ جو لکھنؤ سے باہر نہ جا سکے انھیں دشمن نئے حکمرانوں کے جبر و تشدد کا شکار ہونا پڑا، بعد اپنوں کی بے اعتنائیاں بھی برداشت کرنا پڑیں ——— لیکن جو ذلت علی نقی خان کی بنی شاید ایسی ذلتوں کا سامنا کسی اور کو نہ کرنا پڑا ہوگا۔ علی نقی صاحب کے دورِ وزارت میں اس خاص اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے پلک جھپکتے ہی عوام ان کے منہ پر گالیاں دینے لگے ——— وہ گالیاں بھی اتنی غلیظ و گندی کہ لکھنؤ کی روایتی تہذیب سر بگریباں تھی۔ عوام اور "شہدوں" کا تو ذکر ہی کیا؟ اجر کی گئی اور اس طرح پر کہ نہ معزول بادشاہ کے ناموس کا خیال کیا گیا نہ علی نقی خان کے اس وسیع اخلاق کا جو چند روز پہلے خواص سے لے کر عوام تک سے طرح بہت برتتا تھا۔ غلط ہو یا صحیح؟ یہ "ذلیل شعر"[1] جان صاحب کے نام سے مشہور کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے زبان زد خاص و عام ہو گیا۔

"اختر محل" کو ماس دو نفی تنہ سال
ایام کی خرابی سے کتری ... گئی

علی نقی خان کی ذلت و خواری کے کئی واقعات سید کمال الدین حیدر مصنف "قیصر التواریخ" نے لکھے ہیں۔ بادشاہ کی روانگی کلکتہ کے بعد کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

> "چار دن کے بعد ایک اشتہار شہر میں لگایا گیا کہ فلاں تاریخ وہ بعد دوپہر کو تماشائے عجیب رعایائے شہر کو دکھایا جائے گا کہ کبھی کسی نے آنکھ سے نہ دیکھا ہو۔ ہر شخص کو ایک ترحش ہوا ——— آخر روز سہ شنبہ ۵ اپریل کو دولت سرائے شاہی سے پہلے سواری جناب اختر محل صاحبہ نکلی اور اس کے بعد حضور عالم (علی نقی خان) کا گاڑی دو اسپہ نواب

۱ے یہ شعر جناب شیخ تصدق حسین ایڈووکیٹ لکھنؤ مصنف "بیگمات اودھ" نے سنایا تھا۔ شیخ صاحب تاریخ اودھ کے ماہرین میں ہیں۔ ان کا خیال بھی یہی ہے کہ الحاق اودھ کی کارروائی میں جناب علی نقی خان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ (ناظم سیتاپوری)

استانہ قیصر باغ میں منزل وزارت تک سب سر ہر طرف سے بگھی گاڑی بند، چوبدار چیف کمشنر
کمپنی بخش (ایکس) پر برآمد ہوئی۔ کئی سو آدمی بھی ساتھ کمانی کے پیچھے۔ کچھ خاص بردار بے اسلحہ اور پاس
کثیف سے گرد و رشاہی سے تحسین کی تک زبان طعن و تشنیع بیابان شہر ہر طرف سے بارش
بے وقت برسا رہے تھے اگرچہ چوبدار چیف صاحب ہوتا غالب ہے کہ ڈھیلے اور پتھر بھی بجائے
اولے برستے۔ العیاذ باللہ !"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۶۸)

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ علی نقی خاں اور نواب اختر محل کی روانگی کلکتہ سے متعلق بھی "قیصر التواریخ" نے بیان کیا ہے:

"حضور عالم (علی نقی خاں) نے چیف کمشنر سے کئی مرتبہ رخصت طلب کی اور شقہ خاص بادشاہی دکھایا، منظور نہ کیا۔ آخر نواب (علی نقی خاں) نے نواب گورنر جنرل کو عرضی ارسال کی جس کا حکم باب عدم مزاحمت سفر صادر ہوا۔ بعد اجازت پھر بجانب سفر باستقرار ایمائی پر کی گئی۔ غالباً تاریخ شہر ذی قعدہ روز سہ شنبہ ۲۷ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۵ جولائی حضور عالم مع عیال و لواحقین و ملازمین و رفیقان سر فروش۔ اسٹیشن گاڑی ڈاک اسپی و بیس کرانچی بیل واسطے اسباب ضروری نقد و جنس قسم طلا و نقرہ و پشمینہ وغیرہ۔ ظروف مصروف و خادمان اناثیہ بعد نصف شب روانہ ہوئے۔

وقت روانگی یہ صورت ہوئی کہ شام سے رفقاء ملازمین در دولت پر حاضر ہوئے حضور خود مع منسوبوں کی پردگیان عصمت ہوئے۔ ایک گاڑی میں چار سواریاں زنانی جب سوار ہو چکی تھیں ایک رفیق گاڑی کی چھت پر باسلاح بیٹھا تھا بعد اس کے خود بدولت گاڑی چار اسپہ پر سوار ہوئے۔ نواب محسن الدولہ خاں بہادر اللہ دلہ بہادر بہ تقاضائے قرابت قریب ہی تا ناکہ "چار باغ" ہم پہنچے تھے۔

شہر کے شہدوں نے شام سے دروازے پر ہجوم کیا تھا۔ پچاس روپیہ مرحمت ہوئے کہ آپس میں تقسیم کر لو۔ وقت وقت سواری کے شور و غل نہ مچانا۔ کچھ منہ سے کلمات بیہودہ نہ کہنا لیکن یہ حرامی کب مانتے تھے۔ ناکہ شہر تک بانداز مشعل دیکھ پیچھے ہو رہے تھے اور شہر کے بنگلے تماشبین سر راہ کوٹھوں پر منتظر تشریف آوری تھے جب سواری نکلی شہدے کب اپنی زبان طعن و تشنیع سے باز رہ سکتے تھے۔ غرض جو خدا نے سنوایا سب نے سنا -!"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۸۹)

"انقلاب لکھنؤ" پر نہ نظم لکھے ملتے ہیں نہ نثری تصانیف۔ صرف ایک "مثنوی رشک ماہ تمام"[۱] ویسے ہی تاثرات کی آئینہ دار ہے

۱۔ "مثنوی رشک ماہ تمام" پر میرا مضمون (انقلاب لکھنؤ کی ایک گمنام مثنوی) ماہنامہ نیا دور لکھنؤ (اسپیشل نمبر) اگست ۱۹۷۵ء میں ملاحظہ ہو۔ "مثنوی رشک ماہ تمام" کا اصل مخطوطہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ (نادم سیتاپوری)

جس میں علی نقی خاں کے خلاف اسی انداز سے اظہار بیزاری کیا گیا ہے اور "الحاق اودھ" کی ذمہ داری علی نقی خاں کے سر عاید کی گئی ہے یہ مثنوی ایک غیر معروف شاعر "محمد رضا خاں عاشق" کی ہے جو کے وارد حضرت مجاہدات کے شاگرد تھے۔ مثنوی کا سبب تالیف ۱۲۷۰ھ میں ہوا اور اختتام ۱۲۷۱ھ میں۔

مثنوی نگار نے علی نقی خاں کو "عقل کل" کا خطاب دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دیا کچھ نہ سلطان نے اس کا جواب　　وہیں "عقل کل" کو بلایا شتاب
معتقد جو خدمت میں اس سے کہا　　کہا کیا تھا تم نے جواب یہ کیا؟
دیا سمجھتا تھا میں اشکر تو　　یہ منہ چاہیے۔ مرحبا مرحبا
شکایت نہیں اس میں صاحب خطا　　معتقد کا میرے فقط پیہ تھا
دیا عقل کل نے یہ سن کر جواب　　خطا اس میں کیا میں عالی جناب
نہیں اس میں کچھ ہے میرا قصور　　یقین آپ جانیں اسے اے حضور
میں جانتا تھا مجھ کو کیا آفتاب　　میں قدوہ تھا مجرا کر بایا اسحاب
کروں مختصر عرض گرچہ ہے طول　　کہ ادنیٰ ہے میری شہا اقبال
کروں اب ذرہ "اوزم" کا سوال　　مناسب نہیں اس میں کچھ قیل و قال
یہی ہے مناسب سمجھتا ہوں غور　　نظر آتے ہیں اس میں کچھ بے طور
اگرچہ بظاہر ہیں صورت بری　　کرو "غور" اس میں ہے مطلب بھری

لیکن "مصر الحاق" پر مہر ثبت کرنے کی ذمہ داری واجد علی شاہ نے علی نقی خاں پر عاید نہیں کی ہے بلکہ انہیں مجبور و بے بس ہی قرار دیا ہے "مثنوی "حزن اختر" میں واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

جو وہ "ڈلہوزی" اس وقت تھے　　منادی انھوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے　　تمھاری ریاست بے انتظام ہے
رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ　　فقط ہم کے تم رہو بادشاہ
مہینہ ہر اک لاکھ دیں گے کا　　لے کا تمہیں کچھ نہیں شک ذرا

علی نقی خاں جو تھے وزیر　　وہی میرے ہر حال میں تھے مشیر
مرے دل میں آتا تھا ہر دم خیال　　جو ہونا تھا وہ ہو چکا یا ملال
کرو غور کم راضی تم پر اب　　گئی سلطنت ہو گئی بے سبب
کہ سلطنت نے چھوڑا ہے　　دیا یا دیا جھنجھٹا بے

رعایا یہ سب کہتی تھی واہ واہ کیا ہم کو اس بادشہ نے تباہ
یہ جلسے جو فرہاد کو خوب ہے یہ عاشق جو راضی ہو معیوب ہے
علی نقی خاں کو دکھلا دیا کہ سب آب طعنہ میں نہلا دیا

(مثنوی "حزن اختر" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۲ء، صفحہ ۲۸-۲۷)

کیوں ——— ؟

علی نقی خاں کے خلاف اودھ کی وسعت عامہ کے اس شدید ہیجان منافرت کا تعلق نہ تو اودھ کا مسئلہ الحاق تھا اور نہ شاہ اودھ کے ساتھ علی نقی خاں کی غداری ——— اس کا صحیح "پس منظر" حقیقتاً کچھ اور ہی تھا جسے "عہد وزمان" کی قربت نے کچھ اس طرح دھندلا کر دیا کہ علی نقی خاں کی مخالفت کے اصل سبب کو تو عوام نے بھلا دیا اور "افسانوی پروپیگنڈہ" ان کے سارے کردار پر چھا گیا۔

علی نقی خاں کے خلاف منافرت کا جذبہ دراصل "الحاق اودھ" سے چند ماہ پیشتر اس وقت پیدا ہوا تھا جب "ہنومان گڑھی" کی "بابری مسجد" کا ہنگامہ اودھ میں پہلے "ہندو مسلمان تنازعے" کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ ہنگامہ اوّل سے آخر تک انگریز سازش کاروں کی سامراجی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا جو بنگال اور میسور میں اپنے قدم جما لینے کے بعد للچائی ہوئی نگاہوں سے لال قلعہ اور قیصر باغ کو دیکھ رہے تھے۔ اس شرمناک سازش کو پروان چڑھانے کے لیے انگریزوں نے کس طرح جال پھیلائے تھے؟ اس کی تفصیلات اس عہد کی تاریخوں میں نہیں ملتیں۔ تاریخ ہمیں صرف اسی قدر بتا سکی کہ "بابری مسجد" میں نماز جمعہ کے وقت ہندو بیراگیوں کے ایک ہجوم غفیر نے نمازیوں پر حملہ کر دیا اور "کپتان آر" اور "جان ہرسی" کی نگاہوں کے سامنے ۲۶۹ مسلمان نہایت بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کر دیے حالانکہ یہ دونوں انگریز اس ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے اودھیا بھیجے گئے تھے۔ مسلمانوں کے اس قتل عام کے ساتھ کلام مجید کی بے حرمتی ہوئی اور مسجد مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی ——

یہ قتل عام معمولی سانحہ نہیں تھا جس پر مسلمانوں میں ہیجان پیدا نہ ہوتا؟ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا ایجی ٹیشن شروع ہو گیا جس کی رہبری "سید امیر علی شاہ" کر رہے تھے جو ایک ذی اثر بزرگ تھے۔ کچھ لوگوں نے آئینی راستہ اختیار کیا۔ بادشاہ کے باب انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کچھ لوگوں نے "جہاد" کا نعرہ بلند کیا؟ جہادی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی ایک اجتماعی طاقت حکومت کی مدد کے بغیر بابری مسجد واپس لے لے۔ اس جہادی جماعت کے میر قافلہ یہی سید امیر علی شاہ تھے جن کا نام بعض لوگوں نے سید امیر الدین علی شاہ بھی لکھا ہے۔

ایک طرف تو آئینی اور دستوری تحقیقات جاری تھیں، دوسری طرف امیر علی شاہ کے نعرۂ جہاد نے مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت ان کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا۔ بادشاہ اودھ کی بے بسی کا حال یہ تھا کہ وہ کوئی فیصلہ "ریذیڈنسی" کے ایما کے خلاف کر نہیں سکتے تھے۔ جب بادشاہ کی یہ بے بسی تھی تو ظاہر ہے کہ علی نقی خاں ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت کس طرح کر سکتے تھے؟

"قیصر التواریخ" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے دربار میں انگریزوں کے سازش کاروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ بادشاہ اور وزیر اعظم علی نقی خاں تو محض برائے نام ہی تھے۔ یہ لوگ جو کچھ چاہتے تھے وہی ہوتا تھا۔ چنانچہ "قیصر التواریخ" کی یہ چند سطور اسی احوال کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

"ادھر جب یہ جھگڑا اسی ہنگامہ میں تھا ایک دن کپتان جیمز صاحب نے معرفت اقتدار متوسطہ شاہی سے کہا کہ تم ہمارا پیام بادشاہ وزیر سے جا کر کہدو۔ اہل بروشاہی سید جب یہ تبلیغ صاحب کی لایا ہمیں وسیلہ تے ہیں حسب الحکم شاہی بعض مولوی گلاب ذکر مانع ہوئے اور مسٹر کپتان بارلو صاحب کی ضمانت سے دردولت پر حاضر ہوئے۔ حضور عالم (علی نقی خان) نے انھیں اپنا مہمان کیا۔ آخر بے خبر اور کوتاہ اندیشوں نے "بہ طمع دُنیا" اپنا کام کیا اور انھیں بسلامت سرکار سے رخصت کر دیا اور بنا بر اپنے بچاؤ کی باتیں اول ذہن نشین کر بادشاہ سے بہ اتفاق ہمزبان ہو کر عرض کیا اور پرچہ پیام مشروحہ مارینہ ڈینٹ کو بھیجا کہ بنائے مسجد ہنومان گڑھی میں کسی طرح ثابت و تحقیق نہیں ہوتی .... حسب الحکم سوار پانچ ضرب توپ فتح جنگ و نجیب مع افسران اہل اسلام و کپتان بارلو صاحب و حاجی مفاعلین علی گیہان شاہی (شاہی ملازم) گلابی پر سب روانہ ہوئے جس وقت کہ کوچ کر ... مولوی صاحب (سید امیر علی شاہ) کو آگے بڑھنے نہ دیا اور ریذیڈنٹ سے متواتر پرچہ و پیام آنے لگے کہ جلد انسداد اس فتنہ کا کرو اور مرضیوں اور چاپلوس خدمتوں نے بادشاہ سے نسبت خلاف مولوی صاحب (سید امیر علی شاہ) کی باتیں اپنے بچاؤ کی بنا بنا کے کہنی شروع کیں۔ ادھر حضور عالم (علی نقی خان) سے خائف تھے اور مشتق تھے اور "جیب طمع" بھر چکے تھے پھر کیونکر صاف صاف خدا سے ڈر کر عرض کرتے۔ غرض چند روز تک مولوی صاحب (سید امیر علی شاہ) وہیں (شاہی ملازم) رہے اس عرصہ میں مولوی جو مستعد تھے بلکہ جہاد فرما ہوئے تھے حسب الحکم "حضور عالم" مشتق ہو کر فہمائش کرنے چلا کہ مجاہدین کو مرتد کریں اور مسجد عیدگاہ میں گول مول باتیں خوف حاکم وقت اور خوف جان و آبرو از راہ موعظہ بیان کیں —— جاہل یہ سن کر سب کے سب بولے کہ واہ مولویو تم سب اہل دُنیا ہو۔ کل تم نے ہم کو آمادہ جہاد کیا تھا اب حاکم وقت کے بہکانے سے ہمیں مرتد کرتے ہو اب ہمیں فریب نہ دو۔ یہ فضیلت اہل دُنیا جاہلوں کے ہاتھ سے جاتی رہے گی — یہ سن کر مولوی ڈر کر پیچھے چلے آئے۔"

(قیصر التواریخ جلد دوم صفحات ۱۲۲-۱۲۳)

مجاہدین کا جذبۂ جہاد بجائے سرد ہونے کے ان باتوں سے تیز تر ہو گیا اور جہادیوں کی ایک بڑی تعداد سید امیر علی شاہ کی سرکردگی میں اجودھیا کی طرف بڑھنے لگی۔

فتنہ و فساد کی روک تھام کے بہانے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سدا کی عادت مجاہدین کے قتل عام پر کمر بستہ تھی جس کے ساتھ شاہ اودھ کی فوجیں بھی "کپتان بارلو" کے حکم کی منتظر تھیں چنانچہ جب مختصر جہادی "جاٹ گنج" سے "ردولی" کی طرف بڑھے تو شاہی فوج اور

ریزوں کی کئی کمپنیاں "کپتان بارلو" کی معیت میں ان پر ٹوٹ پڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں مسلمان خاک و خوں میں لوٹنے لگے۔
یا امیر علی شاہ بھی معہ جماعت شہید کیے گئے اور مقتول مجاہدین کی تعداد تو ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ لاتعداد معاصر "سلیمن"
ے دورے کی رپورٹ اور بادشاہ اودھ کے خلاف بدنظمی کی طویل فہرست کے بعد۔ انگریزوں کے سیاسی ترکش کا یہ آخری تیر تھا جو کل
لنے پر جاکر بیٹھا۔ شروع تو اس کا باوا واسطہ سلطنت اودھ کے خلاف تھا لیکن سازش کاروں اور مفاد پرستوں نے دھر لیا علی نقی خاں
جن پر بحیثیت وزیر اعظم بہرحال کچھ نہ کچھ ذمہ داری تو عاید ہوتی ہی تھی ——

اور یہی تھی اصل "بنائے مخاصمت" علی نقی خاں کے خلاف! چنانچہ چھ مہینے کے بعد ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو جب الحاق
دھ کی کارروائی کا حکم ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری علی نقی خاں کے سر عاید کر کے انھیں ہدف ملامت بنا لیا گیا۔

اجودھیا کا دردناک المیہ اور سید امیر علی شاہ کی شہادت کا واقعہ جولائی ۱۸۵۵ء میں ظہور پذیر ہوا اور الحاق اودھ
ے محضر پر شاہی مہر ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو ثبت کی گئی۔ چھ مہینے کے اس مختصر عرصے میں علی نقی خاں کے خلاف مسلمانوں کا متحدہ
اذ برابر کام کرتا رہا۔ عام مسلمانوں کے دل و دماغ ان سانحات سے اتنا متاثر تھے کہ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف جنگ
ادی کا آغاز ہوا اور مولوی احمد اللہ شاہ لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے مسلم عوام میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے انھیں دردناک واقعات
ہارا لے کر فضا بنانے کی کوشش کی۔ لکھنؤ کی جنگ آزادی کے سلسلے میں کسی مورخ نے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کا اشارہ
ی عہد کے ایک اخبار "طلسم" لکھنؤ میں ملتا ہے۔

> "وہ جو احمد اللہ شاہ گھسیاری منڈی میں مقیم ہیں جو چاہتے ہیں زبان پر لاتے ہیں۔ بے خوف ہیں
> ہیں۔ بہت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ ملکی باتوں کی بھی چرچا رہتی ہے۔ اکثر "مولوی امیر الدین
> علی صاحب" مغفور کا ماجرا یاد کرتے ہیں۔ ہوتا کچھ نہیں زبانی جد و جہاد کرتے ہیں۔ ۔ ۔"
>
> (بحوالہ نیا دور لکھنؤ اسپیشل نمبر اگست ۱۹۵۷ء)

علی نقی خاں کی اصل مخالفت کا سبب حقیقتاً "اجودھیا" کا المیہ اور سید امیر علی شاہ کا سانحہ قتل تھا۔ ان کا مفروضہ غدارانہ کردار
——— اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ مطبوعہ ہجویہ مثنوی ہے جو حال ہی میں مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ سید امیر علی شاہ کے المیہ کے بعد اس سانحہ
ے متعلق بہت سی نظمیں اور قطعات کہے گئے تھے جن کا مجملاً ذکر "قیصر التواریخ" نے بھی کیا ہے ———

> "مادۂ تاریخ اور قصاید منظوم اس معرکے (معرکۂ اجودھیا) کے بہت سے کہے گئے جو
> جلد سارے ہندوستان میں مشتہر ہوئے —"
>
> (قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۲۸)

مثنوی "ترجیع المشتقی فی احوال التقی" انھیں میں سے ایک ہے جس میں علی نقی خاں پر یہی الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے انگریزوں
سے ساز باز کر کے سید امیر علی شاہ کو قتل کرا دیا۔ اٹھارہ صفحات کی یہ مثنوی "مطبع اسلامی محمد اسلام خان" میں چھپی تھی لیکن اس سے
یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ مثنوی کس کی کہی ہوئی ہے؟ کس سن میں چھپی؟ اور یہ مطبع اسلامی لکھنؤ میں تھا یا لکھنؤ سے باہر؟

ابھی تک مجھے پتہ نہ چل سکا کہ موجودہ مطبوعہ مثنوی کا یہ منفرد نسخہ ہے۔ البتہ اس مثنوی کی ایک نقل محب محترم پروفیسر سید مسعود حسن ادیب کے کتب خانہ میں ضرور موجود ہے جس میں کچھ ایسی تصحیحات بھی درج ہیں جو اس سے قبل میری نظر سے نہیں گزریں۔ مثنوی کی یہ نقل نواب ذکی علی خاں اشفق لکھنوی کے توسط سے پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کو پہنچی ہے۔ یہ مثنوی کوئی قدیم مخطوطہ نہیں ہے بلکہ کسی مطبوعہ نسخے سے ۱۹۳۰ء میں نقل کی گئی ہے۔ ابتدا میں اشفق مرحوم کی ایک قلمی یادداشت بھی شامل ہے جو من وعن درج ذیل کی جاتی ہے:

"یہ نقل ہم نے مرزا محمد عسکری تخلص متمم شاگرد فصاحت صاحب (ساکن رستم نگر) سے کی ہے۔ معلوم ہوا مرزا محمد عسکری صاحب سے کہ یہ مثنوی مولوی نعمت اللہ صاحب لکھنوی کی تصنیف ہے اس کی تصدیق فرزند علی خاں ہیڈ پنڈت "اڈیٹر پنچ" ساکن پل غلام حسین لکھنؤ نے کی تھی۔ فرزند علی خاں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ مثنوی چھاپی گئی تھی مطبع کا اصلی نام نہ تھا۔ بلکہ یہ لکھا تھا کہ "در مطبع گمنام طبع شد" چنانچہ علی نقی خاں نے بہت کوشش کی لیکن کسی مطبع میں اس کے طبع ہونے کا پتہ نہ ملا! یہ بھی فرزند علی خاں نے لکھا تھا کہ مطبوعہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ مطبوعہ نسخہ جامع میں ایک نسخہ حضرت واجد علی شاہ کے سرہانے اور ایک نسخہ علی نقی خاں کے قلمدان میں ——— اور ایک نسخہ علی نقی خاں کی زوجہ کے پاندان کے نیچے کسی نے کسی طرح پہنچوا دیا تھا تا کہ یہ لوگ خود بھی پڑھیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کو خود پڑھا یا کسی سے پڑھوایا۔ بہرحال اس تصنیف کے حالات سے وہ لوگ کافی طور پر مطلع ہو گئے تھے۔ اسی بنا پر علی نقی خاں نے جمعدار میں تحقیقات کرائی تھی۔ جس کتاب سے متمم صاحب نے نقل کی تھی۔ وہ قلمی نسخہ تھا اور صرف اسی قدر تھا جتنی یہ تحریر ہے جس نے بلحاظ صحت خود لکھا ہے اور جو کچھ تھا بھی قابل اصلاح ہے۔ نقطہ نقطہ مطابق ہے اور ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ تقریباً اصل کتاب قلمی میں موجود نہ تھی جو نقل سے ہم لکھتے ———۔"

اشفق عفی عنہ - ۳۰ اپریل ۱۹۳۰ء

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرزند علی خاں کے پاس جو مطبوعہ نسخہ تھا اس پر "در مطبع گمنام طبع شد" چھپا ہوا تھا میرے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے اس پر "مطبع اسلامی" چھپا ہوا ہے! ہو سکتا ہے کہ اس مثنوی کے کئی اور ایڈیشن بھی چھپے ہوں۔ "مطبع اسلامی" نام کے کسی پریس کا عہد شاہی میں پتہ نہیں چلتا!

اس مثنوی کے سن تصنیف یا سن اشاعت کا پتہ نہیں چلتا لیکن یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی "الحاق اودھ" (فروری ۱۸۵۶ء) سے پہلے اور ممکن ہے جلا وطنی کے بعد (جولائی ۱۸۵۵ء) چھ ماہ کے اندر شائع ہو چکی تھی۔ اس بات کی تصدیق

---

۱۵ نواب ذکی علی خاں اشفق لکھنؤ کے ... میں رہتے تھے۔ ایک مذہبی اخبار "تحفہ" کے نام سے نکالتے تھے۔ بیس پچیس سال ہوئے جب انتقال کیا

۱۶ یکم مئی ۱۸۸۰ء کو یہ ہفتہ وار اخبار فرزند علی خاں کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلا تھا۔ (غلام میر ...)

اتنی کی ان تفصیلات سے بھی ہوتی ہے کہ مطبوعہ نسخے واجد علی شاہ، علی نقی خاں اور ان کی حکیم تک پہنچا دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مزید مثنوی الحاق اودھ کے بعد چھپی ہوتی تو اس میں "الحاق اودھ" کے واقعہ کو کسی طرح پر نظر انداز نہ کیا جاتا ——— بلکہ علی نقی خاں کے خلاف وہ تمام پروپیگنڈہ اس مثنوی میں ضرور موجود ہوتا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

مثنوی نگار مولوی لطف اللہ لکھنوی کا بحیثیت شاعر کیا درجہ تھا؟ کس کے شاگرد تھے؟ ان تمام تفصیلات سے لاعلمی کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنی اعتبار سے اس ہجویہ مثنوی میں کوئی خاص سقم نظر نہیں آتا۔ جو بھی ابتذال اور صد درجہ سوقیانہ پن ہے اس زمانے کی ہجویہ شاعری کا وہ تقاضہ کمال سمجھا جاتا تھا پھر جیسا کہ مثنوی کے نام سے ظاہر ہے یہ ہجویہ مثنوی کہی بھی اسی لیے گئی تھی کہ علی نقی خاں کے خلاف جی بھر کے دل کا بخار نکالا جائے اور ان کی عزت و ناموس کو رسوا اور ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔

مثنوی اچھی خاصی طویل ہے لیکن کچھ زیادہ اختصار و انتخاب اس لیے ممکن نہیں کہ اس سے صحیح پس منظر کی پردہ کشائی نہ ہو سکے گی اور یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید ان اجزا کو نظر انداز کر دیا گیا جو اصل موضوع کے خلاف ایسے حقائق پر روشنی پڑتی تھی جو ایودھیا کے سانحے اور امیر علی شاہ کے المیہ کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔

صرف حمد و نعت کے چند اشعار حذف کر دیے گئے ہیں جس سے نفس مقصد پر کوئی حرف نہیں آتا
مثنوی مندرجہ ذیل چھ ابواب پر تقسیم ہے۔

۱۔ حمد۔

۲۔ نعت سرور کائنات۔

۳۔ آغاز مثنوی و شروع خطاب بہ نواب شفیق۔

۴۔ اگر چہ نتواند پسر تمام کند

۵۔ بیان شہادت امیر الشہید بسبب شقاوت الوزیر الا مید۔

۶۔ تقریظ

کل اشعار کی تعداد دو سو بیالیس [۲۴۲] ہے جن میں بہت سے اشعار فارسی کے ہیں۔ حمد و نعت تمام تر فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہیں تسلسل کے ساتھ فارسی کے بہت سے اشعار کھپائے گئے ہیں۔

حمد و نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بنام خداوند فرد الحمید　　　پدید آورد ہر چہ شد ناپدید
گہے از یزیدے پدید آورد　　　حسینے پئے آن یزید آورد
گہے تازہ فرعون پیدا کند　　　بر موسیٰ نو ہویدا کند
خدائے کہ در عرصۂ امتحان　　　برو تیغ عشق سر دوستان
. . . .　　　. . . . .

خدائے توانا خدائے قدیر | خدائے سمیع و خدائے بصیر
خداوند جسم و خداوند جان | خداوند فرماندهٔ حکمران

پس از حمد حق است نعت رسول | شود تا کلامم قرین قبول
امام رسل خاتم الانبیاء | شہ ہر دو عالم وزیر خدا
رسول امم پیشوائے سبل | حبیب خدا باعث جزو کل
زہے عبد مقبول خاص خدا | کزان بندگی شد خدا دنیا
رسولیکہ قرآن اعجاز اوست | امینیکہ جبریل ہمراز اوست

. . . .

پس از حمد و نعت خدا و نبی | سرود چند شعر است این مثنوی
پئے نذر نواب صاحب حشم | من این نامہ نغز کردم رقم
بود تا بود آسمان برقرار | مر این نامہ نواب را یادگار
من این نظم کردم بہ اردو زبان | کہ خطش بود سہل بر ہمگنان
ہر آنکس کہ وردش کند صبح و شام | شود بر تنش نار دوزخ حرام

"آغاز مثنوی و شروع خطاب بہ نواب شقی" کا عنوان دراصل اس کے نام "علی نقی" سے تعلق رکھتا ہے جس میں مثنوی نگار نے بصد معذرت کے ساتھ اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ "علی اور نقی" کے پاک ناموں کا کوئی اثر علی نقی خان کے کردار پر نہیں پڑا۔ بلکہ اس سے انکار کیا گیا ہے کہ ایسے شخص کا نام "علی نقی" ہو ہی نہیں سکتا۔

اے او ہنوماں ستمگر شقی | ترا نام کب ہے علی نقی
ہنوماں کے نطفۂ ناتمام | علی اور نقی سے تجھے کیا ہے کام
سگے نام پر ان کے وہ اپنا نام | کہ ہے نام بھی موجب احترام
یہ لائق ہے اس کو کہ دینا لبے | وہ ایسے لقب کا سزاوار ہے
مگر تجھ کو اے کافر بے حیا | ایسوں کے اسما سے ہے کام کیا؟
خدا کا تو دشمن ہے اے لعیں | اسد کا کب تجھ کو ہوگا یقیں
اسے تو تو مردود شیطان ہے | بڑا دشمن دین و ایمان ہے
شقاوت سے تیری مگر اے شقی | کتاب خدا کی اہانت ہوئی
ہوا غلبۂ کفر جو کہ میاں | کہ آگاہ ہے اس سے سارا جہاں

دعا یا کسی نے سنا تھا کبھی　　ہوا تھا نہ ایسا نہ ہوگا کبھی
کتاب خدا اہلبیت نبیؐ　　یہ دو چیزیں ایماں تھے کل اے شقی
بجز جفا اے قوم جہول　　ہوئی اوّلاً قتل آلِ رسولؐ
جز مکر نے تیرے پئے حُبِّ جاہ　　کیا قتل آلِ رسالت پناہ
فقط ایک باقی جو قرآن تھا　　اہانت کا اوس کی تو باعث ہوا

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

اے یادگار یزید پلید　　ارے ابن ملجم کے خلف الرشید
ارے او حرامی ارے او شقی　　ارے او منافق ارے لعنتی
ذرا کچھ تو شرما تو اے نابکار　　خدا کی ہے لعنت دل تجھ کو مار
یہ بے شرم کی جا کہ مانتے ہیں　　ہمارا ہے اور ان سکھوں لعین
کریں گے کی اپنے تائید سب　　نہ ہو پاس دیں تجھ کو کچھ بے غضب
کہ ہندوؤں سے جو ہوتا ہے فخر　　جن نے تجھے کر دیا کور و کر
اے عبد دنیا ارے بے حیا　　نہ آیا تجھے کچھ بھی خوف خدا
باعلان کہتے ہیں سب اہل دین　　لیا مول نواب کا ہم نے دیں
ارے بے خبر تو نے یہ کیا کیا　　کہ دنیا کے بدلے میں دیں کھو دیا
ملے گول احمق اے کور خر　　ارے دشمن دیں ارے بے خبر
ملے نطفہ ہندی بت پرست　　بنائی بہت دین کی تو نے پست
منتروں نے شے کر دیے شکر　　کیا رام تجھ کو ارے بد شعار
ہوئی جبکہ توہین دیں اس قدر　　اور اوس پر بھی تو نے نہ لی کچھ خبر
مسلمانوں کو تب ہوا ناگزیر　　کہ جوں متفق سب صغیر و کبیر
زبس ظلم کرنا تھا ان کو شاق　　کیا اہل اسلام نے اتفاق

؎ ۱ حاشیہ مثنوی (نسخہ دیوان رام پور) ص ۴۲ - ۱۲

بیان شہادت امیر الشہید بسبب شقاوت الوزیر المرید

امیر علی سنیوں کے امام — ہمہ غیرت دیں آمادہ بر صمصام
عجب مرد جرار و کرار تھے — شہامت میں عالم کے سردار تھے
خیال ان کو آیا نہ کچھ جان کا — فقط پاس تھا اپنے ایمان کا
ہوئے سنتے آگرہ میں اہتمام — کریں جا کے بت خانوں کا انہدام
بنا مسجد منہدم کو کریں — مٹا کفر و کفار کو اس سے دیں
اذان و تکبیر جو بند تھا — بجے خوب ڈنکا وہاں دین کا
سروں کو ہنودوں کے پامال کر — بھریں خوب سا اون سے قبر ستر
مدد سے جو ان کے ہزار آفریں — خدا نے کیا ان کو سردار دیں
نہ کی کوتاہی دین کے کام میں — کہ خود مر مٹے اس سرانجام میں
مگر تھا جو قسمت میں ان کا لکھا — شہادت وہ نہیں تجھ کو منت ملا
ہزاروں مسلمانوں کے قتل پر — کمر باندھ لی تو نے اے بد گہر
نہ کی جنگ جب تک تھے سب یکجا — دغا کی دغا کی۔ دغا کی دغا
مسافر وہاں پر سر راہ تھے — تری اس دغا سے سب آگاہ تھے
وہ وعدہ تیسرا جو تھے بارہ — گرانی کا تجھ حسد کا عدہ
جو راہ میں اس نے دھوکا کیا — کہ غفلت میں توپوں سے اڑوا دیا
نہ تھا ایک جا لشکر اہل دیں — کوئی تھا کہیں اور کوئی کہیں
فقط چند تھے گرد و پیش امام — صف جنگ میں صرف آئے وہ تمام
جو ہوتے وہ سب مجتمع ایک جا — تو پھر "بارلو" کر چکے تھے برا
فقط سات سو تھے یہ سب ملے — کہ سب برق سان توپ پر جا چکے
مقابل ہوئے جب وہ کفار سے — لیا چھین توپوں کو تلوار سے
دلیران دیں حمد آور ہوئے — وہ بیکار توپ سب وہ فدا ہو گئے
ہوا اس سے فوج مقہور کا — تقابل تھا ظلمت و نور کا

چلے عدو توپوں پہ تلوار سے   آڑائے دھوئیں فوج کفار نے
وہ تھا غلغلہ جب کہ تکبیر کا   تو منہ پھر گیا قوم بے پیر کا
جدھر رخ چھٹ گئے فوج کفار کے   نہ ٹھہرا کوئی منہ پہ تلوار کے
سنو جس طرف شور تھا بھاگ بھاگ   نہ سیلاب ٹھہرا چلی جب یہ آگ
جلے وہ چلے تھے جو تیغوں سے بھاگ   ہوئی آب تلوار کی اون کو آگ
وہ دریا سے اٹھی تھی فوج زوال   یہ تیغیں نہیں ماہی بحر گراں
وہ نیزے وہ شمشیریں اور وہ خدنگ   یہ سب بن گئے بحر خوں کے نہنگ
چمکتی تھیں واں جتنی تیغ و سناں   گراتی تھیں کفار پر بجلیاں
کیا غازیوں نے جو دھاوا وہاں   فلک نے کہا الاماں الاماں
یہ تھا دبدبہ فوج اسلام کا   کہ دم بند تھا رستم و سام کا
تیغے[1] چند سے گو ہوئی کارزار   مگر سب معینوں کا تھا کارزار
جو تھے کافروں میں نجیب شاہ جنگ   ہوا عرصہ زندگی اون پہ تنگ
بہ شمشیر و خنجر بہ تیر و تبر   شد از کار بسیار را پا و سر
بسہم جگر دوز و گرز گراں   یکے کشتہ بیجاں یکے نیم جاں
چو چار آئینہ پوش کال یکقلم   بہ تیغ دو دم رفتہ سوئے عدم
بسے پہلواناں لشکر شکن   گریزاں شدہ از نہیب بزن
چو دادند جنبش گراں گرز را   بجاں لرزہ افتاد البرز را
بہ تیغ صفاہاں صف شکاف   کہ از فرق بشگافتہ تا بناف
بسا زخم دادہ بہ خنجر بدست   کہ از دست او رفت بسیار دست
ز دود سیہ شد نمودار تیغ   چو برق درخشندہ از تیرہ میغ
بہ تیغ دلیراں بہنگام جنگ   شدہ ماہیاں جملہ توپ و تفنگ
ز مشدہ عجب چیستاں نعرہ ہا   کہ گوش فلک کر شدی بر صدا
بپا گشتہ ہنگامہ رستخیز   نہ جائے فرار و نہ پائے گریز
ہوئے اس قدر کشتہ پیر و جواں   کہ بہنے لگیں خون کی ندیاں

۱۔ تیغ چند۔

ہوا دس محرم کو جب گیا بارلو　　ہوئی جوش میں جنگ شدید ہو
زمیں جوش میں تھا وہ طوفان اوں　　ہٹے فوج سب کافروں زبوں
غرض سیکڑوں وہاں پہنچے تھے　　پئے واصل دوزخ شیاطین
لیا مجھی توپوں کو اک وار میں　　پڑا تہلکہ فوج کفار میں
وہ لشکر وہاں سے فراری ہوا　　جب خوف اسلام طاری ہوا
وہ سب بھاگ نکلے فرار میں　　پڑا فرق جسد و بکشیر میں
وہ توپیں رہیں اور ڈنکے رہے　　وہ بندوق تلوار ترکش رہے
نیا مرد جنگ بس دوران رزمگاہ　　کہ آئے یہ پیش یلان آور
امام زمان میسر امیر علی　　کہ تھے شیخ اناس حق کے ولی
دلیران عالم کے سردار تھے　　وہ کھینچے ہوئے سر میں تلوار تھے
کئی کٹنے تھے وہاں بڑے بہادر　　یہ بیٹے مرتضیٰ اصغر بہادر
اگر چاہتے جو بچا کر سے　　نہ موڑ دیہان منہ کو کفار سے
کھلے تھے یہ در جنت تمام　　ہے تحت السیوف کہ دار السلام
دلیروں نے جس وقت حملہ کیا　　تفنگوں سے نصیحت سے بھگت دیا
تفنگوں سے لی جبکہ ماہ وار　　تو پھر بار لو نے بلائی گمار
ہوئے جنگ تب ہزاروں گروہ　　لگی بجنے ہر سمت سے مار مار
مسیحوں نے مل کر کے زخمہ کیا　　انہیں زور پر ہاتھ سے دھرلیا
عقب سے فی توپیں لا کر وہاں　　لگے بچے برسنے پھر ابر سان
کہا آخر کار دون کو شہید　　منظر پھر کہ ان سے نجات یزید
ترے ظلم سے ظالم رو سیاہ　　ہوئے قتل کیا سیکڑوں بیگناہ
ہوا بار و شمر اور تو یزید　　امیر علی چون حسین شہید
کہا تو تو اے کافر بدیقین　　مسلمان کہتا تھا اپنے تئیں
یہ کیسا مسلمان ہے تو اے شقی　　کہ اسلام کی تجھ سے ذلت ہوئی
یہ کا یہ کفر اور یہ دعوائے دین　　ہزار آفریں صد ہزار آفریں
مگر . . . اصلی ہے تونے جیا　　کہ ہے اپنی ہی ذبح کر مارا
یہی تھا گر اسلام کا مقتضا　　یزید لعین بھی مسلمان تھا

ارے دشمنِ دین اے بد نہاد ‏ ‏ بلا شک ہے تو ابنِ ابنِ زیاد
نہیں تجھ کو ہرگز اگر پاسِ دین ‏ ‏ تو کچھ دل میں خوفِ خدا بھی نہیں
ضلالت اسی کی تھی کیا مقتضی ‏ ‏ کہ ہو مستفیضوں کی گردن زنی
وہ بے دین و غافل ترا بادشاہ ‏ ‏ تو اس کا وزیرِ ضلالت پناہ
وزیر جیسے شہریار سے چناں ‏ ‏ جہاں چوں نگینہ ترا ہے چناں
وزارت کے لائق تو ہرگز نہ تھا ‏ ‏ مگر تھی تری جورو کو بھڑوے دعا
کہ اس سال زادی نے او بد شعار ‏ ‏ زنا سے جنیں بیٹیاں بے شمار
بہت آپ کو گو کہ رسوا کیا ‏ ‏ ولیکن ترے حق میں اچھا کیا
وہ سب بیٹیاں کام آئیں ترے ‏ ‏ رئیسوں امیروں کو ڈولے دیے
کئی اودھ میں بھی نذر شاہ اودھ ‏ ‏ وزارت ملی تجھ کو بے جد و کد
بدولت . . . کے اے بے ہنر ‏ ‏ کیا تو نے حاصل یہ سب مال و زر
جو آخر عمل جب ہے منظور شاہ ‏ ‏ ستارہ ترقی پہ ہے سال و ماہ
تکبر تجھے کیوں نہ ہو جاہ کا ‏ ‏ کہ سسرا ہے واجد علی شاہ کا
میں قرباں اس جاہ و حرمت کے ‏ ‏ وزارت تصدق میں ہے . . . کے
بہت تو نے تدبیر معقول کی ‏ ‏ کہ بیٹی کو دے کر وزارت یہ لی
اب اک اور دے ریزۂ جنس کو ‏ ‏ کہ جس میں وزارت کو جنبش نہ ہو
ہوئی جب سے تجھ کو وزارت نصیب ‏ ‏ ترا حال ہے کچھ عجیب و غریب
دیا یا تجھے ایک دم ہوش ہیں ‏ ‏ یہ با رات دن خوابِ خرگوش میں
نہ خوفِ خدا ہے نہ پروائے دین ‏ ‏ نہ دنیا کی ذلت کا پاس اے لعین
مگر تو ہے سرگرم صبح و مسا ‏ ‏ اطاعت میں جورو کی اس سے سوا
اور اوس کا بیاں کیا ہو جو حال ہے ‏ ‏ کہ سارے جہاں کی بد افعال ہے
کسی سے نہیں اوس کا جوڑا ہے جی ‏ ‏ نہ تسکین ہوا تیری گر ارد لی
تھیں فیل و خر بھی اسے یاد بس ‏ ‏ تو بچے وہ اون سب کو مانند خس
مگر کیا دلیری و جرأت ہے واہ ‏ ‏ کہ ان سب . . . نکلی نہ آہ
کس طرح اس میں ذہن رہے شک ‏ ‏ کہ ہے اوس کو بیانی آتشک
فسانہ گلی کا شاید ہوا تھا گزر ‏ ‏ کہ باقی ہے اوس کا ابھی تک اثر

کہیں جھکڑ قیصر کی ہوئی　　کہ خالق پہ قیصر کی ہوئی
زمانے میں حالت یہ مشہور ہے　　کہ اک... میاں اس سے کیا کام ہے
جب اُلفتی ہے ناسور یا مسکے چل　　وہ جب بے چین ہو کر ہواتی تھی عقل
جب ہے ڈاکٹر بیاں خائف حسین　　علاج اوس سے کیا جات یا حسین
ہوا ڈاکٹر کا یہ احسان ہوا　　کہ مرہم نہ زخم پنہاں ہوا
وہ بیتاب ہونے سے بس بچ گئی　　جو ناسور میں اوس کے بچ گئی
سر اوسکی شرم و دستے تعقبان　　کہ قائم - ہمشہ اسی ہے جگر کیا
ہیں آگاہ اس سے سبھی خلق عام　　کہ ہے گھر میں تیرا وہ تمام
خود اک روز اس نے تمسخر و بذ　　تمسخر سے اس طرح کی گفتگو
شنا تجھ کو دنیا میں دوام رکھے　　سدا تیری جورو کو قائم رکھے
اسے اوحیا و شرم بے شعار　　تو ساق دو دوشیزہ ننگ ہا
نہ اوس پر بھی آئی تجھے کچھ حیا　　سمجھ کر کے تو نے تب ہی کیا
نہیں تجھ کو پوشیدہ ہرگز یہ راز　　کہ جورو کی ہے تیری ڈھال جھکاز
کہا کرتا ہے تجھ سے پیم سدا　　کہ قائم ہے کیا سالم و باخدا
اسے عجز ہے تجھ کو نہیں کیا تمیز　　کہ قائم ہے کہیں اس کو اتنا عزیز
یہ تعریف خوبی پہلے ہم ہے　　نہ ورع و تقوی سے کیا کام ہے
نہ کچھ وصف قائم نہ ہے عرب ہے　　فقط نفس قائم ہے ہر خوب ہے
نہ اس پیشے اس طرف کیا ہے　　کہ اوسکا دہی اگر قائم القیل ہے
کہاں تک لکھوں تیری جورو کا حال　　کہ قصبہ زمانے کی ہے وہ چھنال
کسی سے نہیں اس کو خوف و ہراس　　سمجھتی ہے میں بادشاہ کی ہوں پاس
رعایائے سلطان ہیں سب اس کو ریش　　جو بیگانہ ہیں وہ ہیں اپنوں سے بیش
جمعیت جمیع اوسکی نازل ہوئی　　تو نانے دل خوب ماسن ہوئی
جو عیاشی کی اوس نے کی جستجو　　ملا ایک سے اک جوان خوبرو
جب ملنے لگے اوس کو خوش رو جوان　　تو فی منور تجھ سے بیچاری...

---

۱ لکھنؤ کا مشہور بھانڈ

اُسے اپنے عیبوں سے ہے چشم پوش — تجھے پاس حسرت سے بنتا ہے کام

رہیں جو ترے کام اُسے نابکار — ترے سر پہ رہتا ہے ہردم سوار

مصاحب ہیں اوس کی تو سرگرم ہے — جو وہ غضب ہے تو بھی تو نرم ہے

تماشے تو سے نکلتا ہے گز — کہ جیسے نکلے وہ آتش جان سوز

غرض انتہا کی وہ بے باک ہے — بڑی بیسوا اور چالاک ہے

اسے ساتھ دو فعل بد ہے بکار — شب و روز ہے اوس پہ شیطاں سوار

بدآئین و بد وضع و مستغرب ہے — وہ سارے زمانے کی عیار ہے

یہ سب کچھ ہے لیکن جو انصاف ہیں — یہاں حقیقت ہے مطلب صاف ہیں

وہ گو را عجب فعل معیوب ہے — مگر پھر بھی تجھ سے کہیں خوب ہے

اگر فعل بد کرد آن بدنہاد — دل بندگان خدا کرد شاد

تو دو آن فعل بد ہم نچندان بد است — کہ آید دل بندگان زان بدست

نہ کبھی اوس نے وہ مردم آزار یا — کہ جن سے کریں مردم آزاریاں

چہ ارباب کفر و چہ اصحاب دین — کسو کو ضرر اس سے پہنچا نہیں

شریف و خوش اطوار رند و خراب — ہوئے ذات سے اوس کے سب فیض یاب

نہیں کچھ تری طرح سے وہ لئیم — کہ ہے بیشک وہ بنت کریم

نہیں اوس کو امساک ہرگز ذرا — کہ ہے چشمۂ فیض جاری سدا

وہ خلق و سخاوت پہ باندھی کمر — کہ شاہ و گدا سب گئے اوس کے گھر

بنے درگاہ اوس کی وہ بیت الحرام — کہ جھکتے ہیں جا کر جہاں خاص و عام

کسی سے نہیں اوس کو انکار و عار — وہاں سب کا ہوتا ہے اجلت کار

محمد یہ مسدود م زیں بارگاہ — چہ روسفید و چہ بخت سیاہ

ہر آں اہل حاجت کہ خواہد ... — کند از درش خواہش دل حصول

زمیں کو اوس نے وہ بخشا نکھر — پیادوں کو بھی کر دیا ہے سوار

وہ با غرض بدکار و قحبہ سہی — مگر حق تو یہ ہے کہ سب سے بھلی

سخاوت سے ہے عیب اکسیات — سخاوت ہمہ درد را دارو است

وہ ہر چند بد وضع و جاہل ہے — مگر دشمن دین نہ زندیق ہے

مگر مرتکب وہ زنا کی ہوئی — گنہگار اپنے خدا کی ہوئی

محمد شفیع نے نظم پر شکوہ
کیا ایک دیوان یکتا بہت با شکوہ

کیا اس نے فخر اپنے ہنر پر
بجا تجھ سے خلق حسد کا اثر

کیا اس نے صرف کی آگاہ
بجا کار اسلام تجھ سے تباہ

خدا تجھ کو غارت کرے اے شریر
مگر تجھ سے تنہا کہ وہ خلاہ دیں

جو دیندار ہو وہ فنا مت کرے
تجھے جلد مند غارت کرے

بحق تو اسے دشمن مومنان
مرا قول سے بیت صد زبان

مسلمان دل آزار ہے اے شاد
کر از مہر دنیا و دین برباد

الٰہی کیا جس نے دین کو تباہ
ہے وہ کیا کہ زمیں ہی میں چھپ گیا

رہے جب تلک کرۂ مہ و مہر
رہے جب تلک گرم و سرد و سیاہ

جہنم رہے جب تلک شعلہ ور
کشادہ ہو جب تلک در آب سقر

وہ کفر خدا میں گرفتار ہو
خدا کی لعنت کا سزاوار ہو

شب و روز دوزخ میں جلتا رہے
کف یاس و حسرت میں ملتا رہے

سرش مطرح قہر بالکاہ باد
دلش مورد لعنت اللہ باد

تقریظ

ہیں ایک بزرگ صاحب یگانہ
بے مثل ہیں اوحد زمانہ

شاعر ہیں بڑے سخنور
مالک ہیں نظم و نثر کے وہ

کامل ہیں وہ بلکہ اکمل
سب شاعروں سے جلیل و افضل

جو قلب ہے کلام ان کا یا رو
اقلیم سخن کے ہیں وہ شاہ

ذی مرتبہ ذی صفات وہ
مقبول جناب حق تعالیٰ

ممکن نہیں ہو سکے ان کی تعریف
جو کچھ نہیں ہے مجھ سے تعریف

کیا خوب یہ مثنوی لکھی ہے
اور ہجو کی واہ خوب دی ہے

ہے جگہ ایسی ہے باب تفصیح
اور حال شقی کی خوب تفضیح

ہر کچھ کر بیان واقعی ہے...
کچھ اپنا مبالغہ نہیں ہے

ہر ایک ہے اور یہ کیا ہے
تحریر اس میں جنہیں ہوا ہے

قبول اس کے نہ تھی سے امارت
پیش کے عرض کی وزارت

اس پر بھی جب نہ اس کو آیا
رشوت کا مال خوب کھایا

دنیا کے عوض میں دین کو کھویا
اس غرض سے تو دونوں کو ڈبویا

جا کر کوئی پوچھے اس شقی سے
یعنی نواب علی نقی سے

بتلا تو فقد بچے تو لے حشر
کیا تجھ کو بھلا تھی حاجت زر

واہی پر بھی ہو نہ قانع
نیکی بھی ہوا تو اس کو مانع

ہر چند کہ تھی نہ حاجت اس کو
نکلے کے ادھر کیا کرے وہ

دینار و درم اہم فراوان
رکھتا تھا وہ نطفۂ ہنوان

لکھنؤ کا عروج و زوال

ڈاکٹر مسعود نیّر رضوی

۱۸۵۷ء سے پہلے کی جس تہذیب کو ہم اودھ کی تہذیب کا نام دیتے ہیں وہ دراصل بیت السلطنت لکھنؤ کی تہذیب تھی۔ لکھنؤ کے قریب قریب اسی زمانے میں تہذیبی مرکز بنا جب دہلی کے حالات سے لکھنؤ سے بہت مختلف تھے۔ شجاع الدولہ کے عہد تک اودھ کے حکمرانوں کا مستقر فیض آباد تھا اور لکھنؤ (دوسری) حیثیت میں ایک معمولی شہر تھا۔ شجاع الدولہ کے فرزند آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو دارالحکومت بنا لیا۔ اس وقت سے لکھنؤ کی ترقی اور خوش حالی کا دور شروع ہوا۔ دہلی میں مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی اور اس عظیم شہر کا مستقبل بہت تاریک اور خطرناک نظر آ رہا تھا۔ لکھنؤ کی ترقی دیکھ کر دہلی اور دوسرے مقامات کے اہل کمال اور معزز لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس شہر کو مختلف حیثیتوں سے مالا مال کر دیا۔

اسّی برس تک لکھنؤ کے چراغ کی لو تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ آخر واجد علی شاہ کے عہد میں انتزاع سلطنت (۱۸۵۶ء) کے بعد سے اس کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ اور اہل کمال لکھنؤ چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف نکل گئے اور دیکھتے دیکھتے لکھنؤ پر زوال آ گیا۔ عروج و زوال کی یہ داستان کچھ اس طرح ہے:

(۱)

آصف الدولہ اور ان کے جانشین سعادت علی خان کے زمانے تک اودھ مغل سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ یہاں کے حکمران سلطنت مغلیہ کی طرف سے اس پر حکومت کرتے تھے اور مغل بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے ان کا لقب "نواب وزیر" تھا۔ اصولاً انھیں مغل بادشاہ کی چشم و ابرو کے اشارے پر چلنا چاہیے تھا لیکن اب یہ نیابت فقط برائے نام تھی۔ حقیقتاً اودھ کے حکمران خود کو دہلی سے آنے والے احکام اور ہدایات کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ اس صورت حال کے ذمہ دار ایک حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عہدہ دار تھے۔ جو نواب وزیر اور بادشاہ دہلی کے درمیان حائل ہو گئے تھے اور پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خاموش تہیہ کر چکے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ نہایت منظم اور مکمل منصوبے بنا کر بڑی ہوشیاری کے ساتھ عمل کر رہے تھے اور بادشاہ اور نواب کے درمیان بڑھتی ہوئی بے تعلقی انھیں منصوبوں کا ایک جزو تھی۔

دہلی اب بھی ہندوستان کا دارالسلطنت اور مغل بادشاہ اب بھی ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اب اس کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ دہلی کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور مغلوں کی بادشاہت ختم ہو رہی تھی۔ اس تنزل کا سبب انگریزوں کے دخل در معقولات کے علاوہ یہ بھی تھا کہ خود مغل حکمراں وہ خون کھو چکے تھے جو تیمور، چنگیز خان سے لے کر بابر، اکبر اور اورنگ زیب کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔

۱۔ سوانحات سلاطین اودھ (۱۸۹۸ء) میں سید کمال حیدر دارالحکومت کی منتقلی کا واقعہ ۱۱۸۸ھ بتاتے ہیں لیکن دوسری تاریخوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے اور بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند نشینی کے پہلے ہی سال انھوں نے لکھنؤ میں قیام اختیار کر لیا۔

سلاطینِ مغلیہ کے جانشین بزمِ پروزم کو قربان کر چکے تھے۔ ان کی فعالیت ختم ہو چکی تھی۔ اور ان کی جنبشیں کٹھ پتلیوں کی طرح تھیں جن کی ڈوریاں انگریزوں، سیندھیوں، مرہٹوں اور جاٹوں، روہیلوں، سبھی کے ہاتھوں میں آتی رہتی تھیں اور ان کے بازیگروں میں اپنے فن کے سب سے زیادہ ماہر انگریز تھے جو دھیرے دھیرے پورے ملک کی سیاست پر چھاپتے جا رہے تھے۔

آصف الدولہ کے عہد تک اودھ پر بھی انگریزوں کی نظریں پڑنے لگی تھیں۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نواب وزیر کو اپنے قابو میں لائیں۔ یہ مقصد تین طریقوں سے حاصل ہو سکتا تھا۔ نواب کو اپنا ممنون کر کے، اپنا محتاج بنا کر یا اپنے سے مرعوب کر کے۔ انھوں نے پہلی صورت کو مصلحتِ وقت سمجھ کر آصف الدولہ کو ان کی ماں بہو بیگم صاحبہ کی تیس دولت دلوا دی۔ آصف الدولہ انگریزوں کے ممنونِ احسان ہو گئے اور اخلاقاً ان سے دوستی نبھانے اور مختلف طریقوں سے ان کی مدد کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں پر بھی یہی حربہ کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا۔ آصف الدولہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے وزیر علی[۱] نے مسندِ نیابت پر بیٹھنے کا قصد کیا۔ لیکن انگریزوں نے ان کو ہٹا کر شجاع الدولہ کے بیٹے سعادت علی خاں کو مسند نشین کیا۔ یوں سعادت علی خاں کا اقتدار بھی انگریزوں کی بدولت قائم ہوا اور خود ایک جوہرِ قابل ہونے کے باوجود انھیں انگریزوں کی مرضی کا پابند ہونا پڑا۔

سعادت علی خاں کے بیٹے غازی الدین حیدر نے نیابت شپ کے بعد ۱۸۱۹ء میں "ابوالمظفر، معز الدین، شاہ زمن، غازی الدین حیدر، بادشاہ غازی" کا خطاب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اب اودھ صوبے سے ملک بن گیا اور مغلیہ سلطنت سے اس کا برائے نام تعلق بھی ختم ہو گیا۔ اس انقلاب کے پس پردہ بھی انگریزوں کی حکمتِ عملی تھی۔ اور یہ اقدام انھیں کے تعاون سے کامیاب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اودھ کا ہر بادشاہ شاہِ شطرنج تھا۔ ملکِ اودھ میں انگریزوں کی حیثیت شریکِ غالب کی ہو گئی اور اسبابِ سیاسی اور ملی معاملات کا کیا ذکر، بڑی حد تک اپنے نجی معاملات میں بھی اودھ کا بادشاہ ان کی دخل اندازیاں روکنے پر قادر نہ رہا۔

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے قطع نظر اودھ کے نظامِ سلطنت میں خود بھی کمزوریاں تھیں۔ وقتاً فوقتاً ایسے عمال برسرِ اقتدار آ جاتے تھے جو اپنے منصب کے اہل نہیں ہوتے تھے اور محض سفارشوں اور تعلقات کے بل پر منصب حاصل کر کے نظم و نسق کو زیر و زبر کرتے رہتے تھے مثلاً مرزا رجب علی بیگ سرور نے محمد علی شاہ کے عہدِ سلطنت کی تصویر یوں کھینچی ہے:

"حکومت خفتی، نیا طور ہوا۔ اس دور میں رنڈیوں کا دور ہوا ..... قوتِ سبزہ شہرے
اڑ گئی۔ کسی کو ان سے سوائے چھوڑا، بیٹا رسالا تھا، کسی کو ہونے پشم سے منہ موڑا"

---

۱ وزیر علی کو گرفتار کر کے کلکتے میں قید کر دیا گیا جہاں چھتیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا اور سلطان شہید ٹیپو کے بیٹے کے قریب دفن کیے گئے۔ (سوانحات ص ۱۴۲) وزیر علی شاعر بھی تھے۔ ان کا یہ شعر ان کے سب حال ہے ؎

جوں سبزہ زمیں سے اُگتے تھے پیروں کے تلے ہم
اس گلشن شاداب میں پھولے نہ پھلے ہم

۲ سبیلہ لفظ صحبت فروش عورتوں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے لیکن پہلے یہ عام عورتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

ہوتا تھا...... غیرت نے غضب برپا کیا۔ ایک گنبد سفید سے سپید تھا......
بردستی میں کا جو حصہ ہمارے ذمہ آیا تھا، شیخ کا کارندہ ادھر شہا ہو جاتا تھا...... اب
تو یہ خود بحث ہوا۔ چاند کو نیزہ اندوں کا سلسلہ کیا، یہی دیکھ کر بعضے پریشانی چھا گیا۔ جو
پچھ ندے ہوتے، جو ایسے پھولتے تھے، چناروں کو کے جھگڑے منہ موڑتے تھے، اب جو
ایک مدہ پچھڑی کا چٹا تیار کر کے ہاں جو چھوڑ دی، بیچ کر کہ جس سے لڑکی بادشاہ کے روبرو پیش
کی، آتش خانے کے دلدادہ ہوئے...... مگر پیشتر ندے سے بھی پہلے تو بادشاہ وزیر حضرت
بادشاہ کا تشریف ہے۔ خالہ خلوت میں پانچ نشین، سپاہ جلوت میں صدر راہ۔ لخت سرکاری،
ان اخبار میں اور جس کی اندر جو جلوہ کی ہے اس کی ابر سرد کی جیسے بڑی کی ہے۔ وگر حضور رس
تا فیہ ہے تو کا بنیاد کی گھوڑی زیر ران ہے، خوشی مال کی گلیوں میں گرم مانی ہے......
اور جس کی رشتہ دار انسانی ہے وہ سب پر ہنستے گیا...... جاہ کے فیصلہ کر بیٹھے ہوتے
ہیں...... بردم بر زبان یہ سخن ہے، "الملک اللہ روسیاہ کو بھو ہے آ......" ملا

آگے بڑھ کے لکھتے ہیں:

"سلطنت سلطانی کا یہ حال ہے، بد عملی سے مسافروں کو راہ چلنا محال ہے۔ دن دیئے بستیوں میں
ڈاکے پڑتے ہیں، ملک اجاڑ ہوتا ہے...... چلا دور اپنا گھر بھرتے ہیں، گاؤں خالی ہو گئے
جنگل میں زمیندار رہتے ہیں، قبولیت میں کچھ کہا، پیچھے میں کچھ اور ہے...... مزروع زمین
بیکار پڑی ہے، اصطبل کا ایک حال ہے...... رعیت کا گلہ ہے اور چرا کا گلہ ہے۔ بدحالی
تیز اور قلم رو میں انصاف عنقا ہے۔" ملا

صاحبوں کا حال بھی دیکھئے:

"وہ اشتروں میں...... سب سے زیادہ اندھیر ہے...... دار و غہ متوحش ہے کہ کرو ساتھ کے
دار و باشی ہے۔ بہترا جبر و رشوت کا پیام ہوتا ہے۔ اس امید پر فرشی سلام ہوتا ہے......
کچہری کا یہ دستور العمل ہے کہ دیتے بنے تو بچ جاتا، ورنہ بگڑ کا ہے۔" ملا

اسی انداز میں حکومت کے مختلف شعبوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مبالغہ اور عبارت آرائی سے قطع نظر سر تدریک ان بیانات سے نظم حکومت میں بدعنوانیوں کی نوعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس دور کی تاریخوں کا غور سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جو حال کا سرور نے کیا ہے ذکر

ملا پچھ ندہ، آتش بازی کی ایک قسم

ص۲۰۳ فسانۂ عبرت، مرزا رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کتاب نگر لکھنؤ (اصلاح المطابع علی شاہ)

ہے اُن میں سے بیشتر کا وہی وجود تھا اور وہ بڑی حد تک ایسے ہی تھے جیسا سرور نے اُن کو پیش کیا ہے ۔ غرض اس امر میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ دیسی حکمرانوں اور اُن کے اہل کاروں میں خود غرضی کی بہت کمی تھی ۔ نا اہلوں کو کلیدی عہدے مل جانا ، ملکی سیاست میں انہماک اور اپنے دم سے زیادہ دُوسرے عہدے داروں کے کاموں میں جارحانہ دلچسپی ، دُوسروں کو نیچا دکھانے اور خود زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرلینے کی کوششیں ، تعدی اور بدی سازشیں ، خالص سیاسی کارفرمائی ، یہ سب وہ عوامل تھے جو اودھ کی سلطنت کو آہستہ آہستہ فنا کی طرف لیے جا رہے تھے اور آخر کار انھیں تمام بد انتظامیوں کو حجت بنا کر ۱۸۵۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے " اتمامِ سلطنت " کے اعلان کے ساتھ اودھ کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔

انتزاعِ سلطنت کے وقت واجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے ۔ اُن کو اپنی رعایا میں نہایت مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی ۔ آصف الدولہ کے بعد وُہی ایسے حکمران تھے جو سے عوام دل سے محبت کرتے اور اُن کو اپنا سمجھتے تھے ۔ اُن کی شرافت ، نرم مزاجی اور سب سے بڑھ کر رعایا دوستی نے اُن کو عوام کا ہیرو بنا دیا تھا ۔ اُن کی معزولی پر ایک سناٹا سا چھا گیا اور لکھنؤ سے اُن کی روانگی پر شہر میں کہرام مچ گیا ۔ لیکن عوام کو نہ تو اپنی قوت کا احساس تھا نہ اُن میں کوئی تنظیم تھی ، اس لیے بادشاہ کے ساتھ اس بے انصافی اور انتزاعِ سلطنت پر آنسو تو بہت بہائے گئے لیکن صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی عملی کوشش نہیں کی گئی ! غزلوں ، نظموں اور لوک گیتوں میں نوحہ خوانی تو بہت کی گئی لیکن انگریزوں کے جبر سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کیا گیا ۔

سلطنتِ اودھ انگریزوں کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح آگئی ۔ انھیں اس پر قابض ہوتے وقت معمولی مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا ۔ البتہ اس کے دُوسرے سال ۱۸۵۷ء میں جب مُلک کے دُوسرے حصّوں میں جنگِ آزادی اور انقلاب کے شعلے بھڑک اُٹھے تو لکھنؤ بھی اُن کی لپیٹ میں آکر ایک بڑے محاذِ جنگ میں تبدیل ہو گیا ۔ بیلی گارد (ریذیڈنسی) ، عالم باغ اور سکندر باغ وغیرہ کے معرکوں میں مقامی سپاہیوں نے شجاعت اور جاں بازی کے کارنامے دکھائے اور دشمن تک سے داد وصول کی ۔ لیکن انگریزوں کی منظم فوجوں اور جواب حربی بیاقت کے آگے اور کبھی اپنے ہی غدار ساتھیوں کی بدولت جیت نہ سکے ۔ اس طرح آزادی کی یہ پہلی جدوجہد پورے ہندوستان کی طرح لکھنؤ میں بھی ناکامی پر ختم ہوئی ۔

(۲)

بڑی تحریک ۱۸۵۷ء کا معروف نام " غدر " ہے ۔ لکھنؤ میں آج بھی بڑے بوڑھوں میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اسے " ہنگامہ " کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ یہ دونوں نام اس تحریک کو ایک بڑی بدامنی اور زبردست ہنگامے کی حیثیت دیتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ عوام کی اکثریت کو اس کا احساس نہیں تھا کہ انگریزوں کی حکومت ہو جانے کا مطلب کیا ہے اور اس کے دور رس نتائج کیا ہوں گے ۔ صرف چند افراد ایسے تھے جو اس کو جنگِ آزادی سمجھ کر جنتِ دہلی میں سر بکف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے ۔ باقی جن لوگوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا وہ اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کی خاطر میدان میں آئے تھے ۔ مُطلق العنانی کے اس دور میں عام طور پر بادشاہوں اور حکومتوں کے ردّ و بدل سے متعلق عوام کا رویّہ " ما را چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت " کا مصداق ہوتا تھا ۔ حکومت کے انقلاب کے سلسلے میں انھیں اپنی قوت اور اہمیت کا کوئی اندازہ نہ تھا ۔ صدیوں اور پُشتوں سے ان کا اعتقاد اور تجربہ انھیں یہ بتاتا چلا آرہا تھا کہ اُن پر کوئی نہ کوئی مسلط ضرور رہے گا ، وہ

کوئی فرد واحد ہو خواہ کوئی قوم۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اس قوم کی حکومت بھی تسلیم کر لی جس کے افراد کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ۱؎

جب لکھنؤ نے دیکھا کہ فرنگیوں کا نظم سلطنت چست ہے اور وہ دیسی حکمرانوں سے زیادہ لائق ثابت ہو رہے ہیں تو وہ مطمئن ہو گئے اور مان گئے کہ حکومت کرنا انگریزوں ہی کا حق ہے۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کے نتیجے میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار ختم کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ہندوستان کے ساتھ صوبہ اودھ اور بیت السلطنت لکھنؤ بھی برطانوی سامراج کا جز ہو گیا۔

لکھنؤ کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ اس مغالطے میں ڈال سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہر دم زوال پذیر یہ شہر اپنی تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے بھی پس ماندہ رہا ہوگا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔

"سبحان اللہ! چہ شہرے ست دل پذیر و چہ مقامے ست بے مثل و نظیر!! جائے ست دل فریب و مکانے ست مرغوب، منزہ از نقص و عیب۔ جنتے ست بس دلچسپ و خوش سواد۔ دکان ہا بس معمور و آباد۔ و معمور ملے ست از اقسام و انواع چیزہا!"

[نجات حسین خان عظیم آبادی کا روزنامچہ "سوانح لکھنؤ" ۲؎]

"...... لکھنؤ کا کیا کہنا! اللہ اللہ، وہ سرکار امیر گر تھی! وہ ہندوستان کا بغداد تھا جو بے سرو پا وہاں پہنچا امیر ہو گیا۔"

[غالب بنام میاں داد خان سیاح ۳؎]

۱؎ "سپاہی سے صوبہ دار" (خود نوشت سرگزشت سیتا رام) مترجمہ لیفٹیننٹ کرنل ڈی سی فلاٹ اور خان بہادر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی۔ سیتا رام لکھتا ہے:

"یہ بات مشہور تھی کہ صاحب لوگوں (انگریزوں) کی پیدائش ایک انڈے سے ہوئی ہے جو کسی درخت سے نکلا تھا اور یہی خیال اب تک ساحلی دور دراز مقامات میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی جوان میم ہمارے گاؤں میں آ پڑتی تو لوگ دہی کہہ کر اسے انڈے سے پیدا ہونے والی کہتے تھے۔ لیکن اگر کوئی بڑھی میم ہوتی تو اس کو جادوگرنی سمجھ کر جنگلوں میں بھاگ جاتے۔" (صفحہ ۳) سیتا رام نے ایک انگریز کی عورت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: "یہ سچ ہے کہ انگریز لوگ انڈوں سے کسی درخت پر ایک جزیرے میں پیدا ہوتے ہیں جو یہاں سے بہت دور ہے۔" (صفحہ ۴)

(سیتا رام ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا ایک سپاہی تھا جو ترقی کر کے صوبہ دار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی سرگزشت ہندی زبان میں لکھی تھی جس کا ترجمہ لیفٹیننٹ کرنل نارمیٹ نے کیا تھا۔ زیر نظر اردو ترجمہ اسی انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے۔ "شورش" "خواب و خیال" [illegible])

۲؎ بحوالہ مضمون "لکھنؤ سو برس پہلے" از پروفیسر سید حسن۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ جنوری ۱۹۶۰ء

۳؎ خطوط میاں داد خان سیاح ... مرتبہ ڈاکٹر سید [illegible]۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد (دکن) ۱۹۵۷ء ص

"جب سے دہلی کا عروج و اقبال مٹا ہے اور دہلی میں اس کے جاہ و جلال کا صرف ایک خاکہ رہ گیا ہے۔ اس وقت سے ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں جو لکھنؤ سے تمول اور شان و شکوہ کے لحاظ سے دعویٰ ہمسری کر سکے۔"

[ولیم نائیٹن[1]]

"بعد خرابی شاہجہان آباد (دہلی) یہ زمین (لکھنؤ) بسی۔ سب طرح کی خلقت کا یہاں قیام ہوا۔ وہ شہر اس شہر کا شہرہ ہوا، نام ہوا۔" [رجب علی بیگ سرور[2]]

"..... یہ شہر لکھنؤ نواب آصف الدولہ بہادر کا آباد کیا ہوا ہے جس کی بے مثالی کا ہر شہر و دیار میں چرچا ہے۔ کم و بیش سو برس کا زمانہ گزرا ہے کہ اتنی مدت میں آباد بھی ہوا اجڑ بھی گیا..... جب تک عہد شاہی رہا وہ زمانہ اس کے اوج عروج کا تھا۔ دور دور سے لوگ دیکھنے کو آتے تھے۔ صفحۂ دل پر یہاں کی تصویر جنت نظیر کھینچ لے جاتے تھے۔ لکھنؤ ہر چیز کا مخزن تھا۔ ہر علم و فن کا یہاں کامل استاد تھا...." [فدا علی عیش[3]]

آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنی سلطنت کا مستقر بنایا اور دیکھتے دیکھتے لکھنؤ شمالی ہند کا مرکز نظر بن گیا۔ آصف الدولہ کی دلآویز شخصیت، بے اندازہ فیاضی، علم دوستی اور اہل ہنر کی قدر دانی نے بہت جلد لکھنؤ کو مرجع خلائق بنا دیا۔ جس وقت دہلی کی سلطنت کا چراغ گل ہو رہا تھا لکھنؤ کے چراغ کی لو اونچی ہو رہی تھی۔ تاریخ اور ادبیات کے واقف خوب جانتے ہیں کہ کس زمانے میں دہلی کے کتنے گھرانوں نے لکھنؤ کو بسایا۔ گردش زمانہ نے دہلی کے چراغ کا اجالا بھی لکھنؤ کے کنول میں انڈیل دیا۔ اور دہلی ہی نہیں ہندوستان بھر سے قدردانی اور معاش کے طلبگاروں نے کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آنا شروع کر دیا۔ یوں لکھنؤ کی تہذیب کی تشکیل ہوئی۔ اس تشکیل کی رفتار نہایت تیز تھی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب تقریباً ایک وقت معرض وجود میں آ گئی۔ اس کے پس پشت صدیوں اور قرنوں کے تجربات و حوادث کارفرما نہیں تھے۔ چند سال کے اندر اس تہذیب نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کر لیں اور بہت تیزی کے ساتھ ثقافت اور معاشرت کے لحاظ سے ایک واضح اور منفرد شکل اختیار کر کے اپنے عروج کی انتہائی منزل تک پہنچ گئی۔ یہ ارتقائی منزلیں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے دور نیابت میں طے ہوئیں۔ غازی الدین حیدر

---

1. شباب لکھنؤ (ترجمہ "پرائیویٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ" مصنفہ ولیم نائیٹن) مترجم محمد علی۔ ناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۱ء ص ۶
2. گلزار سرور۔ افضل المطابع محمد کالان پور۔ (سن طباعت درج نہیں)۔ دیباچہ
3. فسانۂ دلفریب۔ منشی فدا علی عرف منشی لچھے صاحب عیش لکھنوی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۲ء ص ۲

(۱۸۹۲ء – ۱۸۸۶ء) اور ضیاء الدین حیدر (۱۸۹۲ء – ۱۸۸۷ء) کے دورِ شاہی تک لکھنؤ کی تہذیب اپنی آخری [illegible] ہو چکی۔ اس عہد کا ایک شاعر ہے جس نے عہدِ شاہ جہان بیگم [illegible] فسانۂ عجائب کے دیباچے میں پیش کیا ہے جس کا تعلق لکھنؤ والوں کا بھی ہے جو اس سے پہلے ہی ہو گئی ہے:

سید فضل علی دہلوی و صفیر قادری حیدر میر کہتے تھے پہلے لکھنؤ پہنچے تھے اپنی کتاب "فسانۂ عجیب" میں لکھتے ہیں:

...... جب میں اس شہر لکھنؤ میں پہنچا تو سیر کا شوق تھا۔ چوک کو جو دیکھا تو راستے دوپٹے زانوئے نظمیہ و نعت قافیے سے مشغول تھی۔ ہر جا پر احباب شاعر و نقل کرتے ہیں۔ بازاروں کا جو حال ہے:

احوالِ بازار

کوئی کتابیں کیا کہیں سنے ہیں¹ ‏ کوئی کتاب، روپوں کے چھپے ہیں¹
سے ساغر پیر تھی [illegible] کی بان ہیں ‏ کڑاکے کی کالی ریوڑیاں ہیں¹
بیٹے پھرتے ہیں شہدے² دو شیزوں کو ‏ کرتے ہیں بہاری پہ جھک جھیلک دو¹
سہا کتابیں کوئی ہاتھ اٹھا کے ‏ معز بچھل ہی بانہی مرتبہ کے¹
یہ شہر لکھنؤ و فاروقی کا عالم ‏ کہ گویا چاند اور تارے ہیں باہم
وہ شربت کو جو اس کو بنا سے ‏ شب مہر کا ساں پیالے میں چلے
دھری ہیں کہ میں اس زبان سے ‏ کہ گویا چاند اور تارے ہیں ہرے

۱۔ یہ اخبار اب بھی موجود ہے۔ پہلے اس کا مسلسل ریلوے کی گنتی کے کنارے تک پھیلا تھا لیکن جب اس کا حوالہ اکبر اعظم کے زمانے کے وہ دکانیں سے گول دروازے تک محدود ہو گیا ہے۔ اور یہاں اس کی فضا میں ایک بڑی مدت کی سی کیفیت ہے جو اس کو دوسرے بازاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

۲۔ شہدے: عام طور پر شہدا کا لفظ اوباش اور غنڈے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک پیشہ ور فرقے کا نام تھا جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شہدوں کا ذریعہ معاش رومیاں بیچنا تھا:

بیٹے پھرتے ہیں شہدے دو شیزوں کو ‏ کرتے ہیں بہاری پہ جھک جھیلک دو

شہدے بیت کا تعلق اشاعت اور اس کا شاعر: سنبھالنے کا کام کیا کرتے تھے اور خوشی کی تقریبوں میں جب کہ بادشاہ کا ختم ہو چکے وغیرہ کی تقریبوں میں بازار اشاعت سے شہدوں کا پڑھا ہی پڑھ کر منا گویا ایک متعلق پیشہ تھا۔ انہوں کو خوشیوں کے ہجوم میں سے فائدہ ہونا چاہیے۔ لکھنؤ میں اب بھی چند شہدے باقی ہیں لیکن پیشہ وارانہ حیثیت سے ان کا وجود تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ کیجیے)

نہ دیکھا ہم نے ایسا حسن و سوہن   کہ جو دیکھے سے جس کے شیریں تر ہو
مٹھائی وہ کہ ہے دیکھو تو گویا
اسی میں مال حلوائی نے کھویا

غرض سارے بازار کا حال لکھتا تو جب [کذا . . . . . لکھتا تو جب ؟] طول کتاب کا اور
اس مقام کا ثانی یعنی

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

ہر ایک کوچہ فرحت افزا اور ہر ایک راہ دل کشا۔ شہر ہے یا یہ جنت ہے !!"

نصیرالدین حیدر کے عہد میں ایک انگریز سیاح ولیم نائیٹن بھی لکھنؤ آیا تھا۔ اس نے لکھنؤ میں اپنے قیام کے حالات اپنی کتاب 'ایک مشرقی بادشاہ کی نجی زندگی' میں درج کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے :

"...... صرف ایک عظیم الشان شہر ہے جس نے دیکھا ہے . . . میرے نزدیک لکھنؤ کے نشیبی حصے سے تنگ و تاریکیوں، اپنے چھتے کوچوں اور گنجان بازاروں سے مشابہ ہے اور وہ شہر قاہرہ اور اسکندریہ مصر ہے۔

"قسطنطنیہ، ماسکو، قاہرہ، جس سے چاہیے آپ لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجیے۔ مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی جانب روزمرہ چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔ اولاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم اوپر سے نظر آئیں گے۔ ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں، وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں اور کوچہ گرد حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر تیغے کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ گینڈے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھالیں جن میں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں۔ اکثر انہیں بانکے ٹیڑھی پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنتے چلتے

ے   ہندوستانی "سرفروشی کی تمنا" میں شہروں کے کردار اور انداز نظر کی تفریحی جھلک دیکھیے (تصویر کشی کی ہے)
ے   "فسانۂ عجائب" ، مصنفہ رجب علی سرور، لکھنؤ۔ حسب الحکم سلطان المطابع ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۰۲

نظر آتے ہیں جو لکھنؤ والوں کے چند بڑے قدروں و خود پسندی اور جوشیلے انداز کو بہ طرح ظاہر کرتے ہیں۔

یہ امر کہ یہاں اہل لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ ذہن رکھتے ہیں تعجب خیز نہیں ہو سکتا اس لیے کہ کمپنی کے فوجی پیشے میں بہت سے لوگ پیدا ہو کر شہرت یافتہ ہوتے ہیں اور اساتذہ بہادر کی فوج تمام تر یہیں کے باشندوں سے ہے۔

باشندگان لکھنؤ میں اس امر کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیر اور بچھیوں کے لوگوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح پر انگریز دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے تنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں۔ ۱

سپہگری کا مذاق عام ہونے کی وجہ سے اس زمانے میں بڑی بڑی اکھاڑیں پیدا کرکے اس کو بہت دلچسپ بنا دیا گیا تھا شمشیر زنی کے کرتب اور دلاوری کا بازار گرم کیا گیا۔ اس کے علاوہ کشتی، بانک، بنوٹ وغیرہ کو اتنی ترقی دی گئی کہ اسے ایک فن کی حیثیت حاصل ہوئی۔ لکھنؤ کا قریب قریب ہر ایک باشندہ سپہگری میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور رکھتا تھا لیکن جس نے اس میں خصوصی مہارت بہم پہنچا کر اسے زندگی کا مقصد بنا لیا تھا وہ بانکوں کا طبقہ تھا۔ بانکے اپنے کر دار اور اطوار کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھے۔ مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہونا، مریضوں کی امداد کی تعداد کا لحاظ کیے بغیر مدد کرنا، ہر امداد طلب کرنے والے کو مدد دینا، ہر وقت مدد طلب کرنے والے کے لیے جان کی بازی لگانا، ایک وضع مقرر کر کے مرتے دم تک اور ہر حالت میں اسی پر قائم رہنا، جرأت اور خودداری پر قربان ہو جانا؛ بانکوں کی یہ سب ایسی خصوصیتیں تھیں جنہوں نے ان کو ایک علاحدہ افسانوی حیثیت دے دی۔ واقعات گواہ ہیں کہ ان کے اٹل ارادوں کو جنبش نہیں ہو سکتی تھی۔ جس شخص کی طرح وہ مقصد کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ ان کی بہادری شجاعت سے گزر کر تہور میں داخل ہو گئی تھی۔ ان کی وجہ سے شہر میں آئے دن کشت و خون اور معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں اور اس زمانے کے لوگوں میں لکھنؤ کی جھنکار، تلواروں کے دھماکوں اور جنگی نعروں سے گونجا کرتا تھا۔ ولیم نائٹن لکھتا ہے:

"اس شہر کی گلیاں میرے نزدیک بالکل عجیب معلوم ہوتی ہیں گویا عالم رویا میں پہنچ گیا ہوں۔ دفعتاً کسی ایسے عجیب ملک میں آ گیا ہے جہاں کے تمام لوگ تمام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جو کہ بچپن سے بھی زیادہ جنگجو ہیں اور جن کا تذکرہ ہم نے لڑکپن میں قصوں اور کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا۔" ۲

ایک اور منظر جسے ولیم اور فورسل لکھنؤ کو دیکھ کر اپنے تاثرات یوں بیان کرتا ہے۔

"شام کے وقت کا ایک خاموش منظر ہے جو نہ صرف میں سے ابھرتے ہوئے گنبد اور ... ہے

---

۱ و ۲ - شباب لکھنؤ، ص ۳۳

> فصیلیں، محلات، گنبد، مقبرے، محرابیں، کلس، قطاروں جیسے متناسب ستونوں والے حویلی مکانوں اور سایہ دار چھتوں کا ایک منظر! میلوں میل نگاہ دوڑاتے چلے جاؤ، یہ منظر پھیلتا چلا جاتا ہے اور اس کے درمیان اس پرستانی شہر کے مینار چمکتے نظر آتے ہیں۔ سنہری برجیاں دھوپ میں جگمگاتی ہیں اور جنبش کرتے ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جھلملاتے ہیں۔ کہیں بھی بدنمائی اور بے ربطی دیکھنے میں نہیں آتی۔ ہمارے سامنے ایک شہر ہے جو پیرس سے زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ بارونق ہے۔ کیا یہ شہر اودھ کا ہی ہے؟ کیا اسے ایک بداعمال، از کار رفتہ اور انحطاط زدہ [شاہی] خاندان نے تعمیر کیا ہے؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مجھ کو تو اتنا حسن و آفرینہ روم میں محسوس ہوا، نہ ایتھنز میں، نہ قسطنطنیہ میں؛ نہ اپنے دیکھے ہوئے کسی بھی دوسرے شہر میں اور اس [شہر] کو میں جس قدر زیادہ غور سے دیکھتا ہوں، اسی قدر اس کی خوبیاں مجھ پر کھلتی جاتی ہیں۔"[1] (ترجمہ)

ایک طرف رسل لکھنؤ کی عمارتوں کی نفاست اور نزاکت دیکھ کر اس کو پرستانی شہر کہہ رہا ہے، دوسری طرف ولیم نائیٹن یہاں کی سیاہ بیانہ فساد دیکھ کر دنگ ہے۔ دراصل جلوہ گری کے ساتھ ہی لکھنؤ کی فضاؤں نے ایک خاص لطافت کو بھی پروان چڑھایا جو بظاہر متضاد سی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا سبب صوبۂ اودھ کی زرخیزی تھی۔ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے پوری علمداری کی دولت کھنچ کھنچ کر لکھنؤ میں آتی تھی اور اس زمانے میں لکھنؤ کی فی کس آمدنی یا یوں کہیے اصطلاح میں قوت خرید کا اوسط آج سے کہیں زیادہ تھا۔ شہر سے باہر جو لوگ یہ دولت پیدا کرتے تھے ان پر جو گزرتی ہو لیکن لکھنؤ میں یقیناً ہُن برستا رہتا تھا۔ اور یہاں بھی دولت کی تقسیم مساوی نہ تھی۔ بہت سے گھر ایسے بھی تھے جہاں دونوں وقت چولہا اور شام کو چراغ مشکل سے جل پاتا تھا لیکن امرا کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ یہ امرا بالعموم اسراف کی طرف مائل رہتے تھے اور بے محابا دولت خرچ کرنے ہی کو اپنی صفت سمجھتے اور اس پر نازاں رہتے تھے۔ یہ کمال کے قدردان اور جدت کے شوقین تھے اور خاص طور پر انہیں کی بدولت لکھنؤ کی ہر ہر ادا میں ایک نکھار پیدا ہو گیا۔

علم و فن اور زندگی کے مختلف شعبوں میں لکھنؤ نے جو امتیازات حاصل کیے ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ لکھنؤ کی فضا میں ایسی تاثیر پیدا ہو گئی تھی کہ ہر چیز میں اس شہر کا اپنا ایک سانچہ بن گیا تھا جو بیرونی اثرات کو اپنی مخصوص شکل میں ڈھال لیتا تھا۔ باہر کے رہنے والے جب لکھنؤ کر آکر بستے تھے تو اسی کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ بیشک سب اپنی وضع کے پابند کچھ ہوں گے جو پرانے سانچوں کے جنس جنس کا سنے کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتے۔ علاوہ بریں وہ آصف الدولہ کا عہد تھا اور لکھنؤ کی تہذیب اس وقت تک اپنے عروج کو نہ پہنچی تھی۔ ورنہ باہر کے آنے والوں کے لیے لکھنؤ کے رنگ سے بچنا محال تھا اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہو کے رہتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

---

[1] بحوالہ "LUCKNOW PAST AND PRESENT" از نظام الدین قریشی، شائع کردہ تیج کمار پریس لکھنؤ ۱۹۵۱ء ص

"... لکھنؤ میں تراش خراش بہت ... ہر طرح سے ... بہت ہی مناسب ...
گھلاوٹ، برجستگی، تراش خراش ... مناسبت سے ... [illegible]
وضع دار ہو گئے۔" [1]

فنون لطیفہ کی ہر شاخ لکھنؤ میں پہنچ کر نئے نئے نکھری۔ شاعری کی ایک صنف غزل نے لکھنؤ میں آکر خود کو رعایت لفظی کے چکر سے ایسا سجایا کہ اس آرائش کے پیچھے اس کی اصل صورت ہی چھپ گئی۔ دوسری صنف مرثیہ پانچویں بندوں سے بیس ہو کر اس شان سے نکھر کر دنیا بھر کے مذہبی ادب سے ٹکرا گیا اور پھر بھی اپنی صنف میں منفرد رہا۔ موسیقی میں ایک صنف ٹھمری اور غزل کا نیا سنگم قائم ہو گیا، دوسری طرف میر علی نے سوز خوانی کے ذریعے ان شاعروں کو ایک عجیب ساز پر ڈھال دیا۔ یہ سوز خالص کلاسیکی راگوں کی بنیاد پر استوار ہونے کے باوجود ... اصل ... سموئے ہوتے تھے۔[2] موسیقی کے ساتھ رقص کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ ... کوششوں کے علاوہ تنہا واجد علی شاہ نے رقص کے بیسیوں انداز ایجاد کر دیے۔ مصوری میں لکھنؤ کا قلم اپنے جزئیات اور سبز رنگ کے کثرت استعمال کی وجہ سے دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اگر مغل یا پہاڑی قلم اس سے بہت بہتر تھے، فن تعمیر میں لکھنؤ وہ عظمت اور شکوہ پیدا نہیں کر سکا جو مغلوں کی عمارتوں میں ... ہے اور ... جیسے پتھر کا استعمال ناگزیر ہے۔ لکھنؤ کی عمارتوں میں پتھر کم لگایا جاتا تھا لیکن اس کمی کو یہاں عمارتوں کی سجاوٹ اور حسن تناسب سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ خصوصاً آصف الدولہ کا امام باڑہ فن تعمیر کا ایک اعجاز ہے اور اس کو آج بھی غیر ملکی سیاح اور ... حیرت سے ... دیکھتے ہیں۔ یہ امام باڑہ خاص ... صنعت، فن اور کاریگری کا نادر نمونہ ہے جس کے بنانے میں عام مزدوروں کے ساتھ خاندانی شرفا کا طبقہ بھی ... شامل ہوا ... قحط کے زمانے میں ... اپنی شکلیں چھپائے رکھنے کی خاطر اس کی تعمیر راتوں کی تاریکی میں بھی جاری رہتی تھی۔

اس عظیم الشان تعمیر کا نقشہ دہلی کے معمار کفایت اللہ نے بنایا تھا لیکن اس کا انداز دہلی کی عمارتوں سے مختلف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کو لکھنؤ بنانے میں دوسرے شہروں کے اہل کمال نے بھی بہت حصہ لیا تھا، البتہ لکھنؤ پہنچ کر ان کے فن میں نمایاں تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس تبدیلی کا سبب لکھنؤ کا وہ عام مذاق تھا جو ان کے فن پر اثر انداز ہوتا تھا۔

انگریزوں نے لکھنؤ کو "باغوں کا شہر" کہا اور یہ بہت موزوں نام تھا۔ یہاں باغات بے شمار تھے۔ ان باغوں کے پھل اپنے رنگ روپ اور مزے کے لحاظ سے دوسری جگہ کے عام پھلوں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ باغبانی اور پیوند بندی کے فن میں نئے نئے تجربے کیے گئے اور یہاں کے باغوں میں جاپانی بونسائی[3] کے نمونے مل جاتے تھے۔

---

[1] دیباچہ فسانۂ عجائب [2] سوز خوانی پر حاشیہ ... دیکھیے [3] ... سوانحات سلاطین اودھ، ص ...

[4] بونسائی (Bonsai) ایک جاپانی فن باغبانی جس کے ذریعے ... قسم کے درختوں کی پرورش اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ چند بالشت سے زیادہ اونچے نہیں ہونے پاتے۔ اسی تناسب سے ... درخت کی پتیاں بھی چھوٹی کر دی جاتی ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ قد و قامت ... درختوں کی طرح ... دوسرے درختوں کے ... چھال میں ... آ جاتی ہے۔ ... ان کی ... (آگے صفحے پر)

لکھنؤ نے بھی طوائفوں کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے ممتاز کر لیا تھی۔ مجلس محفل اور صحبتی وغیرہ میں لوگ کوشش کر کے ملازمت حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آداب محفل، نشست و برخاست کے انداز اور اعلیٰ طرز گفتگو سیکھنے کے لیے باضابطہ تربیت ہوتی تھی اور اس کے لیے طوائفوں کے بالاخانے بہترین تربیت گاہ تھے۔ سرور ان طوائفوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"...... خوش مزاج، مردم شناس، روزمرہ شستہ، دم تقریر و مزہ کنایہ۔ اس کی صحبت کے فیض سے منہ میں تو بیت بہم پہنچاتا ہے۔ تماش خوش، اثر صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔" ①

یہ طوائفیں محض عصمت فروشی یا محفل رقص و سرود تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ معاشرے کے اعلیٰ افراد کی طرح تعلیم و تربیت حاصل کرتی تھیں اور اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ان میں مستند صاحب دیوان شاعرات بھی تھیں۔

طوائفوں کی طرح بھانڈوں کا طبقہ بھی لکھنؤ میں ایک خاص شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ آداب و اطوار میں نہایت مہذب اور بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بھانڈ اپنی مضحک نقلوں سے محض لوگ صرف ہنساتے ہی نہیں تھے بلکہ اکثر مزاح کے پردے میں معاشرے کی خرابیوں اور اپنے طبقے کے افراد، بلکہ بادشاہوں تک کی ذاتی کمزوریوں ——— اور کبھی کبھی سیاسی غلطیوں کی بھی بے دھڑک نشاندہی کر دیتے تھے۔ یہ بھانڈ معاشرے کے سب سے بے باک نقاد تھے۔

معاشرے کی وہ خرابیاں جو زیادہ دولت اور تمدنی ترقی کا لازمہ ہوتی ہیں لکھنؤ میں بھی موجود تھیں۔ فضول خرچیاں، مختلف قسم کی بازیاں، حد سے زیادہ شوق، جھوٹی نمائش، یہ سب چیزیں ایک طرف معاشرے کو گھن کی طرح لگی ہوئی تھیں دوسری طرف تکلف و تصنعات سے

[illegible] قسموں کے متعلق ہوتی ہیں، چنانچہ جاپان میں بعض درخت چار چار سو برس سے زیادہ کی عمر کے موجود ہیں جن کا قد دو ڈھائی فٹ سے زیادہ نہیں بڑھنے پایا ہے حالانکہ شکل تصویروں میں وہ کہنہ پیر درخت معلوم ہوتے ہیں۔

نواب سعادت علی خاں کے بنوائے ہوئے دلکشا و عیش باغ میں ایسے چھوٹے درخت تھے جو ایک ایک دو دو ہاتھ سے زیادہ اونچے نہ تھے اور اس کے باوجود یہ سب درخت باقاعدہ پھلتے تھے۔ واجد علی شاہ نے اپنی ولیعہدی کے زمانے میں نواب علی نقی خاں کی معرفت جو قیصر باغ بنوایا تھا اس میں ملک ملک کے پیڑوں کے کئی چمن تھے، واجد علی شاہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک چمن میں بالکل ناشپاتی کے درخت لگائے تھے، ایک میں بالکل سیب کے درخت لگائے تھے... ایک چمن متعلق شفتالو کے درختوں کا تھا..... ایک چمن امرود کا اور ایک نارنگی کا تھا، ایک نارنگی ولایتی میٹھی شربتی کا تھا..... تعجب یہ ہے جملہ درخت باوجود شل ناز [[illegible] قد آدم سے نصف گز یا ایک گز سے زیادہ بلند نہ تھے۔" (اختر نامۂ شاہی۔ پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ۶)

① دیباچہ "فسانۂ عجائب"۔

جا رہے تھے اور جس نے حقیقت پر کڑی کا جالا تان رکھا تھا۔ قریب کاری نے اخلاق، تہذیب نے تکلف، اخلاقی بندشوں نے اوپری کام اختیار کر لیا تھا اور مذہبی جوش نے رسم و رواج کے پہلو سے ہی عقیدے کو مسخ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب میں خارجی نسبت تھی لیکن خلوت اور باطنی بہت کم تھی۔

لکھنؤ کی تہذیب پر کوئی گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں کی جا سکتی جب تک اس ضمن میں اودھ کے حکمرانوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ بعض کے کسی دور میں ہم بادشاہ اور رعایا میں اتنا ذہنی قرب اور دونوں کے مزاج میں اس سے زیادہ ہم آہنگی نہیں دیکھتے جتنی اودھ کے دور میں دیکھتے ہیں۔ ان حکمرانوں میں آصف الدولہ اور واجد علی شاہ کو خاص طور پر اپنی رعایا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آصف الدولہ کی شان پر لکھنؤ کے گلی کوچوں سے ... وہ نئی کہانیاں بنتی تھیں تو واجد علی شاہ کی لکھنؤ سے جلاوطنی پر شہر بھر میں کہرام مچ گیا اور یہ واقعہ اودھ کی لوک گیتوں کا موضوع بن گیا۔

اودھ کے سب ہی حکمران شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آصف الدولہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ سعادت علی خاں خود شاعر تو نہ تھے لیکن بہت سے شاعر ان کے دامن سے وابستہ تھے۔ غازی الدین حیدر کو لغت سے خاص دلچسپی تھی، انھوں نے ایک بہت ضخیم اور جامع لغت "تاج اللغات" کے نام سے تالیف کرایا۔ نصیر الدین حیدر کو بھی لغت سے دلچسپی تھی، اس کے علاوہ وہ شاعر بھی تھے اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کی ادبی سرگرمیوں کا زیادہ ذکر نہیں ملتا لیکن ان دونوں کی تلافی واجد علی شاہ نے کر دی۔ بادشاہوں کا کیا ذکر، کسی بھی ادب کی تاریخ میں ایسے کثیر التصانیف لوگ کم ہی نکلیں گے اور اتنے متنوع موضوعات پر کسی شخص نے قلم اٹھایا ہو۔ شاعری میں ان کے مجموعے اپنے دامن میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیے، نوحے، سلام، رباعی، قطعہ وغیرہ سے لے کر ٹھمری، کبت اور دوہے تک رکھتے ہیں۔ اردو ڈراما میں اولیت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ ان کی تصنیفیں اور ... خود نوشت، تاریخ، مذہبیات، علمیات، جنسیات، منظومات، صنعت و حرفت، فلسفہ و اخلاق وغیرہ نہ معلوم کتنے موضوعوں کو محیط ہیں۔ شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے خزانے سے وظائف اور تنخواہیں پاتی تھی۔

اودھ کے حکمرانوں کے اس ذوق اور قدر دانی نے ریاست سلطنت میں قلم کے سپاہیوں کا ایک بڑا دل لشکر تیار کر دیا تھا۔

عام طور پر یہ حکمران اہلِ فن کی قدر دانی میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اکثر ان کی گستاخیاں بھی سہ لیتے تھے۔ ایسے متعدد واقعات ہم کو تاریخ اور روایت میں ملتے ہیں جہاں اودھ کے حکمران کم حیثیت اور غریب کاریگروں تک کی ناز برداریاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تقریباً یہی حال دوسرے امرا اور اکابر کا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں کوئی بھی فن یا ہنر تھا، قدر دانی اور قدر دانوں کی تلاش میں کھنچ کھنچ کر لکھنؤ آتے اور لکھنؤ ان سے چھلکنے لگا۔ چونکہ انہیں اپنے فن کی پوری پوری قیمت ملتی تھی اس لیے انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایسے تخلیقات پیش کیے کہ ان کو دیکھ کر ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے اور اگر اب تک ان کے آثار نہ باقی رہ گئے ہوتے تو ان کی حقیقت پر یقین کرنا مشکل ہوتا۔

اودھ کے حکمرانوں کے مختلف النوع مشاغل کو عوام نے بھی اپنی زندگی کے شعبوں میں اختیار کر لیا تھا۔ اگر وہ دریا کے کنارے

بالا خانوں کی جنگ کرتے تھے تو یہ سڑک کے کنارے گھیرا ڈال کر مرغ، بٹیر اور بلبلیں لڑاتے تھے، یہ بھی نہ ہو تو مرغیوں کے انڈے ہی لڑا کر خوش ہو لیتے تھے۔ اگر واجد علی شاہ وہ کھیلوں سے بھی زیادہ صرف کر کے اپنے رہس کے جلسے ترتیب دیتے اور ان کو اسٹیج کرنے کے لیے عیش محل عمارتیں بنواتے تھے تو یہ بھی کھلی ہوئی جگہوں پر تخت بچھا کر اور پردے باندھ کر اندر سبھا کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ غرض بادشاہوں کے تقریباً تمام مشاغل سے چھوٹے پیمانے پر عوام بھی دل بہلایا کرتے تھے۔

سلطنتِ اودھ کے بانی نواب سعادت خاں برہان الملک کا وطن ایران تھا۔ اسی وجہ سے اودھ کی تہذیب پر ایرانیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ یوں تو مغل حکمرانوں کے عہد ہی سے ہندوستان کی تہذیب ایران سے متاثر ہوئی لیکن اودھ پر ایرانیت کا نقش بہت نمایاں تھا۔ لباس کی وضع قطع، بالوں کی تراش خراش، مکانوں کی اندرونی آرائش ایران کے انداز پر ہوتی تھی۔ فارسی سرکاری زبان تھی اور تحریر و تقریر دونوں پر اسی کی حکومت تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اردو اس پر حاوی ہو گئی۔ دوسری طرف اہلِ لکھنؤ کی جدت پسندی ہر شعبے میں نئی نئی تبدیلیاں پیدا کرنے لگی۔ اس طرح ایرانیت کا وہ رنگ جو ابتدا میں بہت گہرا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہلکا پڑتا گیا اور دوسرے بہت سے رنگوں کی آمیزش کے باعث اتنا نمایاں نہ رہا، جتنا شروع میں تھا۔ لکھنؤ کی تہذیب پر ایرانیت کے اثر کے بارے میں پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "جب اٹھارہویں صدی میں دہلی کی مغل حکومت "شمشیر و سناں" کی منزل سے نکل کر "طاؤس و رباب" کی منزل میں داخل ہوئی تو اودھ میں بھی ایک نیم خود مختار حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے قائم کرنے والے محمد امین برہان الملک سعادت خاں تھے جن کی رگوں میں ایرانی خون گردش کر رہا تھا ...... یہیں سے پہلی خصوصیت کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے جسے لکھنؤ کی تہذیب میں ایرانیت یا عجمیت کے عنصر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ گو دہلی کی درباری اور جاگیردارانہ فضا اس اثر سے محفوظ نہیں تھی لیکن یہاں اس کا اثر قدرے زیادہ گہرا اور نمایاں تھا کیونکہ اس دفعہ اس میں مذہبیت بھی شامل تھی۔ اس کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا اظہار لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں فرقہ پرستی، تنگ نظری یا عصبیت کی شکل میں نہیں، ایک عقیدے سے جذباتی وابستگی کی شکل میں ہوا اور چونکہ حکومت اور عوام دونوں نے اس سے گہرے شغف کا اظہار کیا اس لیے اس کا اثر یہاں کی علمی اور ادبی زندگی، موسیقی، تعمیر اور دوسرے چھوٹے چھوٹے فنونِ لطیفہ پر پڑا۔" [1]

اودھ کے شاہی خاندان کا مذہب شیعہ تھا اور ان حکمرانوں کو اپنے مذہبی مراسم، عزاداری وغیرہ میں خاص انہماک تھا۔ النّاس علیٰ دینِ ملوکہم کے مصداق اودھ کی تہذیب اور ثقافت پر بھی شیعیت کا اثر پڑا۔ ایامِ عزا میں عام طور پر لوگ لہو و لعب سے گریز کرتے تھے۔ تعزیہ داری، مجالسِ عزا اور دیگر مذہبی مراسم جو بالعموم شیعوں سے مخصوص تھے، ہندو اور اہلِ سنت حضرات بھی دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔

۱۔ "افکار و مسائل"، [illegible] ۱۹۶۳ء ص ۲۴۲ (مضمون: لکھنؤ۔ ادبی مرکز)

دوم مذہب کے پیرو اور ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ کیونکہ شیعہ تھے اور دربار سے وابستہ عمائدین کی اکثریت شیعہ ہو چکی تھی۔ … مذہب کے بعض مراسم بھی عام طور پر شامل ہو کر شریک ہو گئے۔ مثلاً جس طرح ہندوؤں میں کرشن کا جنم دن منانے کے لیے … اسی طرح مسلمانوں نے سنت کے طور پر جناب سیدہ کی کہانی کا آغاز شروع کیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ست نرائن کی کتھا اور جناب سیدہ کی کہانی کے بعض اجزا بالکل یکساں ہیں۔ سوز خوانی میں بھی مرثیوں کے بعد ہندو دھنیں … کرنے لگے تھے۔[1]

مذہب کا ذکر کرتے ہوئے خود نواب آصف الدولہ کی ایک نہایت اہم خصوصیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی توجہ اگرچہ ذاتی طور پر پورا … مذہب کا پابند تھا۔ اور ان میں سے بعض تو کٹر شیعہ اور اپنے عقائد میں سرسخت تھے۔ لیکن یہ پابندی ان کی اپنی ذات تک محدود تھی۔ ملکی سطح پر ان کی نظر میں شیعہ اور غیر شیعہ، مسلم اور غیر مسلم کی ایک حیثیت تھی۔ حکومت کے اکثر اہم منصب ہندوؤں کے ہاتھ میں رہتے تھے اور دیوان کا عہدہ تو گویا انہیں کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ یہ عہدہ دار پورے خلوص نیت سے جاں نثاری کا حق ادا کرتے تھے اور اودھ کے حکمران نہ صرف ان کے پیچھے قدر دانی … بلکہ ان سے دلی محبت بھی رکھتے تھے۔

ہندوؤں کے مذہبی تہواروں سے بھی حکمرانوں کو خاص دلچسپی تھی۔ آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے تھے۔ اس کا اسے پتا میر … ایک معاصر شاعر کی مثنوی کے … سے چلتا ہے:

ہولی کھیلے آصف الدولہ وزیر

محمد بخش مہجور … سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے یہاں بھی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ غازی الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ مہجور نے لکھا ہے۔ اس میں "تعریف ہولی" کے عنوان سے یہ شعر ملتے ہیں:

---

۱ سوز خوانی کے لیے … قدیم اور مشکل صنف دھرپد کا انتخاب کیا گیا۔ اگرچہ اس وقت تک خیال کی گائکی دھرپد پر غالب آ چکی تھی لیکن جس خصوصیت کی بنا پر سوز خوانی کے لیے دھرپد کو اس سے زیادہ موزوں تھا۔ شرع اسلامی غنا کو اس شرط پر قبول کرتی تھی کہ اس میں گلے بازی اور تکلفات سے کام نہ لیا جائے۔ دھرپد کی بھی یہی شرط تھی کہ گلے بازی سے کام نہ لیا جائے۔ سوز خوانی میں ظاہر ہے کہ الفاظ پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ خیال کے برخلاف دھرپد کی بھی امتیازی خصوصیت یہی تھی کہ اس میں الفاظ ادا کرنے پر بھی اتنا ہی زور دیا جاتا تھا جتنا راگ کی پیش کش پر۔ البتہ دھرپد میں … تھا لیکن سوز خوانی میں اس پابندی کو ہٹا دیا گیا اور خاص طور سے سوز خوانی میں یہ حیرت انگیز وصف پیدا ہوا کہ سوز راگ … سے الگ کوئی چیز معلوم ہونے لگے۔ میر علی سوز خوان جو دھرپد کے نامور استاد تھے، ان کے شاگردوں نے سوز خوانی کے … بھیرویں، … اور بعض دوسرے راگ راگنیوں کی بنیاد پر سوز کی بہترین دھنیں بنائی گئیں۔ … کرم، ملک خوشی کا تاثر پیدا کرتے ہیں وہ بھی سوز میں ڈھل کر غم کی کیفیت ظاہر کرنے لگے۔ … سوز کی بعض دھنیں بھی آج … پیش کرنے والے سوز خوان … ہے۔

"نکلے کے موسم میں تیری بزم کا دیکھا یہ رنگ — غش کے غش باندھے ہوئے اس میں پایا جا
پھر تکھیں سب شوق جی میں شکل سلطانی ہوئے — ہاتھ میں شمشیر تیا مہر کے سب پچکاریاں"

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو ہندوؤں کی راس لیلا اور سری کرشن جی کی شخصیت سے بہت دل چسپی تھی۔ اُردو کا پہلا ڈرامہ جو واجد علی شاہ نے تحریر کر کے اسٹیج کیا وہ "رادھا کنہیا کا قصہ" تھا۔ یہ ڈرامہ دراصل راس لیلا کو ترقی یافتہ اور پرشکوہ شکل میں پیش کرتا تھا۔[۱]

فرماں روایانِ اودھ کا فوجی کردار ایک طرح سے شجاع الدولہ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا اور ملک گیری کی نسبت اب ان کا میلان ملک داری کی طرف زیادہ تھا۔ آصف الدولہ غالباً اس سلسلے کے آخری شخص تھے جنھوں نے باضابطہ فوج کے ساتھ شریک ہو کر جنگ کی۔ میر تقی میر شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں کی جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"صاحبزادہ آصف الدولہ بہادر۔۔۔ جنگ کے میدان میں بڑی سرگرمی سے لڑے۔ جدھر کا رُخ کرتے دشمنوں کا صفایا کر دیتے اور توپ خانے کی زنجیروں کو تلوار سے کاٹ دیتے۔"[۲]

ہمیں ذاتی حد پر یہ پورا سلسلہ شجاع اور فنِ حرب سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور ان میں سے بعض حیرت انگیز جسمانی قوت کے مالک تھے۔ ان کی زور آوری کے کچھ واقعات تو موجودہ زمانے کے معیار کو دیکھتے ہوئے ناقابلِ یقین سے معلوم ہوتے ہیں۔ واجد علی شاہ نے اپنے صیغۂ فوجی کی طرف بطورِ خاص توجہ کر کے اپنی عسکری قوت کو بڑھانا چاہا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا یہ بیان پڑھیے:

"(واجد علی شاہ) انتظامِ سلطنت کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنی فوج کی درستی کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی نئی پلٹنیں اور رسالے بھرتی کیے۔ روزانہ صبح کی نماز پڑھ کر پریڈ کے میدان میں پہنچ جاتے تھے اور فوجی قواعد کی جو فارسی اصطلاحیں خود ایجاد کی تھیں ان کے مطابق تین چار گھنٹے فوج کو قواعد کرواتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ اگر فوج کا کوئی دستہ وقت پر پریڈ کے میدان میں نہ پہنچے تو اس پر دو ہزار روپیہ جرمانہ کیا جائے اور اگر وہ خود سلطنت کے ضروری کاموں کے علاوہ کسی اور وجہ سے غیر حاضر ہوں تو ان پر بھی اتنی ہی رقم جرمانہ کر کے فوج میں تقسیم کر دی جائے۔ ان کی یہ فوجی سرگرمیاں انگریزوں کو پسند نہ آئیں اور وہ ان کو ترک کرنے پر مجبور کیے گئے۔"[۳]

جس طرح اودھ کے حکمرانوں کے دوسرے مشغلوں کا اثر عوام نے قبول کیا اسی طرح ان کے سپہ گری کے شوق نے بھی لکھنؤ کی عام زندگی میں سپاہیانہ ادا میں پیدا کر دیں۔ نائیٹن کو لکھنؤ ایک سپاہیانہ شہر نظر آیا جہاں کے "خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں۔" حرب و ضرب کے اسی ماحول نے اُردو مرثیے کو اس دور میں رزمیہ عناصر سے ایک منفرد صنفِ سخن بنا دیا اور اسی عام فضا کا اثر تھا کہ اس دور کی بیشتر اُردو داستانوں میں التزام کے ساتھ جنگ کے مناظر ملتے ہیں۔

۱۔ ص ۳ ۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔

۲۔ ذکرِ میر، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۳ء، ص ۱۱۵

اودھ کے حکمرانوں کی فضول خرچی، شادیوں اور عیش کوشیوں کی داستانیں [illegible] میں [illegible] جنہیں انگریزوں اور ان کے حاشیہ نشین مؤرخوں نے مبالغہ آمیز [illegible] انگلستان کا [illegible] اور فرانس کا [illegible] ترقی [illegible] پیش کیا ہے، سب سے اہم [illegible] کے اور اس کے مستحق ہیں کہ ان کو ایک [illegible] اور غیر جانب دارانہ تاریخ لکھی جائے [illegible] کہ انھوں نے [illegible] کیا دیا۔

لکھنؤ کی ثقافت کا ایک نہایت روشن پہلو یہاں کے دو بڑے مذہبی فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد تھا۔ یہ اتحاد اس شہر کی روایت بن گیا تھا اور آج تک اس کا اثر باقی ہے۔ اس روایت کی بنیاد آصف الدولہ کے زمانے میں مستحکم ہو چکی تھی۔ آصف الدولہ کا میلہ، شاہ مینا کا عرس اور چہلم کے جلوس ایسے سلسلے شہر کی جان تھے، تو ہندو اور مسلمان مل کر منایا کرتے تھے۔ ادھر جیسے ہولی یا ناگ پنچمی کے میلوں میں شرکت ہونے والوں کے لیے مذہب و مسلک کی کوئی قید نہیں تھی۔ علم، ادب اور فنون کی تمام راہوں پر یہ دونوں فرقے دوش بدوش لگے ہوئے رہتے تھے، دونوں یکساں داد و انعام سے نوازے جاتے تھے اور لکھنؤ کو بامِ عروج تک پہنچانے میں دونوں کا برابر کا حصہ تھا۔

اس شہر کی ایک جہت کے پیچھے فرمانروایانِ اودھ کی بے تعصبی تو کام کر رہی تھی لیکن اس کے پس پشت سب سے بڑی قوت [illegible] تھی وہ اردو زبان [illegible] دونوں فرقوں کو اتنا قریب لے آئی کہ دونوں ایک معلوم ہونے لگے۔

۱۸۵۶ء انتزاعِ سلطنتِ اودھ کا سال ہے اور یہی وہ سال ہے جس کے بعد سے لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت زوال کی طرف جھکنے لگی۔ یہ سبب [illegible] سے اہلِ کمال کو کھینچ کھینچ کر لکھنؤ لایا تھا وہ ختم ہوا اور یہ شیرازہ بکھرنے لگا۔ تلاشِ معاش کے لیے [illegible] ہجرت اختیار کر کے لکھنؤ چھوڑ کر جانے لگے۔ انہیں کے ساتھ لکھنؤ کے اہلِ کمال بھی قدردانوں کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے اور اب دوسری دیسی ریاستوں رامپور، بنارس، الور، بھوپال وغیرہ کے عروج کا زمانہ آیا۔ یوں لکھنؤ کے اقبال کا ستارہ ڈھلنے [illegible] روشن کر گیا۔

اودھ کی ریاست پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ لکھنؤ جہاں سلطنت بھر کا سرمایہ کھنچ کر آتا تھا، تہی دست ہونے لگا اور اب یہاں کی دولت لندن پہنچنے لگی۔ اس طرح لکھنؤ کی خوشحالی کو اتنا دھکا پہنچا کہ اسے سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ اصل سبب یہ ہے کہ دولت کی فراوانی ہی خاص طور پر لکھنؤ کو مرجعِ خلائق بنائے ہوئے تھی، چنانچہ دولت کے ساتھ ہی لکھنؤ کی مرجعیت اور مرکزیت نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حکومت سے چھٹکارا پانے کی پہلی تحریک شروع ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے ملک بھر میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ لکھنؤ میں بھی یہ آگ دہک اٹھی لیکن دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ اس تحریک میں لکھنؤ نے جو کچھ دیکھا وہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک مختصر سی مدت میں باغوں اور سنہرے محلوں کا یہ پرستانی شہر بربادی اور ویرانی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ جن [illegible] میں زندگی اور زندہ دلی کا ہجوم رہتا تھا ان میں وحشتوں کی وہ کثرت اور [illegible] کے شعلے [illegible] ایک عرصے تک گلیوں اور کوچوں سے [illegible] کا ادھر سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ بڑے بڑے [illegible] کے [illegible] سے [illegible] اور پھر ان باغوں میں [illegible]۔ [illegible] زمین کے برابر کر دی گئیں جن میں [illegible] شیخ زادوں کا بنوایا ہوا قلعہ مچھی بھون بھی شامل تھا۔ [illegible] عمارات اور دوسرے [illegible]

نادر نسخے گئے یا انگلستان کے عجائب خانوں اور شخصی ذخیروں، ہندوستان کے انگریزوں اور ریاستوں کے توشہ خانوں کی زینت ہو گئے۔ اس غارت گری میں صرف انگریز ہی نہیں، ہندوستانی فوج کے تلنگے اور بہت سے "گھر کے چراغ" بھی شریک تھے۔

۵۷ء کے واقعات متعدد کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہاں فاضل عیش کے بیان کے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں جن سے لکھنؤ کی تباہی اور اہالیانِ شہر کی خانماں بربادی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ عیش لکھتے ہیں:

"انگریزوں نے ...... لکھنؤ میں ہزاروں بم کے گولے آمارے۔ آگ برسا دی۔ ... صدہا مکان لوٹے، ہزاروں کا انتقال ہوا۔ اس سے جو بچے اُنھوں نے بھاگنا شروع کیا ...... شہر کے تینوں ناکے بند تھے، ایک ناکہ کھلا تھا۔ بھاگنے کا وہی راستہ تھا۔ ہزاروں کیا، لاکھوں زن و مرد ایک کے پیچھے ایک پیدل رواں تھے ...... وہ وہ شہزادیاں، امیرزادیاں جو گھر میں دو قدم بھی پیدل نہ چل سکتی تھیں ...... بے مقنع و چادر روتی جاتی تھیں ..... کوئی بی بی کہیں تھک کر بیٹھ گئی، کوئی نازنین کہیں گر پڑی، کسی نازک اندام کے پاؤں میں کانٹا چبھا، کسی چاند سی صورت نے ٹھوکر کھائی ... اپنا ہوش نہیں، لڑکوں کو کون سنبھالے .... دوپٹے کی دھجیوں سے منہ چھپائے، جنگل جنگل کی خاک چھانتی ...... چلی جاتی تھیں ..... بچے جو بلبلاتے تھے معصوموں کو بھوک پیاس سے غش پر غش آتے تھے .... مرد بھی غریب اسی حال میں مبتلا تھے ...... جب کسی قصبے یا قریے میں پہنچے، کسی قدر آرام پایا۔ کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا ... دشمن کے ڈر سے نیند نہ آتی تھی .... بعضی عورتوں کے وارث، بعضوں کے بچے چھوٹ گئے۔ بعض ناخدا ترس قصبے والوں نے یہ سلوک کیا، رات بھر گھر میں رکھا، صبح کو چلتے وقت لوٹ لیا۔ خلقت کے اژدہام سے جنگل میدانِ حشر کا نمونہ تھا ...... کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ ...... اس کس مپرسی کے زمانے میں معلوم نہیں کون کس طرف، کون کدھر گیا۔ کسی کے جینے مرنے کا حال نہ کھلا۔

"جب لکھنؤ رعایا سے خالی ہوا، مکانوں کے کھدنے کا حکم ہوا۔ لاکھوں گھر کھد کر زمین کے برابر ہو گئے۔ آبادی کا نشان کیسا، نام تک نہ رہا۔ لکھنؤ سنسان، ہو کا مکان ہو گیا ...... شب کا کیا ذکر، دن کو شہر میں جاتے خوف آتا تھا ...... اگر یہ داستان بھی تحریر کروں تو ایک طومار ہو جائے۔"[1]

"جب تک یہ شہر بیت السلطنت تھا، مخزنِ اہلِ کمال، ہر چیز میں ضرب المثل رہا۔ اب ویرانی

---

[1] "فسانۂ دل فریب" ابتدائیہ

دبستان میں مشہور ہو گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو ہم نے اس زمانے میں [illegible]
دیکھا تھا اس سے کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا [illegible] تمام بیگمات میں [illegible]
پھرتی ہے ۔ ۱

مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تباہی ریاست اودھ نے، باوجود بیگانہ محض ہونے کے، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔" ۲

۱۸۵۷ء کے بعد سے انگریزوں کی اصل حکمرانی شروع ہوئی۔ اب ان کا اثر تہذیب و معاشرت کی رگوں میں بھی نفوذ کرنے لگا۔ نئے حاکموں کے طور طریقوں کو اعلیٰ زندگی کا معیار تصور کر کے ان کی تقلید شروع کی اور دھیرے دھیرے "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" مغرب کے زیر اثر اپنے اصل خدوخال سے محروم ہونے لگا۔ لکھنؤ کی ثقافت اور معاشرت کسی مضبوط بنیاد پر نہیں کھڑی تھی۔ وہ قدیم روایات، حوادث و تجربات اور ادوار و نسل کی وہ گرد نہیں جو کسی تہذیب کو دیرپائی بخشتی ہیں لکھنؤ اس سے محروم تھا۔ صدیوں میں تشکیل پانے والی تہذیبیں صدیوں تک زندہ رہنے اور نامساعد حالات کا سامنا کرنے کی سکت رکھتی ہیں اور ایک مدت تک منفی عمل کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب پر سے ایک صدی کی بہاریں چند تماشائیوں کی طرح گزری تھیں اور وہ اس قلیل مدت میں ابتدا و ارتقا کی منزلوں سے گزرتی اور اپنے عروج کی بلندیوں کو سر کرتی ہوئی زوال کی پستیوں میں جا پڑی تھی۔ اس کے تمدن کے عروج و زوال کا سبب جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، لکھنؤ کی دولت تھی۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد دولت کے سرچشمے پر انگریز قابض ہو گئے۔ اب برعکس دلّی کے یہ سمجھنے کی [illegible] ہی نہیں [illegible] سکتے نہیں رہے۔ ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ تحریک کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس لیے فتح یاب ہونے کے بعد انگریزوں نے یہاں دار و گیر کا بازار گرم کیا۔ جنگ آزادی کے نتیجے میں اودھ کا لکھنؤ تاراج ہوا اور دوسرے کے نتیجے میں اہلِ شہر نے گرد و نواح لکھنؤ سے جانا شروع کیا۔ یوں ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ کی پھر وہی حالت ہو گئی جو اس کے تہذیبی ارتقا سے پہلے تھی۔ وہی اداسی، ویرانی، پسماندگی اور وہی کسمپرسی ایک دفعہ پھر لکھنؤ کا مقدر ہو گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے یہ شہر بھوس کے چھپروں اور کچے مکانوں کے ساتھ ویران تھا اور اب عالی شان عمارتوں اور عالی شان محل سراؤں کے ساتھ۔ ۳

اگرچہ یہ حالت بھی زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی، امن و امان بحال ہونے کے بعد مہاجروں نے پھر لکھنؤ واپس آنا شروع کیا، شہر آباد ہو گیا، رونق بھی ایک حد تک واپس آگئی لیکن اب لکھنؤ دوسرا تھا، دور دوسرا تھا، انگریزوں کے

---

۱ "فسانۂ دل فریب"، اتنا بیہ۔

۲ بنام شیخ لطیف احمد عثمانی بلگرامی۔

۳ شہابِ لکھنؤ، مقدمہ مرتب۔

نے نظریات اور حیات سے نہ صرف گریز کیا اور عوام نے ان کی پیروی شروع کی۔ خادم علی عیش کے مسدس " انقلاب لکھنؤ " سے اس تہذیب کا بہترین سراغ ملتا ہے۔ چند ایسے بند پیش کیے جاتے ہیں جن میں شاعر نے لکھنؤ کی گزشتہ اور موجودہ حالتوں کا موازنہ کیا ہے:

" لکھنؤ میں وہ کسی شخص کو تھی جب کہ معاش   سارے ساماں تھے بہم تھی نہ کسی شے کی تلاش
تھی اسی شہر کی مشہور تراشش اور خراش   عیب بھی کرتے تھے اس ڈھنگ سے بانکے اوباش
بات کرنے کا سلیقہ اسے آجاتا تھا
ان کی صحبت سے بشر آدمی کہلاتا تھا

اب کہاں اس کی وہ رونق وہ شکوہ اور وہ شان   اگلی باتوں کا نہیں خواب میں بھی نام و نشان
نہ وہ پوشاک نہ وہ لوگ نہ وہ لطف زبان   دیکھ لیں آنکھوں سے احباب جہاں جا کر یہاں
اب یہ تہذیب کہ یوں چال بشر چلتے ہیں
سیٹیاں منہ سے بجاتے ہیں جدھر چلتے ہیں

لال ٹوپی تو سر پاک پہ کترے سے کٹے بال   تولیہ جیب میں جاکٹ کی بجائے رومال
چھڑی تو ہاتھوں میں دستی ہے تو بل چلتے ہیں چال   گوشت بریان ولایت کا سمجھتے ہیں حلال
کوئی کھانا جو اٹھاتے ہیں چھری کانٹے سے
میز پر بیٹھ کے کھاتے ہیں چھری کانٹے سے

ہے پسند آج گلاب اور چنبیلی کی زبان   شگفتہ قصۂ دل چسپ میں ہے لطف بیان
کوئی ناول جو لکھے ہے وہ فصیح دوراں   نثر زمین و سخن کی نہیں قدر یہاں
جس میں انگریزی کے الفاظ ہوں تقریر وہ ہے
جس میں انگریزی کا پرداز ہو تحریر وہ ہے

عہد شاہی کے جو کچھ لوگ نظر آتے ہیں   نیم وحشی وہی اس وقت میں کہلاتے ہیں
بعضوں سے غیر مہذب بھی سنے جاتے ہیں   پڑھے انگریزی مہذب کا لقب پاتے ہیں
جو زباں ان کی ہے مردہ وہ زباں ہے اب تو
فعل انگریزوں کا مطبوع جہاں ہے اب تو

جا بجا ڈیرہ مکانوں کے جو آتے ہیں نظر   کھینچ کر آہ بہ صد درد یہ کہتے ہیں بشر
تھا کسی وقت میں آبادیٔ شہر خوش تر   شام تھی شام اودھ صبح بنارس تھی سحر
پہلے آباد تھا یہ ملک سلیماں کی طرح
اب تو ویران ہوا ہے خط یونان کی طرح "

غرض لکھنؤ کی تہذیب دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک کے نمائندے وہ تھے جو قدیم وضع پر قائم رہنا چاہتے تھے اور انگریزیت سے متعلق ہر بات کو [illegible] و لندن کی نشانی سمجھتے تھے۔ دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا تھا جو زمانے کے ساتھ خود بھی بدل رہے تھے اور قدامت پسندی کو جہالت کی علامت سمجھتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" میں خوجی اور میاں آزاد لکھنؤ کی تہذیب کے انہیں دونوں متصادم عناصر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

غرض ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ کی قدیم تہذیب بالکل تو نہیں مٹی لیکن اس کے نمائندے کُچھ سے [illegible] کی سرحد میں داخل ہو گئے اور یہ مستثنیات آج بھی لکھنؤ میں مل جاتے ہیں۔

رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں

اکبر علی خاں

ادھر کچھ عرصے سے رشید حسن خاں صاحب کا نام اُن مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں زیرِ بحث آ رہا ہے جن کے ذریعے انھوں نے مختلف لکھنے والوں کی سہل پسندیوں اور بے پروائیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان مضامین کو بہت سے رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کیا ہے اور اس طرح رشید حسن خاں صاحب کی اُس محنت کی داد دی ہے جو موصوف نے لکھنے والوں کی سہل پسندی اور موضوع سے بیگانگی ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔

بے شبہ ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے اور یہ کوشش کرنا چاہیے کہ جو کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ محتاط ہو کر قلم اٹھائیں خصوصیت سے تحقیق کے میدان میں احتیاط برتنا اور بھی ضروری ہے تاکہ کسی ایک کی غلطی آئندہ کی اور بہت سی غلطیوں کا دروازہ نہ کھول دے لیکن اگر نقاد کا عمل تنقید صرف عیب جوئی ہو جائے تو یہ امر نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا سبب بن جائے گا بلکہ معترض کی خود اپنی صلاحیتوں کا بھی کوئی اچھا مصرف نہ ہوگا۔

ابتدا میں رشید حسن خاں کے پیشِ نظر یہی بات رہی ہوگی کہ ان کے احتساب کے بعد لکھنے والے اپنے کام کو شائع کرنے سے پہلے اچھی طرح پرکھ لیں اور اس طرح کاموں کا معیار بلند ہو جائے۔ لیکن یہ احتساب چند وجوہ کی بنا پر خود ان کے لیے کسی طرح صحت مند ثابت نہیں ہوا چہ جائیکہ دوسروں کے لیے۔

ہوا یہ کہ ادھر انھوں نے جو مضامین لکھے ہیں اُن میں پڑھنے والوں کو وہ بے لاگی نظر نہیں آئی جس کی توقع ان سے کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اکثر و بیشتر اپنے مضامین میں طنز و تمسخر کے تیر و نشتر چلائے ہیں جس کا ردِ عمل خوشگوار ہو ہی نہیں سکتا اور انھوں نے بعض مواقع پر اپنے اعتراضات میں ان معذوریوں کو بھی نظر انداز کر دیا جو لکھنے والوں نے اپنی مجبوریوں کے تحت کی تھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی کتاب کے غلط نامے کو نظر انداز کر کے ساری غلطیاں ایک بار پھر لکھنے والے کے حساب میں لکھ دیں چونکہ یہ رویہ خلوص کے سراسر منافی ہے اس لیے ان مضامین سے کسی صالح اثر کا مرتب ہونا قطعاً ناممکن ہو گیا اور کچھ کاموں میں جن کی ضرورت اور اہمیت کا ہم سب کو اعتراف ہے بے جا رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کام کرنا مشکل ہے اور اس پر اعتراض عائد کر دینا اتنا ہی سہل ہے جتنا سہل ہو سکتا ہے۔ کسی نمائش میں ایک مصور نے اپنی تصویر کے ساتھ یہ نوٹ بھی لگا دیا تھا کہ اگر کوئی صاحبِ نظر اس تصویر میں غلطی پائیں تو اس پر نشان لگا دیں۔ ہوا یہ کہ بہت سے صاحبِ نظر پیدا ہو گئے اور نشانات کی زد میں تصویر ہی غائب ہو گئی لیکن جب اسی مصور نے دوسری تصویر کے ساتھ یہ درخواست کی کہ غلطی کو درست کر دیا جائے تو کوئی بھی تصویر کی صحت پر انگشت نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ یہی حال زبان و ادب کے معاملات میں

بھی معاملے میں اختلاف کو شکوے کی شکل میں لانا چاہیے تاکہ دوستانہ فضا میں بحث کرنا ممکن ہو سکے۔ اور اس کے نتیجہ میں کوئی مثبت نتیجہ بھی نکل سکے۔ دوسری بات یہ بھی ضروری ہے کہ معترض یا محتسب کو خود اپنا محاسبہ کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس قسم کی غلطی پر وہ دوسروں پر گرفت کر رہا ہے بعینہ اسی قسم کی غلطیاں اس کے اپنے نشتر بھی چھپا رہا ہے کہیں اس میں تو غلطیاں خود اس کے کارناموں میں تو شامل نہیں ہیں اور کیا اس نے کوئی بے داغ کام بھی پیش کیا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کرنے والوں کو یہی نقصان ہوتا ہے اور زبان و ادب کو بھی کہ وہ پھر اپنے نام سے کوئی کتاب بازار میں لانے سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ اگر ان کی کچھ دھکڑ شائع ہو گئی تو قیامت کی دولتی کا سلسلہ ہر گز شروع ہو جائے گا۔ اور یوں وہ صلاحیتیں جو تعمیری کاموں میں صرف ہونا چاہیے تھی منفی اور تخریبی کاموں میں ضائع ہو رہی ہیں۔

یہ کسی بھی زبان کی کم نصیبی ہے کہ اس کے باصلاحیت افراد یہ سمجھ پائے کہ شاید اُن کے کرنے کا کام یہی ہے۔

رشید حسن خاں نے بھی اپنے تبصروں میں جو بڑا ان کی شہرت کا دار و مدار ہے اپنی منفی صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔

اس معاملہ کا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر حضرات جنھوں نے رشید حسن خاں کے یہ تبصرے پڑھے ہیں ان کی نیت پر بھی شک کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس تحریر کا خلوص مشکوک ہو وہ چاہے کتنی بھی کیوں نہ ہو معقول ہی نہ ہو اور شاید کتنا ہی کچھ درست ہو سکتا ہے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

رشید حسن خاں کی نیت پر شک کرنے والے کہتے ہیں:

بعض معیاری تبصرے تحقیق و تنقید میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور بے توجہی کو دور کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن۔

(۱) پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ تبصرہ نگار کے لہجے میں ہمیشہ طنز یا تمسخر کیوں کار فرما ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ اس مسئلہ نقد و نظر میں رشید حسن خاں نے اس ادارے اور اس ادارے سے متعلق مصنفین کی کتابوں کو کیوں شامل نہیں کیا جس ادارے سے وہ خود وابستہ ہیں یعنی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔ اگر وہ اس ادارے کی مطبوعات اور اس سے متعلق حضرات کی کتابوں پر نہیں لکھتے تو اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ

(الف) ان کے نزدیک وہ سارے کام معیاری ہیں اور وہ ان سے مطمئن ہیں اور ان کے خیال میں ان کاموں پر لکھنے کی گنجائش نہیں ہے

یا پھر یہ کہ

(ب) رشید حسن خاں کے یہاں بھی مصلحتوں کو دخل ہے۔

ان حضرات کے مطالبوں میں سے شاید کوئی مطالبہ بے جا نہیں اس لیے کہ اگر رشید حسن خاں کے نزدیک حکومت ہند پر شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کو امداد دینے سے فضول خرچی کا الزام آتا ہے تو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے بھی تا حال حکومت ہند کی بڑی بڑی امدادوں کا کوئی ایسا مصرف نہیں کیا جو قابل داد ہو یا جس سے یہ ثابت ہو کہ اس نے حکومت کی رقم کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔

کیا کوئی شخص اس بات کا منکر ہو گا کہ احتساب اور احتساب کا کام اپنے گھر سے شروع ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہو گا تو کیا

ایک شخص کو محتسب اور مصلح پر رشک کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عیب جوئی میں اپنا وقت برباد کرنے سے زیادہ افسوسناک کیفیت اور کوئی نہیں ہو سکتی، آئندہ گفتگو میں جو مثالیں میں رشید حسن خان کے صرف ایک مضمون سے پیش کرنے والا ہوں ان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ رشید حسن خان جو باشعور آدمی ہیں ان معروضات کی روشنی میں اپنے آپ کو مزید "فضول خرچ" ہونے سے بچائیں ـــ اس مثال کو سامنے رکھ کر جو ان کے لکھے چند صفحوں کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے آپ تحمل سے غور فرمائیں۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

تاریخ لطیف اور رشید حسن خان

رام پور رضا لائبریری میں "تاریخ لطیف" نام کا ایک مخطوطہ ہے جس میں مہدی علی خاں رام پوری مرتب کتاب نے مشاہیر شعراء، رؤسا، امراء، علماء، اولیاء اور عمائدین ملک کے قطعات تاریخ وفات جمع کر دیے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے قابل قدر کتاب ہے کہ اس میں بعض مشاہیر بالخصوص شعراء کے بارے میں مستند مواد مل جاتا ہے۔ دلی کالج اردو میگزین کے شمارہ ۱۹۶۳ء میں رشید حسن خاں نے اس کتاب کا تعارف کرایا اور اپنے نزدیک چند اہم ترین شعراء سے متعلق قطعات تاریخ کے وہ شعر بھی نقل کیے جن سے مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے، اور "ان" پر حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے۔

کسی قلمی کتاب پر کچھ لکھنا یا اس سے کچھ اخذ کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور بڑی احتیاط اور دیدہ ریزی کا متقاضی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کتاب عام طور پر لوگوں کی دسترس میں نہیں ہوتی اور پڑھنے والوں کو اسی شخص پر تمام و کمال بھروسہ کرنا پڑتا ہے جس نے اس قلمی کتاب سے اخذ و اشاعت کا کام لیا ہے۔

اس نزاکت کے باوجود بھی رشید حسن خاں نے اپنے اس تعارفی مضمون میں بے توجہی اور سہل پسندی برتی ہے۔
میرے معروضات میں انہیں سے پیدا ہونے والی صغیرہ و کبیرہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

(الف)

۱۔ سب سے پہلے رشید حسن خان صاحب نے مؤلف کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ان کے نام کے ساتھ ان کا تخلص "مہدی" بتایا ہے لیکن یہ تعارف نامکمل ہے اس لیے کہ ان کا تخلص مہدی اور "آثم" بھی تھا ان میں سے آخر الذکر تو مذکورہ کتاب ہی کے نسخہ ۲۰۲ پر پایا جاتا ہے۔ مولف نے صفحہ ۲ پر مہدی علی خان کا لکھا ہوا عبدالہادی خاں وفا رامپوری کا قطعہ تاریخ وفات موجود ہے (۲) سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تخلص آثم بھی تھا۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔

دنیا سے گئے حسیر عبدالہادی | برہم ہوئی اہل علم کی محفل تمام
آرام کرو ہی سوئے عیش سے ہمدا | جنت میں جب جا کے فاروق

۱۳۲۴ھ

اس کے علاوہ کتب خانہ رامپور میں ان کا ایک مجموعہ [illegible] کلیات [illegible] تصنیف کی کتاب

رشید حسن خاں تاریخ ادبیات [illegible] کے باوجود [illegible] ہیں۔

(ب)

۲۔ آگے چل کر رشید حسن صاحب نے کتاب کے صفحات کی تعداد ۱۱۲ بتائی ہے۔ جبکہ [illegible] صفحے ہیں۔ اس لیے کہ کتاب کے صفحات کی تعداد ۲۰۰ ہے۔ ابتدا میں [illegible] فہرست ہے جو [illegible] صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ۱۰۵ صفحات پر قطعات تاریخ درج ہیں۔ اس طرح دونوں کی مجموعی تعداد ۲۰۰ ہو جاتی ہے۔

قلمی کتابوں کے حوالے میں عام طور پر صفحات کے بجائے اوراق لکھے جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں کے بیان کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید انھوں نے اوراق کی جگہ سہواً صفحات کا لفظ لکھ دیا ہے مگر [illegible] اوراق [illegible] یہ خوش گمانی بھی [illegible] اس لیے کہ ۲۰۰ یا ۱۰۰ کی دو سے تقسیم کا حاصل ۱۱۲ [illegible] کسی طرح ممکن نہیں۔

پھر میں نے سرسری [illegible] تحقیق سے پتہ چلا [illegible] نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب خانہ رامپور کی فہرست مخطوطات اردو میں اس کتاب کے صرف ۱۱۲ صفحات ہی بتائے گئے ہیں [illegible] رشید حسن خاں کی [illegible] سہل پسندی نے وہیں سے [illegible] اختیار کی ہے۔

(ج)

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کتاب کے آخر میں ۱۰ صفحات کی فہرست مندرجات ہے اس میں سارے قطعات کو تخلص کے لحاظ سے حروف تہجی پر ترتیب دیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں نے کتاب کے مشمولات میں اس فہرست کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا حالانکہ اس سے بعض اہم معلومات اخذ کرنا چاہیے تھیں۔ مثال کے طور پر:

۳۔ فہرست کے صفحہ ۰ پر مولانا عبدالرحمن مداح کے نام کے ساتھ [illegible] کتاب نے ان کا رشتہ شاگردی [illegible] محمد حسین فقیر سے بتایا ہے جبکہ رشید حسن صاحب نے [illegible] ذوق کا شاگرد لکھا ہے۔ یا تو انھیں محمد حسین فقیر کا نام بھی لکھنا چاہیے تھا یا اس سے اختلاف کرنا چاہیے تھا۔

(د)

۴۔ رشید حسن خاں نے تاریخ ادبیات کے [illegible] کو احتیاط اور توجہ سے دیکھے بغیر ہی بعض مقامات پر جو [illegible] ہیں جو تضاد و اختلاف کے [illegible] ہیں انھوں نے [illegible] کیا ہے۔

"تاریخ ادبیات میں ہر جگہ ایک سنہ لکھا ہوا ہے ہجری، عیسوی یا فصلی"

لیکن ان کا یہ دعویٰ غلط ہے [illegible] کے صفحہ ۰ کی طرف رجوع کریں جس پر [illegible] حسین [illegible] کا [illegible] خاں نظام حیدرآباد کا صرف تاریخ وفات [illegible] درج ہے [illegible] اس کے ساتھ ہجری [illegible] دیا گیا ہے [illegible] اسے نقل کیا گیا ہے۔

جوب کمک وہ علی باغ جناں ہوئے

[redacted] تعلیق ۱۲۲۹ھ

تحریر گزشتہ سے کہیں کہیں قطعات میں عیسوی اور ہجری دونوں سنین سے تاریخیں بتائی ہیں اس لیے بھی رشید حسن خاں کا ہر جگہ "ایک سنہ لکھا جانا غلط ہے۔

(۷)

۵۔ رشید حسن خاں نے مقدمہ میں فرمایا ہے کہ تاریخ لطیف میں بعض مقامات پر شمار کی غلطی سے غلط اعداد درج ہوگئے ہیں مگر میں یہ عرض کروں گا کہ رشید حسن خاں نے اپنے حواشی میں جہاں کہیں ایسی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خود رشید حسن خاں کا سہو ہے مخطوطہ کا نہیں ہے مثلاً :

تحریر [redacted] مندرجہ ذیل ماں کے لکھے ہوئے راسخ عظیم آبادی کے قطعہ وفات سے شعر اوّل کو رشید حسن خاں نے اس طرح نقل کیا ہے۔

سال فوت راسخ غفران پناں
گفت ہاتف "راسخ شیوہ بیان"

۱۲۴۱ھ

اور پھر حاشیہ میں اعتراض کیا ہے کہ :

مخطوطے میں مادہ تاریخ کے نیچے ۱۲۳۸ھ درج ہے لیکن اس لفظ سے ۱۲۴۱ھ
نکلتے ہیں اور یہی درج کیے گئے لیکن اس کا صحیح سنہ وفات ۱۲۳۸ھ ہے۔"

یہاں رشید حسن خاں کا بیان غلط ہے مخطوطے میں مصرعٔ تاریخ صورت یہ ہے۔

گفت ہاتف "راسخ شیوا زباں"

اور اس مادے سے ۱۲۳۸ھ ہی نکلتے ہیں۔

۶۔ ضمیر کا مادۂ تاریخ مخطوطے میں مندرجہ ذیل ہے۔

بود سید ضمیر مرد امام

اور اس مادے سے ۱۲۰۲ھ نکلتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب نے اس پر حاشیے میں لکھا ہے کہ :

"مخطوطے میں ۱۲۰۱ لکھے ہوئے ہیں جو سہو قلم ہے یا شمار کی غلطی۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سہو قلم اور شمار کی غلطی رشید حسن خاں کی ہے مخطوطہ تاریخ لطیف کی نہیں اس لیے کہ وہاں ۱۲۰۲ھ ہی درج ہیں۔

۷۔ قسمت دہلوی کا مادہ تاریخ وفات جو شاہ نے نکالا تھا۔ تاریخ لطیف میں اس طرح نقل ہوا ہے۔

• داستانِ گلشنِ نسیم بجنسہ

۱۲۰۵ھ

میں رشید حسن خاں نے اپنے حاشیے میں بتایا ہے کہ "نظم" سے مادۂ تاریخ کے لیے ۵ عدد کم ہوتے ہیں ورنہ پانچ کا فرق ہے:

یہاں بھی رشید حسن خاں کی اصلاح غور طلب ہے کا سبب ہے نقطے کا نہیں۔ نقطے میں ۵ اعداد کا فرق ہے۔

(ق)

۸۔ حواشی لکھتے ہوئے رشید حسن صاحب نے غیر ضروری معلومات کا اضافہ کیا ہے اور جو مطالب پہلے سے تاریخ ادبیات میں موجود تھا کے لیے گرانقدر اضافے کیے ہیں۔

مثلاً مسعود یاد اردو کے مادۂ تاریخ وفات "صد و سلام بر امام ہشتم" پر حاشیہ لکھتے ہوئے محمد علی حسن کا کہا ہوا قطعہ تاریخ تذکرۂ خطوط ہند سے نقل کیا ہے۔ یہ قول غیر ضروری تھی اس لیے کہ یہ قطعہ تاریخ ادبیات صفحہ پر پہلے ہی موجود تھا اس قطعے کے مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

بروز پنجشنبہ کرد رحلت　　کہ این عالم نہ جائے جاودان بود
ماہِ اول و بیست و چہارم　　وداع او سوی دار الجنان بود
ظہور افسوس آن دو استاد ذی قدر　　پدر وارم ہمیشہ مہربان بود
چو عقل "بست تاریخ ولادت　　ندا گفتم "چو باغ و جہان بود"

۱۲۸۵ھ

اس قطعے سے یہ تاریخ اور مہینہ اور سنہ وفات کے ساتھ ساتھ دن بھی معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ آزاد دہلوی کے استاد تھے۔ رشید حسن خاں نے تاریخ ادبیات میں اس قطعے کا موجود ہونا نہیں بتایا جس سے اس کا استفادہ کیا جاتا۔

۹۔ امیر کے لیے امانت لکھنوی کے قطعہ تاریخ وفات سے مادۂ تاریخ

• جان داد امانت بجنت بریں •

نقل کرکے رشید حسن خاں نے حاشیے میں میر کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات مجلہ دیوان مرتبہ ضیا دیوان امانت قاضی عبد الودود صاحب کے متعلق مشہور سالنامہ نقوش سنہ ۶۱-۶۲ء (یہاں قاضی صاحب کے مقالے کا حوالہ درج نہیں کیا گیا) بھی نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ قطعہ تاریخ ادبیات (ص ۳۱-۳۲) میں بھی موجود ہے اور اس قطعے سے کے نام پتا چلتا ہے جس سے سوائے حوالوں کے اضافے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(س)

حاشیہ نگاری میں رشید حسن خاں نے تصریحات جمع کرنے کی خاطر لغت تمام ماخذ رسالوں کو سامنے رکھا ہے اور نیاز مندی سے زیادہ

وسے فائدہ اٹھایا ہے لیکن افسوس کتاب کو سامنے نہیں رکھا تھا وہ یہی تاریخ لطیف ہے۔ قطعات تاریخ میں مادہ تاریخ اکثر آخری شعر میں نظم کیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی تفصیل مرض و موت، دن، مہینا اور تاریخ وغیرہ قطعے کے پہلے اشعار میں نظم کر دی جاتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس قسم کی کسی اطلاع سے جو تاریخ لطیف کے قطعات میں پائی جاتی ہے، کوئی استفادہ نہیں کیا اور ادھر ادھر کے ذریعے حوالے اکٹھے کر لیے ہیں۔

ہر تحقیقی کام کرنے والے کو اس بات کا احساس ہوگا کہ مرتب کو سب سے پہلے اسی کتاب کی معلومات پیش کرنا چاہئیں جن پر وہ انحصار کر رہا ہے اگر وہ صحیح ہیں تب، غلط ہیں تب۔ اس کے بعد مرتب کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مزید کاوش سے اگر ممکن ہو تو کسی اطلاع کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں دلائل کا اضافہ کرے لیکن اصل کتاب کی اطلاعات سے صرف نظر کرنا سہل پسندی اور بے توجہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ایسی صورت میں ثانوی حوالوں سے غلطیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور بہت سی ضروری معلومات پردے میں چھپی رہ جاتی ہیں۔

رشید حسن خاں نے تاریخ لطیف پر اپنے مضمون میں اس انداز کار کی ایک مثال پیش کی ہے اور کتاب کے مندرجات کی قریب قریب ساری ہی اطلاعات سے چشم پوشی کی ہے۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل معروضات کو سامنے رکھیے:

۱۰۔ امیر مینائی کے قطعۂ تاریخ وفات از نواب مرزا داغ (تاریخ لطیف صفحہ ۳۸) کا آخری شعر رشید حسن خاں صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ لیکن امراض موت کی جو تفصیل داغ نے دی تھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں:

کیا لکھوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں — کیا لکھوں تفصیل امراض کثیرہ
بگڑی صحت صفرا و تپ — درد آزار اسہال و زحیرہ

اس قطعے کے ایک شعر میں "مینائی" نسبت کی طرف اور امیر سے رشتۂ شاگردی کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے:

شاہ مینا سے تھا نسلی سلسلہ
شاعری میں خاص تلمیذ امیر

رشید حسن خاں نے اس سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۱۔ تاریخ لطیف صفحہ ۴۴۔ ۴۴ پر امیر مینائی کا قطعۂ تاریخ وفات از کلیم لکھنوی بھی درج ہے جس سے وقت انتقال معلوم ہوتا ہے اور رشید حسن خاں نے جن حوالوں سے تاریخ وفات بتائی ہے ان سے اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں:

چہار شنبہ بہم بہ ز جمادی دوم — بود پاس یک شب شنبہ گزشتہ تقدیر
بچھٹیں سیزدہم از مہ اکتوبر بود — ز صد و الف کلیم سال بیمن تحریر

رشید حسن خاں نے اس کے برخلاف ۱۹ جمادی الاول تاریخ انتقال بتائی ہے اور وقت انتقال کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

۱۲۔ میلا قیس کی تاریخ وفات کے لیے رشید حسن خاں نے "اسیر" کا مادہ تاریخ انتخاب کیا ہے اور مزید معلومات کا اضافہ

[illegible] خمخانۂ جاوید، تاریخ ادب اردو، آب بقا اور گل رعنا سے کیا گیا ہے [illegible] کیا گیا قطعہ
[illegible] کے ساتھ سنہ عیسوی کا بھی [illegible] ہے پہلے [illegible] رشید حسن خاں [illegible] اس قطعے کے
[illegible] تاریخ ادبیات کے صفحہ ۲۰-۲۱ پر یہ قطعہ [illegible]
یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

قریب شام ہوئے آہ وہ کسل تمام — اخیر چاند تھا گزرے تھے تیرہ دن شاید
سنا یہ واقعہ جاں کاہ جب کہی تاریخ — کہ میں [illegible] انتخاب [illegible]
بیان مصرع آخر کے اب مناسب جان — [illegible] مصرعے ہے مطلب [illegible]
شمار مصرعہ تاریخ جو کرو ہیں دو حرف — [illegible] ایک [illegible]
سنیں یہ بھی ہیں حیاں اس سے عیسوی [illegible] — ہر بیات زر جہاں وقتِ [illegible]
وہ مرثیہ، وہ پڑھا وہ [illegible] — [illegible]

عجیب مصرعۂ تاریخ ہے [illegible]
"یہ پنج تو کا ہے زہرا میں ملے ہیں"

۱۲۹۱ھ

۱۳۔ اردو کے مشہور شاعر سید ضامن علی جلال کا قطعۂ تاریخ وفات انھیں کے بیٹے میر مہدی کمال کا نتیجۂ فکر تاریخ ادبیات (صفحہ ۹۹۔۱۰۰)
میں موجود ہے۔ رشید حسن خاں نے اس قطعے کا آخری شعر نقل کیا ہے اور اپنے حاشیے میں آب بقا، خمخانۂ جاوید، تذکرہ کاملان
مشاہیر، آرزو صاحب (یہاں بھی مقالے کا عنوان نہیں بتایا) بحوالہ جلال از محمد حسن اور انتخاب یادگار سے کام لیا ہے۔
مجھے یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ اتنی بھاگ دوڑ سے اور جود بھی صحیح تاریخ دریافت نہیں کر سکے حالانکہ کمال کے اس قطعے کے سامنے آ
جانے کہیں زیادہ طویل تلاش کے سفر پر جانے کی ضرورت پیدا نہ ہوتی۔ کمال کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں:

مہ شوال کی تاریخ چودھویں — وہ بدھ کا روز تھا آفت کا سماں
وہ شاعر اٹھ گیا بزم جہاں سے — کمال شاعری جس پر تھا نازاں
کمال آنکھوں سے پنہاں ہو گیا آہ — "چھپا ہے شاعری کا مہرِ تاباں"

لیکن رشید حسن خاں نے اپنی تحقیق میں مستند حوالوں کے بجائے تذکرہ نگاروں کے خمخانۂ جاوید کی اس اطلاع کو بنیاد بنایا ہے۔
"جناب جلال نے بعمر ۷۶ سال بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء انتقال فرمایا۔"
اور اس کے بعد تقویم کے حساب سے ہجری تاریخ دریافت کر کے ۵ شوال ۱۳۲۷ھ بتائی ہے۔
ہجری سال صحیح تاریخ وفات پہلے ہی سے سامنے ہوتے ہوئے سنہ عیسوی کو بنیاد قرار دے کر ہجری تاریخ نکالنا تحقیق کے علاوہ کیا کہی جا
سکتی ہے جبکہ اس سعی کاوش کے باوجود نتیجہ غلط ہی رہا۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ رشید حسن خاں نے منظور بالا قطعہ تاریخ سے

ہے تو کبھی برق فنون کا ایک اس قطعہ کا آخری شعر خود نقل بھی کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ رشید حسن خاں نے بیٹے کی بتائی تاریخ پر نہ صرف یہ کہ دُوسرے حوالوں کو ترجیح دی بلکہ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ معلوم نہیں تحقیق کے وہ کون سے اصول ہیں جن کی بنیاد پر بیٹے کا بیان دیگر بیانات کے مقابلے میں غیر معتبر اور ناقابلِ ذکر قرار دیا گیا۔

بہرحال جلال کی تاریخ وفات ۵ شوال نہیں جو رشید حسن خاں نے تحقیق کی ہے بلکہ ۴ شوال روز چہار شنبہ ۱۳۲۷ھ ہے جو جلال کے بیٹے کمال نے اپنے قطعہ میں نظم کر دی ہے۔

۱۴۔ داغ دہلوی کا مادۂ سالِ وفات جو احسن مارہروی نے نکالا تھا رشید حسن خاں نے نقل کیا ہے اور مہینہ اور اس کی تاریخ خمخانۂ جاوید کے حوالے سے۔ لیکن تاریخ بلیت کے کسی قطعات سے کوئی استفادہ نہیں کیا جن میں سے ایک حنیف جونپوری کا کہا ہوا ہے اس میں مہینہ اس کی تاریخ اور مرضِ موت کا تذکرہ موجود ہے۔ اس قطعے کے مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

ہائے فالج نے کیا ستم ڈھایا — کیسی برپا ہوئی قیامت آہ
ماہِ ذی حجہ کی نویں تاریخ — یا ہے عاشور کا یہ روزِ سیاہ
مر کے چپ ہو گیا فصیح الملک — یہ خبر منتشر ہوئی ناگاہ
ہائے وہ خوشنوائی بلبلِ ہند — ہائے اُستاد شاہ آصف جاہ
دوستانہ تھا حنیف امیر کا غم — کہ ہوا داغ کا غم جانکاہ

سالِ غم پڑھ کے خونِ ناب بہا
شاعری داغ کے گئی ہمراہ

۱۹۰۵ء (ص ۹۲)

اس کے علاوہ ایک اور قطعہ میں جو نادر شیخ پوری شاگرد امیر مینائی کا کہا ہوا ہے اور تاریخ بلیت ص ۸۲ پر درج ہے مرضِ موت کا ذکر آیا ہے۔ متعلقہ شعر یہ ہے:

ہائے فالج کا تھا وہ اک جھونکا — جس ہوا سے یہ گل چراغ ہوا

مرضِ موت کا ذکر اور بھی مختلف قطعات میں ہے لیکن رشید حسن خاں لاعلم ہیں۔

۱۵۔ داغ سے متعلق کئی اور قطعات بھی ہیں جن میں سے ایک قطعہ مصنفہ قاضی سید غضنفر حسین حیرت شاہ جہاں پوری سررشتہ دار عدالت جج خیر گڑھ جو خود شاگرد داغ ہیں یہ اشعار بھی ہیں۔ ان سے داغ کے ساتھ شاگردوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

اے مرے استاد کیا کہنا ترا — کر دیا استاد شاگردوں کو بھی
ماشاء اللہ بیخود و بیباک و وحد — حیرت و مطلب جلال و واصفی
برق تمکین شوق و بیتاب و شرر — آفریں جاوید نسیم انجم غنی
اختر و امید شیدا شوق و شاد — ذوق و مضطر سید احسن لکھنوی

شمعِ افسردہ شرفِ محمود عشق — داغ صاحب محمود صاحب دہلوی

گوہرِ مقصود ضیا سائلِ طیبان — عیش شادان عیش فرخ نادری

اشک و بسمل حاجب و منتظر فصیح — بزم ثاقب احسن احمد دری

مرو باغ و مرود و قیصر و مخمور — شاعر و دُرّ نسیم عسکری

جس کے ایسے سیکڑوں شاگرد ہیں — ایسی اُستادی مسلّم کس کی تھی

ص ۹۲-۹۳

سائل دہلوی کے قطعہ کا مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کیے جانے کے لائق ہے

شُد وفاتش بشام یوم الاحد — دفن شد روز جمعہ سائلِ ہند

(ص ۱۰۰)

رشید حسن خاں صاحب نے ان میں سے کسی ایک مصرع سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۶۔ دبیر کا مادہ سال وفات از امیر نقل کرکے تاریخ کی تفصیل کے لیے شاد دبیر مخانۂ جاوید، آبِ حیات کو پیش نظر رکھا ہے لیکن سید امداد ... وفات کے قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

روز شنبہ تھا اور تھی محرم وقت صبح — تاہم شب میں جنہیں ماہ و فرشتے ...

ان اشعار سے معلومات میں دن اور وقت کا اضافہ ہوتا ہے اور تاریخ کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھیے تاریخ لطیف ص ۱۲۶)

رشید حسن خاں نے اس سے کام نہیں لیا۔

۱۷۔ مولوی عبدالرحمن راسخ دہلوی کا مادۂ تاریخ وفات از آغا شاعر قزلباش نقل کرکے راسخ کی تاریخ وفات خمخانۂ جاوید کے حوالے سے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۱ء بتائی ہے۔

تاریخ لطیف میں اس قطعے کے خاتمے پر حاشیے میں یہ عبارت بھی مؤلف کتاب ہی کے قلم سے درج ہے:

"۱۹ شعبان روز چہار شنبہ قبل از نصف النہار"

رشید حسن خاں نے اس حاشیے کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ اس سے استفادہ کیا، نہ یہ بتایا کہ عیسوی اور ہجری تاریخوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔

راسخ دہلوی کی وفات سے متعلق ایک اور قطعۂ تاریخ منیر ... کا تاریخ لطیف میں درج ہے اور اس کے مادۂ تاریخ سے مہینے اور سنہ دونوں کا علم ہوتا ہے۔ قطعے کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔

منیر اب اُن کا سالِ فوت کہیے

"نہم ہی شعبان میں ہیں اُن کی رحلت"

۱۳۰۵ھ (تاریخ لطیف ص ۱۰۳)

رشید حسن خاں نے اس وقت سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

۱۸۔ پیارے صاحب رشید کا مادۂ تاریخ از نشتر لکھنوی نقل کرنے کے بعد رشید طبع ۱۹۵۱ء کے حوالے سے مزید معلومات فراہم کی ہیں لیکن اس قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں کو محروم توجہ رکھا ہے۔

عالم ضعف سے فالج کے گو کر جنبش تھی　　　مگر گئے شوقِ اجداد جب کرائی قضا
سحر کا وقت تھا ذی قعدہ کی تھی بست و ششم　　　کہ آفتاب کمالات زیرِ خاک چھپا
وہیں پہ قبر بنی جس جگہ پہ سوتے تھے　　　قدم نہ گوشۂ عزلت سے مر کے بھی نکلا

(ص ۱۴۲)

رشید حسن خاں نے اس قطعے سے وقتِ انتقال تو دیا ہی نہیں لیکن ایک زیادہ اہم اطلاع سے بھی محروم رکھا اور وہ یہ کہ پیارے صاحب رشید اپنی خوابگاہ ہی میں دفن ہوئے۔ اس کے برخلاف انھوں نے گلزارِ رشید کے حوالے سے باغ میر عشق متعلقہ کاظمین لکھنؤ مدفن بتایا ہے۔

۱۹۔ محمد جان شاد کے قطعہ تاریخ گفتۂ تجلی حسین تجلی کو نقل کیا ہے مگر اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے صرفِ نظر کر کے اپ بتا سے کام لیا۔

سن از تخمین گفتی می تو انم　　　کہ عمرش زاں مد از ہشتاد شدہ ای
بہ فالج چار ماہ بر فرش مرگ افتاد　　　مرض ہم فی المثل افتاد شدہ ای
ربیع الآخر و یکشنبہ ششم　　　بہ مغرب دیدہ را خنیا و شدہ ای
ہمیں دو چار ساعت اند بر خود　　　ز قید زندگی آزاد شدہ ای
مکان ویران شدہ تاریخ بنفتم　　　لحد از سعد مش آباد شدہ ای

اس طرح مرض موت اور تاریخ دفن کی اطلاع رشید حسن خاں نے نہیں دی۔

(دیکھیے تاریخ طبیعت ص ۱۵۱)

۲۰۔ رشید حسن خاں نے غلام امام شہید کے مادۂ تاریخ کے لیے مرزا سالک دہلوی کا یہ شعر نقل کیا ہے جس سے ۱۲۹۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔

آہ ارباب درد پر طاری　　　ہے بپا ماتم امام شہید

اور اس پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

"کلیات سالک نے فی الوقت میری دسترس سے باہر ہے کہ تحقیق کر سکوں، موجودہ صورت میں اس شعر سے مطلوبہ تاریخ نہیں نکلتی ہے۔"

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ انھیں الفاظ سے تاریخ نکلتی ہے۔ رشید حسن خاں شعر کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں، اس شعر کو سمجھنے میں ناکام

ہے لیکن اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اب سرِ ماتم امامِ شہید [illegible]

جمع کر دیے [illegible]

ہے کہ رشید حسن خاں [illegible] سے تکرار ہے۔

مختلف بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں اپنی دسترس سے باہر کتابوں سے استفادہ کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن تاریخ [illegible]

کے زیر مطالعہ ہے اس سے کوئی کام نہیں لیتے۔

۲۱ - رشید حسن خاں نے شاہزادہ قادر بخش صابر کا مادۂ تاریخ وفات از محمد ناصر [illegible]

"شد شاعر ابو [illegible] مردود ہے۔"

۱۲۹۹ھ

نقل کر کے [illegible] قاضی عبد الودود [illegible] نقوش [illegible] کے حوالے سے مقام وفات کا اضافہ کیا ہے۔

لیکن اس قطعے کے مندرجہ ذیل شعر سے استفادہ نہیں کیا جس میں تاریخ، مہینا اور دن بتائے گئے ہیں

ز شعبان سوم بود روز دو شنبہ — [illegible] شان و نام و نشانش [illegible]

۲۲ - میر غلام علی عشرت بریلوی کے مادۂ تاریخ وفات کے [illegible] رام پوری کے قطعے سے یہ شعر

[illegible] کرم نے [illegible] تاریخ — [illegible] میر عشرت

۱۲۳۶ھ

نقل کیا ہے اور مزید اطلاعات کے لیے تذکرہ [illegible] رام پور کا حوالہ دیا ہے لیکن کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔ اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے عشرت کے ناتمام منظوم ترجمہ پدماوت کی تکمیل، قصۂ شش [illegible] کرم اور ایک دوسری نثری کہانی کی تصنیف [illegible] کے [illegible] اور تاریخ کا علم بھی ہو جاتا ہے [illegible] میں سے کسی بات کا رشید حسن خاں نے اپنے حاشیے میں بیان نہیں کیا۔ اشعا[illegible] یہ ہیں۔

پدماوت نا تمام کی ختم — جس سے شاد ہوئی روح عشرت
قصۂ شش [illegible] کر کے [illegible] — کیا خوب جگر کا بہ محنت
مجموعۂ عجیب ایک کہانی — کی نثر بزبان فصاحت
شوال کی بست و ششمیں کو — واں اس پہ ہوا ہے باب جنت (ص ۱۸۱)

۲۳ - مندرجہ بالا قطعے کے کہنے والے کرم خاں رام پوری پر بھی انتخاب یادگار کے حوالے سے یہ حاشیہ لکھا ہے:

مرزا محمود عرف کرم خاں شاگرد قدرت اللہ شوق ۷۰ برس کی عمر پائی، وفات

۰ ذی الحجہ ۱۲۵۳ھ بروز دوشنبہ

لیکن تاریخ [illegible] میں منقول کرم خاں کا قطعہ تاریخ وفات جو کرم خاں کے [illegible] احمد خاں [illegible] زادہ [illegible]

۲۳- ماموں صاحب رشید حسن خاں کے نزدیک تاریخ بہ اعتبار شعرا جس قطعے سے کریم خاں کا صحیح نام، مدت مرض، سن وفات
انتقال اور تاریخ وفات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مزید اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں:

شاعرِ کامل و ذی حوصلہ ماموں صاحب | جن کو اُستاد کرم خاں کہے اعلیٰ و ادنیٰ
متخلص بہ کرم نام کریم اللہ خاں | مجمعِ خوبی و اہلِ ہنر و شرم و حیا
مرضِ ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال | شصت و یک سال تلک کھائی ہوئے دنیا
ہونے تعلیم بقا ملکِ فنا سے جس دم | وہ ہمہ قسم جہاں رختِ سفر باندھ اُٹھا
ظہرِ یکشنبہ و ہفتم مہ ذی حجہ کی تھی | کہتے پچاگن تھے اسے ہندی میں پیر دیا
عقب اس خسروِ ثانی کے کیا سالِ وصال | آئی ہاتف کی یہ آواز کہ "خوش فکر مرا"

۱۲۵۳ھ

۲۴- مادۂ تاریخ فدا علی عیش لکھنوی کے لیے شاد لکھنوی کے قطعہ کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

شاد بزد چوں پای فنا شد سالِ وفاتش مضاف
غسلِ عرفی، حلۂ جنت، حورِ بہشتی، عیشِ جناں

ادھر محمد علی خاں اثر رام پوری کے ایک مضمون سے یہ جملہ دبدبۂ اخبار دبدبۂ سکندری رام پور ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ نقل کیا ہے۔

"منشی فدا علی عیش لکھنوی بعمر ۷۲ سال بہ ہفتۂ گزشتہ ..."

لیکن اسی تاریخ لطیف کا پہلا شعر نقل نہیں کیا جس سے دن کا علم ہوتا ہے اور اس کی مدد سے صحیح تاریخ بھی دریافت ہو سکتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

عیش سخنور روز دوشنبہ چوں بہ ذی قعدہ برد
جل روحش گشت پدیدہ گئے ارم زیں دارِ جہاں (تاریخ لطیف ۱۸۲)

میں عرض کروں گا کہ ۲۴ ذی قعدہ کو یک شنبہ تھا، اس رعایت سے ہفتۂ گزشتہ میں دوشنبہ ۸ ذی قعدہ کو ہوا اور اس طرح عیش کا انتقال دوشنبہ ۸ ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ کو ہوا۔ رشید حسن خاں لطیف کے پہلے شعر کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے تاریخ بتانے میں ناکام رہے۔

۲۵- قدر بلگرامی پر حاشیے میں دیباچۂ کلیات قدر سے کام لیا ہے لیکن تاریخ لطیف ص ۱۸۸ پر درج شدہ قطعہ تاریخ گفتۂ غلام حیدر عشرت گرامی شاگرد قدر کے ان شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

روز یک شنبہ و بست و سوم ذی قعدہ
فوت کرد آں شے تسلیم سخن داد دیلا

سندِ رحلت او داشت بہ مضمون سرِ نوشت
شُد رحلت مدحت بہ عدم رفت ز دُنیا شد

۱۳۰۱ھ

۲۶۔ محمود قمر بدہمکے ایک شعر سے نکالا گیا ادہ تاریخ بھی تاریخ ادبیت ص ۱۸۹ پر درج ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کی حیثیت کی
طرف توجہ نہیں دی ۔ وہ شعر یہ ہے :

بہاد آئی ہوئی ہے تربت کی تربت پہ پیدا ہے
یہاں ہر پھول جھانکے کربلا کے دیوانے آتا ہے

۲۷۔ باقر علی خاں کامل کا قطعہ تاریخ از سالک تاریخ ادبیت ص ۱۹۱ پر درج ہے۔ اس کے آخری شعر پر رشید حسن خاں نے بھی توجہ
نہیں دی ہے :

یہ بھی نوحہ ہے یہی تاریخ ہے
نوجواں باقر علی خاں حیف ہے

مخطوطے میں اعداد ۱۳۳۳ھ درج ہیں جو اس مادے سے برآمد نہیں ہوتے۔ اس غلطی کی طرف مرتب صاحب نے مخطوطے کے
صفحہ ۱۹۱ پر جہاں یہ قطعہ درج ہے ایک حاشیہ لکھ کر اشارہ کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

"یہ اعداد سہواً غلط درج ہوئے ہیں مصرعے سے ۱۲۹۳ھ نکلتے ہیں اور یہی تاریخ وفات ہے مرحوم کی"

رشید حسن خاں نے اس غلطی اور تصحیح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جبکہ وہ تین بار یہ اعداد کو غلط سمجھ کر نوٹ لکھ چکے ہیں ان مثالوں
کے لیے دیکھیے زیرِ نظر مضمون کا نمبر ۵، ۶، ۷۔

۲۸۔ حکیم سید مہدی کمال کا دن اور مہینا دریافت کرنے کے لیے رشید حسن خاں نے تذکرہ کا صاحب ادیب سے کام لیا ہے اور تاریخ
ادبیت (۱۹۵) کے درج ذیل قطعے سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے جو جعفر علی خاں رئیس شمس آبادی نے کہا ہے۔

کرد تفحص کمال شاعر نازک خیال
سید مہدی علی جائے نشین جلال
رفت چو زیر زمیں گفت مورخ چنیں
آہ صد افسوس باد ماہ گشتہ زوالِ کمال

۱۳۲۹ھ

۲۹۔ میر مونس لکھنوی کا مادہ تاریخ از منیر نقل کر کے حاشیے میں آپ نے اپنے حوالے سے لکھا ہے۔
"میر محمد نواب مونس خلف میر خلیق برادر انیس۔"
لیکن تاریخ ادبیت (ص ۲۱۹) پر نقل شدہ قطعہ تاریخ از صفات کو کام میں نہیں لائے جبکہ اس قطعے سے ماہِ وفات"

اور تاریخ سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مزید دو اشعار یہ ہیں:

در مہ شوال کرد از درد دل فوز از وفات
در شب جمعہ دل احباب گشتہ دردمند

آہ قبل از نصف شب ثانی عشر از ماہ بود
کاں زباں دان جہاں را شد زباں یکبارہ بند

بہر سال ارتحالش را بسنجیدہ صفر گیر
وادکن مقلوب میم و نون ہم سین را دو چند

۱۲۹۲ھ

۳۰۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا مادۂ تاریخ از قمر سندیلوی یوں نقل کیا ہے:

ہے سراپا ہیں علم و فضل و ہنر

اور اعداد ۱۳۲۰ھ بتلائے ہیں۔

لیکن ان الفاظ سے یہ اعداد برآمد نہیں ہوتے۔ دراصل یہاں رشید حسن خاں کا سہو ہے اور صحیح مادۂ تاریخ کے الفاظ اس طرح ہیں:

ہے و سراپا ہیں علم و فضل و اثر

۳۱۔ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کا قطعہ تاریخ وفات جو امیر مینائی اُستاد دربار رام پور نے کہا تھا۔ تاریخ لطیف (ص ۲۳۶ - ۲۳۹) میں نقل ہوا ہے اُس سے مادۂ تاریخ رشید حسن خاں نے انتخاب کیا اور کلب علی خاں پر حاشیہ لکھتے وقت اس قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار کی طرف رجوع نہیں کیا۔

شاغل ذکر و نماز و عامل حج و زکوٰۃ
پیرو شرع حبیب خاص رب العالمین

زانکہ اندر عہد او شد رام پور ہم پور
مصطفیٰ آباد شد در دور او ایں سرزمیں

در ہزار و دو صد و پنجاہ پیدا گشتہ شد
در ہزار و دو صد و ہشتاد و یک مسند نشیں

در ہزار و سہ صد و چار از جمادی الآخرہ
بست و ہشتم چارشنبہ بر ساعت چارمیں

نگراں نوڈ کورس رحمت سے عہدہ دار گروہ

ذرہ دین برداشت مذکیار انقلاب تیش

تحفش کریم خاں حسرت سراج مرحوم

مخاطب گاہ ماہی اسلام امیر المومنین

(۱) معرض التوا کی وجہ سے رشید حسن خاں موفلت کا وقت دیں ہو دو تاریخ نہیں بتا سکے نہ پابندی ہو صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ ادا کرتے۔

مندرجہ بالا مثالوں کے ذریعے رشید حسن خاں کی اصول پسندی اور موضوع سے بے توجہی پر گفتگو کرنا تو مشکور کام بھی نہ دینا چاہئے۔ یہ امر میرے لیے ناپسندیدہ تھا مگر میں نے اس کو اس لیے کہ ایک پیلی تنقید کے خلاف جس کا احتجاج کرنا ضروری ہے جو عام پر چیار اور صورت مسائل نتائج پیدا کرتا ہے۔

مجھے امید بھی ہے اور میری یہ درخواست بھی ہے کہ رشید حسن خاں جیسے اس اقدام پر صحت مند ذہن و فکر کے ساتھ یہ غور فرمائیں گے کہ اگر وہ اپنے ایک مضمون میں بہ حیثیت موضوع پر لکھا گیا ہو تو فاحش غلطیاں کر سکتے ہیں تو انھیں دوسرے لکھنے والوں سے احتیاط اور توجہ کا بس حد تک مطالبہ کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ ایسی صورت میں جب کہ وہ طالب علم سے کام کرتے ہیں انھیں بھی مطالبے کا حق پہنچتا ہے یا نہیں۔

عہد جدید کے شاعر کا ماڈل ۔ شاعر ندیم

طاہر ایم سید

ہر فنکار اپنی تخلیق سے پہلے اگر وہ کسی حد تک بھی اپنے فن کا وفادار ہے اُس خیال کو جسے وہ کاغذ یا پتھر کے سپرد کرنا چاہتا ہے، سہانے سپنے ذہن سے گذرتا ہے کوئی خیال اگر یکا یک ہی ذہن میں آجائے تو وہ اپنے اندر اتنا حسن نہیں رکھ سکتا، جتنا ایک صبر و ضبط کی منزل سے گذر کر خیال منطقی پیکر اختیار کر کے سادہ پتھروں پر نقش و نگار کی صورت میں اُبھر کر حاصل کر لیتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جو فنکار اپنے آپ کو اس دشوار گذار اور صبر آزما تخلیقی عمل کے حوالے نہیں کرتا، وہ ممکن ہے وقتی طور پر اپنی جانب دُنیا کو متوجہ کر لے مگر اُس کا کام اور نام مستقبل میں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکتا۔

قطعہ فرش ہما نہ تراود نہ دے
کشش نہ گیری و در اندیشہ فشاندے نہ ہی

اس ماخذ کو اب بہت کم لوگ پاتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے آپ سے یہ شکایت اکثر و بیشتر رہی ہے کہ میں اپنے خیال کو جلد سے جلد شعر یا پتھر میں تشکیل پایا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے اپنے تصور کو جسم دینے سے پہلے مہینوں سانس لیتی ہوئی دُنیا میں تلاش کیا ہے۔ کبھی میری تلاش مجھے بل بھی گئی ہے کبھی نہیں بھی ملی ہے، اس تلاش کا معاملہ ایسی صورت میں کچھ اور بھی نازک ہو جاتا ہے جب فنکار اپنی تخلیق کے ذریعے کسی خاص تھیم (theme) یا کسی خاص عہد (era) کو نمائندگی دینا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے مواقع کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا فنکار کی صلاحیتوں سے زیادہ اتفاقات پر مبنی ہے۔ یہ دو آنکھیں بھٹکتی رہتی ہیں مگر وہ چہرہ نظر نہیں آتا جس کو دیکھ کر زبانہ پکار اُٹھے،

ہاں خود سے سُنتا یہ صدا کہ بول رہی ہے

فنون لطیفہ کی تاریخ گواہ ہے کہ فنکار کی جستجو اس کی منزل کے نشانات کا کام دیتی رہی ہے اور ایک سچے اور پختہ فنکار کو ہمیشہ اپنی ناکامیوں میں کچھ کامیابیاں اور کامرانیوں کے اُفق نظر آتے ہیں۔ ہر دُھند سے روشنی کی ایک نئی کرن پھوٹی ہے اور ہر تاریک رات ایک نئے دن حقیقت کی ایک نئی صبح بن کر نمودار ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہوتا ہے جب فنکار کے دل میں تمنا ایک پیاس کی طرح ہو، ایک یقین اور ایک ایمان کی طرح ہو۔ سچائی، یقین اور اس کے ساتھ استقلال جیسے دُنیا کے ہر بڑے ہنر کی ضمانت ہے اسی طرح فنکار اور اُس کے فن کی بقا کی بھی ضامن ہے۔ تلاش کا یہ سفر کبھی منزلوں منزلوں ہوتا ہے اور راہی کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں دیتا کہ کہیں اُس کے پاؤں تھک تو نہیں گئے، اس کی تمنا کمزور تو نہیں پڑ گئی۔ عمریں بیت جاتی ہیں اور یہ تلاش

ایک وقت کے بعد ہر فنکار اس کے فن میں الجھ جاتا ہے۔ یہ بات فنکاروں کے معاملے میں کہ جو ہمیشہ کسی کی
کی تلاش اور جد و جہد وقت کے ختم ہونے تک جاری رہتی ہے۔ یہ بات شاید کہنے کی ضرورت ہے کہ کبھی کبھی یہ
ہے کہ فنکار جس تلاش کے لیے اپنی زندگی تج دیتا ہے اور جس حسن کی کھوج میں اپنے شب و روز کھو دیتا ہے وہ حسن خود اس کے
نزدیک ہوتا ہے جیسے اس کی شہ رگ۔ کبھی کسی صحت مند لمحے میں اپنی شہ رگ کی آواز نہیں سنی اور اس کی حرکت کو محسوس نہیں کیا۔
محض اس کی انگلیاں تلاش کرتی ہوئی اسے چھو لیتی ہیں۔ حالانکہ یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ اگر اس کی آواز بند ہو جائے اور اس کی
حرکت ختم ہو جائے تو یہ حقیقت اور خواب کی طرح ایک خواب ہو جائے۔

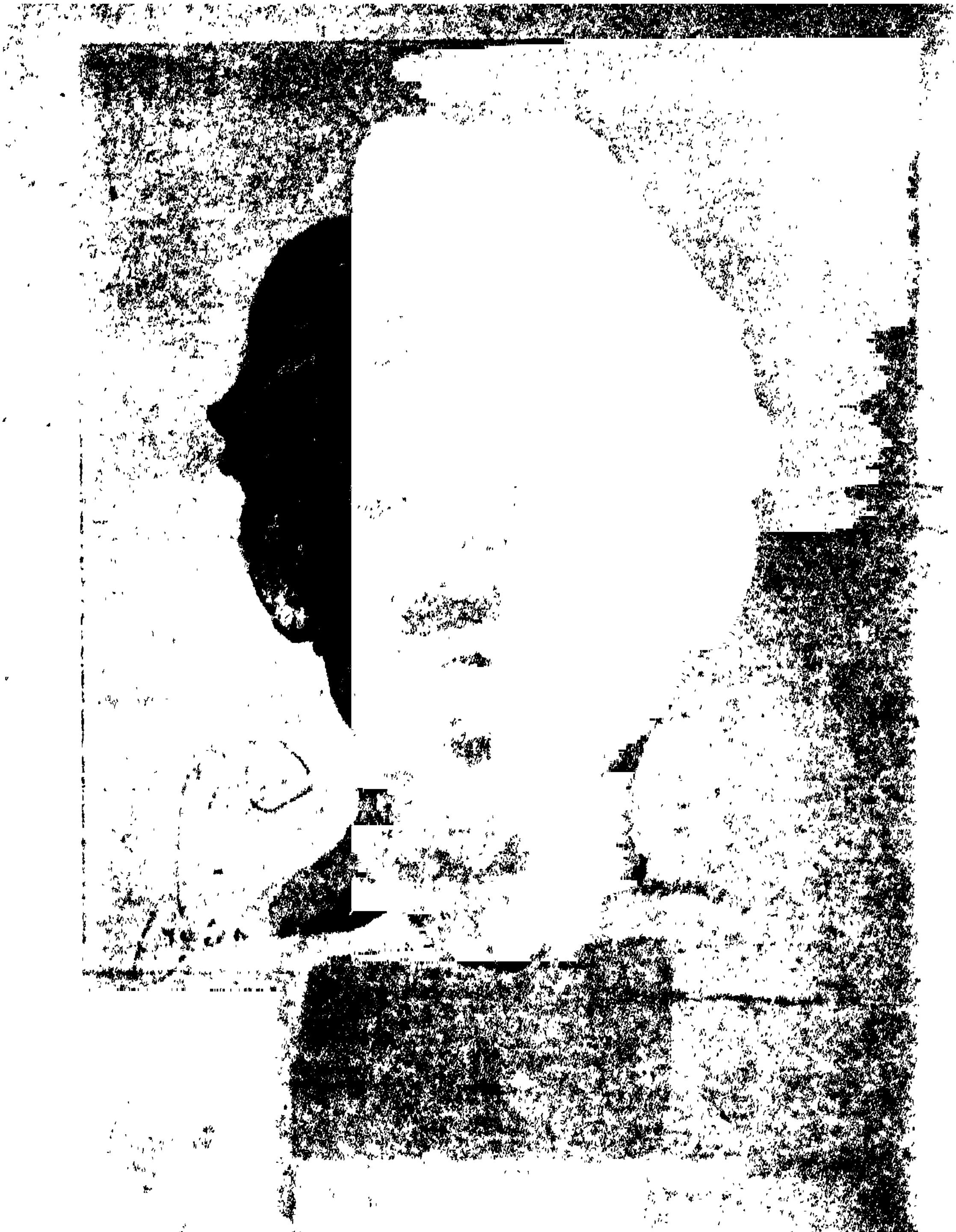
یہاں حسن کو فن اور میرے سفر میں سے پہلے میں ہر چیز حسین ہے جو ایک فنکار کے فن کا موضوع ہو سکے۔ اس کے پیچھے
میں بھی حسن ہے اور اس کے فلسفے میں بھی۔ جو پھول کا احاطہ بھی ہے اور ستاروں کا آسمان بھی۔ اس کے لیے بہتے ہوئے دریا کی روانی میں بھی حسن
ہے اور پانی کے بے ترتیب تڑپنے اور چٹانوں سے ٹکرانے میں بھی حسن ہے۔ اس کے لیے بکھرے بالوں کی پیچیدگی میں بھی حسن ہے جس میں گوری اپنے
پیتم سے ملن کی آس کے گیت گاتی ہے اس کے لیے بجلی کی تڑپ میں بھی حسن ہے جس سے آشیانے جلتے ہیں اور گوری کا دل بھی دہل جاتا
ہے۔ حسن اس کے نزدیک حقیقت کا دوسرا نام ہے اور حقیقت سیاہ اور سفید دونوں ہوتی ہے وہ نرم و نازک بھی ہے اور
تند و گراں سیل بھی۔

بڑا حسرت ناک وقت ہوتا ہے وہ جب فنکار کو یہ علم ہو جائے کہ جس حسن کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا وہ پہلے ہی سے اس کے
پاس تھا اس سے تشنگی کا احساس اگر وہ کچھ ہو بھی تو ختم ہو جاتا ہے اور پھر فنکاروں کے لیے اس حسن کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔

میں اپنے آپ کو فنکار نہیں کہتا یہ بڑی جرأت کی بات ہے اور جرأت بھی جو گمراہ کرنے والی ہو۔ کبھی کبھی کوئی تتلی اس خیال
کی میرے دماغ میں آ جاتی ہے تو میں مریم کے بیٹے کی طرح اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اپنے دل کے بوجھ کو کم کر لیتا ہوں اور اس کے سبب مجھے
آئندہ کے لیے کام کرنے کا روشن اور صاف ستھرا راستہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ میں نے مٹی سے کھیلنا شروع کیا ہے۔ اس کھیل میں عجیب عجیب شکلیں اور صورتیں بن
جاتی ہیں جن سے میں خوش بھی ہو لیتا ہوں اور مطمئن بھی اور جنہیں سجا اور سنوار کر رکھ بھی لیتا ہوں اور ان پر میرا پیار ٹوٹا پڑتا ہے لیکن
وقت کی ایک گردش ایسی بھی آتی ہے جب میرے کھلونوں اور میری مخلوق کو مجھ سے شکایت ہوتی ہے کہ میں نے ان کی طرف پیار بھری
نظروں سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کی ترتیب میں بے ترتیبی آ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آپس میں خفا ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔
یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ کل جو میری منزل تھے آج نشانِ منزل ہو گئے ہیں۔

یوں تو سفر کا ہر قدم ماضی اور راستے کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہوتا ہے جو ایک دفعہ قائم ہو گیا تو قائم ہو گیا لیکن پھر بھی ہر
قدم پاؤں کی گرد پر کوئی نقش نہیں چھوڑتا۔ ان میں سے چند نشانات ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ماضی کے پردے میں چھپ جانے کے
بعد بھی راہی کو یاد آتے رہتے ہیں اور ان پر چلتے ہوئے جو خود کو روشنی پہنچا کر مستقبل کی۔ بڑا سورما وہی سفر جاری رکھتا ہے
جو پھر اور ان کی کامرانیاں جو اس کی فتح مند یادیں ہیں اس کا احساس رکھے۔



نہیں بیٹھ کے اس کھیل میں اپنے ہاتھ سامنے اپنے چہرے پر اگرچہ کم سہی پھر بھی ماہ و سال کی اُڑتی ہوئی گرد و غبار کی ہلکی سی پرت پڑے دیکھتا ہوں اور یہ سوچ رہا ہوتا ہوں کہ میں نے اس مٹی اور پتھر کے کھیل میں کیا پایا۔ اور کیا کھویا ہے۔ کہنے کی تو ایک طویل داستان ہے۔ میں سناؤں تو کون سُنے گا اور کیوں سُنے گا۔ پانے کی بات کروں تو مجھے خود شرم آتی ہے۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں !

بہرحال بقدرِ ظرف اور بقدرِ شوق میں نے کوشش کی ہے کہ میں اگر فن کی دیوی کے سامنے سُرخرو ہو کر نہ جا سکوں تو بھی کم سے کم تہی دست و تہی دامن تو نہ جاؤں اور مجھے حجاب [illegible] وقت یہ احساس ضرور رہے کہ میں نے اپنی توانائیوں کو فن کے لیے صرف کرنے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

میں نے خیال سے حقیقت تک ہر قسم کے کھلونوں کو جسم دیا ہے۔ میں ان میں سے کئی کھلونوں سے آج بھی خوش ہوں جیسے بہت سے کھلونوں پر نادم ہوں کہ میں ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ میں حُسن سے لفظ معنی اور پیکر ہر شکل میں لطف لیتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے الفاظ پر کوئی قدرت نہ ہو مگر پھر بھی اس رشتے سے جو فن کو فن سے ہوتا ہے میں نے ہمیشہ الفاظ و معانی کے فنکاروں سے اسی طرح پیار کیا ہے جیسے جسم اور صورت سے۔

شاعری اظہارِ فن کا ایک لفظی اور معنوی رُوپ ہے چونکہ ہر فن اپنے اظہار سے پہلے اور اظہار کے ساتھ ساتھ بھی اپنے خالق میں جلوہ گر ہوتا ہے اس لیے میں نے تخلیق کو خالق میں ڈھونڈنے اور پانے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی کا شعر بارُود کے دھوئیں، مارچ کرتی ہوئی فوجوں کے بھاری بھرکم قدموں کی دھمک، مضطرب دل و دماغ کی کشمکش اور جسم و رُوح کی ساری پاکیزگیوں اور علامتوں کا مظہر ہے۔ اس لیے اس کے خالق میں بھی ان سب کا سُراغ ملنا چاہیے۔ اس کے چہرے سے حکمتِ آدم اور اس کا عزم و حزم و استقلال بھی ظاہر ہو، اس کے چہرے سے چاند کو چھونے کا قصہ بھی پڑھا جا سکے اور اس کی آنکھوں کے خلا کو دیکھ کر ہیپل پی جانے کی بات بھی یاد آ جائے۔ وہ جوانی اور حُسن کے تقاضوں اور مطالبوں سے دبا ہوا بھی ہو، بلکہ وہ اس کے ماحول میں پرورش پانے والے خطوط بھی اپنی پیشانی پر ابھارے ہوئے ہو۔ جس سے نفرت اور محبت پیدا کرنے والی حیات کی تلخی کو سنگ کا سینہ دیا جا سکتا ہے۔ جیسے اس کی خاموش مگر جلتی ہوئی عاشقی نے صبر و ضبط کے وہ پیمانے ملا کیے ہوں جس سے دُوسروں کی پکارتی ہوئی عاشقی کو تسلی ملے۔ جس کے چہرے پر اضطراب، خندہ، تیغ اصیل بن جانے اور جس کے ہنسنے کا اطمینان گریہ بہار۔

کسی نے کہا تھا بہت سے ایسے شاعر ہوتے ہیں جو عمر بھر شعر کہتے رہتے ہیں مگر ان کے قریب سے شاعری کا دُور دُور پتہ نہیں چلتا اور کتنے ہی ایسے غیر شاعر ہوتے ہیں جنہوں نے کبھی ایک مصرع موزوں نہیں کیا ہوتا لیکن انہیں دیکھ کر سوائے اس کے اور کوئی خیال ہی نہیں آ سکتا کہ وہ شاعر کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں ——— یہاں میں جس کی بات کرنے جا رہا ہوں وہ شاعر مجسّم شاعر نظر بھی آتا ہے۔

مگر یہ کوئی بیسویں صدی کے پہلے شاعر کا قصہ ایک لکھنؤی بیٹھک کا ہو سکتا ہے اس خلائی دور کے انسان کا شاعر یا نیم
پختہ دنیا کی جو شکل ہے جیسا میں نے ابھی بیان کیا۔ کئی سالوں سے یہ وہ آئیڈیل ساز جو اس شاعر اپنے سے بیگانہ گمشدہ،
آشنا، عہد حاضر کے افکار و اوہام کے سامنے میں چپ چاپ بیٹھا اپنے بستر پر وقت کی ساری کرم فرمائیوں کے آثار دیکھتے رہا ہو
کی خاموش پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا۔ ان چپ چاپ پگڈنڈیوں سے حقیقت کی شاہراہ پر اُسے لا کھڑا کرنا بھی آسان نہیں معلوم ہو
اور کئی بار مجھے شکست پر شکست اور پسپائی پر پسپائی اٹھانا پڑی۔ میں اپنے اس خیالی شاعر کو گوشت پوست کے پیکر میں ڈھونڈ رہا
تھا میری آنکھیں بھٹک رہی تھیں، بہرے ہاتھ کئی بار مٹی کی طرف بڑھتے تھے، ایک خاکہ بناتے تھے اور مٹا دیتے تھے لیکن مجھے نہیں
معلوم تھا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

بہت پاس ہوتی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

جسے میں نے اتنا ڈھونڈا، تلاش کیا، اور جس کی خاطر میں اتنا پریشان اور آوارہ رہا وہ خود میرا دوست شاعر ندیم تھا۔

عہد جدید کے شاعر کا جو نقشہ میرے خیالوں میں بسا ہوا تھا اس کو مٹی میں ڈھال دیا، مگر میں اپنی انا (Ego)
سے کام لوں تو کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے فن پاروں کے لیے ماڈل ضرور ہونا چاہیے۔ دُنیا کے سارے بڑے اسکیچ
یا پورٹریٹ جنہیں کوئی مقام ملا، کسی نہ کسی ماڈل کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ لیونارڈو دا ونسی (Leonardo da Vinci)
نے مونالیزا (Mona Lisa) کو، رافیل سانزیو (Raphael Sanzio)
نے مریم کو بنانے کے لیے لاولٹا (La Valta) کی جیتی جاگتی صورت کا سہارا لیا۔ ڈوناٹیلو (Donatello)
نے سینٹ جارج (St. George) کو بناتے وقت اپنے ایک دوست کو سامنے بٹھا لیا۔ اور ۵۰۰ قبل مسیح
ایک یونانی بت تراش فیڈیاس (Phedeas) نے تو خود اپنی ہی شکل کے نقوش اپنے اسکیچ میں اُبھار دیے جس
پر وہ سزا کا مستحق بھی قرار دیا گیا اور اُس کی محنت کا سارا ذخیرہ اس سے چھین لیا گیا۔ مائیکل انجیلو (Michaelangelo)
پندرھویں صدی کا یہ نازک استاد مانا جاتا ہے اس نے بھی ڈیوڈ (DAVID) کو بناتے وقت اپنی تخلیق میں اپنے ایک شاگرد
اور چند دُوسری صورتوں کے خطوط کو اپنے احساس سے ترتیب دیا تھا۔ اُس کا بنایا ہوا یہ مجسمہ آج بھی ہر لحاظ سے مکمل کہا جاتا ہے اور
جوانی اور بہادری کا نشان ہو گیا ہے۔ سترھویں صدی کے مشہور آرٹسٹ ریمبراں (Rembrandt)
کی تصویروں میں اس کی بیوی ساسکیا (Saskia) کے حسن کا پرتو ملتا ہے۔ اسی طرح رینوا (Renoir)،
گویا (Goya)، کورٹ (Corot)، ڈیگاس (Degas) وغیرہ کی تخلیقات کے
آئینے میں ان کی محبوباؤں کے عکس پائے جاتے ہیں۔

حقیقت پسندانہ (Realistic) کام کرنے والے تو بغیر کسی ماڈل کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے بلکہ
جنہیں (Romanticists) کہتے ہیں وہ بھی بہت سے حقیقی مناظر اور حقیقی تصویروں کو ذہن میں اتارنے کے بعد اس لائق ہو سکے ہیں،
مزید یہ کہ جو لوگ اپنے آپ کو ماڈرن آرٹسٹوں میں شمار کرتے ہیں اور (Impressionism) یا (Expressionism)

[illegible] کے علمبردار ہیں۔ اپنی تخلیقات میں ان چیزوں کا سایہ پڑنے سے نہیں روک سکتے جو کسی نہ کسی طور انھیں عزیز ہیں یا جن کا دخل ان کی زندگی میں ہے۔

انیسویں صدی کا مشہور آرٹسٹ وان گاف (Van - Gogh) جس کا نام آرٹ کی دنیا میں ایک انقلاب لانے والے کی حیثیت سے بے حد شہرت رکھتا ہے۔ ناکام محبت بھی تھا، ناکام دولت بھی اور اپنے جیتے جی ناکام شہرت بھی رہا اس نے بھی کئی جگہ اپنی محبوبہ اریلا ([illegible]) کی تصویر کشی کی ہے۔ آج بھی آرٹ کے ذریعے پیغام دینے کے لیے ضروری ہے کہ آرٹسٹ کے پاس اپنے گرد و پیش کے بارے میں گہری بصیرت اور تجربات کا ایک سلسلہ موجود ہو۔ آج کے دور کے فنکار کے لیے یہ گرد و پیش اور یہ تجربات دل و دماغ دبا گئے۔ ہر ایک ایبسٹریکٹ خیال کی اصل اسی دنیا میں موجود ہوتی ہے ممکن ہے وہ سمجھ میں نہ آئے اور تحت الشعور کی کال کوٹھڑی میں بیٹھی ہو مگر وہ ہوتی ضرور ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔ خوشی اور غم جو بظاہر محسوسات اور واردات میں اس طرح سے ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر ان کا مظہر نہ ہو تو احساس بھی آسان نہیں۔

آرٹسٹ کا موضوع اس کے دماغ کی نس نس میں بسا ہوتا ہے یا بسا ہونا چاہیے۔ وہ اس کا تجزیہ کر پائے یا نہ کر پائے یہ تو اس کی خوش نصیبی ہے کہ جس موضوع کو وہ اختیار کرنا چاہتا ہے وہ اُسے کہیں نہ کہیں ٹکڑا نظر آ جائے۔ کیا یہ میرے لیے مسرت، انبساط اور فخر کی بات نہیں ہے کہ مجھے وہ سارے اوصاف صورت کے اور معنی کے جو کہ میں عہد جدید کے شاعر کے بشرے میں دیکھنا چاہتا تھا ایک جا مل گئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے غیر شعوری طور پر شاعر ندیم کے چہرے کو اپنے تخیل کے تصویر خانے میں سجا رکھا ہو اور ایک عرصے تک میں یہ شعور پایا ہو کہ یہ میرا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا چہرہ ہے لیکن اس مسرت کا احساس ایک فنکار ہی کر سکتا ہے جو مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے اس کے چہرے میں اپنے تصورات میں بسائی ہوئی ساری امانتوں کو ایک ایک کر کے محفوظ پایا۔

اپنی پہلی فنکارانہ پہچان کے بعد میں نے اُسے بار بار دیکھا اور اُسے یہ بتلائے بغیر کہ وہ میرا موضوع بننے والا ہے میں نے اس سے مضمون باتیں کیں، اس کے شعر سنے اس کی صورت کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا اس کے چہرے کو جی لگا کر دیکھا اور اس تناسب میں نئی صدی کے غمے، خوشیاں دیکھیں، حق اور ناحق دیکھیں۔ اس کے چہرے میں مجھے نزاکت نظر نہیں آئی مگر جلال ملا۔ اس میں آج کی قوموں کے ساتھ مستقبل کی بھیانک جنگ کا خوف و ہراس نظر آیا جو ہر دم ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ اس کے چہرے میں مجھے اس جنگ کی کم وقتی کا سراغ ملا اس جنگ سے نپٹنے کا حوصلہ بھی ملا اور فتح کے یقین کی چمک بھی ملی۔ مجھے عزم و استقلال بھی ملے اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ستاروں سے آنکھوں کو مستقبل پر گاڑ گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میرے اسکیچ کی سطح کھردری ہے۔ چہرے کے تاثر کو بنانے میں اس کی بڑی بڑی غلافی ساحرانہ آنکھوں کے گرد مسرتوں کے حلقے اور گالوں کے گڑھے مددگار رہے ہیں۔ گھنے بالوں کی بے ترتیبی بھی اس عہد کی [illegible] بن گئی ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ نئی صدی کے شاعر کے پاس خوشی ایک ہے غم ہزار ہیں۔

میں نے اپنے ماڈل کا تعارف کرا دیا۔ یہ تعارف ظاہر ہے کہ صورت کا زیادہ ہے معنی کا کم۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے صرف صورت کو سامنے رکھ کر۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس سے مختلف باتیں کی ہیں اس کی تخلیقات کو سنا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور اسے کہنے کا بے پناہ سلیقہ ہے۔ اس کے یہاں گہرائی اور گیرائی دونوں ہیں۔ اس کے باوجود وہ جب

اپنے تسلسلات کے باوجود شاید اس کو فقد نہیں ہوتا کچھ نہیں کہتا۔ اس پر خاموشی کے طویل وقفے پڑتے ہیں اور ایک اجلی خاموشی میں سالہا سال مستقر ہیں جو پیشانی پر اگر شاید اس کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا ہے مگر غیب سے جیسے اچانک اس کا کلام پھوٹ پڑتا ہے اور وہ نئی صدی کے دکھوں کے ساتھ ابھر آتی۔ میرا گمان ہے (ممکن ہے وہ انکار کرے) کہ شاید کسی خاموش مسرت نے اسے سب واہموں سے بے نیاز کر دیا ہو دسے دی ہے۔ جو رہا کہ وہ بے تاثیر بغیر کسی درد کے پیدا نہیں ہوتی۔

یہ کہنے دیجیے کہ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ اس کی یہ میری نافہمیت ہے بلکہ صرف اپنے آدمی کو جاننے کا دعویٰ ہے۔ وہ اس کی گفتار میں اسے تلاش کرنے کا کام وہ میرا ہی ناقد کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ اس لیے یہ سطریں لکھتے وقت بھی اس کی ایک نظم کے ابتدائی مصرعے پکار پکار کر گونجتے سنائی دے رہے ہیں۔

جسم کی پیاس تو ہر شہر میں بجھ سکتی ہے
ذہن آوارہ کو منزل کا پتہ دو کوئی

دیکھنا ہے اس کھوج میں اس کا ساتھ کون دیتا ہے۔

سرشار بہ حیثیت انشائیہ نگار

ڈاکٹر احراز نقوی

انشائیہ نگاری پر قیامِ پاکستان کے بعد اچھا خاصا کام ہوا ہے۔ تحقیقی انداز کا تنقیدی نوعیت کا اور تخلیقی پیمانے پر بھی کام ہوا اور ادھر چند برسوں سے منطقی اور فکری انداز کے مذاکرے اور بحثیں بھی ہو چکی ہیں۔ ہندوستان سے دو پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ فنی حدود، ہیئتی قیود اور فکری نمود کے سلسلے میں بے شمار نکتے باعث نزاع بنے ہوئے ہیں۔ یہ تو تنقیدی سطح کی بات ہے۔ تحقیقی حساب کتاب میں جہاں یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ ہمارا پہلا انشائیہ نگار کون ہے؟ یا ہمارے ادب میں انشائیہ نگاری کا سلسلہ کب سے اور کہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں ہمارے بہت سے انشائیہ نگاروں کے نام بھی فہرست سے مفقود نظر آتے ہیں۔

اُردو انشائیے کے موضوع پر کسی نقاد اور محقق نے اپنی بحث میں غالباً سرشار کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہی سبب ہے کہ اُردو انشائیوں پر تمام انتخابات ہو چکے ہیں مگر سرشار کا کوئی بھی انشائیہ کسی بھی انتخاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ دراصل وجہ اس کی یہی رہی کہ سرشار کے انشائیوں کو دریافت ہی نہیں کیا گیا اور نہ اس تصور کو ہی روا رکھا گیا کہ سرشار انشائیہ نگار ہو بھی سکتے ہیں۔

سرشار کو ناول نگار کی حیثیت سے میں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع بنایا اور مختلف تحقیقی مرحلوں کو سر کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سرشار پر تحقیق ابھی کئی پہلوؤں سے باقی ہے۔ ہمارے یہاں سرشار پر کام کرنے والوں نے بڑی ہی آسانی سے کام لیا ہے اور تحقیقی نوعیت سے تو کچھ کام ہی نہیں ہوا ہے اور جو کچھ تحقیقی سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ بہت کچھ مفروضوں پر استوار ہے۔ غلط۔ اور گمراہ کن ہے۔

ہمارے نقادوں نے ہمیشہ سرشار کو ایک ناول نگار سمجھا اور فسانۂ آزاد سے آگے ان کا قلم نہیں بڑھا۔ بہت کم ہمارے پاس ایسی تحریروں کا سرمایہ ہے جن میں اس کے علاوہ بھی کچھ ملے۔ مگر۔۔۔

۱۔ سرشار بحیثیت انشائیہ نگار

۲۔ سرشار بحیثیت شاعر

۳۔ سرشار بحیثیت صحافی

۴۔ سرشار بحیثیت مترجم

۵۔ سرشار بحیثیت نقاد

۶۔ سرشار بحیثیت علمی اور معلوماتی مضمون نگار۔

ان موضوعات پر کہیں کوئی مضمون تو کجا ضمناً یا برسبیلِ تذکرہ بھی ذکر نہیں ملتا۔

سرشار بحیثیت انشائیہ نگار —— یہ میرا تحقیقی وجدان تھا جو مجھ میں ہر وقت اسی امر پر مُصر تھا بلکہ ملامت کرتا تھا کہ سرشار نے یقیناً انشائیے لکھے ہیں جب ہم نے اپنے کسی مضمون میں خود اس کا ذکر بھی کیا تھا اور یہ گمان ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ سرشار صرف کچھ تراجم اور ناول نگاری پر اکتفا کر سکتے۔ یہ ان کے زمانے کی روایت کے خلاف تھی۔ ذرا ۱۹ویں صدی کی اخلاقی صحافت پر نظر کیجیے۔ اردو کا سب سے پہلا ماہنامہ خیر خواہِ ہند (۱۸۳۷ء) ماسٹر رام چندر سے لے کر ۱۹ویں صدی کے سب سے آخری ماہنامے پردۂ عصمت (۱۸۹۹ء)، عبدالحلیم شرر تک تمام ادبی رسالے دو حصوں میں منقسم نظر آتے ہیں اوّل حصہ نظم اور دوم حصہ نثر۔ حصہ اوّل شاعری پر مشتمل اور حصہ دوم نثر پر محیط۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نثری تحریریں کیا ہوتی تھیں؟ ظاہر ہے کہ آج کل کی طرح افسانے، انشائیے، تحقیقی مقالوں کا رواج تو نہ تھا۔ علمی اور معلوماتی مضامین ہی سے صفحوں کی تعداد پوری کی جاتی تھی۔ تنقیدی مضامین برائے نام لکھے جاتے تھے۔

اس سب میں تمام صاحبانِ قلم انھیں موضوعات کو اپنی تحریر بناتے تھے۔ تصوف، الٰہیات، منطق اور فلسفے کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ہیئت اور نجوم وغیرہ موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے جاتے تھے اور تمام صاحبانِ قلم اس میں شریک تھے۔

سرشار نے اپنی تحریر کی بسم اللہ اسی طرح پر کی۔ ابتدا میں مرآۃ الہند، کشمیر درپن، وکیل، ریاض الاخبار، اودھ پنچ اور اس کے علاوہ انگریزی کے کچھ اخباروں میں مضامین قلم بند کیے۔ ان مضامین کو میں ایک عرصے سے تلاش کر رہا تھا۔ تقریباً یہ تمام مضامین ہنوز دستیاب نہیں ہو سکے۔ کچھ چیزیں بے حد مدت بعد ملی ہیں۔ میرا اندازہ ہے سرشار کے یہ تمام مضامین یکجا کیے جائیں تو مختلف نثری اصناف کا ایک بڑا متنوع گلدستہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام تحریریں سائنس، ہیئت، نجوم، معاشرتی، علمی، معلوماتی اور ادبی موضوعات پر محیط ہیں۔ اس نثری سرمائے کو سامنے رکھ کر ہم اردو انشائیوں کا بھی ایک خوبصورت گلدستہ مرتب کر سکتے ہیں۔

نقوش کے اس شمارے کے لیے میں نے چند نمونے سرشار کی تحریر سے انتخاب کر لیے

ہیں۔ دو تنقیدی مضامین ہیں پہلا شاعری سے متعلق ایک چھوٹا سا نزعی مضمون ہے۔ دوسرا نثری صنف پر یعنی ناول کے فن پر تنقید ہے اس مضمون کو سامنے رکھ کر ہم ان کی فنی بصیرت اور ان کے ناول ادراک کا ایک ہلکا سا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تیسرا عشق کے عنوان پر انشائیہ ہے جو ہلکے پھلکے انداز سے من کی موج میں بہہ کر لکھا گیا اور چوتھا مضمون بنی نوع انسان پر ہے جس میں اُردو انشائیہ کا انداز اور بشاشت نظر آتا ہے۔

یہ تمام تحریریں میں نے دبدبۂ آصفی کے ذخیرے سے دریافت کی ہیں۔ دبدبۂ آصفی، مرکشن پرشاد نے نکالا تھا۔ سرشار اس کے اڈیٹر تھے جس کا ضمناً ذکر میں نقوش ہی کے ایک پچھلے شمارے میں چپل نامے کے ذیل میں کر چکا ہوں اور دبدبۂ آصفی پر تفصیلی اور تحقیقی مضمون نقوش کے آئندہ شمارے میں پیش کروں گا۔

عشق

ہائے اس عشق میں رونا ہی نہ آساں نکلا — جس کو ہم قطرہ سمجھتے تھے وہ طوفاں نکلا

عشق کس کو کہتے ہیں اس کا حال کسی چوٹ کھائے ہوئے دل سے پوچھیے۔ وہ دل جو مسلکِ عشق میں فنا ہو گیا ہو۔ وہ دل جو عشق کے صدمے اٹھانے کا جگر رکھتا ہو۔ وہ دل جو عشق کی کڑی منزل میں تھک کے بیٹھ گیا ہو مگر ہمت نہ ہارا ہو۔ وہ دل جو راہِ عشق سرد و گرم چشیدہ ہو۔ وہ دل جو عشق کی بھول بھلیاں بھٹک بھٹک کر کعبۃ اللہ جانے جاتے ترکستان کا ڈھرا پکڑے اور بحرِ اوقیانوس ہو کر خوارزم پہنچنے کو سیدھا راستہ سمجھے۔ وہ دل جس کی زنجیرِ نقشِ سخن کی خوگر ہو۔ وہ دل جو نخچیرِ پُر حوادث ہو کر صیادِ جفا پیشہ کو لاکھوں دعائیں دے۔ وہ دل جو زخمِ پیکاں کے اندمال کے بدلے مرہم کے عوض نمک کا طالب ہو۔ وہ دل جو طبیب کو اجل اور اجل کو مسیحا سمجھے۔ وہ دل جس میں ... کا درد اٹھ اٹھ کے ٹھکانا بناتا ہو کہ اس مقام پر چوٹ لگی تو تڑپنے کا مزہ آئے۔ وہ دل جس پر عشق کا زخمِ کاری پڑا ہو۔ وہ ... جو اس ... کی بقعت اٹھا کر دیں زخم سے قاتل کو چلائے۔ وہ دل جو کسی عشق کے دریائے ناپیدا کنار کے منجدھار میں ہو اور ناخدا ساحل ... جس کا خدا ہی بیڑا پار کرنے تو ہو۔ وہ دل جو عشق کے مرکبِ دل کے زہرِ ہلاہل کو تریاقِ فاروقِ عراق پر ترجیح دے۔ وہ دل جو حنظلِ عشق کو ... پر فوق دے۔ وہ دل جو کوچۂ عشق کا نشیب و فراز دیکھا بھالا ہو، بچپنے ہی سے دایۂ عشق نے گود میں کھلایا، نازو نعم سے پالا ہو۔ وہ ... ترکیب عشق ہو۔ وہ دل جس کی رگ رگ میں عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔

روکھی پھیکی طبیعت کے پیدائش والے بھلا عشق کا حال کیا جانیں۔ اس قسمت جلی اور اس دولتِ لازوال سے ان کو کیا سروکار۔ وہ عشق کو ... ۔ عاشق کو مجنوں خیال کرتے ہیں اور عاشقانہ کلام، عاشقانہ خیالات کو ... کی ... سے ... سمجھتے ہیں۔ یہ ... عقل و دانش ... یت۔ یہ کچھ فرض نہیں ہے کہ کل بنی نوعِ انسان میں ہر فردِ بشر کو ایک ہی قسم کا عشق ہو۔ یہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ عشق کے لفظ کا ... زیادہ تر عورت اور مرد کے عشق پر کیا جاتا ہے بلکہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد کا عورت پر عاشق ہو جانا اور عورت کا مرد پر جان دینا بس اسی کا

م عشق بھی علاوہ محبوب کے ہر چیز سے بلا تخصیص ہے۔ عشق ایک جامع چیز ہے۔ اس کا اس طرح پر شمار کرنا مشکل ہے۔ جیسے انسان کو ہر شے سے مشکل ہے۔ کسی کو گھوڑوں کا شوق ہے۔ اپنی حیثیت کے موافق گھوڑے خرید سکتے ہیں۔ اگر امیر ہو تو ایک طرف کبھی گھوڑے سے اس چیز کی چیز میں انسان آدھا چھپ جائے کسی جانب عرب کے نایاب گھوڑے کہیں کاٹھیاواڑ کے عمدہ جانور خرید سکتے ہیں ایسا کہ کیپ کے اونچے اونچے ویلروں کی قطار ہے۔ بیگم کے تانگے میں دم سے گھسی ہوئی ہے اور قد ہو ری کا کام ہے سب ہیں۔ پہاڑی ایابیں، ترکی مشہور گھوڑوں کی کمی نہیں۔ معلوم ہوا کہ عرب کے گھوڑے کی چال آپ ہی خیر ہیں مگر تختہ گردن ہوتی ہیں۔ بڑا عیب ہے۔ اس عیب کو دور کرنے کے لیے کاٹھیاواڑ کی پرورش ہوتی جوان جوان گھوڑیاں منگوائیں اور عرب کے خوبصورت بچھیروں کا میل ملا کر تیار کریں ان گھوڑیوں سے ملا تو جو بچے پیدا ہوئے ساری خدائی کے گھوڑوں میں فرد۔ غرضیکہ ان کے اصطبل میں ہر طرح کے ترکی، عربی، آدمی، کیپ، پیگو، کاٹھیاواڑ، دکھنی، پہاڑی، چینی ہر قسم کے جانور باد رفتار موجود اور

قدم کا وا ایڑ کا میٹھی پوئی دولکی جست

میں سب ساتھوں میں حرکی اور تیزی لاثانی

دن رات اصطبل میں۔ اسکی سیاہ و سپید۔ شوق ہی نہیں۔ نادری حکم ہو کہیں آتی ہے؟ یہ کبھی نہیں بیان کی اٹھائی گئی۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑ رکھنے اور مکھڑیاں کرنے کو خود تیار۔ سالوتری کی نوکر۔ خود مویشی خصوصاً گھوڑوں کے علاج سے واقف۔ غرضیکہ دن رات اسی میں خیال اور اصطبل۔

بعض آدمیوں کو اپنے بچوں سے عشق ہوتا ہے۔ یوں تو اپنے بچوں سے کس کو عشق نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اصحاب کو اور لوگوں کی نسبت اپنے بچوں سے زیادہ عشق ہوتا ہے۔ شب و روز انھیں کی فکر، انھیں کا خیال، انھیں کے غور و پرداخت۔ عورتوں کی طرح خود پالنا نہلانا دھلانا، اپنے پاس سلانا۔ اگر ذرا پھانس چبھی تو گویا ان کے دل پر تیر لگا۔ یوں ہی سا بدن گرم ہوا اور گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ڈاکٹر پر ڈاکٹر، حکیم پر حکیم آ رہے ہیں۔ پنساریوں اور کمپوڈر آ کے نسخہ ذرا احتیاط کامل سے باندھنا۔ کوئی دوا خراب یا وزن کم و بیش نہ پائے۔ جس چیز پر بچے نے ذرا رغبت کی فوراً مول لے دی۔ جو اس نے کہا وہی ہوا۔ بالکل ہٹ کو کبھی ٹالا نہیں۔

خیر یہاں تک تو خیریت ہے گو اس کی وارفتگی ہیں۔ مگر اس عشق کے ساتھ بچوں کی آئندہ بہبودی کا خیال رکھا تو عشق کو ہم کامل کہیں گے۔ علم و فن کے زیور سے ان کو آراستہ کرنا، پڑھانا، لکھانا، صحبت بد سے بچانا۔ لائق و فائق اتالیق ان کے لیے مقرر کرنا یہ سچا عشق ہے۔ یہ کچھ فرض نہیں کہ ہر بیٹے کا ہونہار لڑکے کو پڑھانے لکھانے ہے۔ ضروری معمولی تعلیم کے بعد کوئی پیشہ سکھانے۔ بڑھئی اپنے بیٹے کو نجاری کا کام سکھائے۔ سنار سناری کے پیشے میں اس کو طاق کرے۔ کسان کا لڑکا زراعت کے اصول سے واقفیت حاصل کرے اور اگر اس کے برعکس وہ اپنے لڑکے کو کوئی کار آمد زبان علم یا پیشہ نہ سکھایا تو لڑکا پڑھ کے گنوار کا گنوار نکلے گا اور سبب ہوا کہ اس کی باپ ماں نے لاڈ میں اس کو خراب کر دیا ہے اور دنیا میں کسی کام کا نہ رکھا۔ اس قسم کے عشق پر حیف صد حیف۔

بر سر لوح او نوشتہ بزر　　جور استاد بہ ز مہر پدر

بعض شوق اس قسم کے ہیں کہ عشق کے درجے کو رفتہ رفتہ پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ان سے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔ بالکل بیکار شوق۔

وہ کون شوق۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ پتنگ بازی، بیٹھے لڑانا۔ ہم کو اس قسم کے شوق سے نفرت ہے۔ کبوتر پالنے جوتا نے پر پامال۔ دوپہر کو جلتی بلتی دھوپ میں چیل انڈا چھوڑ رہی ہے اور آپ کو۔ کو کر رہے ہیں۔ کنی دکھا رہے ہیں۔ مرغ بازی اس سے بھی بدتر ہے۔ ایسا ظالمانہ شوق دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ مرغ بیچاروں کی جان عذاب میں ہو جاتی ہے۔ دو دو پہر گھستے پڑے ہیں جن دن اس شغل پر دنیا و مافیہا کے کل اشغال کو فوقیت دیتے ہیں اور خرچ کرتے کرتے ان کے دھرے اڑ جاتے ہیں۔ پتنگ بازی کار بیکاراں۔ پریوں کو پالنے کا شوق بھی انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتا۔ بشرطیکہ چڑیوں کے ساتھ عشق کا درجہ ہو۔ اور نتیجہ اس کا کیا۔ لینا ایک نہ دینا دو۔ ہاں مگر شوق کے لیے۔ سر پا پنجری، خوش نوا، خوش نغمہ، خوش رنگ طیور رکھے ہوئے تو مضائقہ ندارد۔

عورت کا عشق مرد اور مرد کا عشق عورت کے ساتھ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس سے مطلب اس عشق سے نہیں ہے جو بعض نوجوانوں کو زنان بازاری کے ساتھ ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی عشق میں عشق ہے۔ یہ عشق کا نام بدنام کرتا ہے۔ یہ عشق نہیں ہے فجور و فسق ہے۔ اس شہوت پرستی کو اگر واقعی عشق کہتے ہیں تو ایسے عشق کو عقلا کا سلام۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فہمیدہ آدمی زنان بازاری، ہرجائی، بدکار، [illegible] عورتوں پر کیوں کر لٹو ہو سکتے ہیں۔ آج ایک کی کل دوسرے کی، پرسوں تیسرے کی۔ اس وقت زید کی بغل میں دو دن بعد بکر کی ملکیت۔

شاید ہوس باشد با گلے   کرے با مادش شود بلبلے

عشق سے اس بیہودہ بات کو کوئی سروکار نہیں۔

ممکن ہے کہ کسی مرد کو کسی عورت سے عشق ہو اور وہ عشق پاک ہو اس کو بعض کوتہ اندیش معاملات سے [illegible] ہیں مگر یہ ان کی ناقص عقل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پختہ مغز نہیں ہیں۔ چھوٹے خیالات کے آدمی ہیں اور ان کی طبیعت [illegible] فسق و فجور کے دلدل میں [illegible] حسن اور جنسی ہوتی ہے کہ اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اگر کوئی شاعر غزل جو اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو کسی شاعر و سحر بیان کا کلام سنے گا تو ان پر نشتر کا کام کرے تو بیشک اس کی روح وجد کرنے لگے گی اور عشق کا درجہ ہو جائے گا۔ عام ازیں کہ شاعر جوان ہو یا بوڑھا، حسین ہو یا کریہہ منظر۔ حسن ظاہری کا وہ عاشق نہیں۔ وہ تو حسن باطنی کا عاشق ہے۔ وہ جادو جو ان کی آنکھوں پر اثر نہیں ہے وہ بیان کے جادو کا دلدادہ ہے۔ سخن اور فصاحت وہ جادو ہے کہ اس کی تاثیر روحوں پر جا لگتی ہے جو جانتے ہیں اور اس کی لذت کو وہی پہچانتے ہیں جو چکھتے ہیں۔ یہ کچھ فرض نہیں ہے کہ انسان ہی خدمت کو دل سے چاہے۔ بدن کا خیال [illegible] وروں میں اس سے ہرگز نہیں۔

بمجنوں گفت روزے سارپانے   چرا بیہودہ دشت اندر کنائے
اگر با لیلی ات باشد سروکار   [illegible]
ببی عشق بکار دیگراں ہست   [illegible]
زحرف سارپان مجنوں برنجید   جواب ایں داد و زیر لب بخندید
میاں عاشق و معشوق رمزیست   کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

رموزِ عاشق و معشوق بداند
چہ داند آنکہ اشتر می چراند

مجنوں سے کسی ساربان نے کہا کہ میاں تم دشت نوردی کیوں کرتے ہو لیلیٰ تمھاری ہتھنی پر سوار ہے۔ ع

این خباست و نجاست مجنوں

مجنوں نے ہنس کر کہا تو اس پیر میں نہ پڑ تجھے معشوقوں کے عشوے اور غمزے سے کیا سروکار تو شتر غمزے کا عادی ہے اپنے اونٹ چرا۔

درد و الم عشق زلیخا کا طبیعت   خواہش وصل زنا انصافیت

اب ذرا سے سمجھنے کے قابل ہے۔ اگر عشق یہی چاہتا ہے کہ فلاں بنت مکروس ہمہ دستیاب ہو تو آتشیں مزاج کے عشق کا نام ہی نہیں یہ تو صرف خواہش جسمانی ہے۔ جس کو شہوت پرستی کہتے ہیں۔ اگر وہی محبت طویل ہو کر بعد قطع ہو جائے یا جھک نکلے تو وہ عشق جاتا رہتا ہے۔ پھر دیکھو مثنوی عاشق صاحب کیونکر معشوق بہ مطلوب سابق پر مرتے اور جان دیتے ہیں۔ ماں سے بڑھ کر عشق کسی کو نہیں ہوتا۔ ماں کی ممتا مشہور ہے۔ اگر لڑکا بیس برس کا بھی ہو جائے تو ماں کو بچے سے وہی محبت رہے گی جو پہلے تھی عشق اس کو کہتے ہیں عاشقوں کے زمرے میں عاشق اللہ کا بہت بڑا درجہ سمجھا جاتا ہے اور ہماری ایک غزل کا مقطع اسی مضمون کا ہے۔

چھوڑ کر عشق حسینانِ جہاں اے سرشاؔر   عاشق اللہ کا ہو عشق بشر کچھ بھی نہیں

مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہ باتیں کچھ حقانی آدمیوں ہی کو پسند آتی ہیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم نے خدا اللہ والے لوگوں کو عشق حقیقی میں گم پایا۔ بحر عرفان میں غرق فنا فی اللہ لیکن نادان خشک سے ڈر کر کتابوں کو ہمارے نزدیک دنیا دار آدمیوں کے جو عشق سب عاشقوں سے بڑھا ہوا ہے وہ اور ہی عشق ہے دنیا دار کے لفظ کو یاد رکھیے گا۔ مگر گرہستوں کا ذکر ہے۔

جو بہت پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

ان کے نام پر درود پڑھیے ان کا درجہ ہم جاہل لوگ کہاں سے پائیں۔

خیر وہ عشق کیا ہے اسے وہ عشق ایسا ہے کہ اس سے بغیر عشق ہو ہی نہیں سکتا بشرطیکہ دل ملے ہوئے ہوں جس عشق کا ہم اب ذکر کرنے والے ہیں وہ عشق انسان کو چوندھیا دیتا ہے۔ جان کی کوئی حقیقت نہیں مال کیا چیز ہے یعنی میاں بی بی کا۔ بی بی میاں پر پروانہ۔ میاں بلبل کی طرح شیدا۔ میاں کی دلی آرزو کہ یا اللہ میں چاہے ایک دن فاقہ کیا کروں مگر میری پیاری بی بی آرام سے رہے۔ بی بی روز صبح شام دعا مانگتی ہے کہ یا خدا پاک رانڈی کی کوئی اور تمنا نہیں ہے ہے تو یہ ہے کہ میرا سہاگ ہمیشہ قائم رہے۔ میاں نے بی بی کو دیکھا تو غم غلط ہو گیا۔ بی بی نے میاں کی صورت دیکھی تو باچھیں کھل گئیں۔ گویا تمام دنیا کی نعمتیں مل گئیں۔ مگر میاں کے پاؤں پر کانٹا چبھے تو بی بی کے گویا رونگٹے رونگٹے پر کسی نے نشتر پر نشتر چبھو دیے اور اگر بی بی کا پنڈا پھیکا ہوا تو میاں کی کچھ نہ رہیں۔

بی بی چاہتی ہے سہتی ہیں نہ ہو مگر عشق کے یہ معنی ہیں کہ میاں ہر حالت میں خوش ہیں۔

انسان چاہے جس قدر تھکا ماندہ شل دن بھر اپنے پیشے کے مطابق محنت شاقہ کر کے شام کو گھر آئے اور بی بی کے گورے گورے پیارے گالوں کو اِدھر اُدھر چوم لے تو ان گرما گرم بوسوں سے سب تھکاوٹ دُور ہو جائے۔

بیپیرز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی حیدرآباد دکن
۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ ۔ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱

نوع انسان

یہ آدمی ہے کہ برسوں نہال رہتا ہے ورنہ ماہ کوکب شب کا سال رہتا ہے

حضرت انسان نے اپنے لیے اشرف المخلوقات کا خطاب فضیلت انتساب تجویز فرمایا ہے۔ دیدۂ انصاف وا کر کے دیکھیے تو یہ خیالی میاں مٹھو نہیں بن بیٹھے بلکہ واقعی خلعت اشرف المخلوقات کو خالق کارساز نے ان کے قد پر راست کیا ہے۔ الحمد للہ زمین کے رہنے اور آسمان کی خبر لائیں۔ شمس جیسی منور کرے کی باتیں بتائیں جس کو انسان بے تجربہ نگاہ دیکھ نہیں سکتا۔ قمر کے پہاڑوں کی بلندی دریافت پانے ذخار کا بند کرنا ہوا مٹھی میں تھام لیتا ہے۔ آگ اور پانی کے ذریعہ سے ریل کا چلانا موت کے پنجے چبانا ہے۔ مگر عقل کے صدقے [illegible] موم کر دکھایا۔ دُنیا میں جتنے مخلوق ہیں سب ان کا لوہا مانتی ہیں۔ سب کو انھوں نے نیچا دکھایا۔ اپنی زبردست کر سب کو زیر کیا۔ ان کے [illegible] کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ یہ مشت خاک کا پتلا ہے۔ غبارہ و ہوائی جہاز ایجاد کیا کہ کائنات اونچی ہو کر اُڑنے لگے۔ جہاں پرندوں کے پر جلیں [illegible] جانے لگے۔ جدھر جاؤ ان ہی کی دھوم ہے۔ جہاں دیکھو ان ہی کا سکہ چلتا ہے۔ کوئی ملک کوئی جزیرہ کوئی منزل کوئی جنگل الغرض [illegible] تمام ایسا نہیں جہاں یہ نہ پہنچے ہوں۔ اپنے قدوم میمنت لزوم سے جنگل کو گلزار اور بن کو فرخار بنا دیا۔ جہاں کتنے بھی نہیں ویسے [illegible] وہ صورتیں نظر آتی ہیں کہ انسان عش عش کر جائے۔ انسان ہر قسم کی آب و ہوا کو برداشت کر لیتا ہے۔ ہر قسم کی سرزمین میں [illegible] ہے۔ قریب قریب ہر قسم کی غذا استعمال میں لاتا ہے۔ دریائے بنگال کے کناروں پر آفتاب عالمتاب کی تمازت اس غضب کی ہوتی ہے [illegible] شرب اُبلنے لگتا ہے۔ وہاں بھی یہ انسان بہ آرام تمام زندگی بسر کرتے ہیں۔ گرمی کو اصلا نہیں مانتے۔ برعکس اس کے براعظم ایشیا [illegible] شمال و مشرق میں اس درجہ سردی ہوتی ہے کہ پارہ تک جم جاتا ہے۔ جیسے وہاں بھی چین سے بستے ہیں۔ ڈاکٹر [illegible] کا یہ [illegible] ہے کہ تمام روئے زمین پر صرف انسان ہی اس قسم کی ذی روح ہے جو [illegible] اور [illegible] سے [illegible] ہر طرح کی آب و ہوا کے لائق اپنے جسم کی حفاظت کے لیے کپڑا بنا لیتا ہے۔ سردی کے لیے اس قدر گرم کپڑا تیار کرتا ہے کہ [illegible] پہنتے ہی سردی کی حقیقت بھی سرد ہو جائے۔ جو موسم گرما میں ایسی پوشاک پہنتا ہے کہ گرمی کی گرم بازاری پر اوس پڑ جائے۔ بارش کے [illegible] ایسا ایجاد کیا ہے کہ چاہے جیسا ہی موسلادھار برسے بدن پر [illegible] نہ اثر کرے۔ ان ہی اسباب سے وہ ہر [illegible] اور ہر فصل میں رہ سکتا ہے اگر اور جانوروں کی طرح اس کے جسم پر اون یا کسی قسم کی پوشش ہوتی تو گرم ملکوں میں وبال جان ہو جاتا۔

علمائے بنی نوع انسان کو مختلف اقسام پر منقسم کیا ہے جن کے خد و خال آنکھ اور بال کو پرکھ اور کھال میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر [illegible] نے کل مخلوق کو تین جنسوں پر منقسم کیا ہے۔ اوّل ملینک یعنی سیاہ وہ لوگ جن کے بالوں کا رنگ سیاہ ہے۔ دوم [illegible] یعنی [illegible] وہ لوگ جن کے بال زرد یا سرخ یا بھورے ہیں۔ ثالثاً [illegible] یعنی سفید جن کے بال بالکل سفید ہیں اور آنکھیں سرخ۔ [illegible]

صاحب نے اس بارہ میں خوب لکھا ہے اور آخر مصنف نے ان کی رائے صائب سے اتفاق ہی کیا ہے ان صاحب نے انسان کے پانچ فرقے
قرار دیئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ فرقے کی کیفیت کا مختصر ذکر ہے۔ مین کاکیشین۔ منگولین۔ انیتھوپک۔ امریکن ملے (۱) کاکیشین
فرقہ کا سر قریب قریب گول ہوتا ہے۔ پیشانی نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔ چہرہ بیضاوی استخوان رخسار نکلے ہوئے نہیں ہوتے۔
دونوں جبڑوں میں آگے کے دانت بصورت عمود۔ چہرہ بیضاوی۔ ناک محراب دار۔ دہن چھوٹا نیچے کا ہونٹ کسی قدر نکلا ہوا۔ ٹھوڑی
متعدد اس فرقہ کے لوگ ہر ایک رنگ کے ہوتے ہیں۔ اصلی رنگ ان کا سفید ہے مگر آب و ہوا اور اثرات آفتاب وغیرہ وجوہ سے
گندم گوں۔ سیاہ فام اور سرخ سفید بھی ہو جاتے ہیں۔ اہل اسیریا اہل بابل۔ اہل میڈیا۔ فارسی۔ یہودی۔ عرب۔ ترکی۔ تاتاری
ہندو۔ فرانسیسی ڈچ۔ اہل یونان۔ جرمن۔ پرودس۔ آسٹریا۔ کوہ قاف۔ اسی گروہ میں شامل ہیں۔ افریقہ میں جو لوگ بحر شمالی کے
قریب رہتے ہیں۔ وہ اور مصری اور اہل ابی سینیا فرقہ کاکیشین سے ہیں۔ اہل منگولین ان کے سر قریب قریب مربع ہوتے ہیں
استخوان رخسار نکلے ہوئے۔ چہرہ چپٹا۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ ناک چپٹی۔ اس فرقہ کے لوگ سرخ و سفید بالکل نہیں ہوتے۔ بلکہ رنگ
کسی قدر مائل بہ زردی ہے۔ بال سیدھے۔ کالے اور مضبوط ہوتے ہیں مگر بہت ہی کم۔ داڑھی سو میں دس کے ہوتی بھی تو بالکل ذرا
سی۔ چینی۔ جاپانی۔ بھوٹیے۔ اہل سیام۔ تبت۔ منبر۔ اسکوٹی مو۔ اس گروہ سے علاقہ رکھتے ہیں (۳) انیتھوپک۔ سر
دبا ہوا ہے۔ پیشانی ذرا گول گنبد۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے نیچے کے جبڑے بڑے اور مضبوط آنکھیں ابھری ہوئی۔ اوپر کا ہونٹ
موٹا۔ رنگ بالکل سیاہ اور گھونگھریالے بال۔ جنوب صحرائے اعظم اور اہل سینا۔ آسٹریلیا تیونس۔ پنیا۔ نیوگنی۔ جزیرہ سالمان فیجی
وغیرہ کے باشندے فرقہ انیتھوپک سے متعلق ہیں (۴) امریکن یہ لوگ منگولین سے کسی قدر مشابہت رکھتے ہیں۔ استخوان رخسار محراب
کھوپڑی بلی چہرہ چپٹا۔ پیشانی تنگ۔ ناک کسی قدر چپٹی۔ رنگ سرخی مائل یا کسی قدر سیاہ بال منگولین سے۔ داڑھی بالکل ندارد۔ امریکہ
کے اصلی باشندے اسی گروہ سے ہیں۔ (۵) ملے۔ ان لوگوں کی پیشانی کچھ یوں ہی سی ابھار ہوتی ہے۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے
ناک موٹی اور چوڑی رنگ گیہواں۔ بال سیاہ۔

یکم رجب ۱۳۱۸ھ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۵

ناول نگاری

هر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری
اول بہ شگون کرد طواف حرم ما

تعلی اور لن ترانی اور دوسروں کی بیا اور شیخی بگھارنا میری وضع کے خلاف ہے اور ایک مجھ پر کیا فرض ہے کل اہل آبرو کی وضع
کے خلاف ہے یہ شعر جو میں نے زیب عنوان کیا ہے اس کو تعلی پر محمول کرنا انصاف بیچارے کی گردن کو کند چھری سے سنا کے
ریتنا ہے میں آپ تعریف اپنے ناولوں کی کروں تو چور کی سزا وہ میری۔ ہاں اگر امر حق کا اظہار تعلی اور سچ بولنا وبال کی بنا ہو
تو مجھ سے بلا کے ڈھیٹ یا کوئی نہیں ہے۔ اس شعر کے یہ معنی ہیں کہ فسانۂ آزاد نے قدر دانوں کی قدر دانی سے وہ قدر پائی کہ لندن اور
پیرس اور شکاگو تک اس کی شہرت ہوئی اور اسی کی دیکھا دیکھی لوگوں کے دلوں میں ناول لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ گو قصوں کی کتابیں

افسانے اردو میں پیشتر بلکہ کہیں پیشتر سے موجود ہیں لیکن بالکل انگریزی اصول اور یورپین طرز پر کوئی ناول مثل فسانۂ آزاد کے اودھ اخبار سے مشہور اخبار کے ساتھ روزانہ شائع نہیں ہوا تھا۔ جن صاحبوں نے اس کے بعد ناول لکھا۔ ان میں سے انصاف پسند بزرگوار دل نے قبل اشاعت خود اس کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ گورکھپور سے حضرت ریاض نے لکھا تھا کہ ہمارا ناول اسی طرز یورپین پر ہوگا۔ جس میں فسانۂ آزاد والے کچھ شہرت پا چکے ہیں۔ چنار کے رئیس بابو سیتارام پرشاد صاحب نے بھی اپنے ناول میں فسانۂ آزاد کو تعریف کے کلمات سے عزت بخشی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھ سے بڑھ کر ناولسٹ دنیا میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تو اس کی تعلّی کی مجھ سے شکایت کرنا بیجا ہے۔ اس کی شکایت ڈاکٹر سید عابد الدین صاحب تفضل یا ب جنگ سے کرنی چاہیے کہ مجھ مجنوں کی ضد نہ کھیرائی

غیر معاہم بر سر مطلب۔ اردو زبان میں جو کتب قصص پیشتر کی ہیں وہ پرانی وہمی جغرافیے اور اکثر دقیانوسی خیالات اور ان امور پر مبنی ہیں جن کا عدم وجود بہ بابت اور حسب عادت محال اور حسب عقل غیر ممکن ہیں تب اردو کی سرزمین پر نئی تہذیب کا آفتاب اچھی طرح نہیں چمکا تھا۔ سب کے پہلے انڈیا میں انگریزی اصول پر اہل بنگالہ نے اپنی بنگلہ زبان میں ناول لکھے اور رائے بنکم چندر چیٹرجی نے اس فن کی گھوڑ دوڑ میں بازی جیت لی۔ ہندوستان میں ابھی تو کل کی بات ہے کہ ناول لکھے ہی نہیں۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت بھاشا کا یہاں ذکر نہیں ہے اردو کے ناول نہ تھے اور جو تھے وہ پرانے فیشن کے۔ ان ڈراما جس کا نام ہے۔ اس کے ترجمہ ہندو ہیں۔ بڑے بڑے مبصروں کی رائے ہے۔ جو ہفت زبان تھے اور جن کو ڈرامہ سنسکرت سے بڑھ کر لاطینی میں بھی نہ یونانی میں۔ تا بہ داستانہائے دیگر چہ رسد۔

اردو کے ناول یعنی افسانے پرانے زمانے کے لکھے ہوئے حال کے تربیت یافتہ پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ عموماً پوچ یاوہ اور بیہودہ خیالات سے مملو ہیں۔ اب لوگ واقعات ڈھونڈتے ہیں۔

اب ہم پرانے قصص کے محاسن کی چند مثالیں دیتے ہیں:

۱۔ ایک مصنف صاحب نے اپنے ہیرو کو جادو کے ایک گڑھے میں دھکیل دیا تو وہ بیچارے دس کروڑ دس لاکھ دس ہزار برس تک اس گڑھے میں گرتے گرتے کہیں خدا خدا کر کے تہ تک پہنچے جل جلالہٗ۔ اب کوئی اس با کمال مصنف سے پوچھے کہ اگر کوئی انسان بفرض محال سطح ارض سے قعر کرۂ زمین تک دھنستا ہوا جائے تو علم حیات کی رو سے کتنے عرصہ میں انتہائے قعر تک پہونچ جائے گا اور زمین کا قطر کتنا ہے؟

۲۔ ایک مصنف صاحب نے اپنے ہیرو کو سمندر کے اس کنارے سے اس کنارے تک چشم زدن میں پہنچا دیا۔ یہ موجودہ ریل بھی ایسی سریع الرفتار نہیں ہے۔ تار بھی نہیں ہے مگر مصنف نے بزور زبان ہیرو کو سمندر پار کرا دیا۔ ادھر آنکھ بند ہوئی ادھر ایک ساحل سے دوسرے ساحل پر دندنا رہے ہیں۔

۳۔ ایک ناولسٹ فرماتے ہیں کہ جو جوں نے جھیل کے نیچے نیچے منزلوں سرنگ لگائی اور ہاتھی اور گھوڑے اور اونٹ اور بے شمار اسباب اور علم اور نشان کے ساتھ برسوں کا راستہ چٹکیوں میں طے کیا اور غنیم کو مار اور جادو کے زور سے سرنگ کی ہر منزل میں مینار روشن کیا۔

۴۔ ایک صاحب نے کوہ کشمیر پر پرستان کی ایک پری کو ہوا پر اڑا دیا اور وہ آپ پر عاشق ہوگئی۔ بیہوشی کی حالت میں ان کو

اُڑن کھٹولے پر بٹھا کر پرستان کی راہ لی یہ جا وہ جا۔

اب ذرا ایسے گردِ دنیا میں کوئی پڑھا لکھا آدمی جس کو عقلِ سلیم سے حصہ ملا ہے کبھی ان مزخرف خیالات کو تسلیم کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ یہ پرانے ایشیائی خیالات کی کہانیاں ہیں جو کہ اب سر نہ پائیں۔ نہ بچوں کے خاصے کی نہ نوجوانوں کی اور نہ پیرِ فرتوت بڈھوں کے توڑ جیسی۔

گو سادہ اپیر شد و لکا نشد

ناول کے ذمی قصے واقعات پر مبنی ہیں تاریخی امور پر مبنی ہیں اخلاقی باتیں ان سے پیدا کی جاتی ہیں۔ ناول نتائج نکلتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ پڑھا لکھا انسان ان کو پڑھے اور انتہا سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوں۔ مگر ان بہت سے پرانے فیشن کے آدمی دیکھیں تو پسند نہ کریں اور کہیں کہ اس میں تو وہ باتیں لکھی ہیں جو ہم روز مرہ دیکھتے اور سنتے اور کرتے ہیں:

دندانِ تو جملہ در دہانند

چشمانِ تو زیرِ ابروانند

وہ تو اس بات کے پڑھنے کے شائق ہوتے ہیں کہ "طوطی یا توتا جس کو طلسم زبان تھی کہ فلاں بادشاہزادی کو حسن پر اتنا ہے۔ واہ رے واہ واہ"

تو نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

کوہ طلسمات ملک بلغان میں خیتان نامی سمندر کے اس پار ایک بادشاہ رہتا ہے وہاں اس کی لڑکی حسن و جمال میں یکتا ملکہ رہتی ہے جس کے رخ کا یہ حال ہے کہ رات اس ملک میں ہوتی ہی نہیں۔

بس (اس ناول حلول کے) سنتے ہی اور کو چھوڑ چھاڑ کر اور کے عاشق نے طلسمات کی راہ لی چل جلا۔ اب اندھا دھند چلے جاتے ہیں جہاں سیکڑوں سانپ منہ پھیلائے منتظر۔ اب جو بھوت اور پریتا اور چڑیل اور دیو سب کے سب بھیڑ ہوئی اور جا کے اس کو بیاہ لے۔ تمنے (مبارک ہو) کہ ہم بھی تو ہیں ایک کوئی کسی ہیرو کو ایسی ملی کہ وہ سب کو دیکھیں اور باقی سب اندھے۔

زمانہ حال کے اردو ناول نویسوں کو اس امر کا خیال چاہیے کہ ملک کے خیالات ہوں اور اس خوبصورتی سے قلمبند کریں کہ تصویر کھینچ دیں۔ حیوان قلم سے بچیں۔ پس یہ معلوم ہو کہ مصنف کوئی چشم دیدہ واقعہ بیان کر رہا ہے جیسے کسی شیخ پر کوئی چابک دست کامل فن انجینئر اپنے سینہ کے گھوڑے کی باگ کو یوں قابو میں رکھے جیسے استاد شہسوار اصیل گھوڑے کی باگ جہاں جی چاہے وہاں موڑ لے۔

رہا زُخل اور اعتدال کو ہر امر میں ملحوظ ہو مگر ناول میں تو سخت سے سخت عیب سمجھا جاتا ہے جہاں تک ممکن ہو سکے ہر پارٹ یعنی پیشن یا فصل کو قریب قریب مساوی رکھے۔ ہاں یہ ذرا مشکل ضرور ہے لیکن جہاں تک ہو سکے ایسا نہ ہونے پائے کہ ایک حصہ پچاس صفحے کا ہو اور ایک آٹھ صفحے کا۔ اس کا بھی خیال ضروری ہے کہ اس کا مکالمہ سب چیدہ ہو اور کم ہو۔ مگر فضول مکالمہ خواہ مخواہ طول دیا جائے یہ بڑا عیب ہے۔ لوگ پڑھتے پڑھتے عاجز ہو جاتے ہیں اور سرسری طور پر پڑھ کر ختم کر دیتے ہیں۔

اس طرح کی متوالی کہانی یا بات نہ چھیڑ دے کہ دفعتاً لاتعلق ہو جائے ناول کے کسی ذکر کو شیدائیوں کو ... ہو جائے کوئی پسند

ذرے کانہ

شانو ناول کا ایک عیب یہ ہے کہ جب ایک باب ختم کر دیں تو پھر ناظرین بڑے دلی شوق سے دوسرے باب کے مطالب جاننے کے منتظر رہیں اس کا لکھنا مشکل ہے کہ ایک نہایت ضروری اور تعجب خیز بات ختم کر کے ناظرین اس کے چھوڑے ہوئے ٹکڑے کو جب تک دریافت نہ کر لیں تب تک کھانا پینا حرام ہو جائے۔

رومانٹک ناول اور عشق جو اصلی واقعات پر مبنی ہوں ان کا اُردو ناولوں میں کم چرچا ہے اور جو ہیں وہ دقیانوسی خیالات سے مملو، ہیں، دو کوڑی کے۔ ٹریجڈی کو ہمارے اردو خواں صاحب کم پسند کرتے ہیں حالانکہ ایشیائی خیالات غم کے قصص سے خالی نہیں۔ عاشق و معشوق کے دائمی ہجر کا حال لیلیٰ و مجنوں۔ فرہاد و شیریں، وامق و عذرا، نل دمن بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ابھی اُردو خوانوں کے طبائع ٹریجڈی کی طرف مائل نہیں ہیں اس واسطے ٹریجڈی کا لکھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اُردو ناولوں کے مطالعہ کا شوق ہم لوگوں میں بڑھتا جاتا ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔ اسی سبب سے ان کی اشاعت بھی زیادہ ہونے لگی اور ہو گی۔ اور اسی باعث سے اب اچھے بُرے ناولوں میں ہم تمیز بھی کرنے لگے۔

ہیچمیرز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کاشمیری
یکم جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۱

شعر و شاعری کی بحث

عالیجناب مہاراجہ پیشکار بہادر وزیر فوج آصفی نے ایک قصیدہ شگرف حضرت نسیم حیدرآبادی کے مشاعرے کے لیے بتقریب سعید سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ طرح کے مصرع پر سرکار ممدوح الشان نے تصنیف فرمایا تھا۔ اس قصیدہ کے ایک شعر پر کسی صاحب نے گمنام خط رامپور سے بھیجا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(میں حیدرآبادی ہوں اور ملکی ہونے کی سبب سے میرا جی خوش ہوتا ہے جب میں کسی حیدرآبادی کو قابل اور لائق پاتا ہوں مگر تعجب ہے کہ اتنے بڑے اور عالم پیشکار صاحب بہادر نے ایک بڑی غلطی کی وہ یہ ہے ؎

یہ غلط ہے کہ حاتم طائی تھا سخی
میر محبوب علی شہ سا تھا کب بازل

*باذل، کو، بازل، لکھا ہے۔ غیاث اللغات میں بحوالہ منتخب لکھا ہے (باذل بعین ذال معجمہ بمعنی بخشندہ و سخی)

ع ۔ یہ اعتراض چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اُٹھایا جاتا ہے اور یہ شعر مثل ماہ منیر ہو کر چاند کی طرح خسوف سے صاف نکل آتا ہے۔ واضح ہو جب شاعر عمداً کوئی غلطی کرتا ہے تو اسی شعر میں خود اپنی غلطی کا خوبصورتی کے ساتھ اعتراف کر لیتا ہے۔ عیب میں حسن ہو جاتا ہے حافظ شیرازی کی غزل کا مطلع مسکت جواب ہے:

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا
ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

مصرع اولیٰ میں خراب بکون اسمے موصوف اور مصرع ثانی میں تا بہ کجا ہی۔ مگر حافظ نے تو خود اقرار کیا کہ صلاح کار کجا و منِ خراب کجا۔ اِدھر صلاح چہ سروکار، اور پھر مقتضا ہے۔ دیکھو تفاوت رہ کس قدر ہے کہ کجا است تا بکجا۔ قافیہ کیا ہی حسن ہے صحیح غالب ہی نے ایک قصیدہ میں معشوق کے منہ اور ناروں کو سیوے سے تشبیہ دی ہے مگر خود کہہ دیا کہ — غلط کردم کہ گفتم ...... نگاہ یار را ہموار۔

بیچمیز پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی
یکم جمادی الاوّل ۱۲۹۵ھ جلد نمبر۱ شمارہ نمبر۳

موسیقی اور ہماری ثقافت کی ترجمانی

سید عابد علی عابد

فنون لطیفہ میں یوں ہر فن اس لحاظ سے یادگار ہے لیکن اپنی پیچیدگی، تاثیر اور تجربے کے اعتبار سے موسیقی کو بعض اعتبارات سے شعر پر فوقیت حاصل ہے۔ امیر خسرو نے جو ان دونوں فنون کے شہسوار اور محرم اسرار ہیں ایک مناظرہ قلم بند کیا ہے۔ جس میں آخر کار موسیقی کو ہی شعر پر ... ہے اور دوسرے دلائل سے قطع نظر ایک دلیل یہ بھی دی ہے (جو خاصی وزن دار ہے) کہ شعر تو ہر کم الفاظ کا محتاج تو ضرور ہے۔ اس نے ... موسیقی نغموں کے پیرہن سے بھی بے نیاز ہے اور صرف صوت مجرد سے کام لے کر وہ مقامات کی فضا پیدا کرتی ہے کہ خواص اور عوام دونوں ... ہوتے ہیں بشرطیکہ تاثیر سے خالی نہ ہو اور موسیقار لحن خوش سے بے نیاز ہو کر صرف موسیقی کی گرامر یا صرف و نحو کی مشق ہی نہ کر رہا ہو۔

ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ موسیقی صوت مجرد یا صوت خالص سے کام لیتی ہے البتہ یہ صورت منظم اور مربوط ہونی چاہیئے تاکہ شعور معنی میں ... موسیقی میں تمیز ممکن ہو۔ شعور میں آواز ہی منظم نہیں ہوتیں۔ نے شدہ وقفوں کے سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ یہ سوال دوسرا ہے کہ سازینہ ... اور ساخت میں شعور یعنی صدائے محض کس حد تک دخیل ہے اور کیا فریضہ ادا کرتا ہے۔

یہ باتیں مد نظر رکھی جائیں تو واضح ہو جائے گا کہ موسیقی کی حرمت و حلت کے متعلق کسی حد تک اختلاف کیوں موجود ہے۔ فقہ یہ ہے کہ موسیقی جو سُروں کی ایک خاص ترتیب اور ترکیب کا نام ہے بنفسہ بغیر کسی اور خارجی عنصر کے گناہ کے ارتکاب میں یا کسی خلاف شرع امر کے وقوع ... نہیں ہو سکتی۔ سُریں تو محض آوازیں ہیں۔ مجرد اور خالص اور معصوم۔ ان کو حلال و حرام سے کیا تعلق؟ ہاں غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے ... موسیقی کو ایک خاص تناظر میں سُنتے ہیں۔ مثلاً یہ صورت کہ غزل سُنی تو بعض الفاظ تہذیب یا فحش نکل آئے یا پھر یہ صورت پیدا ہوئی کہ گانے ... اپنے حُسنِ ادا ... اور اصطلاحات نے کا ہے کو دلوں میں ایسا ہیجان پیدا کر دیا جو نامناسب ہے یا گانے والے نے ان بات کی اور اپنی ... کرسی اور خوش وضعی سے ایسے احساسات کو برانگیختہ کیا جنہیں شرعاً حرام بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم یہ غلط فہمی دور کر دیتے ... موسیقی کو اپنے صحیح رنگ میں دیکھتے ہیں تو اسے معصوم پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تو سنا ہی ہے کہ فلاں صاحب نے ایک ... ... تو ایسے پر جوش ہو گئے کہ نازیبا باتیں کرنے لگے یا کسی امرد سے کہ خوش وضع تھا، قوالی سنی اور ... اور فساد پیدا ہو گئے ... یا ... صاحب ساز کی موسیقی سن کر یوں اپنے آپے میں نہ رہے ہوں کہ خلاف شرع باتوں کا ارتکاب کر بیٹھے ہوں۔ یہ تو ہم سنتے ہیں کہ فلاں ... نے ذوقی لیکن یہ نہیں سُنتے کہ صاحب گانے والے نے ... ... کو آشفتہ کر دیا اور وہ دین و دنیا سے جاتے رہے۔

سماع کو جو بعض صوفیوں نے جائز قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صوت مجرد کو معصوم سمجھتے ہیں اور ... ... کو ... ... پابندیاں بھی عاید کر دیتے ہیں کہ سماع کی صورت میں ... سُننے والے اپنے آپ میں رہیں ... ... کی ایسی کیفیت کا اظہار نہ کریں ... ... خوش وضع امردوں کو قوالوں میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی جائے اور قوال بھی عموماً نیک خصلت ہوں ...

حالت میں صلح یا خاکسی طرح کیوں بیان کیا جائے گا۔ منظر استعمال ہونے کے ٹھیک غروب آفتاب کے بعد تک گایا جائے تو اس

حالت میں عرفان و اخلاق اور تزکیۂ قلب و روح کے حامل ہوں گے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ موسیقی میں خاص طور پر ہندو اور مسلم کی ثقافتی ہم آہنگی کے نمونے ملتے ہیں اور مسلم مسافروں کا ایک ملا جلا جوش نظر آتا ہے۔ البتہ جو بات موسیقی کے ثقافتی اور تہذیبی ذریعے کو تسکین بخشتی ہے وہ غزل، گیتوں، ٹھمری، کجری وغیرہ کے ذریعے انسانی خیالات سے وابستہ ہو گئی ہے۔

ہندوستان کے کلاسیکی سنگیت میں اپنے وقت کے مطابق راگ ہیں۔ بعض راگ ایسے ہیں کہ ان کی بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔ انسان ہے بس مجبور، محدود، سرگشتہ، بر گشتہ، تقدیر کے ہاتھوں میں اپنی قسمت رہتا ہے جس کی خوشحالی، ثروت اور مسرت کی ضامن ہوتی ہے۔ مشہور راگ ہیں (...) کہتے ہیں یہ خوشحالی اور ... منسوب ہیں کہ وہ ... ثبت، بارگاہ ... اور خوشحالی کی دعا ہے۔ اس دعا کا ہے شکر، مسلمانوں موجود ہیں۔ یہاں صرف اشارہ دینا کافی ہے کہ ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت نے صرف اس دعا کو خدمت میں عقیدت کرتی ہے بلکہ خاص طور پر اس دعا کو ... اور وجہ تسمیہ ظاہر ہوتی ہے جسے مختلف راگوں اور انداز سے ادا کیا جاتا ہے۔

شیو۔ شنکر اور بعض اوقات شنکر کے ساتھ بھی اس کا نام لیتے ہیں۔ مشہور بول ہیں۔

— شنکر شو بر بر

شام کے وقت ... اس دعا سے جو قہر اور فنا کی علامت ہے۔ ... اور ... کا وہ مشہور گاتے ہیں جس کے شروع کے بول یہ ہیں۔

بے سا دیر

اس گفتگو سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مزاج ... مذہب ہے اور ... حکم و دیگر بہروپ سروپ میں مختلف ... کو ... لاتی ہے۔ جب سنگیت کا گمبھیر خیال اپنے ... ٹھمری میں ہے تو بھی ... عقیدت کا عنصر صاف نظر آتا ہے کہ ... اور ... ہے۔ چنانچہ ... ناز و نیاز کی تصویر ... ہے جو سنگیت کے ثقافتی مزاج کی ترجمان ہے۔ مثال کے طور پر ... کے مشہور بول ہیں۔

البیلی رے ... کرشن ...

البیلی رے ...

اس طرح ... کے مشہور بول ہیں:

رس بھری انکھیاں ...

من چین ... رس بھری انکھیاں ...

ش

تعمیر ... میں ... موسیقی کا ثقافتی ... مشرقی مزاج ... سے متعین ہوگیا ہے اور ہندو

... نے عقیدت ... کا اظہار کیا ہے۔

امیر خسرو سے پہلے اس بات پر ... کر سنگیت کا ثقافتی مزاج بدلنے سے بنتا ہے اور سُر یں معصوم ہوتی ہیں اور راگ راگنیوں کے معنی ہیں اور وہ امیر خسرو کا کہنا ... نے ہیں بنتا ... کو بیسیرت سے آزادی حق کریں ... کا ہمنوا ہوکر (جیسے نے کہا تا ہے کر سکتا ... بیسیر ... کی تو ... اور کسی شخص میں نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو نے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ پرانے راگوں ... سے ایسے نئے بول لکھیں جو ہی مسلمانوں کی مذہبی عقیدت کا رنگ جھلکتا ہو اور ایسی تخلیقات پیش کریں جو مدح نعت اور منقبت کی ... بان ... سے متعلق کہیں یا ایک ... جو اپنے ماحول کے مطابق وجود میں آیا کہ وہ خواجہ نظام الدین ... کے مرید تھے۔ ... ان کی عقیدت میں سرشار اور ان کی محبت میں ... چار ——

چھٹا امیر نے ... کی منقبت میں اپنی مشہور چیزیں لکھیں مثلاً بہار میں (امیر خسرو کی ایجاد کردہ مشہور راگنی کا نام ہے) ... بول آج اوپچے سے اونچے ہندو کلاکار کی زبان پر ہیں:

حضرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال

پیش خواجہ تم بہ عشق آئے

حضرت رسول صاحب جمال

حضرت خواجہ سنگ کھیلیے دھمال

میں ... کے ... میں بڑے اونچے درجے کے ہندو کلاکاروں کو یہ بول گاتے سنا ہے بول چونکہ ہندی میں ہیں اس لیے ... اپنی ... کو بڑی اچھی طرح ظاہر کر سکتا تھا۔

یہ محفل گھنٹوں جاری رہی اور یہ بول گائے جاتے رہے۔ ہر کلاکار نے اپنی انفرادیت کا جوہر دکھایا اور ایسا سماں باندھا کہ دکھائی ... دے گیا عالم ... جھوم رہے تھے۔

میں نے ... کا ... پہلے تو تیرنے یہ نئے بول اپنے پیر کی مدح میں لکھے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ان اُنھوں نے ... کوشش کی کہ کلاسیکی سنگیت سے ثقافتی مزاج کو بدل ڈالیں کرد ... طور پر ہندوستان اور اسلامی عقیدت کے کوانف کا ادا کریں۔ ان کی مختلف چیزوں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بتدریج یہ کام کرنا چاہا کر ... ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت ... نیا رنگ روپ دیں۔ اس سلسلہ میں پہلے تو اُنھوں نے ایرانی دُھنوں اور ہندوستانی دُھنوں کی مختلف سروں کے امتزاج سے نئی راگنیاں ... میں زینت ... ۔ فاذا ۔ بہار اور ایمن کلیان بہت مشہور ہیں۔ ایمن کلیان کا کو ... کلاکاروں کو ایسا بھایا کہ اُنھوں نے ... کے لیے بہت سے نئے بول لکھے جو مذہبی عقیدت کے آئینہ دار تھے مثلاً :

آلِ نبیؐ اولادِ علیؓ

اس طرح بہار راگنی کی لچک، خوبصورتی اور اس کے مزاج کی یہ خصوصیت کہ ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ کلاکاروں کو بہت بھائی

اور مختلف راگوں کی بہار ادا کرنے کے لیے بول لکھے گئے مثلاً ہیری بہار۔ بیجیوں کی بہار۔ پھر یہی نہیں بلکہ بہار راگنی کے نام کی خصوصیت کے اعتبار سے کلاکاروں نے مذہبی رنگ ترک کر دیا اور موسم بہار کے مناظر پر اور اس رُت کے بانکپن کی تصویریں بھی بولوں میں کھینچیں مثلاً مشہور بول ہیں۔

کلیاں سنگ کرت رنگ رلیاں

افسوس ہے کہ امیر خسروؒ کی شعوری کوششیں پوری طرح بار آور نہ ہو سکیں البتہ مغلوں کے سلسلہ میں مسلمان فنکاروں نے اپنی ذہنی پیچ اور جودت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے خیال کے گمبیرتا کو غنائی رنگ دیا اور رادھا کرشن کے ناز و نیاز کے نقشوں کی جگہ نہ چھیڑ والوں اور چاہنے والوں کی بے قراریوں اور نالیوں کی بھی تصویریں کھینچیں۔ جب لکھنؤ اور اودھ کے دربار میں حد درجہ وہ موسیقی سے لگ نہیں تھی تو بڑے اچھے مسلمان کلاکار میدان میں آئے جنھوں نے انسانی جذبات و احساسات کی تصویریں کھینچ کر سنگیت کے ثقافتی مزاج کو اور بھی بدل دیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا ان کی یہ کوششیں شعوری تھیں یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر خسروؒ نے راگ اور راگنیوں کے جو بول باندھے ہیں وہ زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم سنگیت میں ایک نیا عنصر پیدا کر داخل ہوئے ہیں اور ہمارا منشا یہ ہے کہ کلاسیکی سنگیت کو شعوری کوشش اور برہمنوں کے دائرۂ عقیدت سے نکال کر اسلامی تصورات و افکار کے دائرہ میں لے جائیں تاکہ سماع و قوالی کی سنگیت اپنی پرانی زبان بھی بولے لیکن نیا مطلب ادا کرے۔ یہ بات بہت ضروری تھی جس کی زبان میں اتنی مٹھاس، لوچ، رس اور گداز ہے کہ اگر بول اردو یا فارسی میں لکھے جاتے تو اس وقت کے کلاکاروں میں نہ مقبول ہوتے نہ عوام الناس تک پہنچتے اور امیر خسروؒ کی کوششوں کا مطلب ہی فوت ہو جاتا۔

خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی نے اپنی تصنیف "حیات حضرت امیر خسروؒ" میں صرف اس بات کی تشریح کی ہے کہ خسرو نے ایرانی راگ راگنیوں اور پردوں کو ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت میں کس طرح سمویا بلکہ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو نئے راگ امیر نے ایجاد کیے ہیں ان کی ہیئت ترکیبی اور کیا اضافہ کیا ہے؟ انھوں نے سید صاحب آغا صاحب کے حوالے سے بتایا ہے کہ امیر کے نئے راگوں اور ان کے کیا اضافے کیا ہیں؟ مثال کے طور پر انھوں نے مجیر۔ سازگری۔ ایمن۔ زیلف۔ فرغانہ۔ سرپردہ۔ عشم۔ زنگولہ کی تفصیلات بیان کیے ہیں۔ میں صرف ایک دو مثالیں پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر امیر خسرو کی طرح دوسرے کلاکار بھی اسی طرح پرانی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مزاج بدلنے کی کوشش کرتے رہتے تو آج ہمارے اس گراں پایہ ورثہ کی شکل مختلف ہوتی اور ہمیں یہ سوچنا نہ پڑتا کہ پرانے راگ اور راگنیوں کے بول کس سے اور کس طرح لکھوائے جائیں کہ وہ ہمارے مذہب، ہماری ثقافت، معاشرت، رہن سہن اور عمومی زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کریں۔

بھیرویں امیر نے یہ بول لکھے ہیں:

حضرت نظام الدین اولیاءؒ
پیر مشائخ زر
آن پڑی دربار تہارے

خسرو پر کرپا ہو برائے انبیاءؑ
پیر مشائخ نور

اس کو آڑو ہی سارے ما پا دھانی ستا ہے۔ اس کی امرو ہی بہت نی دھا پا ما ما نی گا ما رے سا۔ یہ راگ کافی ٹھاٹھ کا ہے۔ آروہی میں گا اور نی ورجت ہے تان کی صورت ایسی ہے کہ ملار کے رنگ کا شبہ ہوتا ہے اس بندش میں ملاوٹ اور گندھار سمادی سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن کو گانا چاہیے۔ استھائی کے بول اور پورے کوائف کے لیے دیکھیے کتاب مذکورہ صفحہ ۔

اسی طرح ایمن خالص فارسی راگ ہے۔ اس کا الاپ بہت خوبصورت ہوتا ہے کہ سمپورن ہے۔ آروہی۔ امروہی شدھ ہیں اس لیے گانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس کی خاص تان مارے گا رے سا ہے۔ یہ تان ایمن سے مخصوص ہے اور بہت لطف دیتی ہے۔ اس راگنی میں بھی امیر نے بول لکھے ہیں جو یوں شروع ہوتے ہیں:

علی علی علی علی علی
خدا بن کون جگت میں اپنا
نبی کے پیارے حسنؑ حسینؑ کے پتا
زہراؓ کے پتی

اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر نے ہمارے سامنے ثقافتی مزاج بدلنے کی ایک ترکیب پیش کر دی ہے لیکن اس ترکیب پر عمل کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ جو شخص پرانے راگ اور راگنیوں کے لیے نئے بول لکھنا چاہتا ہے اس میں ان خصائص کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ سنگیت ودیا میں کم و بیش پنڈت کا تبحر رکھتا ہو۔
۲۔ راگ راگنیوں کی مختلف شکلوں اور متبادل سُروں کے استعمال سے واقف ہو۔
۳۔ اپنی ثقافت، تمدن اور معاشرت کی نہج اس کے امکانات اور اس کے رُخ سے واقف ہو۔
۴۔ ہر لفظ کو ایک تماثلی اکائی سمجھ کر ایک طرف تو اس کی فصاحت اور روانی سے آگاہ ہو تو دوسری طرف موسیقی کے سلسلہ میں اس کی کیفیت سے کماحقہ واقف ہو۔
۵۔ تال پر عبور کامل ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ایک شخص کے کرنے کا نہیں اس لیے ضروری ہے کہ میل جول سے کام کیا جائے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہوگا کہ پہلے ہم ان گیتوں، نیتوں اور بولوں کو ہاتھ میں لیں جو مستعمل ہیں لیکن جن کی بنیاد کلاسیکی سنگیت پر صحیح طریقے سے قائم نہیں ہے۔ بعض بولیاں ہماری معاشرت کی بہت اچھی ترجمانی کرتی ہیں ان کو کلاسیکی سنگیت کا روپ دینا چاہیے اور بندش میں ان میں لطافت خیال اور لطافت فن پیدا کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ حکومت اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹائے گی مگر ہر کام میں حکومت ہی کی طرف دیکھنا ٹھیک نہیں۔ سنگیت کے متوالوں

[illegible] کے لیے [illegible] یہ مسئلہ [illegible] حضرت [illegible] نہیں [illegible] تحقیقات [illegible]
[illegible] چاہیے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ایمان سے ہر جزء [illegible] کیا گیا ہے۔ اور کیا [illegible]
[illegible] سکتا ہے۔

دوسری شق کی تعلیم جو لوگوں کے ذمہ ہے۔ انھیں [illegible] چاہیے [illegible] کام کرنا چاہیے [illegible]
[illegible] ہم اس سے کام [illegible] کوشش [illegible]
[illegible] فرض ہے۔

ہماری کلاسیکل موسیقی

شاہد احمد دہلوی

ہماری کلاسیکل موسیقی کی کوئی مکمل تاریخ موجود نہیں ہے تاہم ان شاستروں اور کتابوں سے اس سلسلے میں کچھ مدد مل سکتی ہے جو دست بُردِ زمانہ سے بچ رہی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم شام وید ہے اور اس کے بعد چند کتابیں ہیں جن میں سب سے مشہور سنگیت رتناکر ہے۔ پچھلی صدی کی دو چار کتابیں اردو میں بھی چھپیں مگر اب کمیاب اور نایاب ہو چکی ہیں۔ شاستروں اور گرنتھوں کی موسیقی محض ان کتابوں ہی تک سرد طریقے پر محدود ہو گئی ہو اب برتاؤ میں کہیں نہیں ہے۔ جو موسیقی آج کل رائج ہے اور جسے عرفِ عام میں پکا گانا کہا جاتا ہے ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط کے ساتھ اس کا ظہور ہوا۔

عرب اور ایران کی موسیقی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ اور یہاں آ کر مسلمانوں کی تہذیب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح کچھ یہ بھی ایسی گھل مل گئی کہ یہیں کی چیز ہو گئی۔ ہندوستان کی قدیم موسیقی شلوک اور کبت پڑھنے کے ایک مخصوص لحن پر موقوف تھی۔ فنی حیثیت اس نے مسلمان فرماں رواؤں کے زیرِ سایہ اختیار کی۔ مسلمان حکمران موسیقی کے حد درجہ دلدادہ اور نہایت قدر دان تھے۔ انھوں نے جنوبی ہند میں اور شمالی ہند میں دونوں جگہ موسیقی کو فروغ دیا اور بعض نے اس حد تک موسیقی سے شیفتگی ظاہر کی کہ پورے پورے شہر ان کلاکاروں سے آباد کیے۔

سندھ میں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کی موسیقی نے قدم جمائے اور سندھی موسیقی نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ جنوبی ہند میں مغربی ساحل سے عرب تاجروں کو میسور تک اور تیرھویں صدی تک کہ اکثر عرب تاجر یہیں آباد ہو گئے اور ان کی نسلیں اب تک مدراس کی تہذیب میں موجود ہیں۔ جنوبی ہندستانی موسیقی کو غور سے سنیے، عربی گانے کی جھلک اس میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہی زیر و بم جو عربی موسیقی میں پایا جاتا ہے خفیف سی تبدیلی کے ساتھ کرناٹکی موسیقی میں ڈھل گیا ہے۔

آب و ہوا کے فرق سے نغمے کی ساخت میں فرق ضرور آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کی موسیقی جداگانہ خصائص رکھتی ہے۔ ہندوستان تو بجائے خود ایک برِ اعظم ہے جس کے چاروں کھونٹ آب و ہوا کے اعتبار سے الگ الگ خاصیتیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ جنوبی ہند کی موسیقی اور شمالی ہند کی موسیقی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرقی ہند کی موسیقی مغربی ہند کی موسیقی سے بیگانہ ہے۔ لیکن ان سب میں ایک جزو مشترک ہے، اور وہ ہے راگ۔ راگ ہی کی وجہ سے ان سب میں مماثلت ہے، اور کل ہند موسیقی میں یکسانیت

ص سرزمین پاک و ہند

کی شباہت پائی جاتی ہے۔ جغرافیائی اور طبعی حالات کی وجہ سے صوبوں میں فرق ناگزیر ہوتا ہے اس لیے تقریباً ہر صوبے کی ایک مخصوص طرز/انداز موسیقی بھی ہے جو کلاسیکی موسیقی یا کل ہند موسیقی سے متاثر بھی معلوم ہوتی ہے اور اسے متاثر بھی کرتی ہے، چنانچہ بعض صوبائی یا مقامی موسیقی کے ڈھنگ کلاسیکی موسیقی کے مستقل اور سکہ بند طریقے یا اسلوب بن گئے مثلاً پنجاب کا ٹپہ، اور پورب کی ٹھمری اور دادرا۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ جیسے جیسے زمانے کی طنابیں کھنچتی گئیں انہیں مقبولیت حاصل ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ انہیں قبولِ عام کی سند مل گئی۔

موجودہ موسیقی کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے ہوئی۔ باہمی اثر و تاثر سے ایک نئی موسیقی نے جنم لیا۔ بعض محققین مقامی دُھنوں نے ترقی کر کے راگوں کے روپ دھارے ہیں۔ اس فن کو عملی شکل مسلمان بادشاہوں اور مسلمان فنکاروں نے دی ہے۔ موجودہ کلاسیکی موسیقی کے جنم داتا حضرت امیر خسرو ہیں جنہوں نے عربی و عجمی راگوں کی مدد و آمیزش سے نئے نئے راگ بنائے۔ ہندی راگوں میں مسلم نام کے راگوں کے پیوند لگائے، کئی نئے اسلوب وضع کیے، بین کو بدل کر ستار بنایا، پکھاوج کو بیچ میں کاٹ کر دایاں بایاں طبلہ بنایا۔ قوالی کے لیے مردنگ کو بدل کر ڈھولک بنائی، جل ترنگ بنایا۔ جگت گرو گوپال نایک کو علاؤالدین خلجی کے دربار میں نیچا دکھایا۔ عجب جامع الصفات بزرگ گزرے ہیں حضرت امیر خسرو۔ پانچ لاکھ شعر فارسی میں کہے اور طوطیٔ ہند کہلائے۔ اردو کے پہلے شاعر ہیں۔ گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، کئی کے وزیر و مشیر رہے۔ موسیقی میں نایک کہلائے۔ صوفیا میں اعلیٰ مرتبہ پایا۔ شاہوں میں شریک ہو کر سپہ گری کے جوہر دکھائے۔ ان کا کوئی مثیل آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کے بعد آسمانِ موسیقی کے درخشندہ ستارے نظام الدین مدد نایک ہیں، والئ جونپور سلطان حسین شرقی ہیں، دربارِ اکبری کے رتن میاں تان سین ہیں، ان کے بعد ایک طویل سلسلہ مغل درباروں کے گائکوں کا ہے۔ پھر محمد شاہ بادشاہ دہلی کا زمانہ آتا ہے کہ جسے فنِ موسیقی کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے، وہ بڑے موسیقی پرست تھے اور بادشاہ "رنگیلے" کہلانے لگتے ہیں۔ ان کے دربار کے دو استادوں سدا رنگ اور ادا رنگ نے خیال کی گائکی کو چار چاند لگائے۔ آخری مغل تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر شاعری میں اور موسیقی کی چیزوں میں "شوق رنگ" تخلص کرتے تھے۔ ان کے دربار کے گائک تان رس خاں کی استادی کو شمالی ہند کے تمام گھرانوں نے تسلیم کیا، یہاں تک کہ پٹیالہ کے علیا فتو (علی بخش اور فتح علی خاں) نے بھی جو موسیقی کے کرنیل اور جرنیل کہلاتے تھے۔ شاہانِ اودھ میں آخری بادشاہ واجد علی شاہ موسیقی کے سرپرست اور دلدادہ تھے، اور موسیقی کی چیزوں میں "اختر پیا" تخلص کرتے تھے۔ اس صدی میں گوالیار والے اللہ دیے خاں، بڑودے والے فیاض خاں، کیرانے والے عبدالکریم خاں اور عبدالوحید خاں، پٹیالے والے عاشق علی خاں، لاہور والے بڑے غلام علی خاں، دلی والے چاند خاں، اُمراؤ خاں، اور نصیر خاں، اندور والے نصیر الدین خاں ڈاگر اور امیر خاں، دیواس والے رجب علی خاں، رامپور والے مشتاق حسین خاں، آگرے والے ولایت حسین خاں، بمبئی والے نثار حسین خاں ——— کہاں تک ان کے نام گناؤں؟ ان کی تعداد سیکڑوں پر نہیں ہزاروں لاکھوں پر ہے۔ چند نام جو اس وقت یاد آئے اور جنہیں میں نے سنا بھی ہے قلم برداشتہ لکھ دیے۔ بہت سے اعلیٰ درجے کے گائکوں کے نام حافظے سے نکل گئے۔ ان کے علاوہ ساز بجانے والوں کی فہرست بھی ان سے کم طویل نہیں ہے۔ وہ گانے والی عورتیں بھی ہیں جنہوں نے استادی کا موسیقی میں نام پیدا کیا۔ صرف دو نام بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ پٹیالے والی گوکی بائی

نے کرشن جی نیل کی جوڑی تیار کی۔ اور آگرے والی زہرہ بائی جس نے بڑے بڑے گویوں کا پانی اُتار رکھا تھا۔ اس زمانے میں روشن آرا بیگم عام طور پر ملکۂ موسیقی کہلانے لگی ہیں۔ ان سب مسلمان فن کاروں نے موسیقی کو بام عروج پر پہنچایا ہے۔

مگر یہ کلاسیکی موسیقی یا پکا گانا آخر ہے کیا جسے ہزاروں لاکھوں فنکاروں نے صدیوں کی جد و جہد کے بعد اس درجے تک پہنچایا؟ ایسا سوال ہے جس کا جواب زیادہ دو لفظوں میں نہیں دیا جاسکتا۔ اسے بیان کرنے کے لیے ضخیم جلدیں لکھی گئیں ہیں۔ تاہم کوشش کی گئی کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کی عام فہم تشریح کی جائے۔

موسیقی کی سب سے پہلی اکائی سُر ہے۔ سُر ارتعاش سے پیدا ہوتا ہے۔ ارتعاشات میں جس قدر کمی ہوگی سُر اتنا ہی اُترتا چلا جائے گا' ارتعاشات میں جس قدر اضافہ ہوگا سُر بڑھتا چلا جائے گا۔ اب اگر ایک سُر کو قائم کرکے اُسے بنیاد تصور کیا جائے اور ارتعاشات میں دُگنا کر دیا جائے تو دُوسرا سُر پیدا ہوگا جو پہلے سُر سے اُونچا ہوگا۔ اس طرح اگر ہم ارتعاشات کو بڑھاتے چلے جائیں تو چڑھتے سُر پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ پھر ایک سُر ایسا پیدا ہو جائے گا جو بنیادی سُر یا قائم کردہ پہلے سُر سے ہم آہنگ ہوگا' اور اس کے بڑھنے پر پھر وُہی تمام سُر دُہرائے جائیں گے جنھیں پہلے سُنا جا چکا ہے۔

پہلے بنیادی سُر اور بنیادی سُر سے ہم آہنگ دُوسرے سُر کے درمیان بے شمار سُر ہوتے ہیں اس فاصلے کو سپتک کہتے ہیں۔ یہ سپتک ایک اکائی ہوتی ہے' اور ہمارا سارا گانا بجانا اس سپتک سے نکلا ہے۔ اس کے لاتعداد سُروں میں سے ایسے سُر چھانٹ لیے گئے ہیں جنھیں آسانی سے ایک دُوسرے سے تمیز کر سکتے ہیں۔ ان کی کل تعداد اگلے ماہروں نے ۲۲ مانی ہے' اور ان کو شرتیاں یعنی چھوٹے سُر کہا ہے۔ ان شرتیوں میں امتیاز کرنے کے لیے بڑی مشق و مزاولت کی ضرورت ہے۔ اس لیے ایک سپتک میں سات شُدھ سُر پہلے قائم کیے گئے جن کے نام کھرج' رکھب' گندھار' مدھم' پنچم' دھیوت اور نکھاد رکھے گئے' جنھیں مخفف کرکے سا' رے' گا' ما' پا' دھا اور نی بنا لیا ہے اور ان کے مجموعے کو 'سرگم'۔ ان کے بعد کھرج اور پنچم کو اچل یا قائم سُر قرار دے دیا گیا۔ پانچ سُروں کا ایک ایک رُوپ اور قائم بنایا' اس طرح ایک سپتک میں کل بارہ سُر قائم' تیور (چڑھے) اور کومل (اُترے) اس ترتیب سے ہوئے:

(۱) کھرج۔ قائم (۲) کومل رکھب (۳) تیور رکھب (۴) کومل گندھار (۵) تیور گندھار (۶) کومل مدھم (۷) تیور مدھم (۸) پنچم (۹) کومل دھیوت (۱۰) تیور دھیوت (۱۱) کومل نکھاد اور (۱۲) تیور نکھاد۔

عام رواج اور برتنے میں یہی بارہ سُر آتے ہیں اور انھی کی جداگانہ ترتیبوں سے ہزاروں راگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی راگ ہماری کلاسیکی موسیقی اور پکا گانا کہلاتا ہے۔

راگ کا تعلق انسانی نفسیات سے بہت گہرا ہے۔ یہ جذبات و احساسات کی موسیقی ہوتی ہے۔ راگوں کے سُر کچھ اس ترکیب و ترتیب سے لگائے جاتے ہیں کہ ان سے سننے والوں میں غم و اندوہ' مسرت و بہجت' خوف و ہراس' مجبوری و دوری وغیرہ کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ موسیقی کا جادو تو جانوروں پر بھی چل جاتا ہے۔ نغمۂ حُدی سُن کر اونٹوں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ طبل جنگ کی گرج پر گھوڑے ہو کر دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔ سپیرے کی بین پر زہریلا ناگ جھومنے لگتا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے' بھلا موسیقی سے کیسے متاثر نہیں ہوگا؟ جالینوس اور اطبائے قدیم نے مختلف نغموں سے مختلف امراض کا علاج تجویز کیا۔ آج کل بھی دماغی امراض کا علاج نغموں سے

کیا جاتا ہے۔ ہمارے راگ ہر مزاج کیفیت کے حامل ہوتے ہیں اور اس کیفیت کو اپنے فضا سامعین میں منتقل کر سکتے ہیں۔
راگ کیا ہے؟ ایک مغربی نقاد سے اس کا جواب سنیے:

It is an arrangement of notes producing definite spiritual, psychological and physical effects —As a magical formula, or let us say, a very mathematical and scientific one, the Raga takes hold of the laws of vibration, and applies them, through the art of music, to the growth and developement of the soul. The Raga is not arrived at haphazard, but is the expression of a supra-mundane urge in close conformity with divine nature, and this is what give it its magical form, its powers and beauty."

راگ جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ انہی نفسیاتی کیفیات کو قدیم ہند کے پنڈتوں نے نظریے کی اساس بنایا۔ وہ احساسات جو جذبات کو جنم دیتے ہیں اُن کی تعداد ۹ بتائی ہے:

۱. رتی (RATI) بلاوا۔ محبت۔ جنسی مسرت۔
۲. ہاسیہ (HASA) ہنسی۔ دل لگی۔ تمسخر۔
۳. شوکا (SHOKA) غم۔ اندوہ۔ ترس۔
۴. کرودھا (KRODHA) غصّہ۔ غیظ و غضب۔
۵. اُتساہا (UTSAHA) کوشش۔ محنت۔ استقلال ہمت۔
۶. بھے یا (BHAYA) خوف و ہراس۔ وحشت۔
۷. جُگپسا (JUGPUSA) ناپسندیدگی۔ نفرت۔ حقارت۔
۸. وسمایا (VISMAYA) استعجاب۔ حیرت۔
اور ۹. شانا (SHANTA) سکون۔ راحت۔ بے کیفی۔ بے حسی۔

ان سے جو نو رس بنتے ہیں اُن کے نام یہ ہیں:
۱. شرنگار ۔ ۲. ہاسیا ۔ ۳. کرونا ۔ ۴. رُودرا ۔ ۵. ویرا ۔ ۶. بھیانکا ۔ ۷. بیبھتسا ۔ ۸. اد
اور ۹. شانتا

بعض پنڈتوں نے دو رس اور بھی مانے ہیں:
۱. واتسیلا ——— اتا

۱۰. ۲. بھگتی ——— عبادت پرستش۔

ان نو رسوں کی مزید شقیں ہیں جن کا بیان یہاں غیر ضروری ہے۔

فنکار کسی ایک رس کو تمام و کمال پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعر مناسب الفاظ کا وسیلہ اختیار کرتا ہے۔ مصور رنگوں کی زبان ہے ۔۔۔ ہے اور موسیقار سُروں سے فضا میں جذبے کی تصویر بناتا ہے۔ شاعر کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس سے دشوار مصور اور بت ساز ۔۔۔ ہے۔ موسیقار کا کام سب سے دشوار ہوتا ہے۔ شاعر اور مصور کے الفاظ اور رنگوں کی طرح موسیقار کے سُر آنکھوں کے سامنے قائم نہیں ۔۔۔ سُروں کا قیام لمحاتی ہوتا ہے۔ انھیں آنکھوں سے نہیں کانوں سے دیکھنا ہوتا ہے۔ حکیم مومن خاں نے اسی خصوصیت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ہندووں نے سُر سے ایک داخلی کیفیت کو وابستہ کیا ہے۔ راگوں کی ترتیب انہی سُروں سے ہوتی ہے اور چونکہ ہر مزاجی کیفیت ۔۔۔ رنگ بھی مقرر ہے مثلاً غم کا سیاہ، خوشی کا گلابی، فراق کا زرد، حسد کا سبز اس لیے کیفیات کے ساتھ تخیل میں رنگ بھی بدلتے ۔۔۔ ہیں اور گھلتے ملتے ہیں کہ اچھے سننے والوں کے ذہن میں راگ کی ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے اسی سے راگوں کی تصویریں بنائی ۔۔۔ گویا موسیقی کو مصوری میں ڈھالا گیا ہے۔

راگ راگنیوں کے لیے وقت بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ انسانی مزاج آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی ایک سا نہیں رہتا۔ راگ کا ۔۔۔ مزاج یا نفسیاتی کیفیت سے ہوتا ہے اس لیے راگ کے لیے بھی وقت کا تعین ضروری ہوا۔ راگ اسی وقت زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے جب فنکار اور سامعین کی مزاجی کیفیت ہم آہنگ ہو۔ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

۱. نور کے تڑکے سے دوپہر تک۔	۲. دوپہر سے غروبِ آفتاب تک۔
۳. شام سے آدھی رات تک اور	۴. رات ڈھلے سے طلوعِ آفتاب تک۔

دوپہر سے شام تک کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان عموماً کسل اور تھکن محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس رات ڈھلے سے ۔۔۔ کے وقفے میں طبیعت جولانیوں پر ہوتی ہے۔ راگوں کے سُروں کو اس لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وقت کے مطابق بدلتے ۔۔۔ ہیں۔ سُر تیز بھی ہوتے ہیں اور ملائم بھی۔ جیسے جیسے رات ڈھلتی جاتی ہے اس وقفے کے راگوں میں تیز سُر کم ہوتے جاتے ہیں ۔۔۔ گھٹتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بھیرویں میں جو صبح کو گائی جاتی ہے پورے سُر ملائم ہو جاتے ہیں۔

علم موسیقی سرتاپا ایک عملی فن ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف سُروں ہی کا علم و فن نہیں بلکہ ۔۔۔ اور تالوں کا ۔۔۔ میں بہت دخل ہے۔ یہاں موسیقی کے اس پہلو کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

صدیوں میں جا کر راگوں کے اصول وقواعد بنے ہیں اور یہ اتنے مکمل ہیں کہ ان سے ذرا سا بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ہر راگ ۔۔۔ مقرر ہیں اور ان کی ادائیگی کا ایک خاص ڈھنگ ہے۔ جب تک مقررہ اصولوں کی پوری پوری پابندی نہ کی جائے، راگ دارد ہب

سرمدی قائم نہیں ہو سکتا، اور راگ کا منشا پورا نہیں ہوتا۔ کسی راگ کا مقصد اگر سکون پیدا کرنا ہے تو اس کے علاوہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس راگ کی تمام باریکیوں اور نزاکتوں سے پوری طرح واقف ہو اور ان کی ادائیگی پر پوری قدرت رکھتا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سننے والوں میں سکون پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ سعادت بہت کم فنکاروں کو حاصل ہوتی ہے اور ہر فن میں اچھے فنکار کم ہی ہوتے ہیں۔ یہ اچھے فنکار وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے عطیۂ خداوندی کی اس طرح قدر کی ہے کہ انھوں نے عبادت کی طرح اس میں ساری عمر کھپا دی ہے اور اس علم کو ایسا سوچا سمجھا کہ انھیں اس کا عرفان حاصل ہو گیا۔ اسی عرفان اور اسی قدرت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کچھ عجب نہیں اگلی روایتیں صحیح واقعات ہی ہوں اور ان کا حکم آب، آتش، باد، خاک پر بھی چلتا ہو۔

فن کے انتہائی انحطاط کے بعد بھی راگوں میں تاثیریں تو اب بھی باقی ہیں، حالانکہ خالص فن کی طرف نہ تو کسی کی توجہ ہے اور نہ فن کی پرستش۔ راگوں کا علم ایک نہایت دشوار علم ہے جسے سیکھنے کے لیے اور جس سے لطف اندوز ہونے کے واسطے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسے برتنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے، اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر ختم ہو جاتی ہے اور فنکار فن پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔

موسیقی کو سننے اور سمجھنے کے لیے ایک خاص ذوق بنانا پڑتا ہے اور اپنے اندر ایک مخصوص صلاحیت اور قابلیت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ یہ اصول کچھ موسیقی ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ کل فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص دماغی تربیت درکار ہوتی ہے، اور موسیقی میں اس کی احتیاج اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح ہمیں دیکھنے اور پھر غور کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

فن اور فنکاروں کی ناقدری اور سننے والوں کی سہل پسندی کے ہاتھوں راگوں کی شکلیں مسخ ہو گئی ہیں، اس لیے اب ان میں وہ اگلی سی تاثیر کہاں؟ اگلے وقتوں میں فنکاروں کو ہر طرح کی فراغت حاصل تھی اور کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ ایسی ہی قدردانیاں بھی تھیں کہ موتیوں سے منہ بھر دیے جاتے تھے اور جاگیریں انعام میں دی جاتی تھیں۔ کیا تعجب کہ ساری عمر کی ریاضت کے بعد فنکاروں نے وہ درجہ کمال حاصل کر لیا ہو کہ راگ کی تاثیر سے انہونی باتیں ہونے لگی ہوں۔ قوتِ ارادی کی کرشمہ سازیاں کس نے نہیں دیکھیں؟ فنکار راگ کے ذریعے ایک جذبے یا ملے جلے جذبوں مثلاً غصہ اور نفرت یا خوشی اور ہنسی وغیرہ کی تصویریں سُروں سے بناتا ہے۔ خود اس کیفیت کو اپنے اوپر طاری کر کے نقل اتار کے ذریعے سننے والوں میں بھی وہی جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ جذبات یوں بھی متعدی ہوتے ہیں، کسی کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسی آ جاتی ہے، اور غم زدہ انسان کو دیکھ کر رونا آ جاتا ہے۔ بس جس طرح ؎

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اسی طرح اگر واقعی جذبہ صادق ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اس سے متاثر نہ ہوں۔ زمانۂ حال کے ایک فلسفے نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ فضا میں سُروں کے زیر و بم سے تموّج پیدا ہوتا ہے اور کچھ ایسی برقی لہریں پیدا ہوتی ہیں جو سننے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔ اگر ایسے آلے بن جائیں یا بن چکے ہوں جن سے ان برقی لہروں کی قوت کو جانچا جا سکے۔ دوسری ناممکن نظر آنے والی باتوں کی طرح ممکن ہے سائنس اس بات کو بھی ممکن کر دکھائے۔ آج کل موسیقی کے وہ اعجاز دکھائی نہیں دیتے جن کا ذکر کتابوں اور روایتوں میں ہوتا ہے تو کیا

کی تابیریں اور گتیں ہیں، راگ تو موجود ہیں لیکن ان سے اثر آفرینی کرنا ہمارے فنکاروں کا کام ہے۔ فنکاروں میں اتنی صلاحیت ہی اب نہیں ہوتی کہ راگوں سے اثرات مرتب کر سکیں۔ ورنہ سترہ اٹھارہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ سردار پٹیل عارضہ قلب میں مبتلا تھے تو انھیں ان کے ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ کسی اعلیٰ درجے کے فنکار سے نرم و نازک موسیقی سنیں۔ سردار پٹیل اس زمانے میں نشریات کے بھی وزیر تھے۔ انھوں نے ریڈیو والوں سے کہا اور ریڈیو والوں نے سارنگی کے جادوگر استاد بندو خاں کو بھیج دیا۔ خاں صاحب گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ ان کی کوٹھی پر جاتے اور انھیں طرح طرح کے سکون بخش راگ سناتے۔ اللہ کی شان کہ سردار کو دل کے دورے پڑنے ملتوی ہو گئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد استاد کو بڑی بڑی رقمیں ریڈیو سے دلوانے کا لالچ دے کر دلی میں روک لیا گیا مگر جیسے ہی استاد کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملا استاد چپکے سے نکل آئے اور کچھ عرصے بعد سنا کہ سردار پٹیل ہارٹ اٹیک میں چل بسے۔ اور یہ تو خود ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک صاحب اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر آئے اور بتلانے لگے کہ اسے مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ کسی نے کبھی ان سے کہا تھا کہ اسے گانا سکھواؤ تو اس کا مرض جاتا رہے گا۔ لہٰذا ہم نے اس لڑکے کو گانا سکھانے کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا۔ جب تک یہ لڑکا سیکھتا اور گاتا رہا اسے دورہ نہیں پڑا۔ پھر بعض وجوہ سے اس نے گانا چھوڑ دیا تو اسے دورے پڑنے لگے۔ اس نے پھر گانا شروع کر دیا، دورے ملتوی ہو گئے چھوڑ دیا پھر شروع ہو گئے۔ اب تک یہی تو اتر کے ساتھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

فن اور فنکاروں کے تنزل کے اسباب پر بھی ہمیں دھیان دینا چاہیے۔

اوّل تو راگوں کی صداقت مشتبہ ہو گئی کیونکہ استادوں میں اختلاف ہو گیا اور ہر ایک کو اپنی روایت کی صحت پر اصرار ہے۔ لہٰذا ہماری کوئی ایک راگ چار طرح سے سنا ہے۔ اس کا فیصلہ کیسے ہو کہ صحیح کون ہے اور غلط کون؟ دوسرے فنکاروں کی ناقدری نے ان کو فن کی صحیح تحصیل سے محروم کر دیا۔ تیسرے پیٹ پالنے کے تفکرات اور غم دوراں کی کشاکش سے انھیں اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ فن کو اعلیٰ پیمانے پر پہنچائیں۔ چوتھے جہالت کی وجہ سے فن کی علمی شان مٹتی چلی گئی۔ پانچویں قدامت پرستی نے فن کو جامد کر دیا جس کی وجہ سے ترقی تو یکسر موقوف ہو گئی اور فن گھٹتے گھٹتے تنزل کی آخری حد میں پہنچ گیا۔ چھٹے اس فن کو ہر دلعزیز بنانے اور عام کرنے کے بجائے اسے میراث بنا کر محدود کر دیا اور اس کے بتلانے میں اتنے بخل سے کام لیا گیا کہ بعض صورتوں میں شاگردوں کا ذکر ہی کیا باپ نے بیٹے کو بھی فن کے گر نہیں بتلائے اور جب اس فن کو سمجھنے والے ہی نہ رہے تو اس کی قدر کون کرتا؟ پیشہ ور فن کاروں نے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری نتیجہ یہ کہ فن مٹتا چلا گیا اور بہت کچھ ان ہی کے ساتھ دفن ہو گیا۔ ساتویں ہمارے فن کاروں نے راگوں کی روح کو تو چھوڑ دیا اور صرف ہنر مندی کی تکمیل کو فن قرار دے لیا جس کی وجہ سے راگ کا رس غارت ہو گیا۔ آٹھویں فنکاروں کی جہالت کے باعث معاشرے میں فنکاروں کو پست ترین درجہ دے دیا گیا اور انھیں حقارت سے دیکھا جانے لگا۔ یہاں تک انھیں گرا دیا گیا کہ ان کا شمار کمینوں میں ہونے لگا اور ان کے ساتھ چھوٹا سلوک کیا جانے لگا۔ نویں افلاس کی وجہ سے خصوصیت میں جو برائیاں بالعموم در آتی ہیں وہ سب ان فنکاروں میں بھی آ گئیں اور فنکاروں نے فن کو پس پشت ڈال کر اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسندکی موسیقی کو اپنا شعار بنا لیا اور شیتں میں ایسی ایسی اختراعات کیں جو شعور راگ مسخ ہو گئے۔ فن کی جگہ بازیگری نے لے لی اور ہماری موسیقی ہر دو صعب بند مغنیوں کا ایک تماشہ ہو گئی۔ اس کی روحانیت رخصت ہو گئی اور اس میں فحاشی نے جگہ پائی۔ دسویں حکومت نے دیس کے ثقافت کی سرپرستی نہیں کی اور اس طرح تعمیر و تعمیر سے ادارے

قائم نہیں کیے اور نہ اس فن کی بقا و ترقی کے لیے کچھ کیا۔ لہٰذا اس کا تنزل ہوتا چلا گیا۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر ہماری موسیقی کا علم و فن پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ وہ روحانیت اور وہ تاثیر اب اس میں کہاں باقی رہ جاتی جس کے تذکرے ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ دیپک گانے سے آگ لگ جاتی تھی اور میگھ ملہار گانے سے مینہ برس جاتا تھا۔ آج کل ان روایتوں کی حیثیت کہانیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جس زمانے میں فنکار موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور مقصد حاصل کرنے کے لیے ایسی ریاضت بھی کرتے تھے تو کیا عجب کہ ان کی گرم جوشی روحانیت کے باعث ایسے معجزے ظہور میں آتے ہوں۔ آخر صوفیائے کرام کے ایک فرقے نے موسیقی کو (قوالی بھی موسیقی میں شامل ہے) تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اگر ہمارے فنکار بھی اس نقطۂ نظر کو قبول کر لیتے تو آج ان کی یہ درگت نہ ہوتی۔ اور فن کا بھی بھلا ہوتا۔

فن اور فنکار کے اس درجہ برباد ہو جانے پر بھی ہمارے راگوں میں کچھ نہ کچھ تاثیر اب بھی باقی ہیں۔ اور اگر راگ ودیا کی چھان بین اور سائنٹیفک ریسرچ کرنے کی کبھی ہمیں توفیق ہوئی تو کوئی تعجب نہیں کہ موسیقی کی ناقابل یقین قوتوں کا حیرت انگیز انکشاف ہو جائے اور مبالغہ خیز کہانیاں اسی طرح سچی حقیقتیں ثابت ہو جائیں جیسے ہوائی جہاز، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے مضحکہ خیز نظریے آج ہماری روزمرہ کی زندگی کی محسوس حقیقتیں بن گئے ہیں۔

مسلمانوں کے اس عظیم ورثے کو مٹ جانے سے بچانے کے لیے تعلیم یافتہ حضرات کو اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو بھی اس کی سرپرستی پر مائل ہونا چاہیے اور آرٹ کاؤنسل اور میوزک کاؤنسل جیسے سرکاری امداد پانے والے اداروں کو اس فن کی بقا و ترقی کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے کیونکہ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کلاسیکل موسیقی سے ہمسری

سجاد سرور نیازی

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

مجھے آپ کی خدمت میں اس امر کی وضاحت کرنی ہے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جنھوں نے ہماری کلاسیکی موسیقی کو للکارا اور اس کی ترقی اور ترویج کی راہ میں رُکاوٹ بن گئے۔ اس کے لیے ہمیں اس فن کی تاریخ کے کچھ پرانے ورق اُلٹنے پڑیں گے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ صدیوں پہلے کلاسیکی موسیقی کی بنیاد دیہاتی عوامی دُھنوں پر رکھی گئی تھی۔ عوامی دُھنیں عوام کے دلوں سے اُٹھیں اور ان کے بولوں سے سادہ نغموں کی صورت میں ہویدا ہوئیں۔ انسان تجربے اور اجتہاد سے زیادہ عقلمند ہوتا گیا اور فنونِ لطیفہ جو انسان ہی کی جدت طبع کا نتیجہ تھے انسانوں کی عقل و بصیرت کے ساتھ ترقی کرتے گئے۔ شہری پیشہ ور اور شوقین موسیقاروں نے دیہاتی دُھنوں پر زیادہ خوش قطع عمارتیں تعمیر کیں۔ آواز اور نغمے کے قواعد مرتب کیے اور کلاسیکی موسیقی کی بنیاد رکھ دی۔ دیہاتیوں کی رُوح اور جذبات کو تسکین دینے کے لیے دیہاتی دُھنیں کافی تھیں۔ گو عوامی گیت زمانے کے ساتھ شکل و صورت بدلتے رہے لیکن بنیادی طور پر وہ عوامی گیت ہی رہے ان میں ان کی خصوصی خوبیاں بدستور قائم رہیں لیکن شہری موسیقاروں کی ضروریات عوامی دُھنوں سے پوری نہ ہو سکیں۔ انھوں نے اپنے وقت کے تقاضے کے مطابق عوامی دُھنوں کے نقش پر موسیقی کے مختلف اسلوب تیار کیے اور سامعین کو اُن کے سننے اور پسند کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ مذہبی، جنگی، رُومانوی اور دیہاتی بولوں کو مختلف راگوں میں پیش کر کے ایک کثیر تعداد سامعین کی پیدا کرلی۔ الاپ، دھرپد، ہوری، ترانہ، ٹپہ اور خیال آگے پیچھے معرضِ وجود میں آئے اور خوب مقبول ہوئے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان وقتوں کی سوسائٹی کو دیکھ کر اس موسیقی کو تیار کیا گیا تھا۔ فن اور سوسائٹی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے میں سوسائٹی کی وجہ سے موسیقی نے یہ صورتیں اختیار کیں اور ان صورتوں نے سوسائٹی کو اپنے رنگ میں رنگا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک نہ اطمینان اور طمانیت بخش فن پرورش پا گیا۔

دیہاتی عوامی گیتوں اور سانگوں سے جی بہلاتے رہے۔ شہری دھرپد اور خیال سے لطف اٹھاتے رہے۔ بادشاہوں، مہاراجوں اور نوابوں نے گویّوں کو ملازم رکھا جہاں مال و دولت، فوجیں اور ساز و سامان حرب ضروری تھا وہاں ثقافتی میدان میں بھی ایک دوسرے سے بازی لے جانا شاہانہ طمطراق اور شان و شکوہ کے لیے لازمی تھا۔ نامی گرامی اور قابل شاعروں، مصوروں اور موسیقاروں کو درباری بنالیا۔ گویّے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے گانے کے نئے اسلوب پیدا کرنے کی دُھن میں لگ گئے اور نئی شکلیں اور طرزیں اختراع کرنا شروع کردیں۔ انھوں نے جان توڑ کر اپنے فن میں خوبیاں اور دلکشیاں ڈالیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ قدردان بادشاہ ان کو خلعت دے کر طرح طرح کی نوازشوں اور جاگیروں سے مالا مال کر دیتے۔

اب اودھ کے تاجداروں کا زمانہ آیا۔ واجد علی شاہ نے ٹھمری کی لطافت کی نظروں سے دیکھا۔ جو انھوں نے بچپن سے ٹھمری، دادرے اور ریختے لوگوں کے دلوں اور مذاق پر اثر انداز ہونے لگے۔ کلاسیکی موسیقی کی ناسی ٹھنڈی پڑ گئی۔ ناٹک اور اوپیرا کے زمرے میں اندر سبھا کا تجربہ کامیاب ہوا تو تھیئٹر نے بھی سر نکالا۔ پارسیوں نے سیکڑوں ناٹک لکھوائے۔ ہارمونیم ماسٹر یعنی اس زمانے کے میوزک ڈائرکٹروں کی جماعت وجود میں آئی اور کمپوزڈ میوزک کی داغ بیل پڑی۔ میوزک ڈائرکٹر ناٹک کی طرزیں بنانے لگے۔ یہ طرزیں چونکہ ناٹک کے کرداروں سے گوائی جاتی تھیں اس لیے ان کو عموماً آسان اور ہلکی پھلکی موسیقی میں تیار کیا جاتا تھا۔ ڈرامے کے پس منظر میں یہ طرزیں لوگوں کو بہت بھائیں اور ان میں سے کئی ایک زبان زد عام ہو گئیں۔ اتنے میں گراموفون کمپنی کا زمانہ آ گیا۔ چونکہ یہ کمرشل ادارہ تھا انھوں نے بڑے بڑے شہروں میں ریکارڈنگ روم کھول کر معیار کا خیال بالکل نہ رکھتے ہوئے ہر وہ گانا ریکارڈ کر ڈالا جو بک سکتا تھا۔ شہروں کے علاوہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ کمپنی نے اپنی گراموفون مشینیں بیچیں۔ کلاسیکی موسیقی کے چیدہ چیدہ اور تھوڑے سے ریکارڈ بنائے لیکن موسیقی کی باقی صنفوں میں کسی ایک کو بھی جلب منفعت کی خاطر ریکارڈ کرنے سے نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ عامیانہ سطح کی سیٹھنیاں اور مبتذل گانے جو رنڈیوں سے بھی بازاروں میں گائے گئے تھے ریکارڈ کر ڈالے۔ بھجنوں اور قوالیوں کی بھرمار شروع ہو گئی۔ آپ خود خیال فرمائیں کہ جب لوگوں کو آسان فہم اور ان کے مذاق کے مطابق گانے سستے داموں مہیا ہونے لگیں، تو کلاسیکی موسیقی ان کو رفتہ رفتہ کیوں نہ گراں گزرنے لگے اور ایسا ہی ہوا۔

اب کلاسیکی موسیقی کے پرستاروں اور گرویوں کو اور، ان میں بالخصوص ہندوؤں کو جو راگ ودیا کو مذہب کا ایک ضروری اور اہم جزو سمجھتے تھے بڑا خطرہ لاحق ہوا۔ گھر گھر خدشات کا اظہار ہونے لگا۔ کانفرنسیں بلائی گئیں۔ گندھروا مہا ودیالے میوزک سکول اور کالج کھولے گئے غرض راگ ودیا کا سبھاؤں جلسوں اور میلوں میں زور شور سے پرچار کیا گیا۔

جو بہت اچھے اور نامی گائک تھے ان کے سننے والے تو پھر بھی کئی تھے لیکن بھدی آواز والے مصنوعی قسم کے گرویوں کو سننے پر ناٹک دیکھ لینے یا گراموفون ریکارڈ سن لینے کو ترجیح دی جانے لگی۔

اندریں حالات کلاسیکی موسیقی کی جاتی ساکھ کو بچانے کی کوششیں شد و مد سے جاری تھیں کہ متکلم فلموں کا زمانہ آ گیا۔ لوگوں کے لیے یہ ایک نہایت دلآویز اور دلچسپ مشغلہ تھا۔ فلمیں درجنوں بننے لگے جاتے اور سینما گھروں پر تماشائیوں کی وہ بھیڑ لگتی کہ ٹکٹ تک دستیاب ہونا دشوار ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ دیسی متکلم فلموں نے شائقین کی ایک بہت بڑی جماعت کو کلاسیکی موسیقی کے دائرہ اثر سے نکال کر اپنی طرف راغب کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور غضب ہوا کہ مغربی فلمیں مع اپنی موسیقی اور رقص کے کچھ اس انداز سے پیش ہونے لگیں کہ متمول اور متوسط گھرانوں کے بے شمار نوجوان مغربی موسیقی سے متاثر ہونے لگے۔ وہ کان جو دھرپد، خیال اور ٹھمری کی نغمہ سرائی کے لیے وقف تھے۔ جیز کی تال اور مغربی موسیقی سن کر خوش ہونے لگے۔ نئی پود راک این رول اور ٹوئسٹ کرنے لگی۔

عوامی ناچوں میں شہری حصہ نہیں لیتے لیکن جب سے انھیں مغرب کے استادوں سے معلوم ہوا ہے کہ کسی ملک کی ثقافتی سرگرمیوں میں عوامی موسیقی اور رقص کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے تو پھر اپنے شوز میں اپنی ثقافتی فوقیت اور دریا دلی دکھانے

کے لیے بیروانہا بستی کے ٹکڑوں جیسے فرسودہ پیلے اور دیہاتی ناچوں کی نقل کرکے دیہاتیوں کی عزت افزائی کرتے رہے۔ اعلیٰ درجے
کی تربیت یافتہ رقصوں کا شمار کلاسیکی موسیقی میں ہوتا ہے۔ جن میں بھارت ناٹیم کتھا کلی، منی پوری، کتھک ناچ مشہور اور مقبول ہیں ان
میں مسلمانوں نے کتھک کو زیادہ مروج دیا لیکن یہ ناچ اب طوائفوں نے اپنا لیا ہے۔ بیشتر گھرانوں میں رقص و سرود کا شمار خرافات میں
ہے اور شرفا اپنی اولاد کو اس کے کسب و اکتساب سے منع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیسی ناچ کے لیے طبلہ سارنگی وغیرہ کی سنگت
درکار ہے۔ لیکن راک اینڈ رول، ٹوئسٹ، یا بال روم ڈانس کے لیے مغرب نے بیشمار ریکارڈ تیار کیے ہیں جن کو بجا کر ان کی لے کے
ساتھ ہمارا نوجوان طبقہ ناچنے کی حسرت پوری کر لیتا ہے گویا یہ ایک اور وجہ ہے ہمارے نوجوانوں کے مغربی موسیقی سے لگاؤ کی۔ انسان
کی توجہ کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف لگن زیادہ ہو جائے تو دوسری طرف سے میلان کم ہو جاتا ہے۔

دیسی کلاسیکی موسیقی کو حاصل کرنے اور اس پر قادر ہونے کے لیے تو ایک عمر چاہیے لیکن انسان اس سے کماحقہ لطف اندوز
ہونے میں ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک اس کی تکنیک سے واقفیت ہو۔ یہ درجہ پانے کے لیے بھی کافی جد و جہد کرنی پڑتی
ہے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو راگ رنگ کو کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر فضول اور مخرب اخلاق سمجھتے ہوئے
بچوں کو اس کی تعلیم دلوانا گوارا نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے بچوں کے آوارہ ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ان قدغنوں
کے ہوتے ہوئے ایک قوم کس طرح موسیقی میں مناسب دلچسپی لے سکتی ہے۔ چہ جائیکہ اپنے آپ کو کلاسیکی موسیقی کا دلدادہ بنا
لے۔ اور فرض کیجیے کہ کچھ لوگ کلاسیکی موسیقی کے رسیا کسی نہ کسی طرح بن بھی گئے تو موجودہ دور میں ان کے پاس وقت کہاں کہ کسی
[illegible] یا اس کی ولمبت اور درت لیکاری اور تان پلٹوں کا دو دو گھنٹے بیٹھ کر کریں یا سن کر لطف اندوز ہو سکیں ہاں
کبھی بار جب موسیقی کی خاص مجلس ہو اور اس میں گراں پایہ گائیک اور بجائیک اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہوں یا نامور رقاص اپنے
[illegible] پیش کر رہے ہوں تو کبھی شائقین گھنٹوں ایسے خوشگوار لمحے خوشی سے گزار دیں۔ لیکن یہ تو کبھی کبھار کی بات ہے۔ کلاسیکی موسیقی
کے جلسے پر اب کمال ([illegible]) ایسی پیدا ہو سکا ہیں جن پر وقت بھی تھوڑا صرف ہوتا ہے اور آدمی اس سے
[illegible] متمتع بھی ہو سکتا ہے۔ آج کل زندگی کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ اب سے تیس پینتیس برس پہلے ان کا تصور بھی
نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خاص مجلسوں کو چھوڑ کر عام موقعوں پر گویا مشکل تانوں پلٹوں سے بھرپور لمبا خیال گائے گا تو سننے والوں میں
بے چینی اور اکتاہٹ پیدا ہو جائے گی اور وہ دوبارہ ایسی مجلس میں بیٹھنے سے گریز کریں گے۔

اس ضمن میں ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان اور اس محکمے کے دیگر اصحاب اقتدار کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا
چاہتا ہوں کہ ریڈیو پاکستان برائے نام نادار کلاسیکی موسیقار کو پروگرام دے کر ان کی معاشی زندگی کو سہارا دینے کا نیک کام کر رہا
ہے لیکن وہ گویا جو جمالیاتی ذہنی اور فنی لطافت سے گانے کو نہیں نباہ سکتا۔ سننے والوں کو کلاسیکی موسیقی سے متنفر کر دیتا ہے جس
کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ریڈیو کی سوئی کلاسیکی موسیقی کے پروگرام سے ہٹ کر دوسری نشریات کی طرف گھوم جاتی ہے۔

ایک بنا وا گویا یا عمر رسیدہ ضعیف موسیقار جس کے گلے میں سچے سر لگانے یا تان پلٹے کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کی طاقت
نہ ہو ریڈیو پر گا کر کلاسیکی موسیقی کی ترویج کا قدر شناسی کو سخت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ریڈیو پر صرف بہترین گانے والے

گا ہیں جن میں خوبصورت طریقے سے گانے کی قدر ہو۔ جو گیت اب گانے کے قابل نہیں رہے یا ان کا نشر کرنے سے سُننے والوں کی توقعات پوری نہیں ہو سکتیں ان کی مالی امداد کر دی جائے اگر بہت ضروری ہو تو ان کے لیے کوئی اور مناسب انتظام کیا جائے

کلاسیکی موسیقی کو ریڈیو پر زیادہ وقت دے کر اور ہر کس و ناکس گویّے کو نادر پوکا کے لیے بھرتی کر کے مطمئن ہو جانا اس سے کلاسیکی موسیقی کی توقیر یا اس کی جاذبیت میں اضافہ ہو جائے گا میری رائے میں کوئی تسلی بخش اقدام نہیں۔ ا گانے والے بھی کسی پلان (PLAN) کے تحت گانے نشر کریں۔ گراں پایہ گویّوں کی قابلیت کے ہم معتر ہیں اور ان کی دل سے عزت کرتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر گراں بہا فن کے مالک ہونے کے باوجود اس کو کامیابی سے سُننے وا کے سامنے مؤثر طریقے سے پیش نہیں کر سکتے۔ اس کام میں شومین شپ (SHOW MAN SHIP) اور سیلز مین (SALES MAN SHIP) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی نشریات کو کوئی صاحب نظر و فن پیش کرے۔ نشر کی والے راگ ان کے بولوں کی شانِ نزول، گانے والے کی تربیت اور گائیکی کا انداز، سُر کے اتار چڑھاؤ، جملے کے ٹھیکے اور وغیرہ، گانے کو سامعین سے متعارف کرواتے وقت بتائے جائیں۔ مگر اس کام کو پیشہ ور اناؤنسروں پر نہ چھوڑا جائے جو کا صرف لکھی ہوئی اناؤنسمنٹ کو پڑھ دیتے ہیں۔

سب سے آخر میں اب میں اس مدِمقابل کا ذکر کروں گا جس نے کلاسیکی موسیقی کے ساتھ سب سے زیادہ مقابلہ ہے اور اس کی ہر دلعزیزی میں کافی کمی پیدا کر دی ہے۔ میرا اشارہ فلمی موسیقی کی طرف ہے۔ یوں تو اس پر دفتر لکھے جا سکتے لیکن میں مختصراً فلمی موسیقی کی دو قسموں کا ذکر کروں گا۔

پہلی قسم جو بہت زیادہ مقدار میں کمپوز کی گئی ہے۔ اس کو کوئی خاص نام نہیں دیا جا سکتا۔ آپ اسے بازاری ف موسیقی کہہ لیجیے۔ اس کے کمپوز کرنے والے بے شمار ہیں۔ کوئی بھی معمولی درجے کا ساز بجانے والا بہت قلیل معاوضے پر فلمیں بنانے والے کے ہاں ملازم ہو جاتا ہے۔ ایسا پروڈیوسر کہانی بھی سستے داموں خریدتا ہے یا کم تعلیم کے باوجود خود لکھ گانے بھی کوڑیوں کے دام لکھواتا ہے جس کے بول بہت کمزور اور ناقص ہوتے ہیں۔ سینسر ہوتے وقت ابتذال کے الزام بال بال بچتے ہیں۔ ایسی موسیقی کو خوش ذوق لوگ تو کبھی پسند نہیں کرتے لیکن اس کا عوام کے دلوں اور ذہنوں پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ اس قسم کے گانے کو سُننے والے کلاسیکی موسیقی کی طرف کبھی راغب نہیں ہو سکتے۔

دوسری قسم اعلیٰ درجے کی فلمی موسیقی ہے۔ یہ موسیقی ہمارے ملک کے قابل اور ہونہار کمپوزر تیار کرتے ہیں۔ چو ان موسیقاروں کو موسیقی کے ہر شعبے سے مکمل واقفیت ہوتی ہے اور خود صاحب ذوق اور صاحب دل ہوتے ہیں اس لیے ا کی تیار کردہ موسیقی پُرکشش ہوتی ہے۔ یہ لوگ نت نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی موسیقی ایک طرف ہما کلاسیکی موسیقی کی مرہونِ منت ہوتی ہے تو دوسری طرف ہماری عوامی موسیقی کی دلآویزیوں کی حامل ہوتی ہے۔ یہی لوگ جو بسا اوقات مشرقی اور مغربی پاکستان کی موسیقی کے خصوصی رنگ کو آپس میں بڑی خوبصورتی سے ملاتے ہیں۔ ان لوگوں نے کے دیگر ممالک کی موسیقی سے بھی اقتباس کیا ہے اور جہاں جہاں خوبصورتی نظر آئی ہے اسے اپنا لیا ہے۔ یہ لوگ گویا ہماری موسی

۔۔ سندائی پُر وقار بلکی پھلکی موسیقی پیدا کر رہے ہیں۔

باوجود اس کے کہ اس موسیقی کو میں اچھی موسیقی میں شمار کرتا ہوں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ بسا اوقات اس موسیقی نے کلاسیکی موسیقی کا رنگ پھیکا کر دیا ہے۔ چونکہ میں کلاسیکی موسیقی کا بذاتِ خود بہت مداح ہوں اور اسے پسند کرتا ہوں میں اپنے ملک کے کلاسیکی موسیقاروں سے گزارش کروں گا کہ وہ ان خطرات کو جن سے میں نے اُن کو آگاہ کیا ہے مدنظر رکھتے ہوئے اپنی موسیقی کے رنگ اور ڈھنگ میں نئی اور خوش آئند تبدیلیاں پیدا کریں۔ پرانی روش سے بھی سامعین کا دل خوش کریں اور ان کو اپنا گرویدہ بنائے رکھیں۔

امیر خسرو اور اصنافِ موسیقی

مسعود پرویز

اس مقالے میں امیر خسرو کی جامع الصفات شخصیت کے صرف اس فنی کمال کو اجاگر کرنا مقصود ہے جس کا تعلق اصناف موسیقی سے ہے ۔ ان کے ایجاد کردہ راگوں، تالوں اور سازوں پر بحث و تمحیص اس مقالے کا موضوع نہیں۔ اس سلسلے میں جو مواد ہماری رہنمائی کر سکتا ہے وہ یا تو خود ان کی اپنی تصانیف میں پایا جاتا ہے یا ان تذکروں اور تاریخوں میں جو وقتاً فوقتاً مرتب ہوتے رہے۔ یا پھر وہ روایات ہیں جو موسیقاروں میں سینہ بسینہ چلی آتی ہیں۔ ... خان نے نفائس المآثر میں لکھا ہے کہ امیر نے ۹۹ کتابیں تصنیف کیں۔ امین رازی ہفت اقلیم میں ان کی تعداد ۹۹ بتلاتے ہیں لیکن ان میں آج بیس سے زیادہ کا سراغ نہیں ملتا۔ دولت شاہ کے مطابق امیر نے ایک رسالہ فن موسیقی پر بھی لکھا (تذکرۃ الشعرا، ص ۲۲۱) اور وحید مرزا اپنی فاضلانہ کتاب "لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو" میں لکھتے ہیں:

> غالباً اس موضوع پر اگر شاعر نے کچھ لکھا بھی ہو تو وہ کوئی ضخیم یا مستقل کتاب نہ تھی (ترجمہ ص ۲۳۶)

اس کے ثبوت میں وحید مرزا امیر کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

> نظم را کردم سہ دفتر ور بہ تحریر آمدے
> علم موسیقی سہ دیگر بود ار باور بود

حیرت ہے کہ رفیق محمد خان غوری اپنی تصنیف حیات امیر خسرو میں اسی شعر سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

> "گویا موسیقی کا بیش بہا ذخیرہ انہی کی زندگی میں ضائع ہو گیا تھا" (ص ۱۹)

اور شاہ احمد دہلوی اسی کتاب کے اگلے صفحے پر لکھتے ہیں:

> "خود امیر خسرو کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے موسیقی کے تین دفتر لکھے تھے جو تلف ہو گئے۔"

اس شعر کا ترجمہ یہ ہے:

> "میری شاعری کے تین دفتر ہو گئے اور اگر میں تحریر کرتا تو یقین کرو علم موسیقی کے بھی تین دفتر ہو جاتے۔"

یہ شعر امیر کے قصیدے ... غرۃ الکمال میں شامل ہے اور اس کے بعد امیر نے فن موسیقی پر کوئی کتاب نہ لکھی کیونکہ ہو سکتا ہے ... لکھی ہو۔ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انھیں ایسی کتاب لکھنے کی خواہش ضرور تھی۔

اس بنا پر اس تصنیف کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی ضخیم یا مستقل کتاب نہ تھی۔ ...

میں فن موسیقی پر ایک باب ہے جس کا عنوان امیر نے یوں باندھا ہے :

"در تشعب اصول و فروع موسیقی مصرع بست این ہم حرف نسبت موسیقی"

اس باب کے سترہ صفحے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ باب الگ رسالے کی صورت میں بھی مروّج رہا اور فنِ موسیقی پر جس رسالے کی طرف تذکرہ نگاروں نے اشارہ کیا ہے وہ یہی ہو۔ وحید مرزا نے اپنی کتاب میں اس باب سے استفادہ کیا ہے لیکن یہ بات نہیں۔ بظاہر اس باب میں تصنع زیادہ ہے اور مضمون کم لیکن اس کی ہر سطر موسیقی کی مصطلحات سے بھری ہوئی ہے اور تمام صنائع و بدائع موسیقی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً ایرانی راگوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"کہ اصول چرا منحصر بر چہار است و پردہ بر دوازدہ و ابریشم بر شش و مابقی فرعیت کہ ہم از یجا شاخ میزند۔" (ص ۱۸۷)

مثنوی قران السعدین میں سات صفحے سازوں اور پردوں کی صفت میں ملتے ہیں (ص ۱۷۷ تا ۱۸۳) موسیقی سے متعلق امیر کی ان تحریروں کے مستند ترجمے اور قابلِ اعتماد تشریح کے لیے کسی ایسے ماہرِ زبان کی توجہ چاہیے جو ایرانی اور عربی موسیقی کے رموز سے آشنا ہو۔

میں یہاں آپ کی توجہ امیر کی بسیار نویسی کے ایسے میدان کی طرف دلاتا ہوں جس کا بظاہر موسیقی سے کوئی تعلق نہیں۔ دولت شاہ کے مطابق امیر نے خود اپنی تحریروں میں تصریح کی ہے کہ ان کے ابیات کی تعداد پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہے اور اودھا نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے (شعر العجم ص ۱۳۸) لیکن ان کے ہندی کلام میں سے گنتی کے چند اشعار، پہیلیوں، مکرنیوں، دوہروں اور دو سخنوں وغیرہ کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ باقی ہندی کلام کیا ہوا؟ وحید مرزا کی رائے میں امیر اپنے ہندی کلام کو فارسی کلام کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور امیر کا اس وقت کی کتابی ہندی پر کھڑی بولی کو ترجیح دینا بھی وحید مرزا کے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ وہ:

"ہندی شعر صرف اپنا اور اپنے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے کہتے تھے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس مقصد کے لیے وُہی عام روزمرہ کی زبان موزوں تھی جو اس وقت بولی جاتی تھی۔" (ترجمہ لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۳۱)

میری رائے میں امیر خسرو کی عظمت متقاضی ہے کہ اس مسئلے کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جائے۔ امیر ایک درباری فنکار ضرور تھے اور علم و فضل میں یگانۂ روزگار، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک عوامی فنکار بھی تھے۔ ان کی ہمہ گیر مقبولیت اس امر کی دلیل ہے ترکی اور فارسی زبانیں انھیں باپ کی طرف سے ورثے میں ملیں لیکن ہندی (یا ہندوی) صحیح معنوں میں ان کی مادری زبان تھی۔ ہندی کلام محض ایک محدود مشغلۂ دل بہلاوا نہ تھا بلکہ ان کی روزمرہ زندگی کا ایک اہم جزو۔ اس کلام میں وہ ہمہ گیری اور خلوص تھا جو ایک عوامی فنکار کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر رہے تو اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ امیر کا بیشتر ہندی کلام کیا ہوا؟ اس کلام نے اپنی ہمہ گیر مقبولیت کے باعث لوک گیتوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہ شاعری جو موسیقی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی

زندگی کے اس قدر قریب تھی کہ یہ عوامی ادب اور فن میں جذب ہوگئی۔ کچھ اس طرح جیسے یہ عوام کی اپنی تخلیق ہو۔ گنتی کے چند لوک گیت ہیں جن کے مصنف کا نام عوام کو اب تک یاد ہے۔ مثلاً:

"چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملا کے"

یا "کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے"

یا "اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا" وغیرہ

ان لوک گیتوں کے علاوہ امیر کی وہ بے شمار بندشیں بھی ہیں جنھوں نے قدیم ہندوستانی موسیقی کی روش تبدیل کر کے رکھ دی اور شعریت کی روایات میں ایسا عظیم انقلاب برپا کر دیا کہ موسیقی کی تاریخ میں اس دور کو خسروی دور کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس دور کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ بھارت میں امیر خسرو کے نام سے ایک مستقل اکیڈمی قائم ہو چکی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان میں ابھی تک ایسا کوئی ادارہ وجود میں نہ آسکا اور اس عظیم فن کار کی تصانیف و اختراعات کے متعلق تدوین و تحقیق کا دروازہ ابھی تک بند ہے۔

اس مختصر تمہید سے آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ جس فردوس گوش کی تخلیق امیر کے ہاتھوں ہوئی وہ یا تو وقت کے دبیز پردوں میں مستور ہے یا اس کی بازگشت عوامی ادب اور فن میں سنائی دیتی ہے یا ان موسیقاروں کے حلقوں میں جنھیں امیر کی نغماتی اختراعات سینہ بسینہ ورثے میں ملیں یا پھر اس کی جھلک امیر کی ان تحریروں میں ملتی ہے جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہیں۔ ان حالات میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث ناممکن ہے۔ مجبوراً کہنا پڑتا ہے:

حریمِ ناز کی خلوت میں دسترس ہے کسے
نظارہ ہائے سرِ رہگذر کی بات کرو

تو اس مقالے کی حقیقت "نظارہ ہائے سرِ رہگذر" سے زیادہ نہیں۔

اس فردوس گوش کا پہلا طلسم خانہ الفاظ سے مرتب ہوا۔ امیر کا ذوقِ سخن اس درجہ حساس اور ذوقِ سماع اتنا ہمہ گیر تھا کہ مثنوی کا مطلع ان اشعار میں لکھتے ہیں:

ہر چہ دریں پردہ نغم ساختند
قافیہ از بہرِ سخن ساختند

الفاظ صوتی اشارات (   ) کی حیثیت سے خیال و معنی کا وسیلہ ہیں لیکن ان کی محض صوتی کیفیت ایک موسیقار کے لیے بجائے خود دعوتِ تخلیق ہے۔ ڈھول کی آواز کا آہنگ ان الفاظ کے ڈھانچے پر پڑا ہے:

دل بنواز دل زن بہ قیس او
کر دین دین او دین او دین او

تو عیدات کی نوبت میں انھیں تکرار سنائی دی۔

نان کہ خوردی خانہ برد ۔ نان کہ خوردی خانہ برد ۔ خانہ برد ۔ خانہ برد
نان کہ خوردی خانہ برد ۔ نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد ۔ خانہ برد ۔ خانہ برد

خیال گائکی میں بول بڑھت آپ نے سنی ہوگی۔ بعض الفاظ میں اس کا بدل بھی سن لیجیے۔ دُھنیے کے روئی دُھنکنے کا صوتی تاثر یوں ملتا ہے۔

دسپتے جانان جان ہم رفت ۔ جان ہم رفت ۔ جان ہم رفت ۔ رفت ۔ رفت ۔ رفت جان ہم رفت
این ہم رفت و آن ہم رفت ۔ آنہم رفت ۔ آنہم رفت ۔ این ہم رفت ۔ آنہم ۔ اینہم ۔ آنہم ۔ آنہم رفت ۔
رفتن ۔ رفتن ۔ رفتن دہ ۔ دہ ۔ دہ ۔ رفتن دہ ۔ رف ۔ رف ۔ رفتن دہ ۔ رفتن دہ ۔

'آج کل' کے موسیقی نمبر میں ڈاکٹر سید رغیب حسین نے امیر کی ایک رباعی یوں دی ہے۔

آن روز کہ روح پاک آدم بہ بدن
گفتند در آ نمی شد از ترس بدن
خواندند ملائکان بہ لحن داؤد
در تن در تن در آ در آ در تن در تن (اگست ۱۹۵۶ء ص ۵۸)

اس رباعی کے پہلے مصرع میں غالباً کتابت کی غلطی ہو گئی کیونکہ پہلے دو مصرعوں میں لفظ بدن کے اعادے سے ایطا واقع ہوتا ہے۔ اصل رباعی مجھے امیر کے کلام میں نہ مل سکی۔ بہرحال ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم صرف آخری مصرع ہے۔ الفاظ کا طلسم دیکھیے جیسے تانپورے سے چھڑ گئے۔

جب امیر نے الفاظ کی صوت کو ان کے معانی سے ہم آہنگ کیا تو وہ شاعر تھے اور جب صوتی کیفیت معانی پر حاوی ہو گئی تو وہ موسیقار تھے۔ لیکن ان کی تحریر میں سوائے ایک استثنا کے غالباً ایسا کبھی نہ ہوا کہ معانی صوت پر حاوی ہو گئے ہوں۔ یہ استثنا ان کی تصنیف فضل الفوائد ہے جو فارسی نثر میں لکھی گئی اور امیر کے مرشد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے اقوال پر مبنی ہے۔ یہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روحانی عقیدت اور تصوف کے قیود نے امیر کے قلم کو ادب اور احتیاط کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس کے برعکس ان کی نثر اعجاز خسروی جو بظاہر نثر لکھنے کے اصول و قواعد مرتب کرنے کی غرض سے قلم بند کی گئی۔ الفاظ کے معنوی گورکھ دھندوں کے ساتھ الفاظ کی صوتی کیفیات کا بھی بے مثال مرقع ہے۔ تاریخ علائی اور خزائن الفتوح میں بھی ان کی فارسی نثر کا یہی عالم ہے۔ شبلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا۔ (شعر العجم ص ۱۴۲) لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نثر کا یہ میدان ان کی جدت طرازیوں کے لیے ایک تجربہ گاہ تھا جس میں وہ بحیثیت ایک شاعر اور موسیقار کے الفاظ کی معنوی مشق اور صوتی ریاض کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے ان صنائع و بدائع کا جوہر تو ان کی شاعری میں موجود ہے لیکن تصنع غائب ہے۔ چنانچہ اس پر شبلی نے خوشی کا اظہار کیا ہے کیونکہ خطرہ تھا کہ صنائع و بدائع کا جو جال انھوں نے بچھایا اس میں خود بھی نہ پھنس جائیں (شعر العجم ص ۱۹۰)۔ یہاں الفاظ کے صوتی تاثرات کا جائزہ مقصود نہیں لیکن اس کی طرف اشارہ ناگزیر تھا کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری کی سرحد موسیقی سے جا ملتی ہے۔ اس

موضوعات گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس ضمن میں نظامی کا ایک شعر بھی گوش گزار کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

زخمہ آغاز آمد بردن
گردون ہست دون دست گردون دون

یہ وہی نظامی ہیں جن کے خمسے کے جواب میں امیر نے پانچ عظیم الشان مثنویاں لکھیں۔ امیر مثنوی قران السعدین میں لکھتے ہیں:

آنکہ بہ جیسنم بہ ہنر پیشتر
کوشش آں راہ کنم بیشتر
آنچہ ہنر ہست بگیرم ازو
وانچہ جز اینست بگیرم ازو (ص ۲۳۸)

یہی وہ غیر متعصب اور ہمہ گیر اصول تھا جس میں امیر کی فنی عظمت کا راز پنہاں ہے اور اسی اصول کی بنا پر انھوں نے ہندوستانی و ایرانی ادب اور موسیقی کے امتزاج سے سرمایہ لے کر اور الفاظ کا ایک خاص بیش قیمت ذخیرہ تعمیر کر ڈالا۔

علم بیان اللغات سے نکل کر ہم جب کہ موسیقی میں داخل ہوتے ہیں جس طرح شاعری کی مختلف اصناف ہیں مثلاً غزل، مثنوی، مثلث رباعی وغیرہ اسی طرح موسیقی کی بھی مختلف شکلیں ہیں لیکن بعض مروجہ کتابوں میں ان اصناف یا شکلوں کو راگوں یا دھنوں سے خلط ملط کر دیا گیا ہے مثلاً وحید مرزا نے امیر کی صنفی اختراعات قول ترانہ اور خیال کو ان کے ایجاد کردہ نغموں میں شمار کیا ہے۔ (لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۲۸) اور انہی کے حوالے سے ڈاکٹر بشیر نجیب تبسم نے بھی ان صنفی اختراعات کو راگوں کی فہرست میں شامل کر دیا (آج کل اگست ۱۹۵۶ء ص ۵۰) اور منشی محمد میاں اختر جوناگڑھی بھی قول اور ترانہ کو امیر کے ایجاد کردہ راگوں میں گنتے ہیں۔ (ہماری موسیقی ص ۴۴) غالباً یہ غلط فہمی شبلی کی ایک عبارت سے پیدا ہوئی۔ شبلی لکھتے ہیں:

"قول ترانہ، خیال، نقش و نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیر خسرو کی ایجاد ہیں" (شعر العجم ص ۱۴۰) لیکن انھوں نے انہیں راگوں میں شامل نہیں کیا اور راگوں کی فہرست الگ دی ہے۔ اسی طرح شاہد احمد دہلوی اور شیخ اکرام نے ہوا کو اصناف موسیقی میں شمار کیا ہے (راگ ودیا ص ۲ اور ثقافت پاکستان ص ۱۰۰) حالانکہ ہوا امام پروردے مشتاق حسین خان کے نزدیک بھی ایک راگ تھا (آجکل اگست ۱۹۵۰ء ص ۳۲) اور امیر خسرو خود مثنوی قران السعدین میں صفت پردہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

آں شدہ و تنبشک بگاہ نوا
مرغ در آوردہ ز رودنے ہوا

اس شعر میں نوا اور ہوا دونوں راگ ہیں۔

موسیقی کے باب میں امیر کی جن تحریروں کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امیر ہندوستانی و ایرانی دونوں نظام موسیقی سے پوری طرح آشنا تھے۔ عزۃ الکمال میں امیر ایک موسیقار سے بحث کے دوران یہ دعوے کرتے ہیں کہ انہیں شاعری کی طرح موسیقی پر بھی پورا عبور حاصل تھا اور وہ اس کے اسرار و رموز سے عملی طور پر بھی واقف تھے (لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ص ۲۳۶) اصناف موسیقی یہ:

امیر کے اجتہاد کو سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس زمانے میں مروجہ گائیکی کی صورت کیا تھی؟ یہ مسئلہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے اور اس سلسلے میں سنسکرت کے قدیم سنگیت ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ان نایاب سنگیتوں کی تدوین اور تراجم کا کام بھارت میں کئی ادارے بڑے اہتمام سے کر رہے ہیں لیکن افسوس کہ پاکستان میں ایسا ایک بھی ادارہ نہیں جو کم از کم موسیقی سے متعلق موجودہ ادبی ذخیرے کو کسی کتب خانے کی صورت میں یکجا کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہو۔

سارنگ دیو کی تصنیف سنگیت رتناکر تیرھویں صدی کی رائج الوقت موسیقی پر ایک جامع کتاب ہے۔ سارنگ دیو نے ۱۲۴۷ء میں وفات پائی اور امیر خسرو ان کی وفات کے چھ سال بعد پیدا ہوئے۔ اس سنگیت کے چوتھے باب میں موسیقی کی ایک صنف پربندھ کی تشریح یوں کی گئی ہے۔

"پربندھ گانے کی وہ قسم ہے جس میں یہ التزام ہو کہ اس میں کتنے دھاتو یا حصے ہوں گے ...
... اور اس میں کتنے اور کس قسم کے انگ ہوں گے پربندھ میں دو یا دو سے زیادہ انگ ہو سکتے ہیں اور ان کی مندرجہ ذیل چھ قسمیں ہیں۔

۱۔ سُر۔ جو آج کل کے سرگم کے مترادف ہے۔

۲۔ برود۔ گلا یا دھات سے بنے ہوئے اور پھر نک سے بجائے جانے والے سازوں کے بول (جیسے وغیرہ (یہ بول ان آوازوں سے مشابہ ہیں جو افسوس، حیرت، خوشی؟ وغیرہ کے زیر اثر بے اختیار انسان کے منہ سے نکلتی ہیں)

۳۔ پد۔ یعنی عام الفاظ خواہ وہ نثر کی صورت میں ہوں یا شعر کی صورت میں۔

۴۔ تنک۔ یعنی لفظ تن یا تنا کی تکرار (ان کا مادہ لفظ تت ہے جس کے معنی برتا کے ہیں اور تنتنت تتوم سوم بہت انہی معنوں میں آتا ہے)

۵۔ پاٹا۔ وہ بول جو ان آوازوں کی ترجمانی کریں جو تال کے سازوں کے ساتھ مخصوص ہیں (مثلاً مندل، مردنگ، پکھاوج وغیرہ)

۶۔ تال۔ لیکن پربندھ کی ایک قسم بغیر تال کے بھی گائی جا سکتی ہے۔ پربندھ کے زیادہ سے زیادہ چار حصے یا دھاتو ہو سکتے ہیں یعنی اُدگراہ، ملاپک، دھرو اور ابھوگ (انہیں دھرپد کے چار حصوں کے مترادف سمجھیں) اور کم از کم دو حصے یعنی اُدگراہ اور دھرو

(ترجمہ اور اقتباس از شرح (انگریزی) گیت سوتا سار کرشنا دھن بنرجی کلکتہ ۱۹۶۱ء ص ۶۰ تا ۶۹)

ان چار حصوں اور چھ انگوں کی ترکیب و تدوین اور کمی بیشی سے اس صنف موسیقی کی اتنی مختلف شکلیں بنتی ہیں کہ پربندھ کو صرف موسیقی کا بابا آدم سمجھنا چاہیے۔ امیر خسرو نے اپنے اس ہنر پر اصل کے مطابق کہا:

آنچہ ہنر ہست بجلیسہ م بگو   و آنچہ ہنر ہا ہست بگیرم ازو

پربندھ کی بعض صورتوں کو اس ندرت سے اپنایا کہ انھیں چار چاند لگ گئے۔ آئیے اب ان اصناف موسیقی سے متعلق امیر کے اجتہادات و اختراعات کا جائزہ لیں۔

۱۔ غزل (اور دیگر اصناف شاعری): موسیقی پر امیر کا ایک عام احسان یہ ہے کہ انھوں نے قدیم موسیقی کے سرمائے کو جو بیشتر سنسکرت زبان میں تھا ہندی اور فارسی زبانوں کے سانچوں میں ڈھالا اور فارسی شاعری کے بحر کو اصناف موسیقی میں داخل کیا۔ چنانچہ غزل سرائی ہماری موسیقی کا مستقل جزو بن چکی ہے۔

۲۔ ترانہ: یہ رباعی کو گا کر ادا کرنے کا ایرانی انداز تھا۔ عابد علی عابد صاحب قاموس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلاجقہ کبیر کے زمانے میں ترانہ ایجاد ہوا۔ رباعی کو ایک خاص دُھن میں گاتے تھے۔ تو اسے ترانہ کہتے تھے۔" (ہماری موسیقی ص ۱۰)

رباعی کے چوبیس اوزان ہیں اور ساتھ ہی زحافات کی کثرت اس لیے گوارا کی گئی کہ رباعی شاعری کے علاوہ موسیقی کی بھی ایک صنف تھی۔ بعد میں غلط العام ہو کر لفظ ترانے کا اطلاق ایک دوسری صنف موسیقی پر ہونے لگا جس کا اصل نام تلانہ تھا۔ عابد علی عابد رمز شناس ہیں کہ "ترانہ آج کل کے اصطلاحی معانی میں" اس ترانے سے مختلف ہے جو رباعی سے مخصوص تھا لیکن انھوں نے تلانے کا کہیں ذکر نہیں۔ ہم شبلی نے امیر کی اختراعات میں ترانہ اور تلانہ دونوں کا الگ الگ نام لیا ہے اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ تلانہ: (جسے اب ترانہ کہتے ہیں) بیزی کے نزدیک لفظ تلانہ کا ماخذ تلک ہے جو پربندھ کا چوتھا انگ ہے اور جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ (شرح گیت سوتا سار ص ۲۰) اس انگ میں صرف لفظ یعنی تن یا تنا کی تکرار ہوا کرتی تھی اور اسے پرستش کا ادب غنائی اسلوب سمجھنا چاہیے۔ اس لفظ کی باطنی کیفیت میں رب کا تصور تھا لیکن ہندوں کے گرتے اصولوں کی بندش میں صدیوں سے جکڑے رہنے کے باعث اس لفظ کی تکرار غالباً بے کیف ہو چکی تھی۔ پجاری یہ لفظ دہراتے تھے لیکن صرف اس طرح جیسے کوئی جادوگر کسی طلسماتی لفظ کا ورد کرے۔ پرستش کا یہ غنائی اسلوب محض جنتر منتر بن چکا تھا اور تن یا تنا کی معنوی اور وجدانی کیفیت غائب ہو چکی تھی۔ لفظ تن یا تنا کی رعایت سے لفظ تتر بھی غور طلب ہے۔

امیر خسرو کی طبیعت نے جب تصوف کا رنگ پکڑا تو انھوں نے پرستش کے اس غنائی اسلوب پر فارسی اور ہندی کا جامہ چڑھایا اور اس کے بے جان پیکر میں جذبات کی روح پھونک دی۔ امیر کی ایک رباعی پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں روز ازل کی واردات کا بیان ہے:- روح پاک آدم سے جسم خاکی میں داخل ہونے سے گھبرائی تو

خواندند ملائکان بہ لحن داؤد
در تن در تن درآ درآ در تن

چونکہ سنسکرت کے تن کی صوتی مناسبت اور فارسی کے تن کی معنوی رعایت سے امیر نے اس آخری مصرعے کے الفاظ پر تلانے کی بنیاد رکھی، تلانہ کو امیر تصرف کے ایک دوسرے پیرائے میں یوں بانٹتے ہیں:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

اب ترانے میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو:

در آ آ ۔ در آ آ

دتنم در آ جانِ من ۔ در آ ۔ در آ

بتنگ آمدہ ام چند انتظار کشم

بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم (حیاتِ امیر خسرو ص ۲۰۱)

اس بندش میں ایک شعر بھی شامل ہے۔ گویا اس میں پربندھ کے تیسرے انگ کی بھی آمیزش ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ستار کے باج کے لیے جو بول وضع کیے گئے ہیں وہ بھی در آ اور تن سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ستار غالباً امیر ہی کی ایجاد ہے۔ اس دعوے کی تردید میں وحید مرزا ایم اے یہ دلیل دیتے ہیں کہ ستار کا لفظ امیر کی تحریروں میں انہیں کہیں نہ مل سکا (لائف اینڈ ورکس آف خسرو ص ۲۳۹) اور حامد علی خان کو بھی یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ امیر اس ساز کے موجد ہوں اور اپنے اشعار میں اس ساز کا ذکر نہ کریں (ہماری موسیقی ص ۷) جواہر خسروی مرتبہ مولانا رشید احمد کے صفحہ ۱۴ پر امیر کا ایک دو سخنہ میری نظر سے گزرا ہے جس میں ستار کا لفظ موجود ہے۔ دو سخنہ یوں ہے:

ستار کیوں نہ بجا؟ عورت کیوں نہ نہائی؟ جواب ۔ پردہ نہ تھا۔

امیر نے ترانے کی بندشوں میں در، تن، در آ کے علاوہ اور بھی بہت سے الفاظ کا اضافہ کیا ہے مثلاً دانی توم توم دیرے نا تا یلا لے وغیرہ اور آج کل ترانے میں عموماً اسی قسم کے بول ہوتے ہیں اور شعر نہیں ہوتا۔ یہ الفاظ غالباً شروع میں بامعنی تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کی صورت بدلتی گئی اور لغوی معنی عرفانی اشاریت میں کھو گئے۔ الفاظ کے ماخذ کی حقیقت ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ اور اس سلسلے میں ہندی فارسی اور عربی تینوں زبانوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۴۔ قول: اس صنف میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو۔

استھائی نت سد ق قو ل نغال

انترہ امیر خسرو بل بل جبائیں

حضرت نظام الدین کے دربار میں

غالباً قول کا ماخذ بھی قرد ہے اور اس کا اطلاق اس صنف موسیقی پر ہوتا ہے جس میں قرآن مجید کی کوئی آیت یا رسول کریم کا کوئی قول عربی میں پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کی کوئی ہندی تفسیر بھی ہو۔ مذکورہ بندش میں ترانے کے بول شامل نہیں ہیں۔

۵۔ قلبانہ: قول اور قلبانے میں کیا فرق ہے؟ اس کی تصریح کسی مروجہ کتاب میں میری نظر سے نہیں گزری۔ بعض کہتے ہیں کہ قول میں صرف قوالی کا ٹھیکہ بجنا چاہیے اور قلبانے میں مختلف تالیں ہو سکتی ہیں۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ قلبانہ جب بنتا ہے کہ قول میں ترانے کی آمیزش ہو۔ جواہر خسروی میں قلبانے کے عنوان سے امیر کی مندرجہ ذیل بندش ملتی ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ

در تیلے۔ در تیلے۔ در دانی۔ ہم تم تنا نا تا نا رے

یلی۔ یلی۔ یلا یا لِلہ

من کنت مولاہ . . . . . .

اس میں رسول اکرم کی ایک مشہور حدیث کو اس کی وجدانی تفسیر کے ساتھ ترانے کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس صنف موسیقی میں امیر کی ایک اور بندش بھی ملاحظہ ہو۔

استھائی۔ ہی یا در در تا لالا رے

من و نظام الدین اولیا دیم دیم و در در تنے

تنا نا نا نا نا

انترہ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

در تم در تم توم توم تنا نا نا نا

در رے تے تنے درا جانم

دیم دیم در در در در تے۔ تنے نا نا (حیات امیر خسرو ص ۱۹۹)

اس قبانے میں امیر ترانے کے مرحلوں میں سے گزرتے ہوئے قرآن حکیم کی ایک آیت کا قرآنی چراغ لے کر بے خودی کی منزل کی طرف بڑھے ہیں۔ قبانے کے مختلف حصوں میں تال اور سرے کو حال کا مقام سمجھنا چاہیے۔ لفظ قبانہ کا مخرج قلب بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس صنف موسیقی میں ارباب تصوف کی اصطلاح میں قلب پر ضرب پڑتی ہے۔

۶۔ قوالی: گانے کے اس اسلوب کا عام نام ہے جس کی گت میں چلنے پر قوالی کا ٹھیکہ بجتا ہے اور الفاظ کی تکرار اسلوب کو حسب قول اور قبانے کے انداز میں کی جاتی ہے۔ اشعار میں عام طور پر حمد یا نعتیہ مضامین ہوتے ہیں یا تصوف کی واردات کا بیان یا مشائخ میں سے کسی بزرگ سے عقیدت کا اظہار۔ اس اسلوب خنا میں امیر کی ایک بندش ملاحظہ ہو۔ اکثر قوالیاں آخری روز آخری محفل سماع اسی پر ختم کی جاتی ہے اور گانے کے انداز کو رنگ کہتے ہیں:

آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے

اپا پیر پایو نجام الدین اولیاء

جگ اجیارو دیس ترا یو رنگ اور نہیں دیکھوں ری

دیس بدیس میں تو ڈھونڈ پھری ہوں

تورا رنگ نہیں پایو رے نجام الدین اولیاء

آج رنگ ہے . . . .

ترِوٹ ۔ شبلی نے اس صنف کا امیر کی اختراعات میں ذکر نہیں کیا لیکن نکات الہند اور معارف النغمات میں اسے بھی امیر سے منسوب کیا ہے۔ یہ پربندھ کی ایک شکل ہے۔ اس کے تین حصے ہیں اور اسی لیے ترِوٹ کہتے ہیں۔ پہلے حصے میں الفاظ سے مضمون ادا کیا جاتا ہے دوسرے حصے میں ترانے کے بول ہوتے ہیں اور آخری حصے میں طبلے کے بول۔ غالباً پربندھ کی اس قدیم شکل میں دوسرا حصہ تلک پر مبنی تھا اور آخری حصے میں مندل یا مردنگ کے بول تھے۔ جب امیر نے ترانہ اور طبلہ ایجاد کیا تو تلک کی جگہ ترانے نے لے لی اور مندل اور مردنگ کے بولوں کی بجائے طبلے کے بول آ گئے۔

سوہلا ۔ (سوہلہ یا سہیلہ) اس صنف کی تشریح بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ ہو سکتا ہے اس سے مراد ڈھولک کے وہ گیت ہوں جو سہیلیاں مل کر گاتی تھیں۔ مثلاً:

کبے کو بیاہی بدیس سے لکھی بابل مورے

بسیط ۔ اس صنف کی تشریح بھی کہیں نہ ملی۔ اس کے لغوی معنی کشادہ یا وسیع کے ہیں یعنی گانے کا وہ اسلوب جس میں پھیلاؤ ہو ممکن ہے کہ یہ اصطلاح الاپ کے لیے وضع کی ہو۔

نقش گل ۔ ولرڈ (   ) نے ۱۸۹۹ء میں ہندوستانی موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں ایک صنفی موسیقی کا ذکر کیا ہے جس کا نام پھول بند تھا۔ لکھتے ہیں:

"ایسے دھرپد جن میں پھولوں کے نام ذو معنی انداز میں باندھے جائیں۔ پھول بند کہلاتے ہیں۔" (ہندو میوزک (انگریزی) راجہ ٹیگور کلکتہ ۱۸۹۹ء ص ۱۰۲)

دھرپد پربندھ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور پھول بند • پربندھ ہی کی ایک قسم سمجھیے۔ ہو سکتا ہے نقش گل سے مراد یہی صنف ہو۔ معارف النغمات میں ہے آگے نقش کا ایک ترانہ یوں درج ہے:

استھائی ۔ تاناتا ۔ تاناتا دیرے نا دیم دیم

انترہ ۔ دست صبا چو نگاہ فتد بر رخ تو

گری گرفتہ بار صبا گل بہ گل

اس نقش کی اختراع امیر سے منسوب ہے اس لیے ہو سکتا ہے یہ بندش بھی امیر کی ہو۔ لیکن صاحب معارف النغمات نے وضاحت نہیں کی۔ اس بندش کا آخری ٹکڑہ گل بہ گل ہے کہیں یہ اشارہ تو نہیں کرتا کہ یہ نقش نقش گل کی ذیل میں آتی ہے؟

نقش و نگار ۔ شبلی نے نقش گل کا ذکر نہیں کیا لیکن "نقش و نگار" دو لفظ ساتھ ساتھ لکھے ہیں۔ (شعر العجم ج ۲ ص ۱۳۰) نواب واجد علی شاہ کی تصنیف صوت المبارک میں نقش اور گل امیر سے منسوب ہیں لیکن نگار کا کوئی ذکر نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نقش و نگار کسی غنائی اسلوب کی ایک جامع شکل تھی جس کی ایک خاص قسم نقش گل ہے۔ ہو سکتا ہے نقش و نگار پربندھ کی وہ بدلی ہوئی صورت ہو جس پر خیال گائیکی کی بنیاد رکھی گئی ہو۔

خیال ۔ نواب واجد علی شاہ صوت المبارک میں امیر خسرو کو خیال گائیکی کا ... مانتے ہیں اور ... بادشاہ نے ... خیال

کا اختراع امیر سے منسوب کرتے ہیں (آج کل اگست ۱۹۵۶ء ص ۱۰۲) راگ درپن کے حوالے سے شبلی نے بھی امیر کو بتایا کا موجد قرار دیا ہے۔ لیکن امیر کی اپنی تحریروں میں خیال کا کوئی ذکر نہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس صنف کے موجد حسین شرقی تھے۔ (معارف النغمات ص ۱۱۸)

اس مسئلے کا حل غالباً یہ ہے کہ حسین شرقی نے امیر کی ایجاد کردہ صنفِ موسیقی نقش ونگار کے بجائے عام فہم لفظ خیال کی اصطلاح وضع کی اور اس صنف کو دیگر اصنافِ موسیقی پر ترجیح دی لیکن یہ محض میرا قیاس ہے اور اسے محتاط نظر سے دیکھنا چاہیے۔ خیال گائیکی کا بنیادی اصول بول برت سے راگ کا ہمہ گیر انکشاف اور بہلاوے کی نغمہ سرائی ہے۔ خیال گائیکی میں گویا الفاظ کو دقیق جذبات کے زیرِ اثر اور راگ کے لوازمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سُروں کے نت نئے سانچوں میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ گائیکی کا یہ عنصر امیر کی دیگر اصنافِ موسیقی یعنی قول، قلبانہ اور قوالی میں بھی کسی حد تک ہے مگر ان میں راگ کا ہمہ گیر انکشاف مقصود نہیں ہوتا اور مختلف سُروں میں الفاظ کی تکرار سے وجدانی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ ترانے میں راگ کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے اور اس کی سرحد خیال سے جا ملتی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں کہ خیال امیر کی ایجاد ہے میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہوں کہ سنگیت رتناکر کے تالوں میں خالی اور بھری کا امتیاز نہیں جو خیال گائیکی کے لیے نہایت اہم ہے۔ بہلاوے کی نغمہ سرائی میں گوّیے کو پتہ چلنا چاہیے کہ سم کب آئے گا تاکہ وہ مناسب مقام سے بول پکڑ سکے۔ خالی کی اختراع اسی مقصد کے لیے ہوگی اور یہ اختراع بھی امیر سے منسوب ہے۔

اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امیر کے بعد راجہ مان سنگھ تنوار نے پندرھویں صدی میں دھرپد ایجاد کیا۔ میری رائے میں اسے خیال گائیکی کے خلاف ہندوؤں کا ردِعمل سمجھنا چاہیے۔ دھرپد پربندھ کی ایک قسم ہے لیکن اس اصطلاح میں زور لفظ دھرو پر تھا جس کے معنی قائم یا اٹل کے ہیں۔ گویا یہ خیال گائکی کی بظاہر بے راہ روی اور آزادی کے بارے میں برہمنوں کا حرفِ تنبیہ تھا۔ یہ وہ صدی ہے جس میں سلطان حسین شرقی جونپوری نے خیال گائکی کو خیال کی اصطلاح سے نوازا اور دھرپدیوں کے خلاف خیالیوں کا محاذ قائم کیا۔

شیخ اکرام اس روایت کو کہ خیال امیر کی ایجاد ہے شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"مگر قوالوں سے خیال کبھی نہیں سنا۔" (ثقافت پاکستان ص ۱۰۰)

اس سلسلے میں نقی محمد خان خورجوی نے قابلِ قدر کام سرانجام دیا ہے اور اپنی تصنیف حیات امیر خسرو میں بہت سی بندشیں مع نوٹیشن یکجا کر دی ہیں۔ ان بندشوں میں کچھ خیال بھی ہیں۔ راگ مسنم میں اکتالے کا ایک خیال ہے، بول ملاحظہ ہوں:

استھائی ۔ اندھیری گھٹا کالی مَن چراغ

انترہ ۔ علاج دل ناکن خسرو کے باغ

اصنافِ موسیقی کے بارے میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ممکن ہے امیر نے دھرپد کے اسلوب میں بندشیں مرتب کی ہوں۔ چنانچہ دھرپدیوں کے سرتاج تان سین امیر کو نائک تسلیم کرتے ہیں۔ تان سین کے ایک دھرپد کی سنچاری کے بول یہ ہیں:

تان سین کے تم ہو نائک خسرو کرت استتی گن گایو رے

اصنافِ موسیقی کے سلسلے میں میں نے امیر خسرو کی چند ایجادات اور اختراعات کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے۔ یہ "فہرست نہایت

...ل ور تشنہ ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا امیر رحمۃ اللہ علیہ کے تخلیقی اور فنی کمالات پر بڑے پیمانے پر تحقیق و تفتیش ہونی ضروری ہے اور ...ر یہ کہ ادب اور فن تاریخ کی حیثیت کے ساتھ ساتھ ہماری موسیقی کی تاریخ اس کے ارتقائی مدارج اور اس کی قدیم و جدید اصناف و ...ہ کی فراہمی ضروری ہے یا ان کی مروجہ تصانیف اور ان کی نادر تصانیف کی فراہمی (اگر ممکن ہو) اور ان کا تحقیقی اور تحلیلی مطالعہ اس کے علاوہ سے ...ت دور رس کام ہے مختلف علوم کے ماہروں کی ایک بروقت اکیڈمی ہی عہدہ برآ ہو سکتی ہے ۔

حضرت امیر خسرو سے منسوب جو اصناف موسیقی میں نے بیان کی ہیں خود ان کی نوعیت نہج اور اسلوب داد پر تحقیق کے لیے وسیع ...ان ہو رہی ہیں کیونکہ ان میں سے جو اصناف دور جدید تک پہنچی ہیں ان کی نوعیت اور ان کا اسلوب حضرت امیر کے اجتہادی اور ایجادی قالب سے بہت مختلف ہو چکا ہے ۔

موسیقی ـــ آواز ، اس کی لرزشوں ، ان کی کیفیات اور ان کے رد عمل کی گوناگوں دنیاؤں کا نام ہے ۔ صوت و صدا کی بے پایاں وسعتوں کو خاص نظم و ضبط دے کر جس شخصیت نے اصناف میں حلقہ بند کیا اس کا کمال فن صوت و صدا کی دنیاؤں کی طرح وسیع و عظیم ہے ۔ اس وسعت اور عظمت کا احاطہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ :

عمر کے بستہ ام ۔ از خاک ۔ بخون شہدا
تا دل و دیدہ خونابہ فشانم دادند

؟

کیا آپ کے پاس نقوش کے یہ نمبر موجود ہیں ؟

- غزل نمبر
- طنز و مزاح نمبر
- آپ بیتی نمبر
- پطرس نمبر
- شوکت نمبر

اگر ان میں سے کوئی نمبر نہیں ہے تو آج ہی خرید لیجئے !

قیمت علی الترتیب

۸ روپے ۱۰ روپے ۳۰ روپے ۶ روپے ۷ روپے


شکل میں موجود ہے
قومی دفاعی فنڈ
میں زیادہ سے زیادہ عطیات دیجئے
اسٹینڈرڈ بینک

فنی سوجھ بوجھ میں دوش بدوش



بھروسے کے قابل ۔ برماشیل

جنگ اور بیمۂ زندگی

اپنی دیرینہ روایات کے عین مطابق "مسلم انشورنس" ہند و پاک کی حالیہ جنگ کے آغاز سے فیاضانہ رعائتیں دے رہی ہے :

دفاعی ملازمین کے لئے

(۱) بغیر زائد پریمیم کے تمام پالیسیوں پر جنگ کے خطرات کا تحفظ دیا گیا ہے۔

(۲) ہنگامی حالات کے نفاذ تک ان پالیسیوں کے ایام مہلت میں توسیع کر دی گئی ہے جن کی تاریخ ادائیگی ۶ ستمبر ۶۵ء یا اس کے بعد ہے۔ اس عرصہ میں یہ پالیسیاں بحال رہیں گی۔ بقایا جات آسان قسطوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔

شہری آبادی کے لئے

(۱) پالیسی ہولڈر کوئی بھی پیشہ یا ملازمت اختیار کر سکتے ہیں بشمول دفاعی سروسز کے۔

(۲) جو پالیسی ہولڈر براہِ راست بھارتی جارحیت کا شکار ہوئے اور جن کی تاریخ ادائیگی ۶ ستمبر یا اس کے بعد ہے، ہنگامی حالات کے دوران انہیں تین ماہ کی مہلت دی گئی ہے۔ بقایا جات آسان قسطوں میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔

مسلم انشورنس کمپنی لمیٹڈ





ایک یاد اور صدہا پہلو

جوش ملیح آبادی

قریبِ شام، جب اک سوگواری، دل پہ چھاتی ہے
سسکتے نیچ کو، ابھی ہوا، نوحے سناتی ہے
شفق، دھندلی فضا میں خون کے آنسو بہاتی ہے
میانِ گلستاں، بادِ خزاں کی، تو جب آتی ہے
اور اس کی روش میں جب ہر اک پتی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

تھکے ست جھٹپٹے میں، اونگھنے لگتے ہیں جب منظر
فضا کی سوگواری، اوڑھ لیتی ہے سیہ چادر
طلسمی وادیوں میں اک ذرا سا، شہر سے ہٹ کر
کماں کی طرح بل کھاتے ہوئے، خوابیدہ ساحل پر
وہ سرد دل کے اندر یوں ندی جب ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نظر آتا نہیں اک پھول بھی جس وقت دامن میں
کوئی تنہا پرندہ شب کا بول اٹھتا ہے جب بن میں
سسکتی ہے رندھی سی چاندنی جب صحنِ گلشن میں
اور اک ویران حسرت، یاد کے خوابیدہ مدفن میں
ہوا جس وقت آدھی رات کو سیٹی بجاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

سبک سازئیاں جب گونجتی ہیں بزم یاراں میں
حسیں نغموں کی مہکیں تیرتی پھرتی ہیں ایواں میں
نگاہوں کے سفینے ڈوب جاتے ہیں جب افشاں میں
اور اس موقع پہ جب آشفتہ قسمت کی رگ جاں میں
مچلتی راگنی جب آنچ بن کر سنسناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

انگیٹھی کے کنارے، جب بفیض جام زر افشاں
وہ راتیں ہوتی ہیں، جو ابھی تفتیش شدہ ارماں
پرانی داستانیں، جب چھڑتی ہیں نئے عنواں
اور اس موقع پہ کچھ اکثر بیاد وعدہ جاناں
نظر جب ایک عاشق کی گھڑی کی سمت جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

افق پر پھوٹتا ہے صبح کا جس وقت فوارا
تھرکتا ہے سنہری وادیوں میں شربتی دھارا
شفق کا دھوپ چھاؤں کا چمن بنتا ہے اندھیارا
نظر آتا ہے آدھے چاند کے آغوش میں تارا
اور اپنی صبح کو جب آرزو ویران پاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فلک کی نیم بازی سے فضا کی مسکراہٹ سے
افق کی گرد افزائی سے شبنم کی گراوٹ سے
چمن کی خاک گل پرور کی ٹھنڈی سنسناہٹ سے
نسیم صبح کے متواتر بوسوں کی چٹاچٹ سے
کلی میں جب چٹکنے کی تمنا کسمساتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ہوا سے سرد چھوتی ہے لٹیں جب ٹوٹنے ترکاں کی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے مہک انفاسِ خوباں کی
گلابی روشنی سے آنکھ کھل جاتی ہے بستاں کی
اور اس کے ساتھ ہی، پہلی کرن صبحِ بہاراں کی
جب اس ابھرے ہوئے سینے میں چبھ کر ٹوٹ جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مچلتی ہے سرِ دوشِ صبا جب شکریں سردی
لرزتے ہیں ستارے دوڑتی ہے چاند پر زردی
دلوں کو گدگداتی ہے تمنائے جہاں گردی
مسک جاتی ہے جب دوشِ فضا کی مخملی وردی
نویلی صبح جب آہستہ سے کنگن گھماتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

طرب کا رنگ اڑا کر، جشن کی دھوموں کو دھما کر
ربابوں کو بجھا کر راگ کے شعلوں کو جھلا کر
فضا کو کپکپا کر چمپئی مکھڑوں کو سنولا کر
صبا کی تھپکیاں کھا کھا کر آئینوں کو دھندلا کر
قریبِ صبح جب شمعِ شبستاں جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جھلکتی ہے ستاروں کی ردا جب خوش نواؤں پر
برستی ہے نکیلی کج کلاہی دل رباؤں پر
اترتی ہے شعاعِ آئینہ پیکر مہ لقاؤں پر
نداسی راگنی، گھنگھرو بجاتی ہے ہواؤں پر
نشیلی بھیرویں مکھڑے سے جب گھونگھٹ اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مسلسل دو ٹکڑوں سے ایک ہو جاتے ہیں جب جل تھل
ہزاروں داروں سے پھوٹتی ہے جب ہری کونپل
اڑا دیتی ہے ذن سے کاگ بوتل سے جب بادل
پپوٹے کم سنوں کے نیند سے بنتے ہیں جب بوجھل
پھنسی چولی میں ہولی جب نئی ڈہل چھپاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

بھری برسات میں جب ناچتے ہیں دھوم سے جگنو
محیطِ رنگ میں جب تیرتا ہے نشترِ پی ہو
ہوا پر جب مچلتی ہیں پھواریں دم بدم پہلو
کھنکتی بوندیوں میں تیر برساتی ہے جب لڑکو
رخِ جاناں پہ دھل کر بوئے گل جب تہ دھانی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گرجتے گونجتے کم بخت ساون کے مہینے میں
لگا دیتی ہے پانی کی جھڑی جب آگ سینے میں
شبِ غم کے دہکتے کھولتے تنہا سے سینے میں
تمنائے سحر جب ڈوب جاتی ہے پسینے میں
حیات اپنی امیدوں کے جنازے جب اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اچھلتا ڈوبتا ہے چاند جب ابرِ گریزاں میں
ستارے غوطہ زن ہوتے ہیں سنگم کے شبستاں میں
کبھی لپکا کبھی لرزاں دھواں ہوتا ہے میداں میں
اور اک آواز ہوتی ڈوب کر شوقِ فراواں میں
تھکی جمنا کو گنگا جب گلے سے لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

لرزتے ہیں در و دیوار پر یادوں کے جب سائے
نظر آتی ہیں جب گم کردہ گھڑیاں بال بکھرائے
جھلک اٹھتے ہیں جب وہ چاند کب کے جو گہنائے
ہوا آتی ہے جب بکھرے ہوئے لمحوں کو مہکائے
فضا جب گھپ اندھیرے میں کبھی راہیں جلاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نفس کی آمد و شد کو کسی زلفوں میں الجھا کر
اصولِ پختگی و خوفِ رسوائی کو ٹھکرا کر
بھرے جلسوں میں رازِ عاشقی کا عود سلگا کر
کھنکتے ساز پر آواز کی پازیب جھنکا کر
جب اس ناپختہ پن کی خام کاری گنگناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

وہ اک چہرہ جو گوہر فروش و گل بداماں تھا
متاعِ مہ وشاں تھا دولتِ محفل نشیناں تھا
کلیسائے نگاراں کعبۂ اصنامِ دوراں تھا
جو کل کی بات ہے بت خانۂ قومِ حسیناں تھا
جب اس چہرے سے خود میری پکارن منہ چھپاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اٹھائے دوش پر گم کردہ لمحوں کی امانتیں
امانتیں وفا میں شکریے شکوے مناجاتیں
بھرے چاندی کی تھالی میں دمکتی کندنی باتیں
مری گردن میں باہیں ڈالتی ہیں چاندنی راتیں
وہ ان کی آب شبنم آگ دل میں جب لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں میری تمناؤں نے کل دھومیں مچائی تھیں
جہاں کل مست جگنوں نے ساز پر راتیں بجائی تھیں
گھنی زلفوں کے سائے میں جہاں نیندیں جگائی تھیں
جہاں شیریں لبوں پہ مدتوں قسمیں لگائی تھیں
مجھے پہچان کر جب وہ کلی آنکھیں جھکاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حیا سے کانپ کر جھک کر ہجوم شرمساری سے
کلائی میں سبک کنگن گھما کر بے قراری سے
ذرا سا رک کے اک ادائے بادہ خواری سے
دھنک کی سی حسیں انگڑائی لے کر طرحداری سے
کوئی دلہن کسی کو دیکھ کر جب مسکراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کوئی الھڑ گلی میں رات کو کیا کیا جتن کرتی!
جھجکتی ڈولتی تھمتی ٹھٹکتی بھاگتی قدم دھرتی
لرزتی ہانپتی رکتی بدکتی ہولتی مرتی
سمٹتی کانپتی مڑتی جھجکتی جھینپتی ڈرتی
کسی کا در جب اک انگلی سے آ کر کھٹکھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چمن کو غرق سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھونرا
نیاز عاشقی کو ناز کر جاتا ہے جب بھونرا
خموشی کو رہین آواز کر جاتا ہے جب بھونرا
کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھونرا
اور اس کے بعد جب تادیر ٹہنی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جفائے تاج داری سے تنگ آ کر بھنگ آ کر
سزاؤں ذلتوں پابندیوں فاقوں سے گھبرا کر
بھڑکتے جذبۂ ناموسِ انسانی کی شہ پا کر
جمہور سے حاکموں کی ناز برداری سے اکتا کر
غرورِ آسماں کو جب زمیں نیچا دکھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں لیلیٰ کے عشوے سرنگوں رہتے ہیں محمل میں
گھٹی رہتی ہیں دکھیاروں کی فریادیں جہاں دل میں
جہاں جھنکار دم سادھے پڑی رہتی ہے پائل میں
جہاں سرگوشیاں تک جرم ہیں اس قصرِ باطل میں
گرجتے سورماؤں کی زباں جب الالاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

چمک جاتا ہے جب مظلوم کے سینے کا انگارا
فضائے ظلم پر باقی نہیں رہتا کوئی تارا
مذاقِ سرفروشی کا ابل پڑتا ہے فوارا
مچلتا ہے شہیدوں کے لہو کا دور تک دھارا
اجل تلوار مقتولوں کو جب دولہا بناتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کڑکتی ہے کمانِ بے کساں جب فرقِ سلطاں پر
کروڑوں ہات پڑتے ہیں حکومت کے گریباں پر
چھری مجبور کی چلتی ہے جابر کی رگِ جاں پر
سلگتے جھونپڑوں کی آگ منڈلاتی ہے ایواں پر
مدا کے خون میں جب شہریاری ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اُبلتے ظلم کا پانی سروں سے جب گزرتا ہے
جوانوں کے دلوں میں جذبۂ غیرت اُبھرتا ہے
سرِ میداں پئے اقدارِ انسانی جو مرتا ہے
بجائے غم پدر موتِ پسر پر ناز کرتا ہے
بموجِ خونفشاں جب لاش بیٹے کی اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں کج اہلِ وحشت کی جبیں پر تاج ہوتا ہے
جہاں شہرِ تمنائے زندگی تاراج ہوتا ہے
جہاں ہر آن سُولی پر نیا معراج ہوتا ہے
جہاں ننگے سروں پر روز لاٹھی چارج ہوتا ہے
وہاں بارود ایوانوں کو جھلسانے جب آتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جو مظلوموں کی ٹوٹی ہڈیوں کو جوڑ دیتی ہے
جو عفریت حکومت کی کلائی موڑ دیتی ہے
جو شاہی چشمِ فرمانرواؤں کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے
جو قصروں کو فقط ضربِ نظر سے توڑ دیتی ہے
سنِ جانباز میں جب وہ بغاوت کڑکڑاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حفیظ جالندھری

○

(شاعری کا دورِ رفتہ)

دورِ رفتہ دیکھ لیتا ہوں گلستاں دیکھ کر
گل کو خنداں دیکھ کر بلبل کو گریاں دیکھ کر

ناخدا پر مطمئن تھے بندگانِ ناخدا
اب خدا یاد آ رہا ہے موجِ طوفاں دیکھ کر

سنگدل سمجھا برہمن، شیخ سمجھے بد مذاق
ہنس پڑے دونو مجھے اب تک مسلماں دیکھ کر

شکوہ فرماتے ہیں الٹی منتیں کرنی پڑیں
دل پشیماں ہو گیا ان کو پشیماں دیکھ کر

شانِ رحمت کو بھی اپنا جائزہ لینا پڑا
آ پڑی مشکل مرا طومارِ عصیاں دیکھ کر

اس مشقت گاہ میں راحت کا یہ نسخہ حفیظ!
دیکھ لو اور خوش رہو تو ہر بیاباں دیکھ کر

احمد ندیم قاسمی

○

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم! کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبت، یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود مری روح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پہ
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں کدھر کدھر جاؤں

میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں، مر جاؤں

جراحتوں پہ بھی طاری ہے وقت کی گرد
ذرا لہو میں نہاؤں تو پھر سنور جاؤں

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے گھر جاؤں

خدا کرے ترا معیارِ عدل اور بڑھے
میں تیری بزم سے کیسے بچشمِ تر جاؤں

یہ سوچتا ہوں کہ میں بت پرست کیوں نہ ہوا
تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں

اسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

حکیم احمد شجاع ساحر

○

وفا کا مدعی خارست گر جنس وفا نکلا
جسے ہم آشنا سمجھے وہی نا آشنا نکلا

تلاشِ جاہ میں اس کو بھی پھرتے در بدر دیکھا
سمجھتے تھے جسے منعم گدائے بے نوا نکلا

عبث اس شیخ کے کہنے میں آکر دیر کو چھوڑا
جو دیکھا تو وہی زنار زیرِ بوریا نکلا

وہ زاہد دھوم تھی گھر گھر میں جس کی پارسائی کی
چھپا کر لاکھ پردوں میں مگر آخر کھلا نکلا

متاعِ سجدہ ریزی بر جبینِ بت دریغ و حیف
خدا کے گھر میں جب داخل ہوا گھر سے ندا نکلا

اسیروں کی اسیری کا تماشا دیکھنے والے
کہیں چھپ جا کہ ان کو توڑ کر دستِ دعا نکلا

جو آیا میکدے میں شیخ اک محشر ہوا برپا
کہاں دیوانوں کی محفل میں یہ بدبخت آ نکلا

ہوئے گر ہونی برباد مٹی ہم غریبوں کی
تمھارے دل کا ارماں تو بہت کافر ادا نکلا

تعجب سا تعجب ہے ہوئے عشق پیری میں
مگر ساحر کریں کیا کیسے صنم خانے میں جا نکلا

احمد ندیم قاسمی

○

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم! کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبت، یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود، مری روح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پہ
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں کدھر کدھر جاؤں

میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں، مر جاؤں

جراحتوں پہ بھی جاری ہے وقت کی گرد
ذرا لہو میں نہاؤں تو پھر سنور جاؤں

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے گھر جاؤں

خدا کرے ترا معیارِ عدل اور بلند
میں تیری بزم سے کیسے بچشمِ تر جاؤں

یہ سوچتا ہوں کہ میں بت پرست کیوں نہ ہوا
تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں

اسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

حکیم احمد شجاع ساحر

○

وفا کا مدعی غارت گرِ جنسِ وفا نکلا
جسے ہم آشنا سمجھے وہی ناآشنا نکلا

تلاشِ جاہ میں اس کو بھی پھرتے در بدر دیکھا
سمجھتے تھے جسے منعم گدائے بے نوا نکلا

عبث اس شیخ کے کہنے میں آکر دیر کو چھوڑا
جو دیکھا تو وہی زُنّار زیرِ بوریا نکلا

وہ زاہد دھوم تھی گھر گھر میں جس کی پارسائی کی
چھپا تو لاکھ پردوں میں مگر کافر کھلا نکلا

متاعِ سجدہ ریزی بر جبین بت دربغل واعظ
خدا کے گھر میں جب داخل ہوا گھر سے خدا نکلا

اسیروں کی اسیری کا تماشا دیکھنے والے
کہیں چھپ جا کہ ان کو توڑ کر دستِ دعا نکلا

جو آیا میکدے میں شیخ اک محشر ہوا برپا
کہاں دیوانوں کی محفل میں یہ بدبخت آنکلا

چلے گر ہوتی برباد مٹی ہم غریبوں کی
تمہارے دل کا ارماں تو بہت کا فراد نکلا

تعجب سا تعجب ہے ہوئے خستہ پیری میں
مگر ساحر کو کیا کہیے صنم خانے میں جا نکلا

حکیم احمد شجاع ساحر

○

کہتا ہے کون درد کے درماں کی بات کر
تو میری جان خنجر و پیکاں کی بات کر

اب تجھ سے دل کو چارہ گری کی امید تھی
مرہم کا ذکر چھوڑ نمکداں کی بات کر

رکھا ہی کیا ہے حجرۂ زاہد میں جشنِ زیبا
قدحِ شراب و محفلِ رنداں کی بات کر

صیاد کے کرم کی حکایت سے فائدہ
کچھ بے وفائیِ چمنستاں کی بات کر

پھر شورِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دستِ جنوں و چاکِ گریباں کی بات کر

کب تک خیالِ عافیتِ گوشۂ چمن
زنجیر و طوق و روزنِ زنداں کی بات کر

ذکرِ بہارِ حسنِ عروساں نو نہ چھیڑ
رنگِ حنائے خونِ شہیداں کی بات کر

غیرِ سکون و عیش ہے اک مرگِ خانہ زاد
گرداب و موج و صرصر و طوفاں کی بات کر

ساحر کو پند و وعظ و نصیحت سے کیا غرض
زلفِ سیاہ و کاکلِ پیچاں کی بات کر

فضل احمد کریم فضلی

○

تعلق تو نہیں ان کو رہا مجھ سے، مگر اب بھی
ادھر گزروں تو روشن پھر وہ چلمن ہو ہی جاتی ہے

نظر نیچی کیے یوں تو گزر جاتے ہیں ہم دونوں
مگر کچھ تیز پھر بھی دل کی دھڑکن ہو ہی جاتی ہے

بہت راہِ طلب کی دھوپ ہوتی ہے کڑی لیکن
بالآخر زلفِ جاناں سایہ افگن ہو ہی جاتی ہے

نگاہیں جب ملا کرتی ہیں لب کچھ ہل سے جاتے ہیں
مگر قندیل سی آنکھوں میں روشن ہو ہی جاتی ہے

انھیں اللہ نے بخشی ہے صورت ایسی پاکیزہ
نگاہِ بوالہوس بھی پاکدامن ہو ہی جاتی ہے

بگڑ بیٹھو جو تم ضد سے تو بگڑو شوق سے بگڑو
محبت کرنے والوں میں تو ان بن ہو ہی جاتی ہے

ترے خونِ جگر سے اور کچھ ہو یا نہ ہو فضلیؔ
مگر تھوڑی بہت زیبائشِ فن ہو ہی جاتی ہے

فضل احمد کریم فضلی

○

کاش پھر شالِ نسیمِ سحری تو آئے
پھر مہک جائے فضا، پھر تری خوشبو آئے

یوں تو ہر سانس میں آتی ہے تری یاد، مگر
آج کیا جانئے کیوں آنکھ میں آنسو آئے

دور تک اس کی مہک جائے ترے سر کی قسم
زلفِ مشکیں جو تری مثلِ صبا چھو آئے

ہیں کھلے پھول مگر جیسے ہوں سب کاغذ کے
تو جو آ جائے گلستاں میں تو خوشبو آئے

آئینہ خانۂ حیرت سے بنے عشق کہیں
وہ نظر آئے مجھے اور ہر اک سو آئے

یہ خبر گرم ہے اس شہر میں چلتی ہے سموم
درِ زنداں تو کھلے آتی ہے گر لُو آئے

گفتگو کے جو کئی آپ نے بدلے پہلو
سامنے حسنِ غزل کے کئی پہلو آئے

تیرے شعروں نے تو دل موہ لیا ہے فضلی
ایسا لگتا ہے کہ جیسے تجھے جادو آئے

سرورِ کائنات

پروفیسر منظور حسین شور

صبحوں کے سنہرے طاقوں میں ظلمات کی شمعیں جلتی تھیں
سنگین بتوں کی پیشانی آدم کے لہو سے دُھلتی تھی
خورشیدِ سحر کے سینے میں ظلمات کے بھالے ٹوٹے تھے
نسل اور نجابت کا قشقہ ماتھوں پہ لگایا جاتا تھا
اس وقت وہ آیا راتوں کو پیغامِ سحر دینے والا
مرہم دے کر زخموں کے تحفے لینے والا مسیحائی
وہ ابر کہ جس کے سائے نے رُوحوں پہ سکوں برسایا ہے
باطل کے گھنے اندھیروں سے جو بادل ہنستا گزرا ہے
جو بطنِ صحرا سے اُٹھ کر دنیا کے اُفق پر چھایا ہے
سینے میں صفا، ہونٹوں پہ دعا، آنکھوں میں تقدس کا عالم
اے وہ کہ جس نے بخشی ہے خاروں کو گلوں کی رعنائی
جمہور کی زندہ لاشوں پر ناچے گی کہاں تک سلطانی
تقدیس کے پردے میں کب تک انساں کو انساں کھائے گا
تہذیب کے سر سے کب تک قوموں کے دوپٹے اتریں گے
بیچیں گے غلاموں کو کب تک مغرب کے خدا بازاروں میں
الزام کہاں تک آئے گا صدیوں کے چمکتے سورج پر
مغرب کی سیاہی مشرق کے سورج کو کہاں تک کھائے گی
تاریک افق کے ماتھے سے کب رات کی ظلمت چھوٹے گی

دوزخ کو چھپا کر سینے میں جنت کی ہوائیں چلتی تھیں
اوہام کی خونیں تاریکی معبد کی سحر پہ تُلتی تھی
اصنام کے سنگیں جبڑوں میں انساں کے نوالے ہوتے تھے
رنگ اور نسب کے پردے میں ہر کوڑھ چھپایا جاتا تھا
آفاق کی ڈوبی کشتی کو ساحل کی طرف کھینچنے والا
آنکھوں کو نظر، سینوں کو اُجالے دینے والا صحرائی
وہ سیل جو کبر و نخوت کے کہساروں سے ٹکرایا ہے
تاجوں پہ گرجتا آیا ہے، کاسوں پہ برستا گزرا ہے
جس کا پرچم اسپین سے لے کر چین تلک لہرایا ہے
قدموں میں وقارِ قیصر و جم ماتھے پہ غبارِ کرب و الم!
آفاق کو کب تک روندے گا قوموں سے غرورِ دارائی
اس خون میں کب تک تر ہوگی تاریخِ اُمم کی پیشانی
پیار کہاں تک بہکے گا، یہ سیل کہاں تک جائے گا
سونے سے کہاں تک آدم کے معبود تراشے جائیں گے
آواز رہے گی گم کب تک زنجیروں کی جھنکاروں میں
ابنائے زمیں کی قیمت پہ لڑیں گے کہاں تک بحر و بر
انساں کے لہو میں انساں کو کب تک یہ گھٹا نہلائے گی
صبحوں کا اُجالا کب ہوگا، سورج کی کرن کب پھوٹے گی

سن میری فغاں اے میرا سلام، اے ارض و سما کے پیغمبر
خورشید کا ماتھا پھر دھوئے پھر نور سے بھر دے جیبِ سحر

مختار صدیقی

○

یہ بحر بھی زمیں تھی، جو غیرت سے شق ہوئی
ہم سنگ بن گئے، تو سراپا عرق ہوئی

بے کار حادثے ہیں، کہ احساس، کُند ہے
عبرت، جو یادِ ماضی کا بھولا ورق ہوئی

دن بھر ہر ایک سایہ گریزاں تھا نور سے
دونوں ملے۔ تو مہر کی رنگت بھی فق ہوئی

آگ اور لہو سے عرصۂ ہستی ہوا ہے سُرخ
اب کائنات، شاملِ حالِ شفق ہوئی

خود سے کبھی کبھی کا وہ ملنا بھی کیا ضرور!
سب کی رسائی اب تو افق تا افق ہوئی

ریزۂ جاں

مجید امجد

ہماری زندگیوں کے سمندروں میں چھپے
کہیں دلوں کی تہوں میں، عجیب اندیشے!
کبھی کبھی، انہی بھیدوں کی گونج میں، ہم نے
اک آنے والے تموّج کی سیٹیاں بھی سنیں،
مگر یہ کس کو خبر، کیا ہے اک وہ ربطِ عمیق،
وہ گھور اندھیروں کا کڑکا ہمارے ذہنوں میں
وہ ایک بس بھری حس — جو ہوائیں بنتے گئے
سیاہ لمحوں کی آہٹ کو جانب پیتی ہے!
کسے خبر ہے کہ اس جان و تن کی کشتی میں،
لہو کی چھپل سلاخوں کے اس جھمیلے میں
کڑی وہ کونسی ہے، اُلجھے سلسلوں کی کڑی
کہ جس کی دل میں ستم سی اک جھنک پھر آئی،
میرے لیے کوئی عظم سی بات لائی ہے!
میں ڈر گیا ہوں — پُراسرار واسطوں کے تمام
یہ خوف ہی تو ہے اک وہ حصارِ بے دیوار،
جو میرے دل کو تری چاہتوں نے بخشا ہے،
تری ہی دین، سہاگوں کو شگفتگی حس،
ترا ہی خوف، اس اَن بوجھے رابطے کا قرب،
میں ایک ریزۂ جاں، ان عجب قرینوں میں،
تجھے ہی خوف کی زد میں — تری گرفت میں ہوں!
تجھے ہی ہیبت کی حد میں — تری پناہ میں ہوں!

عدم

○

آپ کی آنکھ اگر آج گلابی ہوگی
مری سرکار بڑی سخت خرابی ہوگی

پھول کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ رت بیت گئی
کیا خبر تھی کہ تمہیں اتنی شتابی ہوگی

محتسب ہی نے پڑھا ہوگا مقالہ پہلے
میری تقصیر پہ ہر حال جوابی ہوگی!

یا مصور کے بھروسے کا کرشمہ ہوگا
یا سرشتاً مری تصویر شرابی ہوگی

جرم تو میرا تھا وجہ ان کا مرہونِ تبسم
حاکمِ وقت کی تاویل کتابی ہوگی

پھر وہی رات

ظہیر کاشمیری

ان گنت حسرتوں میں ایک امید
جیسے عصرِ کہن کی لاشوں پر
تھرتھراتی ہو تابشِ خورشید

بحر کے سیمگیں کناروں پر
موتیوں کے چراغ جلتے ہیں
موج ان کو مگر بجھا دے گی
تندیٔ سیل میں بہاتے ہوئے
ظلمتِ بحر میں چھپا دے گی

اسی انداز سے شعاعِ امید
دیر تک ٹمٹما نہیں سکتی؛
ایک طوفانِ سرد آئے گا،
پھر وہی رات، پھر وہی آہیں،
کلفتوں کا غبار چھائے گا،

عبد العزیز خالد

حکایتِ نے

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند
(رومی)

ترے دیار کی خوشبو سے نے چمن آرا!
میں سوختہ تو نیستاں نے کے دیار!
میں موج اور تو سراپا ہیں ہمدمی تو گیت
پکاریں تجھ کو جہاں گیر ہر کرۂ جہاں
نہیں میں ظلم کبھی پہ ہوں تری شمشیر
میں تیری بیباک تن ہوں تو میرا قطب قمی
تو میرا باز ہے سارا میں تیری روپ کی
میں ساقی ہوں تو کیا پیالہ تو شیشہ میں پیار تری
تو بے نظیر ہے میرا میں تیری بے نظیر
پری نہیں پہ پری جسماں ہوں تیری
تو کام روپ، کلا کام یکنسیز تری
تو سیتہ واں ہے میرا میں تیری ساوتری
میں چاند بات سی ہوں تو پرتھوی راج
تو تارہ جیسا نرگس نگاہ میں!
تو راجہ گل میں وہی سیانی تیرا رش
تو لکھنؤ ہی ہے میں تیرا پری حسن

مشام جاں کو معطر کرے نگار صبا
میں صاحباں تو مرزا، میں ہیر تو رانجھا
ہے تو چنیسر و لجندں، تو ہے میں لیلا
ہے تو دادو، میں دو ہنی ادیب زمرہ
تو کوئی نہیں منسوا دے مرا میرا
جنوں کو جادۂ ہموار ہے عجب دریا
جلال اکبر اعظم ہے قصیدہ ترا
تو شہزادہ ہیں ہانا، تو کرشن میں میرا
میں ہوں بکاولی، تاج الملوک نام ترا
تو دل ربا مرا سیف الملوک شہزادہ
مری متاع تری آرزو، ترا سودا
میں موہنی ہوں تو صاحب ہیں ماہ و تمنا
تو کام دیو رتی ہیں میں چکوی تو چکوا
تری تلاش میں سر خود وہ کھو گیا
کلا کیا بھلی میں تجلی عجب تیرا
میں زیدہ دار، تو دیکھ عطر کی صبا

قصہ ہو گا کر جو گزرا کا رن
میں پتنگ تو بتی میں بجلی تو اودے بادل
میں پی پی تو پپیہا میں عندلیب تو گل
میں شہر جاں کی ہوں گلعذار زریں تاج

ہے رشتہ ہم میں عزیزہ و عزیزہ کا جانی
میں تیرے ساقیوں کی شب قبا سینہ ہوں
براؤننگ ہے تو میں ایلزبتھ بیرٹ
میں مہ جبین تری تو مرا اسد غازی
تو شاہزادہ سلیم اور میں انار کلی
میں تیری جستجو کلکتہ تیری شاخ نبات
تو زر مینار میں رستا دل تو قسمی داس
تو نیلکنٹھ میں گوری تو گھنشیام میں گوپی
کلک تا سی میں دا سود تہ تو ادین
ہے تو مرید میں حالی، میں رحمت تو بوعز
میں سست گل کلی تو دیر موسیٰ حسان
ہوں میں سحات کی رختی تو آدم خان
تو شاہ جام تاجی ہے اور میں نوری
میں ودفام گل بادام اور تو بہرام
زبیدہ خاتون میں اور تو علاؤالدین
تو چاند نیلے گگن کا میں موج زبیدئی
میں تیری سبز پری اور تو مرا گلفام
وہ پدمنی ہوں جو تجھ پہ جان دیتی ہے
تو دیوداس میں پاروتی میں صابرہ تو رشید
نہ ہو سکا عاشق و معشوق کی خوشی میں شریک
جو میرے دل میں ہے ان میں وہ التہاب نہیں

ہمیشہ جاپ کرے رام نام کا سیتا
تو کرشن رام تری میں حسینہ الکا
تو بن کلی ہے میں کنیا ہوں دختر تحیی
تو میرا مست مولا، مسافر البیلا
نگاہ عشق میں تو جان شاہ میں شمسہ
تو شیکسپیئر، روش رواں و نغمہ نوا
چکور، چاند کا عاشق ہے میں تری شیدا
ہے سرگزشت ہماری طلسم ہوش ربا
ہے تیری دید مجھے صبح عید کا مژدہ
تو میرا عشق ہے مست و حافظا شیدا
میں تیری چندر بدن ہوں تو ماہیار مرا
ہے دیوتا تو مرے من کا مجھ سے مندر کا
تجھے بدن کے دنیا سبھی مصر بالا
تو معمہ میں تری دلربا سکینہ
میں شہر بانو تو یوسف، حسین کا بیٹا
ہے تو بلاوت تو میں شاہزادی محبوبہ
تو مینہ مہرا ہے میں ہونٹ میں ماہی تو دریا
سنہرے دیس کا تو دیر چاند، میں صحرا
تھی نرگانج ہوں میں تو ہے کان ماناق
میں شہزادہ ہوں تو شہنشہ یار ہمدم آرا
کنو میں جھنا سے ہیں تیرے رنگ نے گیا گیا
تو سیدی ابو جعفری شاعرہ جعفری
میں راجی چندن تو گلاب ماچی پھولوں کا
حسد زمانے کی عادت ہے کیا گلہ اس کا
نظر سے گزرے گا کتاب اختر مسلمی

سنا ہے قصۂ زیب النسا و حال جہاں
پڑھا ہے تذکرہ [illegible]

تو میرا عشق ہے باقی بیان و وہم و گماں
ہیں اہل آنند و اہل جہاں سب بے پروا

بتقدیر تیرہ عشق و حسن ناز کرے
تو باغ گل و چمن یا کہ تری [illegible]

تو سورہ حسن کی کایا میں سر ہستی کا روپ
میرے حسن کا تو کلاکار [illegible]

تو سورج میں آشا ہوں، میں ہستی تو پھل
کوئی کہے جیسی ہیں تو آتش اور میں چشمہ

تو پیکر عشق و محبت میں حسن کی دیوی
ہیں دونوں اپنی جگہ بے عدیل و بے ہمتا

میں تیرے شعروں کی مست شباب شہزادی
تو میرے خوابوں کا شہزادہ شوخ و شرمیلا

رباب بجر پہ گاتی ہوں نغمۂ نغمات
میں شوکت ہوں تو جانشیں سلیماں کا

ہو اتفاق ہی سے حسن و عشق کا سنجوگ
ازل سے دشمن ارباب شوق ہے دنیا

بشکل ہی سے دیارِ وفا کی راہوں میں
پر دستم کا پتہ پوچھتی ہے موجِ صبا

بکھیرتی ہیں جو پتیاں جہاں گلاب کے پھول
وہیں ہے باغِ گل میری آرزوؤں کا

ارم کہیں انہیں فرخندہ رہگزاروں کو
دو عاشقوں نے جہاں زیست کا مزہ پایا

ترا خیال سم زندگی کا ہے تریاق
سیاہ میگھلی راتوں میں جل رہا ہے دیا

خمارِ عشق تری تابناک آنکھوں میں
تو کردگارِ اساطیرِ حسن و رومان کا

ہنسو تو وعدے کا پابند، صابر و ضابط
قلندرانہ طبیعت، مزاج شاہوں سا

تری زباں میں لسانِ کلیم کی لکنت
ترے سخن میں شفا بخشیِ دمِ عیسیٰ

ہو فوراً ان میں نمو زیبِ معانی کی
جونہی تو لفظوں کو دے حکم قم باذنی کا

دماغ روشن و فکرِ سلیم دے کے تجھے
خدائے پاک نے طب کا [illegible] بخشا

کتب جہاں بھی ہے تو صاحب کتاب بھی ہے
خودی کا سرِ نہاں تجھ پہ آشکار ہوا

تو نور کا کہکشاں کا، میں دھول دھرتی کی
ہے مہمانِ زمیں اسے مہِ فلک پیما

مری غذا تری یادیں مری شراب آنسو
فضا ہے میری غزل، مرثیہ مرا نغمہ

ہے داستاں مری ایک لمبی گہری آہ
بنے گا کتبہ مری قبر کا "شہیدِ وفا"

اثر پذیر ہے کسی "فریاد" کا مری سینے میں
گماں ہے میری نوا پہ حکایتِ نے کا

برہ کی آگ میں جلتی ہوں کل نہیں پڑتی
غمِ فراق نے صبر و قرار لوٹ لیا

نہ رات رات ہے میرے لیے نہ دن دن ہے
سکونِ قلب بھی ہے بھاگتا ہوا سایہ

اب اشک آہ مری زندگی کے ساتھی ہیں
انھیں تو شغل نہ جانا بہ عذرِ کارِ جہاں
پریت پیا سے کے دکھ جھیلنے نہیں آساں
ہے جو یک دل و یک جاں بنے وہ پردیسی
ترے ہی شہر میں تیرے لیے ترستی ہے
خوشی حرام ہوئی مجھ پہ تیرے جانے کے بعد
مآلِ خونِ جگر ہے بیاضِ حسرت پر
معاملاتِ محبت نہ رہ سکیں مخفی
دل اختیار سے باہر، نگاہ بے قابو
مثالِ دستِ حنا نہ ہوں میں گریہ کناں
چھپا بروگ کے بادل میں آس کا مہتاب
کہاں وہ ساعتِ سرگوشی و ہم آغوشی؟
وہ الف لیلیٰ کی سی پرفسوں جواں راتیں
زبان چوستے صہبائے ناب لب پیتے
لیے وہ سینے سے وہ یادگار جگراتے
نکال کر قفسِ تنگنائے لذت سے
سکھی! پیا کو منا کیوں وہ مجھ سے روٹھ گئے
زباں سے گر نہیں آنکھوں سے گفتگو کرتے
نوا سے راز کو لفظوں کی احتیاج نہیں
سفیرِ سوزِ نہانی ہے حرفِ زیرِ لبی
ہے بے نیازیِ خوباں ادائے محبوبی
چھڑا کے ہاتھ چلے دل سے جاؤ تو جانوں
تو میرے دل میں تو رہتا ہے خدا کے حضور
یہ دل کی آگ کہ جو خوں میں کس طرح ڈھالوں؟
نہ بدگماں ہو تجھے میری جان کی سوگند

ہے سوتے جاگتے ماتم نشاطِ رفتہ کا
بندھے جو راتوں کی تنہائیوں میں عہدِ وفا
دیے کی لاش کی مانند دل جلے میرا
جو اپنے بس میں نہ ہو اس سے عہد و پیماں کیا؟
تری ستودہ و شیفتہ، تری ستلو بیچارہ
قرار پھر نہ دلِ بے نشتر ار کو آیا
شبِ فراق میں لکھتی ہوں نغمہ ہائے وفا
نظر سے لوگ لگا لیں سراغِ باطن کا
نہیں ہے کھیل چھپانا کشاکشِ دل کا
گھلا گھلا کے محبت نے دل گداز کیا

ہجومِ درد میں گم ہو گئی شبِ وعدہ
وہ صبحِ عشوہ و غمزہ، وہ شامِ ناز و ادا!
امیدِ محسن کو رہا تا حیات جن کا نشہ؟
نشے میں جھومتے کرتے سپاس و حمدِ خدا
جنھوں نے وصل، ترکِ ترک، ہم کو دیا
براہِ محرمِ ابدیت سے ہمکنار کیا؟
کیا جو غیر نے اغوا تو میری اس میں خطا!
ترس نہ دیدہ و رسیدہ پہ کچھ انھیں آیا
زبانِ دل کی سرشک و تبسم و ایما
ہے ترجمانِ محبت نگاہِ دزدیدہ

ہے رمزِ ربطِ نہاں، سرسری سلام دعا
تو مجھ سے بھاگ کے آخر کہاں پنہ لے گا؟
مرے سکوت سے ناحق تو خشمناک ہوا
مجھے فسانہ و افسوں کا فن نہیں آتا
سن اے سرودِ دلِ درد آشنائی میرا:

خیالِ ترکِ محبت ہے؟ محال و جنوں
میں بھول جاؤں تجھے کس طرح یہ ممکن ہے
یہی سنا ہے یہی تجربہ ہے خود کا کہ ہے
نہ وہ قدم ہے مری جس پہ پاؤں پڑتی ہوں
کہ اس طرح نہ ستا یا نہ گفتگو مجھ سے
سمجھ نہ مجھ کو پرائی میں ہوں تری پابند
تو میرے جسم مری جان کا مالک و مختار
دکھائی دیتی ہوں گر خوش تو محض مجبوراً
سکھائی مجھ کو تبسم عشق نے اداکاری
ترے بغیر جہنم ہے مجھ کو جنت بھی
ترے بغیر خزاں رنگ ہے بہارِ شباب
جنم جنم کی میں داسی کہوں نہ کیوں خود کو
ترا خیال ہے یا شب چراغ گوہر ہے
بفیضِ جلوۂ جاناں، بپاسِ خاطرِ دوست
تھی اجنبی جو بنا ہر دو محرمانہ نظر
خیالِ خانۂ خورشیدِ رخ سے روشن ہے
ہوں مالا مال فشارِ الم کی دولت سے
مجھے شعورِ حریمِ زندگی عطا کر کے
خدا نے عرش پہ باندھا ہے خود دلوں کا نکاح
ہمارے نام ہلال و ستارہ کی مانند
رہیں گے شہرۂ آفاق و زندۂ جاوید

خیالِ ترکِ محبت ـــ
یہی ہے میرا اثاثہ، متاعِ حسرت
محبت ایک مقدس امانت و جذبہ
نہ دے خدا کے لیے طعنہ بے وفائی کا
خفا ہو تو تو کسی شے میں بھی نہیں لذت
پرستار ہیں تری، تو پران ناتھ مرا
تو زندگی ہے مری، موت ہے فراق ترا
سمجھ کے فرض نبھاتی ہوں کاروبارِ وفا
جنسی مذاق ہے میرا نگاہ کشی سارا
نسیمِ صبحِ گلستاں ہے صرصرِ صحرا
ترے بغیر بیاباں ہے قصرِ الحمرا
ہے نقش دل کے نگیں پہ ازل سے نام ترا
بجھا کے دل کا کنول داغِ سینہ تاب دیا
بنائے جامِ ہلاہل، پیالہ امرت کا
بغیر کچھ کہے سب حال کہہ گئی دل کا
رواقِ تیرہ و تارِ حزالِ غم دیدہ
نفس نفس ہے ثنا خواں تری کریمی کا
سرورِ سرمدی و کیفِ جاوداں بخشا
نہ مل سکے اگر آپس میں جسم، کیا پروا!
رہیں گے تا بہ ابد اوجِ عرش پہ رخشندہ
مثالِ ویدہ و مائیں و وامق و عذرا

یہی دعا ہے کہ شاد و جوانیاں مانگے!
ہمیشہ سرخوش و دلشاد رکھے تجھ کو خدا!

ادا جعفری

دل زدوں کے بس میں کیا تھا بے بسی بڑھتی گئی
بے رخی بڑھتی رہی، وارفتگی بڑھتی گئی

دل کے چھالے ہیں نہیں ہیں پاؤں کے یہ آبلے
منزلیں ہٹتی گئیں، وابستگی بڑھتی گئی

الجھنیں سی الجھنیں تھیں زندگی میں ہر نفس
ہر نفس اس زلف کی ژولیدگی بڑھتی گئی

اک جستجو اک کمی کافی تھی ساری عمر کو
کیا کریں ہر گھونٹ اپنی تشنگی بڑھتی گئی

جتنا جتنا بے ثباتی کا یقیں آتا گیا
اتنی اتنی زندگی میں دلکشی بڑھتی گئی

ہاتھ میں جو شمع تھی گھٹتی گئی گھلتی رہی
نقشِ پائے رہرواں کی روشنی بڑھتی گئی

سرکشی کا بھی نتیجہ چلتے چلتے دیکھ لیں
جتنا جتنا سر جھکایا بے رخی بڑھتی گئی

ارتباطِ نور و ظلمت سے مفر ممکن نہ تھا
روشنی گلیوں میں دل میں تیرگی بڑھتی گئی

چند ہی لمحے تھے لیکن کیا گراں گزرے ادا
اور وہ سمجھے لذتِ بیچارگی بڑھتی گئی

خان : مستان مرزا

○

ہمارا رازداں کوئی نہیں ہے
محبت کی زباں کوئی نہیں ہے

ہر اک غنچہ ہے مرجھایا ہوا سا
چمن میں باغباں کوئی نہیں ہے

قفس سے چھوٹ کر جائیں کہاں ہم
ہمارا آشیاں کوئی نہیں ہے

اندھیرے راستے، دھندلکے ہیں
چراغ کا، دھواں کوئی نہیں ہے

ہیں پژمردہ تیری یادوں کی کلیاں
بہار جاوداں کوئی نہیں ہے

عبارت ہے حیات و مرگ تم سے
ہماری داستاں کوئی نہیں ہے

یہاں ہر جنس بک جاتی ہے مستان
سخن کا قدرداں کوئی نہیں ہے

خانم ممتاز مرزا

○

وہ کبھی سامنے جو آئے ہیں
اشک پلکوں پہ تھرتھرائے ہیں
دور پھر بھی ہوئی نہ تاریکی
ہم نے لاکھوں دیئے جلائے ہیں
پھر دلِ لالہ، داغ داغ ہے آج
پھر صبا کے پیام آئے ہیں

ہار گوندھے ہیں پھر امیدوں نے

شوق نے پھر دیئے جلائے ہیں
ہائے مجبوریاں محبت کی
ہر قدم پر فریب کھائے ہیں
رہگزر ہے نہ کوئی منزل ہے
ہاں مگر منزلوں کے سائے ہیں
ہم نے ٹھکرا دیئے ہیں دیر و حرم
جب ترے راستے میں آئے ہیں
دشمنوں کی تو دشمنی معلوم
ہم پہ اپنوں نے ظلم ڈھائے ہیں
اپنا سرمایۂ حیات ہی کیا
کچھ ڈرتے بجھے سے سائے ہیں

شفقت کاظمی

○

لالہ و گل سے پیار کیا کرتے ہم یقیناً بہار کیا کرتے
حد کوئی اپنی حسرتوں کی نہ تھی حسرتوں کا شمار کیا کرتے
بارِ گلشن تھا جب وجود اپنا ہم برِ شاخسار کیا کرتے
جام اپنا تھا جب نہ مے اپنی احترامِ بہار کیا کرتے
اپنے شکووں پہ خود تھے نادم ہم تجھے شرمسار کیا کرتے
چل دیئے تیری راہ دیکھنے وقت کا انتظار کیا کرتے
تجھ میں گم ہو کے خود کو بھول گئے اور اسے یادِ یار کیا کرتے
اپنی دنیا میں جب اندھیرا تھا فرقِ لیل و نہار کیا کرتے
آ گیا یاد خود بخود کوئی ہو گئے اشکبار کیا کرتے

کاظمی ترکِ آرزو کے سوا
چارۂ انتظار کیا کرتے

شاعر لکھنوی

○

جو بھی آیا غمِ دنیا کی طرح
بس گیا دل میں تمنا کی طرح

دیر سے منتظرِ سنگ ہیں ہم
میکدے میں سرِ مینا کی طرح

اس کی معصوم نظر کے احساں
دل پہ ہیں تہمتِ بے جا کی طرح

تم سے منسوب ہے اک طرزِ ستم
تم نہ دیکھو اُسے دنیا کی طرح

زندگی ایک چمن تھی جس میں
ہم سلگتے رہے صحرا کی طرح

دیکھ لیتے ہیں تماشا اپنا
ہم بھی ہیں چشمِ تماشا کی طرح

چند اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم بھی پایاب ہو دریا کی طرح

جان دینے کا ہنر جانتے ہیں
وہ جو بنتے ہیں مسیحا کی طرح

اُن کا پیمانِ وفا ہے شاعر
مستقل وعدۂ فردا کی طرح

شفقت کاظمی

○

لالہ و گل سے پیار کیا کرتے — ہم یقینِ بہار کیا کرتے

حد کوئی اپنی حسرتوں کی نہ تھی — حسرتوں کا شمار کیا کرتے

بارِ گلشن تھا جب وجود اپنا — ہم برِ شاخسار کیا کرتے

جام اپنا تھا جب نہ مے اپنی — احترامِ بہار کیا کرتے

اپنے شکووں پہ خود ہوئے نادم — ہم تجھے شرمسار کیا کرتے

چل دیئے تیری راہ دیوانے — وقت کا انتظار کیا کرتے

تجھ میں گم ہو کے خود کو بھول گئے — اور اسے یادِ یار کیا کرتے

اپنی دنیا میں جب اندھیرا تھا — فرقِ لیل و نہار کیا کرتے

آ گیا یاد خود بخود کوئی — ہو گئے اشکبار کیا کرتے

کاظمی ترکِ آرزو کے سوا
چارۂ انتظار کیا کرتے

شاطر لکھنوی

○

جو بھی آیا غمِ دنیا کی طرح
بس گیا دل میں تمنا کی طرح

دیر سے منتظرِ سنگ ہیں ہم
میکدے میں سرِ مینا کی طرح

اُس کی معصوم نظر کے احساں
دل پہ ہیں تہمتِ بےجا کی طرح

تم سے منسوب ہے اک طرزِ ستم
تم نہ دیکھو مجھے دنیا کی طرح

زندگی ایک چمن تھی جس میں
ہم سلگتے رہے صحرا کی طرح

دیکھ لیتے ہیں تماشا اپنا
ہم بھی ہیں چشمِ تماشا کی طرح

چند اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم بھی پایاب ہو دریا کی طرح

جان دینے کا ہنر جانتے ہیں
وہ جو ملتے ہیں مسیحا کی طرح

اُن کا پیمانِ وفا ہے شاطر
مستقل وعدۂ فردا کی طرح

شاعر لکھنوی

○

لب پہ آتا تھا نہ آنکھوں سے رواں ہوتا تھا
آپ کے غم کو تو آرائشِ جاں ہوتا تھا

شوخیِ گل کی طرح تجھ کو عیاں ہوتا تھا
رنگ کو شرح تو خوشبو کو بیاں ہوتا تھا

چھوٹ دو جام عرق ہو گئی شبنم کی طرح
نکہتِ گل کو نہ اتنا بھی گراں ہوتا تھا

ہم بھی بیٹھے تھے کسی پھول کی خوشبو لیے
اس طرف بھی تو نسیمِ گزراں ہوتا تھا

جانے کیا ہے کہ پشیماں سی گزر جاتی ہے
وہ نظر جس کو حریفِ دل و جاں ہوتا تھا

بڑھ گیا بن کے دھواں فاصلۂ ہجر و وصال
اس قدر آپ کو نزدیک کہاں ہوتا تھا

میں اگر چپ تھا تو کھلتا ترے رخسار کا رنگ
کچھ نہ کچھ معرکۂ شرح و بیاں ہوتا تھا

زیست دشواریِ منزل کا ہے نام اے شاعر
راہ میں ایک نہ اک سنگِ گراں ہوتا تھا

فرصت

ابوسعید قریشی

تحیر کدہ ہے یہ دنیا خدایا
نہیں ہے یہاں
کوئی فرصت کی آسودگی کی ، مسرت کی ساعت
یہاں طفلِ نوزاد کی سانس اک چیخ ہے ٹوٹتے تارے کی مانند
یہاں سسکیوں کا دھواں
قدموں کا گلا گھونٹتا ہے
یہاں حسن غازے کا مرہونِ منت ہے
مجرب ہے
مہوشوں ، گلعذاروں کی خاطر
یہاں ناچتی مچھریاں جال بنتی ہیں چپ چاپ بیٹھی
پھلنے سے پہلے ہی غنچے نگوں سار ہیں ۔ یہاں
ہر شام ہی سے سہاگن کے جوڑے کی کلیاں ہیں باسی
شامِ جاوداں کا فریبِ فزوں شکل ہے
یہاں شادیانوں میں نوحوں کے سُر گونجتے ہیں — یہاں
یہاں زندگی موت کی جنتی ہے
یہاں سانس لینے کی مہلت نہیں ہے
یہاں — نور کی کوکھ میں تیرگی کے بسیرے ہیں
بطن میں پھولوں کے کانٹوں کے ڈیرے

خزاں کا مہ یاں بہاروں کے ماتھے کا ٹیکا ہے
یاں کشتِ لالہ فروزاں ہے خونِ جگر سے
ترقی — تنزل کی منزل کی یاں پیش رو ہے
محاسن کے نیچے یہاں کچھ نہیں ہے
معابد کے آگے بھکاری کھڑے ہیں — پجاری
یہاں آدمی — آدمی کا خدا ہے
مگر لوگ کہتے ہیں — دنیا
یہ دنیا خدایا — مصیبت نہیں ہے
اذیت نہیں ہے - یہ نعمت ہے
لیکن —
نہیں
مجھ کو یہ سوچنے کی بھی مہلت کہاں
اتنی فرصت کہاں دی ہے تو نے خدایا
بس اک سانس ہے زندگی' آتی جاتی — یہاں
اتنی فرصت کہاں
اتنی مہلت کہاں
مجھ کو فرصت نہیں
مہر و مہ کے اشارے سمجھنے
ستاروں کے گننے
افق کے جھروکوں
شفق کے نشیمن میں رنگیں نگاروں کے جلووں سے چشمک کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
کہکشاں کی روش پر بہاروں کی نکاسی

آبشاروں
پھواروں
ہواؤں
فلک کی بلندی پہ رقصاں ستاروں
درختوں کی شاخوں میں سرگوشیوں کے ترنم
تخیل بیاباں پہ باران رحمت کی رم جھم
شبستاں کے سایوں میں ہونٹوں کے ملنے
دھڑکتے دلوں کے
تنفس کے نغموں کو سننے کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
مجھ کو فرصت نہیں ہے
محبت کی
ہنس بول لینے
کہیں دل لگانے
خیابان حیرت میں آہو خصالوں کی رم خوردگی کے تماشے کی فرصت —
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
چاک دل کے رفو
اشک جبیں پہ آنسو بہانے کی حسرت کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
صید و صیاد کے عہد باہم پہ غم خوردگی کی — تحیر کی — عبرت کی فرصت

نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
جور و بیداد خواہش
آلِ وفا پر
جفا پر حسینوں کے دل خون کرنے
ستم پر تمنا کی رونے
خرابِ محبت کے ارمان کی بے چارگی — بے بسی کا تماشا دکھانے
فسانہ سنانے کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں
سخن گستری کی
ستائش کی خواہش کی
عرضِ ہنر کی
شکایت کی — شکوے کی فرصت
نہیں
مجھ کو فرصت نہیں ہے
مگر سوچتا ہوں کہ شاید اسی میں کوئی مصلحت ہو
یہ فرصت کا ہونا نہ ہونا
اندھیرے اُجالے کی مانند احساس ہے اک اضافی
خوشی اور غم کی طرح
اور وجود ایک کا دوسرے کی بدولت ہے
ورنہ
وہی ہیں کہ جن کو شکایت ہے فرصت نہ ہونے کی
اس کو — مجھی کو،

مجھے یاد ہے وہ زمانہ
وہ شب پھیل کر سیکڑوں سال پر جو مسلط تھی،
حاوی تھی
جس کا بنا تھا فسانہ
وہ شب جس کی اک ایک ساعت
فقط ایک بے مہر عورت کے دردِ جدائی میں کوہِ گراں بن گئی تھی
مگر مجھ کو اس وقت فرصت کی خواہش کہاں تھی

مجھے یاد ہے
اور — مجھے یاد ہے
بندگی کا غلامی کا وہ دورِ سنگین
شب و روز کا وہ تواتر
بہار کے سایوں میں زنجیرِ جنباں
مرا پائے کوباں
مگر سوچتا ہوں
وہ فرصت کی گھڑیاں اذیت تھیں
اس وقت فرصت کی خواہش کسے تھی
مجھے یاد ہے
اور مجھے یاد ہے وہ سحر
جو سلاسل کے کٹنے کا اعلان تھی
اک نئی زندگی کا تلاطم لے کے ابھری تھی
لیکن —
مرے ہی لہو سے منور تھی
اس وقت سوچا تھا میں نے
اسی کے لیے۔ کیا اسی کے لیے مجھ کو فرصت کی خواہش تھی

اے کاش فرصت نہ ہوتی مجھے
مجھ کو فرصت نہ ہوتی

مجھے یاد ہے
اور مجھے یاد ہے
ایسی فرصت کی ساعت
کہ جب سہم کر وقت
اک طفلِ مکتب کے سامنے کی صورت
سمٹ کر
تدبر سے انساں کے اس کی فطانت سے ڈر کر
تحیر زدہ
ہیروشیما کے بازار میں نقشِ دیوار تھا ـ تھم گیا تھا
مگر اس کے چاروں طرف
آگ کی آندھیاں تھیں
بگولے تھے
صحرا تھے
دریا تھے
طوفاں تھے
اور فیوجی یاما کے نقشے
تباہ کاریاں اس کی
سب ہیچ تھیں جن کے آگے
مگر آہ وہ نقشِ دیوارِ فرصت کی وہ تابکاری کی ـ وہ مستقل جانکنی کی اذیت کی ساعت
تصور سے اس کے مجھے آج بھی ہول آتا ہے

توبہ ہے میری
تمدن کو تہذیب سے
آدمیت کو انسانیت سے بچانے کی اس فرصتِ حشر ساماں سے ڈر کے

تصور مرا

مجھ کو ان جنگلوں میں لیے جا رہا ہے
جہاں روشنی بھولے بھٹکے ہوئے جگنوؤں کی طرح اک ذرا سی ضیا جگمگا کر کہیں
سرد سنسان سایوں میں فرصت کی اک ساعتِ مضمحل کی صدا بن کے
سارے میں پھیلی ہوئی ہے
نہیں تیرہ و تار وحشت کدوں کے کنارے کہیں زندگی کے بسیرے ہیں

اور

ابن آدم یہاں برگِ انجیر سے بھی معرا ہے،
یہاں آگ اور ناگ معبود ہیں
اور وقت ایک رفتارِ معکوس،
قابوس بن کر معلق ہے
نوحہ کناں، پا بجولاں گراں بار لمحے یہاں آدمی کے لیے سینہ زن ہیں۔
یہاں ریگِ صحرا سی پھیلی ہوئی ساعتیں پا بریدہ
بھاری ہیں رفتار کی
کتنی فرصت ہے یاں
کتنی فرصت ہے یاں — اُف — خدایا
نہیں مجھ کو فرصت کی خواہش نہیں ہے!

رفعت سلطان

○

نصفِ شب یہ ہوا کا جھونکا ہے
یا دبے پاؤں کوئی آیا ہے

ایک مدت کے بعد میری طرف
غور سے آج اس نے دیکھا ہے

بے خیالی میں یہ خیال کہاں
کب کسی نے مجھے پکارا ہے

کوئی میرا نہیں رفیقِ سفر
میرے ہمراہ میرا سایا ہے

کس زباں سے تجھے یہ سمجھاؤں
تو مری آخری تمنا ہے

خندۂ گل بھی، اشکِ شبنم بھی
زندگی کیا ہے اک تماشا ہے

ایسی دنیا کو کیا کہیں کہ جہاں
ہر حسیں آرزو بھی رسوا ہے

تشنہ لب ہیں جہاں تمنائیں
آہ، وہ میرے دل کا صحرا ہے

آ رہی ہے ترے بدن کی مہک
حسن اعجاز یہ صبا کا ہے

اب تو اس بزم میں بھی اے رفعت
میری خاموشیوں کا چرچا ہے

رفعت سلطان

○

حسنِ فطرت کی جستجو ہے مجھے

زندہ رہنے کی آرزو ہے مجھے

میں کہ ہوں تشنۂ ازل ، پھر بھی

حسرتِ ساغر و سبو ہے مجھے

پھر ترے پاس آ گیا ہوں میں

پھر تمنائے گفتگو ہے مجھے

میں فدائے گل و گلستاں ہوں

کیا کروں ذوقِ رنگ و بو ہے مجھے

بیٹھ کر با ادب سنیں شاعر

پڑھ رہا ہوں غزل وضو ہے مجھے

میری دیوانگی پہ طنز نہ کر

کیا خبر کس کی جستجو ہے مجھے

جاؤں اُس کی گلی میں کیوں رفعت

پاسِ ناموس و آبرو ہے مجھے

بشیر بدر

○

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پروئے ہوئے بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں۔ کہ دلِ شاعر پہ چھپائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پہ چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اس جانِ تغزل نے جب بھی کہا کچھ کہیے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

پیش بدر

○

میرے سینے پہ وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا۔ روتا رہا

شبنمی میں دھوپ کی جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اُترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اک دل پہ رکھا ہے جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

پوچھنے والوں نے آ کر حالِ دل پوچھا مگر
درد جس پہلو سے ہوتا تھا جہاں ہوتا رہا

اک ہوائے بے مکاں سے آغوش مرجھا گیا
زندگی بھر جو محبت کے شجر بوتا رہا

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا گھر سر پہ مگر
وہ تمام عمر جاگا تھا پڑا سوتا رہا

بند دروازوں، دریچوں پر گرا کر پردوں کو
ایک خط پڑھ پڑھ کے ساون کی طرح روتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا
صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح سوتا رہا

روشنی کو بند کر کے لے گئے جب رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

بشیر بدر

○

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پرونے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پہ چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اُس جانِ تغزل نے جب بھی کہا کچھ کہیے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

بشیر بدر

○

میرے سینے پر وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا۔ روتا رہا

شبنمی میں دھوپ کی جیسے وطن کا خواب تھا
لوگ یہ سمجھے میں سبزے پر پڑا سوتا رہا

وادیوں میں گاہ اترا اور کبھی پربت چڑھا
بوجھ سا اک دل پہ رکھا ہے جسے ڈھوتا رہا

گاہ پانی، گاہ شبنم اور کبھی خوناب سے
ایک ہی تھا داغ سینے میں جسے دھوتا رہا

پوچھنے والوں نے آکر حالِ دل پوچھا مگر
درد جس پہلو سے ہوتا تھا جہاں ہوتا رہا

اک ہوائے بے تکاں سے آخرش مرجھا گیا
زندگی بھر جو محبت کے شجر بوتا رہا

رونے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پہ مگر
وہ تمام عمر جاگا تھا پڑا سوتا رہا

بند دروازوں، دریچوں پر گرا کر پردوں کو
ایک خط پڑھ پڑھ کے ساون کی طرح روتا رہا

رات کی پلکوں پہ تاروں کی طرح جاگا کیا
صبح کی آنکھوں میں شبنم کی طرح سوتا رہا

روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایہ میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

شکیب جلالی

○

حرف جو اس زبان سے نکلا — نکہتِ گل کی شان سے نکلا

چاندنی جھانکتی ہے گلیوں میں — کوئی سایہ مکان سے نکلا

ایک شعلہ پھر اک دھوئیں کی لکیر — اور کیا خاکدان سے نکلا

چاند جس آسمان میں ڈوبا — کب اسی آسمان سے نکلا

اس کے سائے سے کیوں گریزاں ہو — کام جس سائبان سے نکلا

یہ گہر جس کو آفتاب کہیں — کس اندھیرے کی کان سے نکلا

آہٹوں کی تراش کر چادر — پتھروں کے جہان سے نکلا

جب بھی نکلا ستارۂ امید — کہر کے درمیان سے نکلا

پھر ہوا سے سلگ اٹھے پتے — پھر دھواں گلستان سے نکلا

شکر ہے اس نے بے وفائی کی — میں کڑے امتحان سے نکلا

دھیرے دھیرے شکیب یاد کا شہر
دھند کے سائبان سے نکلا

سوزِ فن

صدیق کلیم

فان: یہ ہر اک سمت گھنی تیرگیاں
روشنی لہر بنے تیرتی ہے ڈوبتی ہے
اسی اک چاند کا ہو جائے طلوع
یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا، یہ منوّر لہریں
کاش پھر کوئی کلیم
کوہِ سینا پہ رگِ جاں ہو جائے
مشعلِ راہ فروزاں ہو جائے

سہ: اُف یہ سوچ!
اس قدر گہری گھنیری سوچیں!
پھیلتی کانپتی راہوں کا سفر
دور بھی نزدیک بھی پُرخواب چناروں کا ہجوم
وہ دھیا غاروں کے پُرہول قطار
اُف یہ خاموش الم ناک نظاروں کا سکوت

مرفان: کیسے خاموش الم ناک نظاروں کا سکوت!
تو نے دیکھا کیا ہے؟

کوہ کی سطح سے تنتے ہوئے بھاری بادل
پھیلتے ناچتے ہر سمت گرجتے بادل
وحشت انگیز ہواؤں میں کڑکتے بادل
سنسناتی ہوئی وحشی لہریں
ہر نفس ناچتی ہیں ڈولتی ہیں چیختی ہیں
بجلیاں کوندتی ہیں، ڈوبتی ہیں کوندتی ہیں

شمسہ: پاگل انسانوں کے بے تاب دلوں میں کیا رکھا ہے!
تم شاعر ہو
تم دانشور ہو
تم سب کچھ ہو پر تم دنیا کے رسیا بھی ہو
تم کو دنیا کا علم نہیں ہے
تم دنیا کو بدلوگے؟
تم پاگل ہو
یا اس فکر کی ایندھن سے آگ جلاؤ
یا اس کو نیچے غاروں میں پھینکو
انسان بنو
پاگل نہ بنو
میں سچ کہتی ہوں
تم پاگل —

عرفان: اس درد کو سینے سے لگائے پھرنے سے کیا حاصل ہے؟
جس درد کو اظہار میسر ہی نہیں
اس دولت کیا حاصل ہے؟
پاگل انسانوں کے بے تاب دلوں میں کیا رکھا ہے!
سننے والوں کے دلوں میں جب تک نہ اترے

گیتوں کی آگ سسک کر بجھ جاتی ہے
اس درد سے کیا حاصل ہے؟
یہ درد سسک کر مر جاتا ہے
انسانوں کا درد امر ہو جاتا ہے
بے کار امر ہو جاتا ہے
اس درد سے کیا حاصل ہے؟

ناصر: ہیلو! عرفان!
او ہو تم تو کمرے میں بیٹھے ہو۔ اپنے سے ہی روٹھے بیٹھے ہو
رات ایک نہیں دو نظمیں لکھی ہیں
وہ بھی سنو:

(۱)

مری پیاری مری جاں
پھر پپیہا خوب پیئو
لے کر اس رقص کی لے تیز کرو
سلگتے ہوئے ہونٹوں کی بہار
یہی سب کچھ ہی امرت رس ہے
مری پیاری مری جاں
نغمگی لے تیز کرو
بھول جاؤ مری آغوش میں آؤ
کہ ذرا پیار کریں
یہ مرے گیت یہی دولت ہیں
مری پیاری مری جاں
مجھ کو محروم نہ کر
"تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ"
نغمۂ زیست سنا
تن بھرا ساز بجا
گا ابھی اور بھی گا
تان کی لہر اُٹھا
زیست کا ساز بجا
مری پیاری مری جاں!

(۲)

اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
میں اپنی پیاری کو اپناؤں گا
آخر وہ مجھ کو نہ بھی ملی تو کیا
جو سینے کے زنداں میں سلگتا ہے
اس درد کو راہ نہ بھی ملی تو کیا
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
چاند ستاروں کی اوٹ وہ بستی ہے
سب سے اونچا محل ہے اُس کا گھر
وہ پیت نگر کی ایک ہی رانی ہے
مجھ کو ہے پیت نگر کا پیش سفر
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا
میں اُس کا ایک سنہری پیارا مجسمہ
یہ سارا جیون دے کے بناؤں گا
وہ مجھ کو بے شک نہ بھی اپنائے
میں اپنی پیاری کو اپناؤں گا
اپنی پیاری سے ملنے جاؤں گا

عرفان: پھر وہی گیت۔ وہی پیار کی سطحی باتیں
کبھی اونچی کبھی نیچی سطحی باتیں
تم کبھی اپنے سے باہر آؤ۔ دیکھو
ان دہکتے ہوئے بازاروں کی رونق دیکھو
ان مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو

ں تمہیں شعر سناتا ہوں - مرے دوست -
ور سنو -
ندگی در دو بنے گی مجھے معلوم نہ تھا
مر بسنے جو بٹے گی مجھے معلوم نہ تھا
سے خوں کے ستاروں سے سلگتی ہوئی آگ
وشنی ایسے بجھے گی مجھے معلوم نہ تھا
ہم کے پیار کی سندر متحرک کر دو!
س طرح شام ڈھلے گی مجھے معلوم نہ تھا
ندگی در دبنے گی مجھے معلوم نہ تھا"
ں تو پھر آپ کے اشعار سے محروم ہی
ی درخواست مکرر ارشاد"
: تم ہمیں شعر سناؤ نظم

} تم ہمیں شعر سناؤ نظم

سنو ایک رسالے میں چھپی ہے
یہ پسند آئی بھی لکھ رکھی ہے

ارشاد!

سانس کا سلسلہ جاوداں
ہے [illegible] حرارت رواں
ہے مری دھڑکنوں کا امیں
ہے چمکتی بہاروں کا رس
ں فضا میں نئی زندگی ہے
ہر قدم پہ یہاں تازگی ہے

نغمہ خواں جسم کی راگنی
سر سے پاؤں تک رنگ ہے
پھول سے چاند کی دل کشی،
شاہراہوں کی یہ رونقیں
یہ بسیں ہر جگہ موٹریں،
یہ دکانیں۔ یہ سب ریستوراں
درد و لذت کی آمیزشیں
ہر نفس خون کی گردشیں
سنگتراشوں نے پتھر میں دیکھا جسے
شاعروں نے زباں میں پرویا جسے
فارمولوں میں سائنس نے لکھا جسے
وہ صدی سے مشینوں نے ڈھالا جسے
حسن ہی تھا صداقت بنایا جسے
آج یہ زندگی کا نیا روپ ہے
اک نیا فن ہمیشہ حقیقت نئی
یہی زندگی ہے - یہی زندگی
زندگی اے نئی زندگی!
تیرے بیٹے، تری بیٹیاں
اس جہاں میں جہاں پر بھی ہیں
وہ ملوں میں ہوں کھیتوں میں ہوں
[illegible] ہو کہ ہو [illegible]
تیری خاطر کسی کام پہ
جی رہے ہیں ترے نام پہ
ہر نفس ہے تیری بندگی
زندگی اے مری زندگی!

مضطر اکبر آبادی

○

کترا کر چلے ہیں راہ میں ہر نقشِ پا سے ہم
آگے رہے ہیں چار قدم رہنما سے ہم

سانسوں کی بھیک موت سے مانگیں تو کس لیے
کیوں لیں وفا کا عہد کسی بے وفا سے ہم

اک مستقل سکوت ہے دل سے زبان تک
محروم ہو گئے ہیں اب اپنی صدا سے ہم

جرمِ وفا کیا ہے کریں گے ہزار بار
ڈرتے نہیں جہاں کی کسی بھی سزا سے ہم

حائل ہیں اپنی راہ میں کوتاہ دستیاں
کس طرح چھین لیں تری خوشبو صبا سے ہم

بجھتے ہوئے چراغ سے لیتے ہیں روشنی
بڑھتے ہیں ابتدا کی طرف انتہا سے ہم

کچھ غیر مطمئن بھی ہیں کچھ مطمئن بھی ہیں
مضطر سکوتِ سازِ شکستہ صدا سے ہم

آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں طویل نظم کا ایک حصہ)

ریاض انور

میں اک مسافرِ شکستہ دل، پا بہ گِل
نہ کوئی جادہ نہ کوئی منزل
سکونِ قلبِ حزیں کی خاطر مثالِ بسمل
نہ جانے کب سے تڑپ رہا ہوں
چمن چمن، دشت دشت گھوما
مگر کہیں بھی ملی نہ مجھ کو

وہ اک کرن جو حریفِ شب ہو
روش روش، کنج کنج ڈھونڈا
وہ گیت جو کہ متاعِ لب ہو
میں اک مسافرِ شکستہ دل، پا بہ گِل
گئے زمانوں کے نقش ہائے قدم کی شمعوں کی جستجو میں
عظیم دریا کی شوخ لہروں سے بات کرنے کی آرزو میں
ازل کی محرومیوں کا عفریت ساتھ لے کر
بہ قلبِ ویراں، بہ دیدۂ تر
کھڑا ہوا ہوں صلیب بن کر
کنارِ پدما
خموش، تنہا!

عظیم لہرو، عظیم جمن کی ہمسفیرو ٹھہر بھی جاؤ
مجھے کچھ اس سرزمینِ نغمات و رقص کی داستاں سناؤ

یہ سرزمیں جس کے گیت جھرنوں کی نغمگی سے بھی دلنشیں ہیں
یہ سرزمیں جس کے رقص قوسِ قزح کے رنگوں سے بھی حسیں ہیں
یہ سرزمیں جس کے دکھ حسین ترین شعر و نغمہ کی چاندنی سے
یہ سرزمیں جس میں موت چلتی ہے اک قدم ہٹ کے زندگی سے
عظیم مرد، عظیم لوگوں کی ہمسفیرو
تمہارے لطف و کرم سے شاداب کھیتیوں میں یہ دلکشی ہے
تمہارے حسنِ نظر سے روشن ہیں قریہ قریہ چراغ کتنے
تمہارے دم سے چمن چمن پھول مسکراتے ہیں سرخوشی سے
یہ صندلی کھیت جوٹ کے، جھنڈ ڈاب کے، ناریل کی خوشبو
یہ صف بہ صف باغ آم کے اور دھان کی لہلہاتی فصلیں
ندی ندی تیرتے کنول مسکراہٹوں کی بہار ہر سو
تمہارا خوں ہی ہر ایک پتے کے ریشے ریشے میں گھومتا ہے
تمہاری آواز ہی کے سنگیت پر یہ سنسار جھومتا ہے
عظیم مرد، عظیم لوگوں کے ہمسفیرو
کبھی تو وجہِ حیات ہو تم کبھی ہو پیغام نیستی کا
تمہارے دستِ جفا سے اکثر بجھا ہے مہتاب زندگی کا
وہ بستیاں جن کو تم نے پالا ہے اپنی آغوشِ جاں فزا میں
تمہارے شوقِ فنا کے ہاتھوں کی زد میں آ کر کھنڈر بنی ہیں

پہلی آواز : افق پہ یہ کیسا اندھیرا ہے کیسا دھواں ہے
سنو غور سے یہ ہواؤں کی آواز جیسے کوئی رو رہا ہو

دوسری آواز : یہ طوفاں کی آمد کا پہلا نشاں ہے

پہلی آواز : یہاں دل تو پہلے ہی محرومیوں کے بگولوں کا مسکن بنے ہیں
یہاں آنسوؤں کی جھڑی دیدنی ہے
یہاں تو ہر اک آنکھ پہلے ہی مرتی ہوئی آرزوؤں کا مرگھٹ بنی ہے

یہاں تو ہر اک گام پہ موت کی ایک چادر تنی ہے
برس ہا برس سے ہلاکت کے طوفاں، فاقوں کے جھکڑ یہاں خیمہ زن ہیں
یہاں کیسا طوفاں؟
دوسری آواز: یہی زیست اور موت کی کشمکش
اورض بنگاں کے رقص و نغمہ کی جاں ہے

درخت کے پتوں کی آواز چیخوں میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے
یہ دریا کی لہریں ہیں یا کوئی دیوار بڑھتی ہوئی آ رہی ہے
مکاں اس طرح گرتے جاتے ہیں جیسے
کوئی بلبلۂ آب کا پھٹ جائے
یا جیسے گھروندا کوئی ریت کا
بادِ صرصر کی یلغار سے ٹوٹ جائے
چھتیں ٹین کی اس طرح اُڑ رہی ہیں
ہواؤں کے ریلے میں جیسے کوئی خشک پتا رواں ہو
یہی کھڑکھڑاتی چھتیں تیغ بن کر سروں کو بدن سے جدا کر رہی ہیں
ہر اک سمت چیخوں کا شورِ قیامت
سسکتے، بلکتے ہوئے آدمی
موت کے دستِ بے رحم سے بچ نکلنے کی خاطر
تناور درختوں سے چمٹے ہوئے ہیں
مگر تند دریا کی بے مہر لہریں
سروں سے گزرتی
[illegible] کی شمعوں کو بے نور کرتی
مجسم اجل بن کے آثارِ ہستی مٹاتی چلی جا رہی ہیں

افق سے گھٹا ڈھل گئی ہے، ہوا تھم گئی ہے
کراں تا کراں سنسناتی ہوئی خامشی نوحہ خواں ہے
نہ کوئی مکیں ہے نہ کوئی مکاں ہے
یہ اُجڑے ہوئے کھیت، ٹوٹی ہوئی کشتیاں گزرے لمحات کی داستاں ہیں
دھڑکتے ہوئے دل، مہکتے ہوئے ہونٹ، شاداب چہروں کے گلشن کہاں ہیں؟

عظیم لہرو، عظیم لہروں کی ہمسفیرو
کھڑا ہوا ہوں تمہارے پہلو میں اپنے خوابوں کی راکھ لے کر
شکستہ دل، پا بہ گِل
بہ قلبِ ویراں، بہ دیدۂ تر
تمہاری آغوش کاش بن سکتی میری منزل

اختر ہوشیارپوری

میں نے یوں دیکھا اُسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا
اور جب دیکھا تو آنکھوں پر یقیں آتا نہ تھا

ریگِ ساحل تھا بہارِ ساحلِ دریا نہ تھا
پھر بھی قدموں میں رہی ہے موج میں پیاسا نہ تھا

بام و در سے سخت بارش میں بھی اُٹھے گا دھواں
یوں بھی ہوتا ہے محبت میں کبھی سوچا نہ تھا

آندھیوں کو روزنِ زنداں سے ہم دیکھا کیے
دُور تک پھیلا ہوا صحرا تھا نقشِ پا نہ تھا

لوگ لائے ہیں کہاں سے شب کو مرمر کے چراغ
ان چٹانوں میں تو دن کو راستہ پیدا نہ تھا

شہر کی ہنگامہ آرائی میں کھو کر رہ گیا
میں کہ اپنے گھر میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہ تھا

تم سے پہلے راستوں میں قمقمے روشن نہ تھے
شہر کی دیوار سے صحرا نظر آتا نہ تھا

نت نئے انداز سے رہتی تھی اُن سے گفتگو
دوستوں میں جب مرا رنگِ سخن رُسوا نہ تھا

برف اپنے آپ گھُل جاتی ہے سورج ہو نہ ہو
شام سے پہلے یہ جانا تھا مگر سمجھا نہ تھا

اُن دنوں بھی شہر میں سیلاب سے آتے تھے بہت
وادیوں پر جب کہیں بادل ابھی برسا نہ تھا

دامنِ گل تک نہ تھا محفوظ گردِ راہ سے
ہاں مگر تیرے شہیدوں کا کفن میلا نہ تھا

رات کی تنہائیوں میں جس سے چونک اُٹھتے تھے ہم
اپنی ہی آواز تھی شعلہ کوئی چمکا نہ تھا

وہ بھی سچ کہتے ہیں اختر لوگ بیگانے ہوئے
ہم بھی سچے ہیں کہ دنیا کا چلن ایسا نہ تھا

بشیر منذر

○

بات ہے تب کی وہ جب دیکھیں گے
چاند نکلے گا تو سب دیکھیں گے

کیا ہے جینے کا سبب دیکھیں گے
ہم بھی وہ پھول سے لب دیکھیں گے

ہونے والا ہے چراغاں دل میں
آپ بھی جشنِ طرب دیکھیں گے

حسرتیں اپنی جو یکجا کر لوں!
لوگ اک شہرِ عجب دیکھیں گے

جب وہ گزریں گے ادھر سے تو ہمیں
باملاحظہ، بہ ادب دیکھیں گے

دیکھنا شانِ کریمی منذر
وہ مرا عرضِ طلب دیکھیں گے

بشیر منذر

○

دامان تار تار ہے دل لخت لخت ہے
تعزیرِ عشق زہرہ وشاں کتنی سخت ہے

ہونٹوں کی تازگی ہے بہاروں کا زادِ راہ
آنکھوں کا حسن چاند ستاروں کا رخت ہے

سایہ نہ کوئی شاخِ ثمردار ہے کہیں
کتنا عجیب تیری وفا کا درخت ہے

پنبہ بگوش کس لیے رہتی ہے مرگ بھی
آوازِ سازِ زیست کی شاید کرخت ہے

مرنے کے بعد بھی نہ سکوں مل سکا کہیں
جاں دادگانِ عشق کا اتنا ہی بخت ہے

اختر لکھنوی

○

ہر رنگ میں جو ان کے وفادار رہے ہیں
اختر وہ خطاکار سزاوار رہے ہیں

جب تک نہیں واقف تھے تری راہگزر سے
ہر راہ میں ہم صورتِ دیوار رہے ہیں

ہنگامِ جنوں میں بھی تری چاہ کی حد تک
دیوانے ہمیشہ ترے ہشیار رہے ہیں

مہتاب کی منزل میں ہیں اب قافلے ان کے
جو لوگ ترے محرمِ اسرار رہے ہیں

وہ چشمِ غضب ہو یا نگاہِ کرم ان کی
ہم لوگ بہر حال سپر دار رہے ہیں

چاہیں تجھے چھپ چھپ کے یہ ہم سے نہیں ہوتا
ہم چاک گریباں سرِ بازار رہے ہیں

اعتراف

شاعر ندیم

آج تجدیدِ وفا کا دن ہے
آج کے دن کو تری یاد سے نسبت دی ہے

آج پھر اپنے ارادوں کی اُٹھے گی تمہید
آج پھر ہوگی نگاہوں کو ادب کی تاکید
آج پھر تجھ سے محبت کی رہے گی تائید

آج پھر حرفِ محبت پہ نکھار آئے گا
آج پھر تذکرۂ رقصِ بہار آئے گا
تجھ پہ پیار آئے گا اور ٹوٹ کے پیار آئے گا

پھر ترے دستِ حنائی پہ بندھیں گے پیماں
پھر سے کھل جائے گی ترسی ہوئی باہوں کی کماں
پھر سے جھوم اُٹھے گی ارمانوں کی مہکی رگِ جاں

تیرے گیسو کی سیاہی میں گزارا ہوگا
تیری معصوم نگاہوں کا سہارا ہوگا
غمِ ایام کی وحشت سے کنارا ہوگا

جلوۂ حسن سرِ بام ہمیں پر ہوگا
تیری چاہت کا ہر الزام ہمیں پر ہوگا
تیرے انعام کا اکرام ہمیں پر ہوگا

آج آئے ہیں تو ہم دادِ وفا لے لیں گے
ایک قامت کی تمنا کا صلہ لے لیں گے
جتنی تقدیر ہے پر اُس سے سوا لے لیں گے

لب تشنہ لمس نہ ہوئے جس سے وہی شوق کی بات
زندگی جس سے عبارت ہے وہ غم کی سوغات
کتنے چاندی سے حسین خوابوں کی مکمل بارات

تیرے پہلو میں تلاطم بن کے اتر جائے گی
میرے معصوم پیا دیدہ اثر لائے گی
بیا ہنے تجھ کو ترے روپ نگر آئے گی

سوچتے تھے کہ ترے در کو بھلا دیں گے
اب اُٹھے ہیں تو کہیں دور نکل جائیں گے
اب چلے ہیں تو ترے پاس نہیں آئیں گے

تجھ سے روٹھے تو زمانے میں کہیں بھی نہ گئے
تجھ سے بچھڑے تو رہے دل میں تری یاد لیے
تجھ سے چھوٹے تو ترے اور قریب آ بیٹھے

آج کے دن کو تری یاد سے نسبت سی ہے
آج تجدیدِ وفا کا دن ہے

صت

ساعر ندیم

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
دل سے شانہ مرے انگشتِ حنائی کا خیال
میں کہیں دور کہیں دُور چلا جاؤں گا
کتنا اندوہ فزا ہے یہ جدائی کا خیال

مجھ سے منہ موڑ کے ایک ایک چلے جاتے ہیں
یہ مہکتے ہوئے دن اور یہ تاروں بھری رات
چند یادوں کے دیے چند خیالوں کے نجوم
یہی واماندہ مسافر کو ملے گی سوغات

"چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط"
ان میں کھو جائے گا اک شاعرِ سادہ کا ثبات

نئے مہرے نئے شاطر نئی چالیں لے کر
غمِ ایام بچھائے گا فریبوں کی بساط
سب حسیں نقش بکھر جائیں گے پتوں کی طرح
ذہن و افکار سے مٹ جائے گی تصویرِ نشاط

اک نگہ اور سہی اور سہی اور سہی !

یہ مہکتی ہوئی زلفیں یہ غزالیں آنکھیں
کون آئے گا پلٹ کر یہ خیال آتا ہے
کہیں حسرت کوئی رہ جائے نہ باقی دل میں
"جب کرم رخصتِ گستاخیٔ بیباکی ہے
اک نظر اور ابھی اور ابھی اور ابھی !

جب چراغوں کی لویں سوتی ہیں

شاعر ندیم

جب چراغوں کی لویں چپ ہو جائیں — روشنی سوتی ہے دھرتی میں کہیں
جب ستاروں کے دیئے بجھتے ہیں — رقص کرتی نہیں چاندی کی زمیں
چاند جب روٹھ کے چھپ جاتا ہے — رنگ اور روپ کا انبار کہاں
ساز کے تار بکھر جاتے ہیں جب — خاک ہو جاتے ہیں مایوس ارماں
آشنا ہو چکے جب نغموں سے — اپنے لب پر کوئی جھنکار نہیں
بھول جاتے ہیں محبت کے رسوم — جیسے اب کچھ بھی سروکار نہیں

جب چراغوں کی لویں سوتی ہیں
درد کی راتیں بہت روتی ہیں

اب نہیں جاگیں گے بیتے ایام — اب نہ چھیڑے گا کوئی سنگیت
اب چراغاں نہیں ہوگا ہرگز — اب نہ تڑپیں گے فضا میں نئے گیت
دل کی آواز کا خاموش طلسم — اب بہاروں کو نہیں لاسکے گا
کسی تقدیر کا رخشاں انداز — چاند تاروں کو نہیں لاسکے گا
دل کی دھڑکن میں نہ ہوگی کوئی ترنگ — اب نہ مہکیں گی سہانی راتیں
اب تو بس دن خیالات کے ساتھ — حسن و آلام کی ہوں گی باتیں

اب نہیں جاگیں گے بیتے اوقات
اب نہیں نکلے گی ارماں کی برات

پہرے

شاعر ندیم

احساس عزم و شدتِ جذبات پہ پہرے
خود ہم نے لگا رکھے تھے ہر اک بات پہ پہرے

پہلے ہی سے محتاط تھا جو رندِ خرابات
بڑھتے گئے اس رندِ خرابات پہ پہرے

جو بات ابھی وہم و گماں میں بھی نہیں تھی
کیا خوب لگاتے ہو اسی بات پہ پہرے

اچھی یہ عنایت ہے کہ لپٹی بھی تک ہے
گر ہے یہ عنایت تو عنایات پہ پہرے

ہم ہیں سو اٹھائیں گے یہ اک بارِ ندامت
وہ رند رکے ہم سے خوش اوقات پہ پہرے

خاموش خیالات پہ بس کس کا چلا ہے
کس طرح بٹھاؤ گے خیالات پہ پہرے

وہ تیری ہی یادوں کے لیے وقف رہیں گے
ہم نے بھی لگا رکھے ہیں کچھ اوقات پہ پہرے

اب کس کی شکایت کریں اے دوست کہ ہم کو
منظور ہوں جب خود ہی مری ذات پہ پہرے

۱

قتیل شفائی

○

پیار کی راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں
صرف آنسو جہاں انسان کے کام آتے ہیں

اُن کی آنکھوں سے رکھے کیا کوئی امیدِ کرم
پیاس مٹ جائے تو گردش میں وہ جام آتے ہیں

زندگی بن کے وہ چلتے ہیں مری سانس کے ساتھ
اُن کو ایسے کئی اندازِ خرام آتے ہیں

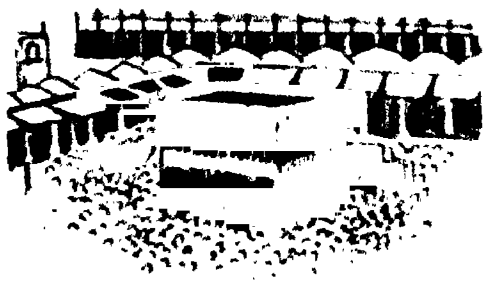
ہم نہ چاہیں تو کبھی شام کے سائے نہ ڈھلیں
ہم تڑپتے ہیں تو صبحوں کے سلام آتے ہیں

قوتِ دستِ طلب کا نہیں جن کو ادراک
تیرے در سے وہی بے نیلِ مرام آتے ہیں

منہ چھپا لیتے ہیں ہم حضرتِ ناصح کی طرح
جب بھی میخانے میں رندانِ کرام آتے ہیں

ہم پہ ہو جائیں نہ کچھ اور بھی راتیں بھاری
یاد اکثر وہ ہمیں اب سرِ شام آتے ہیں

چھن گئے ہم سے جو حالات کی راہوں میں قتیل
اُن حسینوں کے ہیں اب بھی پیام آتے ہیں



حج
کی تیاری
مسلم کمرشل بینک
سے شروع کیجئے

مسلم کمرشل بینک کی مغربی یا مشرقی پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رابطہ قائم کریں۔ ہمارے بینک کے مستعد اور تجربہ کار افسران آپ کو حج کے درخواست کے فارم مفت مہیا کریں گے۔ یہ افسران آپ کو درخواستوں کی خانہ پری میں بھی مدد دیں گے۔ ہماری یہ تمام خدمات عازمین حج کے لئے بلا معاوضہ ہیں۔ مسلم کمرشل بینک کی تمام شاخیں غیر ملکی زرمبادلہ اور کرایہ سفر حج وغیرہ وصول کرتی ہیں جن کی رسید بھی دی جاتی ہے۔

عازمین حج بینک کی ان بلا معاوضہ خدمات سے شام کے اوقات میں بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

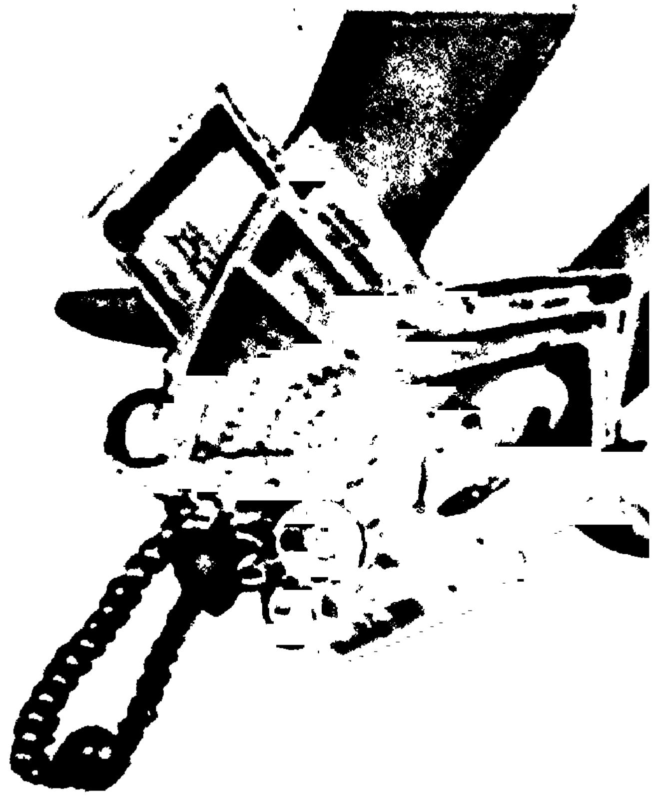
حج کے سلسلے میں تمام خدمات مفت مہیا کی جاتی ہیں

MCB

ہیڈ آفس
کراچی

ایس۔ مصطفیٰ اسمٰعیل
جنرل منیجر

وطن پر سب کچھ نثار



دفاعی بانڈ ۱۹۷۰ء

میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگایئے۔

۵٪ فیصد شرح منافع

یہ بانڈ ۱۰ نومبر [illegible]
[illegible]
سو روپیہ کی قیمت کے بانڈ کی قیمت
ادا [illegible] تک
سو روپیہ ہوگی اور اس کے بعد [illegible]
[illegible] ایک سو روپیہ [illegible]
[illegible] ہوگی۔

بانڈوں پر ۵ فیصد سالانہ منافع دیا جائے گا جس کی تقسیم ششماہی ۱۰ مئی اور ۱۰ نومبر کو کی جائے گی۔ جو لوگ اپنے بانڈوں پر منافع لینے کے خواہاں نہ ہوں وہ درخواست کے اوپر دائیں کونے میں نمایاں طور پر "بلا منافع" لکھ دیں اور اس کے نیچے دستخط کر دیں۔ بانڈوں کے لئے درخواستیں ایک صد روپیہ یا اس کے حاصل ضرب میں ہونی چاہئیں۔ بانڈ اسٹاک سرٹیفکیٹ یا پرامیسری نوٹ کی صورتوں میں جاری ہوں گے۔

رقومات کی واپسی ۵ نومبر ۱۹۷۰ کو عمل میں آئے گی۔

درخواستوں کے ہمراہ مطلوبہ رقومات نقد یا چیک کی صورت میں مندرجہ ذیل مقامات پر ادا ہونی چاہئیں

اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے دفاتر واقع کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی، ملتان، ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا اور بوگرا۔

ان مقامات پر جہاں سٹیٹ بینک آف پاکستان کے دفاتر نہیں ہیں درخواستیں نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخوں میں وصول کی جائیں گی۔

جہاں سٹیٹ بینک اور نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخیں نہیں ہیں وہاں سرکاری خزانوں میں درخواستیں وصول کی جائیں گی۔

جاری کردہ: وزارت مالیات، حکومت پاکستان


جوشاندی
نزلہ زکام کھانسی کی زود اثر دوا
جس میں جوشاندے کے تمام اجزا موجود ہیں
جوشاندہ سالہا سال سے نزلہ زکام کے
مریضوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔
نہ جوش دینے کی قباحت نہ چھاننے کی ضرورت
صرف ایک پیالی تیز گرم پانی میں
حل کر کے استعمال کریں
ہر جگہ ملتی ہے
ہر موسم میں استعمال ہوتی ہے
اجمل
دواخانہ حکیم اجمل خان لاہور



استعفا

ڈاکٹر محمد باقر

حضور! آپ باور نہیں فرمائیں گے لیکن میں واقعی اپنی ملازمت سے استعفا دے رہا ہوں۔ اور باور نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں
یہ تحریر میرے ہاتھوں سے لکھی ہوئی آپ کے سامنے ہے۔ البتہ آپ کو تعجب ضرور ہوگا کہ اس بیروزگاری کے زمانہ میں میں نے
یہ حرکت کیوں کی۔ حضور والا! حالات ہیں جبکہ میرا کوئی اور ذریعۂ معاش بھی نہیں۔ میرے پاس آپ کی طرح زمین بھی نہیں۔ نہ کوئی کارخانہ
ہے۔ میں نے آپ کی طرح ایک درجن ٹیکسیاں بھی نہیں بنائیں جن سے ہر شام کو پچاس روپے فی ٹیکسی وصول کروں۔ میرا اس کارخانے
میں حصہ بھی نہیں کہ وہ پرمٹ لائسنس میری ہی وساطت سے آپ نے اس شرط پر دیا تھا کہ کارخانہ دار دس فیصد حصے کا مالک آپ
کی بیگم صاحبہ کو قرار دے۔

لیکن سرکار! میں اب اس ملازمت کی زندگی سے اس قدر اکتا گیا ہوں اور تھک گیا ہوں کہ میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں
کہ قبر میں پہنچنے سے پہلے یک لخت فیصلہ کر لوں کم از کم پھر اس زندگی کو شروع کروں جس سے مجھے ذہنی آسودگی کے ساتھ حلال کی
ملے۔

مائی باپ! آپ میری اس جسارت کو دیکھ کر تیوری چڑھا رہے ہیں۔ میں اپنی چشم تصور میں پہلی اس پیشانی کو دیکھ رہا ہوں جس پر
بل پڑ رہے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بل بلا وجہ بھی پڑتے تھے۔ اور میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جب کاغذ آپ کے سامنے میز پر رکھتا
اور آپ عالم غیظ و غضب میں ہوتے تو میں گردن نیچی کر کے اپنے آپ کو اس قدر سکیڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ آپ یہ محسوس کریں کہ آپ
کرسی پر بیٹھے ہوئے بھی مجھ سے تین فٹ اونچے ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ میرا قد آپ سے لمبا ہے۔ آپ جب تک گرجتے
رہتے میں سکڑتا جاتا۔ اور یہ ظاہر کرتا کہ آپ ایک ایسے شیر ہیں جس کے سامنے میری حقیقت بلی کی بھی نہیں بلکہ چوہیا کی سی تھی۔
اور محسوس کرتا کہ جب میرا کاغذ پیش ہونے سے پہلے آپ بگڑ پڑے ہوتے (حالانکہ مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ آپ کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے
کس آدمی نے برافروختہ کیا ہے) تو میں کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے یہ ظاہر کرتا جیسے آپ نے مجھے کوئی بہت بڑا تحفہ عطا
فرمایا ہے۔ اور میں بس سر جھکا کر کاغذ لیے شکر کرتے باہر نکل آتا۔

لیکن حضور آج میں آپ کی دسترس سے باہر ہوں۔ آپ میرا لکھا ہوا کاغذ دیکھ کر برافروختہ ہوں یا اس کاغذ سے پہلا کاغذ دیکھ
کر برافروختہ ہوں یا ان دونوں کاغذ دیکھ کر برافروختہ ہوں اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں کیونکہ میں تو اب حلال کی روٹی کمانے اور کھانے
کا فیصلہ کر چکا ہوں اور اسی لیے یہ استعفا داخل کر رہا ہوں۔

---

* [illegible] سے معذرت کے ساتھ۔

واقعہ! آپ جاننا چاہیں گے کہ آخر میں نے یہ فیصلہ اتنی دیر سے کیوں کیا ہے۔ پچیس سال [illegible]
اور پچیس سال [illegible] تقریباً [illegible] [illegible]
[illegible] صورت کے اعتبار سے [illegible] کی حالت کے باہر تھا [illegible]
[illegible] کیا تھا۔ آپ نے مجھے بہت [illegible] پاس کیا تھا [illegible]
کر کے خدمت لی تھی [illegible] سے پیشتر [illegible] ساتھ والی میز پر بٹھا دیا گیا تھا کیونکہ [illegible]
[illegible] آپ [illegible] شروع [illegible] کیا کرتا تھا اور جب ہم دونوں کے
[illegible] آپ کے [illegible] کے پاس جاتے تو وہ آپ کے [illegible] بہت تعریف کرتا اور آپ کے سامنے مجھے [illegible]
کر دیتا [illegible] ہے۔

حضور! آپ نے اپنے [illegible] خوبصورتی اور [illegible] سے ترمیم کی وہ [illegible] تھا [illegible]
میرے [illegible] تھا [illegible] آپ کو [illegible] نے تھا۔ [illegible] کرتے کرتے میرے [illegible] گئے تو مجھے
اپنے [illegible] ایک [illegible] کر کے پوچھنے لگے یہ کیا کیا ہے؟ اب میں کیا جواب دیتا۔ مجھے کیا معلوم کہ
میں نے کیا غلطی کی ہے! [illegible] آپ کو یقین ہو جاتا کہ آپ [illegible] میری نظروں [illegible] اپنے [illegible] کے
مطابق [illegible] "ویل [illegible]" کہہ کر آپ کی [illegible] کے نیچے سے [illegible] کر رہے ہیں [illegible]
[illegible] آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تو آپ کو یقین ہو جاتا کہ آپ نے [illegible]
[illegible] قبول کرتے ہوئے کہتے "اب ٹھیک ہے نا۔" پھر [illegible] کوشش کرتے [illegible] کام [illegible]
"یس سر" کہہ کر [illegible] آپ کے کمرے سے [illegible] آیا۔

[illegible] تقریباً [illegible] تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب آپ [illegible] اٹھایا گیا اور اس کی وجہ آپ کا
ہے کہ اس وقت پہلے آپ کے بالوں [illegible] تھے۔ پھر جب آپ کی شادی ہو گئی اور آپ [illegible] کلب میں اپنی بیگم کے ساتھ شامل
[illegible] ہونے سے پہلے [illegible] سے آپ کے [illegible] ہو گئے کہ کلب میں آپ کی بیگم
[illegible] نہیں بناتے تھے اور [illegible] کلب نہیں جاتی تھیں [illegible]
[illegible] آپ کی [illegible] ہو جاتے تھے۔ [illegible] سال [illegible] آپ اس جگہ پہنچ گئے جہاں کہ اب [illegible]
[illegible] میز پر پہنچنے کے لیے کئی سال لگے۔ یہاں تک کہ [illegible] میں آپ [illegible]
ساتھ والی میز [illegible] پہنچ گئے ہیں [illegible] کئی سال [illegible]
اور اس میں بھی میرے بال سفید ہو گئے [illegible] آپ ماشاءاللہ ابھی تک [illegible] آپ کے سب بال [illegible]
[illegible] ہیں۔ کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ [illegible] استعمال کرتے ہیں [illegible] آپ کی دوسری بیگم [illegible]
کرتی ہیں۔

حضور! مجھے آپ کی پہلی بیگم سے بہت ہمدردی ہے۔ وہ آپ کی اس زندگی میں بھی تھیں اور آپ کے مناصب کی شان بھی
لیکن جب آپ میرے کلرک شپ کے کمرے میں پہنچے اور آپ کو یہ سیکرٹری ملی جو بعد میں آپ کی بیگم بنی تو آپ نے اس آزاد بہن پر بڑا سنگین الزام
لگا اور اس سے آنکھیں پھیر لیں۔ حالانکہ وہ بدستور کلب جاتی تھی۔ برج کھیلتی تھی۔ بڑے بڑے مشروب بھی پیتی تھی۔ شیشہ بازکنہ لیشنڈ
سے میں بیٹھ کر آپ کو یہ احساس ہوا کہ محبت ناچ نہ جانے تو عداوت کے سبب شکن پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خوبی آپ کی
سیکرٹری میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ آپ نے ازدواجی محبت کو ضرورتاً ازدواج میں تبدیل کر لیا۔

خیر یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں اب حلال کی روٹی کماؤں گا اور کھاؤں گا۔
آپ شاید یہ جاننے کے لیے بیتاب ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کیونکہ آپ ہمیشہ مجھے یہ تلقین کیا کرتے ہیں کہ اس ملک میں ملازمت کر کے
حلال کی روٹی کمانا اور کھانا ناممکن ہے۔ میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کا موقف درست نہیں، آپ کی تائید کیا کرتا تھا اور یہیں سے میری
... کا آغاز ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہیں یقین تھا کہ آپ اس قسم کی غلط باتیں اکثر کرتے ہیں اور ایسے فیصلے صادر فرماتے ہیں جن سے
... کے مفاد کو ضرر پہنچتا ہے لیکن میں آپ کے احکام کی تعمیل اس لیے کرتا تھا کہ اگر نوکری نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دن آپ نے فائل پڑھا تھا کہ گزشتہ سال سے ... ہزار گز کپڑا ... دیا جائے
... کیونکہ اس نے بیکار جگہ گھیر رکھی ہے تو میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ یہ کپڑا نہ اس قدر گل گیا ہے کہ اسے دریا برد کر
دیا جائے اور نہ کسی ... کپڑے کی اس قدر ... ہے کہ ہم ... گز کپڑا یونہی پھینک دیں۔ ——————

میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ بہتر ہے اس کپڑے کو یتیم خانوں میں بھجوا دیں۔ لیکن آپ تو اپنی مصلحت اندیشی میں تھے۔ آپ نے فوراً مجھے
... دیا کہ جب کپڑا پھینکا جانے لگے تو اس وقت اپنے بچوں کے لیے کپڑا تم بھی لے لینا اور پھر میں بھی خاموش ہو گیا۔ یہاں سے
میری ... آپ کی مصلحت کوشی کے نقش پا پر چلنے کا آغاز کرتی تھی یہاں تک کہ وہ بے ضمیری کی اس انتہا گہرائیوں میں اتر جاتی تھی جہاں
سے ... اس کے بس کی بات نہ ہوتی۔

لیکن سوال کیا کیا جائے۔ آپ تو قصے میں مجبور تھا۔ اور آپ بھی کسی سے متاثر تھے۔ آپ کو بھی تو ترقی و رتبے کے لیے مصلحت بینی
اور ... مکمل کرنا پڑتا ہے جس میں آپ کی حیثیت صرف ایک حقیر پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اگر آپ یہ پرزہ ہی کرنا چاہیں تو سرکار
... کا ... کے ... وہ دن تو آپ کو یاد ہوگا جب ایک آدمی محکمے کے سربراہ سے ایک ... خود آپ کے نام دیا تھا کہ اس کی مشق
... ہوئی تھی۔ آپ نے جب مجھے تفتیش کرنے پر مامور کیا تو چپراسی کو آپ کے سامنے ہی ... کر سکنے کا۔ ابھی میں اس آدمی کو اب
... پیدا نہیں ہونے دوں گا جب تک یہ میرا حصہ مجھے نہیں دے گا۔ مجھے تو اپنے حصے سے آپ کے محکمے کے سربراہ کی
... ہر روز شیرینی پہنچانا ہوتی ہے۔ سربراہ کو کیا معلوم ... میں لوگوں کو ... دفتر میں ... دن تو شام کو ساہو ... بیگم صاحب کا
... دیں اور پھر آپ چپ ہو گئے تھے اور آپ نے شکایت کرنے والے سے ہی نہایت خوش خلقی سے کہہ دیا تھا کہ یہ
... دیتے ہیں ... کے ... میں ... دیا کرو تو ... میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

حضور آپ ... یاد دہانی سے یہ خیال نہ کریں کہ میں آپ کی مجبوریوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میری ... ۔ ...

[illegible] آپ کے تعلقات [illegible] کرنے کے ساتھ ہوا تھا اور جو کچھ بھی ہوا وہ وقت کے لیے کچھ [illegible]
تھے اس لیے میں [illegible] تمام [illegible] انجام دینے کے بعد اس امر پر [illegible] تھا کہ [illegible] پاس [illegible] کے ساتھ [illegible] کام
کرتے تھے [illegible] کے بعد [illegible] سال تک [illegible] کرنے کی جگہ کبھی [illegible]۔

[illegible] اس لیے تو میں نے اپنی [illegible] میں سے کسی کو بھی [illegible] سے آگے نہیں [illegible] جو میرا لڑکا اب [illegible] ہے
[illegible] ہے جس نے [illegible] شادی ایک [illegible] کی لڑکی سے کی تھی [illegible] نے جہیز میں [illegible] کو ایک [illegible]
[illegible] میں میرا لڑکا اب [illegible] کرتا ہے [illegible] بڑی [illegible] ہے۔ [illegible] سے [illegible] سرمایہ داروں کی [illegible]
[illegible] نہایت [illegible] ماحول [illegible] حاصل کرتا ہے۔ اس دولت کا انتظام [illegible] بیٹے [illegible]
[illegible] کے بعد [illegible] میرے بیٹے [illegible] سے [illegible] پڑھتا ہے۔ [illegible]
باقی ہیں۔ اس پارسل میں میری [illegible] ہے تو وہ خود [illegible] آپ کو بتا سکتی ہے معلوم نہیں اس نے کبھی آپ کو [illegible]
بتایا نہیں

[illegible] جو میرا لڑکا اپنے آپ کو [illegible] کیا [illegible] کتاب ہے [illegible]
[illegible] کسی کا بیٹا [illegible] نہیں۔ میں نے تقسیم ملک سے پہلے [illegible] میں [illegible] تھی [illegible] تھا کہ [illegible]
[illegible] کے قریب نہ جا سکا۔ [illegible] اس نے اس وقت کے ہندوستان کی ایک [illegible]
[illegible] کے [illegible] میں [illegible]۔ دوسرے لوگ [illegible] ہیں اور [illegible] میرے بیٹے نے [illegible]
[illegible] نہیں دیکھی۔ اس نے اپنے [illegible] میں سے ایک [illegible] میں [illegible] اور کامیاب ہو گیا۔ تقسیم سے پہلے [illegible]
میں لڑکی [illegible] کی قسمت [illegible]۔ اس نے ایک سرمایہ دار کو [illegible] سے [illegible] اپنے نفع [illegible] میں سے [illegible]
[illegible] دیا [illegible] نفع [illegible]۔ آپ [illegible] اس کے پاس کیا ہوتا تھا۔ [illegible]
[illegible] نے لوگوں کو خوش کرنے کا [illegible] دیا۔ وہ جب کبھی [illegible] سے [illegible] تو اپنے [illegible] کے ساتھ [illegible]
[illegible] جب سرمایہ دار کے [illegible] سے باہر نکلتا تو ہر مرتبہ [illegible] بھول آتا۔ [illegible] سکتے ہیں [illegible]
کیس میں کیا ہوتا تھا [illegible] صرف ایک بات معلوم ہے کہ [illegible] سیکڑوں کو خرید کر دیے

میرا سب سے [illegible] لڑکا ابھی اس میدان میں [illegible] پاؤں چلنے لگا ہے۔ وہ بڑی دلچسپ [illegible] کتاب ہے۔ میرا [illegible]
[illegible] ایک تعلیمی [illegible] ہے۔ [illegible] اس [illegible] کے [illegible] خیال [illegible]
[illegible] وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتا۔ [illegible] نے [illegible] کتاب کے [illegible]
اپنے لڑکے کے [illegible] سے [illegible]۔ آپ [illegible] ہوں۔ [illegible]
[illegible] اور [illegible] حسین [illegible]
کمال [illegible] سے [illegible] ہے

یہ سب کچھ پچیس سال کا واقعہ ہے دوست کرتے گزر گیا ہے۔ میں نے سیکڑوں خط شفقت اور پیار سے لکھے ہیں۔ مجھے ایک خط
نے یاد کی محبت کر کے وقت نے کبھی نہیں دیا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بڑا کمال کیا جو پروف پڑھ کر کئی صفحے پار آ سکے
ہے۔ آخر میں ایم۔ اے پاس تھا۔ فرسٹ کلاس۔ بہر حال عرض میں یہ کر رہا تھا کہ میں نے پروف پڑھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ کتاب
ہے۔ بک تو گئی پر وہ کا ماجرا تھا۔ جس لڑکے نے کتاب چھاپ کر نہایت اطمینان سے ایک الماری میں بند کر دی۔ وہ کچھ دیر
ز بہ ہو ا۔ اس نے تمہیں سربراہ ادارے کے نہ وقتا کبھی مجھ سے ذکر کیا۔ میں اپنی آنکھوں کے موٹے موٹے شیشوں والے
سے صرف گھور گھور کر اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک دن اس نے مجھے آ کر بتایا "ساری کتاب بک گئی۔"

الماری میں پڑی ہوئی کتاب ایک پندرہ دن میں کیسے ساری کی بک گئی؟ لڑکے نے بتایا ابا! تجارت بھی ایک ڈھنگ ہے۔ آپ
دوست بڑے پکے نمازی ہیں۔ وہ ایک پائی کی رشوت نہیں لیتے۔ اسی لیے سفارش بھی نہیں مانتے۔ شہر میں سیلاب آیا ہوا تھا
میں سبزی، پھل، انڈوں کا قحط پڑ گیا۔ ا برسے چیزیں آنی جانی بند ہو گئیں۔ میں انڈوں کا ایک ٹوکرا لے کر آپ کے دوست کی خدمت
میں لے کر حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ یہ انڈے بیچنے آیا ہوں۔ بہت مزا۔ میں پاؤں پھیر کر یہ انڈے سے کر لوگ تک پہنچے ہیں۔ چونکہ سیلاب
سے عبور کر کے آرہے ہیں اس لیے صرف دو پیسے ایک انڈے کی قیمت مانگتے ہیں۔ (یہ کئی سال کی بات ہے بازار میں اس وقت دو
نے کا بھی انڈا نہیں مل رہا تھا) گویا پیسے دس درجن ہیں۔ میں نے سوچا آپ والد صاحب کے دوست ہیں۔ اس لیے آپ تک پہنچا دوں
صرف نے جانتے سے کو انڈوں کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تیس روپے بارہ آنے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں نے کہا جناب مناسب عزیب
ہیں۔ میں ٹوکرا واپس کر دیں۔ انھوں نے کہا۔ ابھی آپ کو واپس ملتا ہے۔ وہ اندر گئے۔ میں باہر نکل آیا۔ جو آدمی بیگم صاحب کی طرف
سے ٹوکرا دینے آیا۔ اس نے کہا۔ بیگم صاحب فرماتی ہیں۔ ایک دو ہفتوں کے بعد زمینوں سے انڈے منگوا دیں۔ میں "اچھا جناب"
کہہ کر چلا آیا اور ٹوکرا میں نے سڑک پہ جا کر ایک طرف پھینک دیا۔ میری کتاب بک چکی تھی۔

مختصر میں آپ کا زیادہ درد سر نہیں دینا چاہتا۔ آپ صرف یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے حلال کی کمائی پیدا کر نے
اپنا مستقبل تیار کرنے کا منصوبہ کیسے بنایا جس نے مجھے یہ استعفیٰ پیش کرنے کی ہمت دلائی۔ میں تفصیل سے آپ کو پریشان نہیں
کروں گا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ میرا پیسہ اس جہات صاحب کا مرید بن گیا تھا۔ اور یہ انھی کی نظر کرم کا اثر ہے کہ میں اپنی ملازمت سے
مستعفی ہو رہا ہوں۔ میں پہلے سے جانتا ہوں کہ آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے صرف دفتر میں
سوچا کرتا تھا کہ آپ میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں بلکہ گھر آ کر بھی صرف یہی سوچا کرتا تھا کہ آپ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ اور بعض
اوقات میں سوچتے سوچتے کچھ ایسی حرکتیں کرنے لگتا تھا کہ دیکھ کر لوگوں کو شبہ ہوتا کہ میں قتل کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں اس قسم کا آدمی
ہوں کہ چیونٹی کو بھی ... آپ نے میری کیفیت دہشت اور خباثت کو گرفت میں پچیس سال میں اس سانچے میں ڈھال دیا؟
... سب سے صرف ... اور قتل کا ملک ... کر لیا ہے۔ لیکن یہ قوت تنقید بھی عجیب چیز ہے۔ مجھ ایسی چیونٹی کو ... بیچا
... ہوئے چہرے پر کبھی کبھار ایسی شگفتگی پیدا کر دیتی کہ میں قتل کرتے کرتے رک جاتا۔ لیکن حقیقت کی زندگی اس سے بالکل مختلف
... جب مجھے ایک دوست نے کبھی کبھار وحشت کرتے دیکھا تو اس نے مشورہ دیا کہ تمہیں اپنے کرب و اضطراب سے

ملنے کیلئے پیر سائیں حیات کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اکثر لوگ ان سے کشف و کرامات منسوب کرتے ہیں

رہا ہوں۔

آپ جانتے ہیں میں پیروں کا قائل نہ تھا۔ میں صوفیا اور فقیروں کی عزت کرتا ہوں مگر آپ جیسے سربراہ ... سے پناہ پا رہا تھا۔ میری زندگی کے تلخ اوقات میں بیوی بچوں کا سہارا ... کی وقت ... میں نے ... کی بدولت نہ جانے کتنے برس گزار دیئے ہیں۔ میری ملازمت، میری محبت، میری ... صرف انہی سہاروں سے ... تین انسانوں کا ... ہے۔ اسے کوئی انسان ... تھا اور دوست کو ترک ہی کر دیتا ہے ... دیکھو پیر ... ہیں۔ تم ڈاکٹر میرے دوست ... نے مجھے یہ بتایا تھا۔ وہ ... میرے پاس آ رہا اور آخر مجھے پیر سائیں حیات کے پاس لے گیا۔

جس وقت میں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا وہ ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چند معصوم سی شکلیں چہرے ... تھے۔ کسی نے ... حرکت تھی۔ ... ایک معصوم چہرہ پیر صاحب کو ایک گلاس پیش کیا۔ میرے دوست ... کی طرف دیکھتے رہنا۔ یہ ابھی دودھ کا گلاس پئے گا۔ کسی میں کچھ تاریکی سی تھی۔ معلوم نہیں ... دودھ ملایا تھا یا نہیں۔ میں دیکھتا رہا اور پھر پیر صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میرے بدن میں کپکپی طاری ہو گئی۔ ان کی سرخ سرخ آنکھیں میرے جسم کو ... رہی تھیں۔ دفعتاً انہوں نے ... کر کہا "تم گناہ ..." میرے منہ سے نکلا "جی حضور" اور میں نے ... کے کر آج تک کسی آپ سے بھی نہیں کہے۔ پیر صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور وہاں بیٹھے ہوئے سب مریدوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پیر صاحب نے حکم دیا "دودھ سے دو بار ... کو بھی دودھ دے دو!" اور میں ... بیٹھ گیا۔

آپ نے بھی پیر سائیں حیات کا نام سن رکھا ہوگا۔ یہ تیس چالیس سال قبل ... ایم۔اے، ایل ایل بی کرکے آئے تھے۔ ایک انگریز بیوی اور ایک دو بچے ... بھی ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے امرتسر میں آکر اپنے وکیل باپ کی جگہ پریکٹس شروع کی۔ لیکن بیشتر وقت اپنی بیوی کے ساتھ اور ... سیر و تفریح میں گزارتے تھے۔ اس لیے باپ کی جگہ نہ لے سکے ... بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ کی زندگی میں وقت اچھا کٹ گیا۔ وکالت سے طبعاً متنفر تھے۔ ... ہونا پڑتا ہے اور پھر بھی ... نہیں تھا۔ والد کی وفات کے بعد یہ نفرت اور زیادہ ہو گئی اور جب انہوں نے ظاہری زیب و ... ترک کر کے ... اختیار کیا تو بیوی بچے چھوڑ کر واپس ولایت چلی گئی۔ اس وقت سے انہوں نے عورت کی شکل دیکھی۔ یہاں تک کہ جب معصوم چہرے ... ہوتے ہیں یہ اپنے منہ پر ... ڈالے رہتے ہیں۔ ہر ... کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اطلاع دینا پڑتی ہے تاکہ وہ منہ پر نقاب ڈال لیں یا روشنی گل کر دیں۔ آپ نے پیر ... ترک کرنے کے ... زہد و اتقا کی منازل کہاں کہاں طے کیں ... سے ... کر ہر طرف سے لوگ آکر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ... قسم کے سربراہوں سے ... بھی اس ... مشرف ہوئے۔

ہر شخص [illegible] یہ کہہ انسانوں میں [illegible] کر لیا تھا کہ خاموش [illegible] نے یہ کہہ کر مسکرا دیا۔ ان سے ملو یہ ضمیر جان ہیں۔
[illegible] کے دو ہی ہیں۔ میں آگے بڑھ کر چپ ہو گیا۔ میرے سامنے بالکل میرے جیسا انسان کھڑا تھا۔ وہی قد و قامت، وہی جُثّہ، وہی
[illegible] یہاں تک کہ جب بولا تو مجھے اپنی آواز سنائی دی۔ وہ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا۔ خاموش نے
[illegible] ضمیر جان کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں سیر کرائیں گے۔ ضمیر جان آگے آگے ہو لیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم ایک لق و دق
[illegible] راستے سے گزر کر ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ اس جھیل کا پانی گہرے سیاہ رنگ کا تھا اور اس میں سے ہیبت ناک شوں شوں کی
آوازیں آ رہی تھیں۔ ضمیر جان میری طرف دیکھ کر ایک دفعہ پھر مسکرایا اور بولا۔ "یہ ندی لے کی ہے۔ ذرا رُکو۔ میں تمہیں اس
کے پار لے چلوں گا۔" اور پھر جیسے اس نے مجھے ایک ہاتھ پر اٹھایا اور نہایت اطمینان سے جھیل کے پانی میں سے گزرتا ہوا دوسرے
کنارے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مجھے پھر خشکی پر رکھ دیا۔ لیکن یہ عجیب قسم کی دہشت ناک خشکی تھی۔ اس کا رنگ جلے ہوئے گوشت
[illegible] اور مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ اس خشکی زمین پر بہت سے سانپ رینگ رہے ہیں۔ میں سہم کر ضمیر جان سے چپٹ گیا۔ ضمیر
جان نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہارا انتظام کرتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر اس نے [illegible] سے زمین میں شگاف کیا
[illegible] میں [illegible] مجھے شگاف میں سے اوپر سب کچھ نظر آتا تھا لیکن میں دیکھتے ہوئے
[illegible] سے باہر ہو گیا۔ وہ سب بھی اٹکھیلیاں کر رہے تھے بلکہ ان کے ساتھ بڑے بڑے اژدہے بھی شامل ہو گئے تھے اور پھر میں نے دیکھا
کہ ان کی عجیب الخلقت [illegible] پیدا ہونے شروع ہو گئے ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ہزاروں نہیں کروڑوں تک پہنچ گئی۔ یہ سب عجیب
[illegible] تھے۔ ایک تماشہ پر کھڑے ہو کر ناچتے اور جب ایک دوسرے سے ٹکراتے تو شہابِ ثاقب کی طرح آگ کی چنگاریاں [illegible]
[illegible] اور پھر یکایک گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی اور ساری فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔ بوڑھوں نے اپنا [illegible] بند کر دیا اور ان کا سانس [illegible] کا
[illegible] گیا۔ دفعتاً ایک کانپتی ہوئی آواز بلند ہوئی زمین کے [illegible] چیخیں نکلتی ہوئی بلند ہوئیں:

"کیوں تم نے انسان کو راہِ [illegible] دکھانے کے بجائے [illegible] انجام دیے ہیں؟"

اور پھر جیسے ہوا بھی چلنے سے رک گئی تھی۔ کہیں سرسراہٹ کا بھی نشان نہ تھا۔ ایک دفعہ پھر وہی آواز گونجی۔

"ابلیس کے بچو! مرتے کیوں نہیں؟ میں تم سے مخاطب ہوں۔"

ایک بوڑھا [illegible] آگے بڑھا اور بولا۔ "حضور میں نے ابنِ آدم کو جوا کھیلنا سکھایا۔ یہ دیکھیے یہ میرا تازہ ترین شاگرد ہے
جس نے [illegible] سب سے بڑے قمار خانے [illegible] میں اپنی پشتینی جائیداد ہار کر خودکشی کر لی تھی۔" بوڑھے نے ایک داغ
[illegible] آدمی کا سر اوپر کھینچا جس کی پیشانی سے گولی گزر گئی [illegible] بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ ایک
[illegible] ہیبت کے [illegible] اس طرح گونجی کہ مقتول کا سر بوڑھے کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر [illegible] میں جا گرا۔ بوڑھا [illegible]

[illegible] آواز گونجی

"تم جیسے [illegible] ہو کتنے [illegible] تک [illegible] پہنچ کر خودکشی کر سکتے ہیں اور کتنے آدمیوں کے پاس اتنا فالتو روپیہ ہوتا
ہے [illegible] بہت سے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ طریقہ کافی نہیں۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" [illegible]

جس سے ایک تیز دھار کی سیاہ تلوار بننے کو کاشتی چلی گئی اور اس کے اختتام جلی ہوئی زمین پر بکھر کر لتھڑ گئے۔

مہیب آواز پھر گونجی: "ہے کوئی میرا شاگرد جس نے نظام ابنِ آدم کو درہم برہم کرنے کا کوئی طریقہ ایجاد کیا؟"

ایک اور بُڈھا بزرگ اٹھتا ہوا: "حضور میں نے انسان کو شراب کی لت لگائی اور اس نشے نے پہلے سے سب سے کروڑ سے سب تک انسان پرست ہو کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس سیاہ کاری کی ترویج سے انسانی معاشرہ اپاہج ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان ملکوں میں جہاں اس کی ممانعت ہے وہاں ایک منظم گروہ ایجاد کیا ذہنی وصل کرنے کے بجائے سے دوسرے انسانوں کو شراب کے تحت مستقل کے لیے نشہ دیتا ہے۔"

مہیب آواز پھر بلند ہوئی: "تم بکتے ہو۔ تم سے زیادہ شاگردوں نے مجھے ابنِ آدم کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ شراب سے یقیناً انسان ابھی بہت سے گناہوں میں اس کے چھوٹے بڑے اس میں مشغول ہوتا ہے۔ کلبوں کی بات چھوڑو۔ وہ ہر ملک میں عام ہیں جہاں پینے والوں کی کثرت دھوم دھڑکے سے پیتی ہے اور منہ چھپا کر پیتی ہے۔ اس سے دولت مند انسان بھی گو کہ ذلیل ہوتے ہیں مگر وہ کہاں جیتے ہیں۔ وہ دق اور سل میں گرفتار ہو کر بہت جلد اپنے معاشرے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر اس سے انسانی معاشرہ کیسے جاری و ساری ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسی بات اور ایسا کمال بتاؤ جس سے تمہارے شاگرد انسان مستقل حد پر فساد اور ابتری میں مبتلا ہو جائیں۔"

سب بڑے حیران اور چپ تھے۔ میں نے دیکھا ضمیر جان مسکرایا۔ اتنا اب اس نے بھی ایک لمبے کا روپ دھار لیا وہ کھڑا ہوا اور بولا: "استاد! اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟"

"بولو!" فضا میں سیاہی بکھیرنے والی آواز سنائی دی۔

ضمیر جان نے کہا: "حضور میں نے پیرِ سالوس حیات کو تربیت دی ہے۔ جب وہ بیرسٹری اور علم و فضل کے ذرائع اپنی زندگی میں ناکام رہا تو میں نے اسے شکل راہ دکھائی اور اس پر یہ واضح کر دیا کہ وہ انسانوں کو اس امر کی تلقین کرے کہ دولت کی کمائی اصل حیات ہے اور مرافزی صرف ذہنی انسان کرتا ہے جسے ایسا عہدہ یا مرتبہ مل دیا جائے جس کے فرائضِ منصبی سے وہ بالکل اہلیت نہ رکھتا ہو۔ مثلاً حبیب کو پولیس کا افسر بنا دیا جائے یا استاد کو گدھے ہانکنے پر لگا دیا جائے تو انسانی معاشرے میں وہ ابتری پیدا ہوتی ہے کہ اسے دُور کرنے کا حل شیطان سے بڑے انسان کو بھی نہیں سوجھتا۔ خود پیرِ سالوس حیات مراتب کو قرار دیتا ہے اور اپنے مریدوں کو بھی یہی تلقین کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب لگے بندھے مزے میں ہیں لیکن انھوں نے مسائل میں وہ آگ لگا دی ہے کہ بجھائے نہ بجھے۔ یہ دیکھیے پیرِ سالوس حیات کا گندہ مسئلہ۔"

اور یہ کہہ کر ضمیر جان نے بجلے سو رانج سے نکال کر اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر تاریک سایے کے سامنے پیش کر دیا۔

پھر ایک مہیب قہقہہ سنائی دیا: "شاباش! شاباش!! میرے عزیز شاگرد تم نے نہایت صحیح راستہ دریافت کیا۔ انسانی معاشرہ میں ابتری پھیلانے کے لیے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں کہ عہدے اور منصب نا اہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں۔ شاباش" مہیب آواز نے ضمیر جان کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور ضمیر جان اس داد سے اس طرح اکڑا کہ گویا

جیسے جاتا کلا پھٹنے کو تھا۔

میں نے دیکھا کہ غلام خان میرے سرہانے کھڑا مجھے جگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے: "اٹھو تم تو دودھ پی کر یوں سوئے ہو جیسے قیامت تک نہیں جاگو گے۔ پیر سائیں حیات کی خدمت میں حاضر ہونا ہے تو شب بیداری کی عادت ڈالو کیونکہ فیض کا وقت ہوتا ہے جب وہ مخلوق سے کسب فیض کرتے ہیں۔"

حنف میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اب میں نہ آپ کے کام میں آؤں گا: نہ غلام خان یا پیر سائیں حیات کے قریب جاؤں گا۔ یہ میرا آخری ڈرافٹ ہے جو تصویب کے لیے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں میاں سے پہلے ذکر ہو رہی عشرہ میں بیمار رہوں گا۔ آپ کی دعا سے مالی روگ کے لیے پیسے مل جایا کریں گے۔ اس آخری عمر میں یہ امید کیا جا سکتا ہے

نیکا

جیلانی بانو

نیکا! تم اتنی اداس کیسے ہو گئیں ـــ؟

آہ مجھے بتانا نہیں چاہتا تھا ــــــــ پھر کسی میں [illegible] ہو گی۔

میری جوانی، بہار، کب کی گئی ـــــ بڑھاپا کیسے قریب آیا ـــــ؟

مجھے کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

ابر [illegible] ہے۔ میرے [illegible] رہنے والی لڑکی [illegible] ہے ـــــ نیکا نے [illegible] دیا تھا:

[illegible]

[illegible] ہوتا۔

ابر [illegible] رات ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دنیا [illegible] [illegible] اپنے [illegible] [illegible] ـــــ! [illegible] اپنے [illegible] [illegible] ـــــ سب [illegible] [illegible] ـــــ [illegible] ـــــ عورت کا [illegible] [illegible] [illegible] ـــــ کہیں ـــــ کہیں [illegible] ـــــ؟ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کر دیا۔

آہ مجھے بہت سی پچھلی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

[illegible] [illegible] [illegible]

نی بتا دیتی ہے کہ ان کی چپ ... اپنی زندگی کیسے گزرتی ہے۔ سندھ کی کہانیوں میں اور گیتوں میں یہی باتیں دہرائی جاتی ہیں ــــ لیکن
ے کر وہ محنت کا ان پر زیادہ ہے ــ بارش تو جیسا بختے وہ ہوتے ہیں یاد کرتی کہ انہوں نے بھیجا! سندھ کی ہر چیز سے زیادہ مجھ
ے پیار کیا ــــــــ گھر ہمارے سامنے میں ہی دکان کریں۔ غرض کہ رہتے ہیں کہ کہیں ان کی بیٹی ماں باپ کے گھر جوان نہ ہو۔ بچے
ے ہوتے وقت ہی ان کے ماں باپ کسی لڑکی سے نسبت دے دیا جاتا ہے۔ میرے ماں باپ نے بھی اسی وجہ جلدی کی چاہی تھی۔ جبھی تو تیرہ برس کی ہو
یرے ساتھ کی کوئی بچی کنواری نہ تھی ــــ میں پاپا کو یاد کرنے لگتی ہوں۔ جب سے گاؤں چھوڑا ہے ان کے ساتھ شہر آئی ہوں یہ
رسات میں پاپا بہت یاد آتا ہے۔ شہر والوں کے لیے تو برسات ایک عذاب ہے۔ بارش کی قدر تو ان گاؤں والوں سے پوچھو جن کی

امیدوں کا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔

میرے پاپا کا گھر کتنا بڑا تھا۔ پورے گاؤں میں اس سے اونچا گھر اور کوئی نہ تھا۔ لیکن جب میرے چاچا گاؤں میں ایک کچی
ا جا کر ہوئے تو انہوں نے ہمارے گھر کے سامنے ایک بہت اونچا مکان بنوایا۔ اتنا بڑا کہ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ ہمارے
چاچا بڑے پیسے والے تھے۔ ان کے پاس بہت سے ادھار کے ہاتھ تھے۔ کھیت تھے۔ بیل تھے۔ اس لیے گاؤں کے بڑے جھگڑے بھی ان
ے کچھ کر کے اسے ... سے چار بچوں والی بیوی کو گھر میں چھوڑ کر وہاں جا بسے۔
میں بی دکتی ... ہوں گی۔ بس ایسی تھی کہ کبھی کے نام پر سارے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی تھی اور اپنے دُولہا کے
ذکر پر جانے کیوں سارے بدن کا خون کھنچ کر میرے چہرے پر آ جاتا تھا۔
بیٹی کو خاندانوں میں کوئی بھی سیانی بیٹی کو گھر میں نہیں بٹھاتا۔ مگر میرے ابا (اب بھی کیا کرتے) اس سے پہلے وہ میں ہیں ہزار سے
زرد بیٹیوں کے دُولہوں کا سوال کر چکے تھے۔ میرے لیے ایک اچھا سا دُولہا ڈھونڈنے کو پیسہ جمع ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں میری ماں اور
باپ دونوں روز دیول میں جا کر دعائیں مانگتے کہ فصلیں اچھی ہوں۔ بیڑی کے پتوں کی تجارت میں خوب نفع ہو تا کہ میرا بیاہ ہو سکے
ــــ میں ان سے شکر میں کتاب لے کر بیٹھی رہتی تھی۔ مگر میرا من بھاگ ان سے لے جاتا ــــــ جانے کیوں مجھے اپنے
بیاہ کا شادمان تھا۔ بڑی جلدی تھی۔ شاید میں اتنی جلدی نہ چاہتی اگر مجھے پڑھنے کے بہانے ماں بار بار کھڑکی پر نہ بیٹھا کرتی۔ میں جز دان
باتیں بکنے پر بھی یہ بات بکنے کی کوشش نہ کرتی کہ جب اُن آتے ہیں تو ماں یہ کیوں چاہتی ہے کہ میں اب ان کے کمرے میں نہ

آؤں!

اور کوئی کیا جانے کہ کھڑکی پر بیٹھے پڑھتے میں کیا دیکھتی تھی ــــــ؟
میرے چاچا کا مکان بالکل سامنے تھا۔ ہمارے کمرے کے سامنے والے کمرے میں وہ دونوں رہتے تھے۔ وہاں سے چاچا کا
ما جا کے چوتھے دیکھ کر میں دب کی طرح تپنے لگتی تھی۔ مجھے یوں لگتا کہ ذرا سا دھکا بھی لگا تو میں چٹان سے پھٹ جاؤں گی۔
پھر کتاب ایک دم سنبھال کر میں اپنے دُولہا کے انتظار میں کھو جاتی تھی۔ ماں کہا کرتی تھیں ابا کی طرح بننے سنورنے کے
ہزار نسخے میں سنبھالے تھے۔ میں نے تصویروں کے ملک تک ہیں جو سوچا سکے تھے جیسے ساڑیاں ماتا پہنتی تھی ــــ
یکتی تو بہت تھی۔ وہ بھر نہ ہوتی۔ ... میں نے اپنے گھر میں کسی عورت کو اتنا بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا میرا

بھینس کی سی شکل بن جاتی تھی تو سب ہنس پڑتی تھیں۔ رشتے کی عورتیں تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتی تھیں ——— میاں اللہ رکھا جب پہلی بار بیاہ کر لائے تھے تو میں گھر میں بیٹھی دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی تھی کہ یہ کیوں نہیں ہنستیں۔ ایک بار میں نے ان سے یہ بات پوچھی تو وہ بہت بگڑیں۔ میرے ایسے سوالوں پر وہ ہمیشہ غصے بھری نظروں سے مجھے دیکھتی تھیں۔ بعد کو کوئی بیاہتا عورت جب کام میرے سپرد کر کے جاتی تو اپنی قسمت اور خدا سے جھگڑ لیتیں۔

مجھے پہنچ کر پاس دیکھ کر میں چپکے چپکے منظر یاد کرنے لگتی تھی جب بیشم چاچا اپنے ہاتھ سے رادھا کو گھر کے سب سے ایک بار انھوں نے رادھا کے جلنے میں بیٹھ جاتی تھی ——— پھر میں جلدی کو منڈلی پر کھینچ لاتی تھی تب کے سنتا چاچی کی بات یاد آ جاتی ——— جوانی میں عیش کر لیں جو کرنا ہو۔ بڑھاپے میں کمبخت جھک جاتی ہیں۔ مرتے وقت کوئی آسرا نہیں ہوتا۔

سنتا چاچی چاچا بچوں کے لیے اکیلی گھر میں پڑی رہتی تھیں۔ وہ بات چھ سات برس کی ہو گئی ہے۔ مگر پرکاش کی بہو ہے۔ ساری گئی ہے۔ مگر وہ ہر رات سے پہلے بھینس کا دودھ دوہ رہی ہیں۔ آنگن میں پیڑ لگا کر کے چرنے سے نکل جانا چاہتی ہیں۔ چاچا کے دھوم رہی ہیں۔

اس کہتی تھی کہ جب سنتا چاچی بیاہ کر آئی تھیں تو اس سے زیادہ سندر لڑکی پورے گاؤں میں یاد کرکے بھی نہیں تھی۔ خوبصورت ان کے شوہر جلنے پر سے گر کر مر گئے تھے کہ بیشم چاچا نے سنتا چاچی بدل کر نہیں دی۔ کیا پتہ کیا ہوا۔ آ جانے وہی جلی چاچی کو کیسا بد صورت بنا دیا اور اس پہ لی رادھا کو پسار کر دیا ہے۔ رادھا کو جانے کیا چاچی کب بتائیں گے۔ اب تک پاپڑ سا پسرا لگتی تھی۔ میں نے اتنی خوبصورت، ایسی بھینس کی صورت پھر کہیں نہیں دیکھی۔ ویسے جنس کی صورت تو شاید ہی نہیں ہو!

مجھے اس دن کی بات اچھی طرح یاد ہے جب میں ایک دن رادھا کو بیٹھ کر ایک اندھی عورت کے ساتھ بیاہ دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے اٹھنے کی تو میں نفرت سے منہ پھیر کے کھڑی رہی ——— کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ میری چاچی کو روکا کر ساری زندگی ہنستی رہو گی؟

ایک بار اس نے دور سے رادھا کو دیکھ کر کہا تھا۔

"تم بہت اچھی خاصی صورت شکل کی ہے مگر کیسی اپنی مٹی پلید کر رہی ہے!"

اس کی بات سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا تھا۔ اب میں اس سے کیا کہتی کہ ذرا کر کے پر چل کر تو دیکھو۔ مگر جب رادھا کی شکل رہی ہے تو سمجھو کس چیز کا نام ہے ——— ؟ پھر میں چاچی کو دبلی میں کھا جاتی تھی جو اپنے دھان پان بدن کی پوٹلی نکال کر کھیلنے اور موں کو سمیٹ کر رکھتی تھیں۔

اس بات کے کئی مہینے بعد ایک دن میں نے سامنے دیکھا تو جیسے دھک سے نکل گئی۔ رادھا بن سنور کر جیسے بیاہ کے کھڑی تھی کہ دس گز دور سے بیں ایک دم اس پر مر مٹی۔ میں نے اس کے لیے جتنی نفرت جمع کی تھی وہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اپنے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ ہمارے گاؤں کے لڑکیوں نے بھی زندگی کے اس کام کو کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے وہ

پہ ساتھ والی تھی۔ کوئی اس کے گھر دیتا تھا۔ ممکن ہے اچانک سے یوں تنہا رکھ کر مجھے اس پہ بہت ترس آیا۔ پھر جب اس نے
سے بچے کو پالا کر میں اس کے پاس تو اس لئے مجھے دنیا کی بہت بڑی دولت مل گئی۔ اسے قریب سے دیکھنے اور چھونے کی تمنا چلے
سے میں اپنے دل میں دبائے بیٹھی تھی۔

میں تیزی سے نیچے بھاگی جہاں چچی کے پاس اماں بیٹھی سنتا چاچی کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

اماں ــــ اماں وہ ماما ہے نا ــــ وہ ــــ

چپ ــــ چپ ــــ اماں نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

کہیں کنواریاں رشتوں کا نام لیتی ہیں! تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی جو تو نے پھر کبھی ماما کو دیکھا۔ چل جلدی سے چولہا سلگا
میں سہم کر دوپٹے سے لپٹ گئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اماں نے مجھے پاپ کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا ہے۔ اگر میں
ماما کے پاس چلی جاتی تو ــــ! وہ مجھے چھو لیتی تو ــــ میں جو بندگی کی طرح پاک ہوں۔ راجا سے بہت بلند ہوں۔ پہلے
ہی میں گندی کا گند ہاتھوں سے بھرا ہو۔ کسی کو کیا پتہ ــــ!

اری سنتا صبر کر بہو۔ بھگوان پاپ کی سزا کچھ نہ کچھ سنسار میں بھی دیتے ہیں۔ اماں چاچی کو سمجھا رہی تھیں۔

بھابی یہ تو ٹھیک ہیں کچھ دوا کھلا دیتی ہیں کہ آدمی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ چاچی نے آنسو پونچھ

میں نے مہابھارت کی بھاجی پڑھتے ہیں سوچا کہ سنتا چاچی اپنے پتی کو قصوروار کیوں نہیں ٹھہراتیں۔ دیوانہ بنانے کی جو دوا ماما کے
پاس ہے وہ دوا چاچی کو کیوں نہیں ملتی! میں یہ بات آگے بڑھ کر اماں سے پوچھنے والی تھی۔ مگر اماں کا تھپڑ یاد کرکے پیچھے
ہٹ گئی

ارے بھگوان کے باندھے ہوئے بندھن بھی کہیں ٹوٹتے ہیں۔ چار دن عیش کر کے گھر میرا پتی بڑھاپے میں تو میرا ہی ہوگا! چاچی
نے بڑے فخر سے کہا اور آنسو پونچھ کر بیٹھ گئیں۔

کیوں ــــ بھابی میں کیوں نہیں ــــ؟ میں پھر چاچی سے پوچھنے لگی اور جلدی سے اپنا بایاں رخسار پکڑ کے بیٹھ گئی۔
بھابی بھی کتنی سیدھی ہیں۔ جانے کس نے ان کے دل میں یہ بے تکی باتیں بٹھا دی ہیں کہ میں ان جادو ٹونوں پر یقین کیے بیٹھی ہیں۔ سنا ہے
پہلے تو چاچا اس کسی کو ورغلائے تو چاچی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ چاچا سے بھی نہیں جنہوں نے ان کی شادی کے زیور دے کر بڑے اور کسی کو
بنا دیتے تھے۔ بڑی خاندانوں میں کسی مرد نے ایسی جرأت نہ کی ہو گی۔ کیونکہ رنڈی کے کانپتے ہوئے لڑکی والے دیتے ہیں مگر چاچا کو
شاید ایسی یاد دوا ــــ!

آج پچاس برس بعد بھی وہ دن میری آنکھوں میں روشن ہیں ــــ
کہتے ہیں مرنے سے پہلے سوئی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ شاید موت میرے پاس آ گئی ہے۔ آج آبا نے ٹھیک بڑھاپا کا تعارف میں
وہی موتی ہوں ــــ یہ کہتے وقت وہ کیسی حقارت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آخر میں نے اپنی جوانی گرگٹ بیوں سے اندر رکھا ہے!

گاڑی ——— میں [illegible] سے [illegible] نکل کر [illegible] [illegible] یاد کرتی ہوں۔ [illegible]
[illegible] تھی اور [illegible] [illegible] شاید [illegible] [illegible]
[illegible] شکایت [illegible] [illegible] [illegible] دیا۔ [illegible]
——— [illegible] [illegible] [illegible]
اس کے [illegible] سب [illegible] تھے۔ [illegible] آپ اپنے [illegible]
[illegible] زندگی گزار دی ——— [illegible] [illegible] بھی [illegible]

[illegible] لکھ دیا ہوتا :

شاید سب [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] اپنے ہاتھ [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] اپنے [illegible] [illegible]
[illegible] اپنے ہاتھ سے [illegible] سکتا تھا۔ [illegible]
[illegible] [illegible] گھر میں [illegible] [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] [illegible] گھر میں [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] وقت [illegible]

[illegible] میری ماں [illegible] :

[illegible] وقت [illegible] [illegible] ۔ [illegible] آنکھوں میں [illegible] ۔"

[illegible] [illegible] سب سو جاتے تھے تو میں [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] وقت [illegible] [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] زیادہ [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible] خوش قسمت ہوں۔ [illegible] سب کچھ [illegible] ۔

پانچ برس بعد [illegible] [illegible] [illegible] ۔ میری ساس [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] اٹھانی پڑتی ہے۔"

بیٹے کا بیاہ ہوا تو میں پاپا کے [illegible] گیا ہے۔ اس بیٹے کو پا کر انہیں چھوڑ کر ایک دوسرے بیٹا کے پاس چلی گئی ہے۔
... نے اسے بلا بھیجا تھا۔ پاپا پھر بیٹھ گئے تھے مگر اس شہر کے ساتھ جیسے کوئی ملک فتح کر کے لائے ہوں۔ وہ رات پاپی
... پھر لوگ تھے۔ وہ سب کے کھانے کے برتن چمکا دیتے تھے۔ پاپا پاری دم سادھے، سر جھکائے سارے گھر میں وہ تو پھرتی
... رہیں بہت خوشی خوشی کہ دیکھ کر اپنی سہیلی کے گھر میری پناہ میں آ گیا۔
مجھے
پہلے میں پاپا کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ میں کہتی تھی وہ اب زندگی بھر پاپا کو صورت نہ دکھائیں گے۔ اپنے بیٹے پر ہمیشہ پچھتائیں
پاپا اپنے بیٹے کے واپس آنے کی خوشی میں دیوالی منانے میں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ کچھ سال کے بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے
... دروازے کھڑی تھیں۔ کتنی خوبصورت جیسے جنگل سے کوئی روپ دھارا ہو۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تو میں گھبرا کے پیچھے کو ہٹ گئی
— وہ ما جاتی —— سنتی ساڑیوں کی لالی سر پر چڑھائے آنکھیں جھکائے جانے وہ جنگل سے کیا لئے آئی تھی! شاید اب
اپنے بڑھاپے کی فکر ہے۔ اولاد کی کمی محسوس کر رہی ہوگی۔ مگر تھوڑے دنوں میں اس نے اپنی مُٹھی کھول کر ہتھیلی ہی آگے کر دی تھی۔ بلکہ میں اس طرح شاداب تھی
... کی سکھا یا ہوا دیکھ جوشی اور احساس اکڑ دونوں اپنے اصول بھول کر بہت سی کی مدد ہو کر دیتیں۔ دیکھ کر بیٹے سوچیں کہ اس
... اسی علاقے سے اپنے بیٹے کی سرکشی دبی ہے! یہ کب تک ۔ یہ کیا ہو سکتا ہے ہو نہ کی۔
وہ پروا ختم کر کے بیٹے پاس سے گزر کر تو چاہا وہ بھول سے اٹھ گئے۔ ایک بار پھر —— جنگل کے ملتے بیٹا ڈریے
... میں یہ کتنا سا خیال ابھرا کر رہا تھا ابھی ہے۔ بیٹے کے منہ میں تو یہ بات —— ۔ ہاں، پھر سوچ کر میں نے اس خیال کو جھٹکا اور
... دھیان میں ڈھکیل دیا۔

اس کے بعد جب میں پیدا ہو گئی تو مجھ کو ماں نے پاپا کے پاس دے دیا جیسے۔
انہیں ماں کے بعد ایک لمبا عرصہ تنہائی میں گزارنا پڑا تھا۔ اب میں اپنی ساس نند وغیرہ کو دیکھ کر ایک چھوٹے سے گھر کی مالک تھی جیسے
... بہت محنت کر کے بھی پوری طرح سنبھال نہ پایا تھا۔ کیا بچے بہت ہو گئے تھے۔ وہاں اسکول کا انتظام بھی نہیں تھا
... جب میں بچے پڑھے لکھے ہو کر بچوں کو سکھا سکتی تھی تو ان کو پڑھنے کے لئے اوپر بھیج دیتی تھی۔ شاید وہ جانتی بھی نہ ہوگی جب
... کتنا اچھا ہوتا ہے کسی کام میں کچھ لگا دیتے ہیں۔ مگر انہیں اب کسی وقت فرصت نہ تھی وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے ہنسی مذاق
... بیاہ کی خوشیاں منانے جا رہی تھی۔ وہ شام میں بھی تو سب مل کر ہمارا کام کرتے تھے۔ پھر جب تم نے بھی ہائی اسکول پاس
کیا تو میں نے پتا کیا چھوٹیوں کے بیاہ کے بیٹے کا کیا کر دیں۔ سب تو اب بھی اسی طرح سنبھلی نہیں ہیں۔ میرے چہرے پر اظہار
... وقت پاپا نے کچھ پوچھا کہ کیا کچھ منگوا دیا تھا۔ کتنی خوش ہو رہی تھیں کہ وہ پڑھ چکے ہو گئے تھے وہ اپنی بیٹی کی شادی کے
... نے کہا۔ وہ دونوں بیٹے بھی شامل کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے میرا دل کرتا ہے۔ مجھے بھی خیال کرنا چاہئے۔ اور بڑا حوصلہ بیٹا
... بڑی کی دیکھ بھال کرنا ضروری کر سکتی تھی۔
... وہ ملک کے گاؤں سے آیا تو کہتا تھا کہ پاپا اور بیٹے کے پاس سے ہم لوگ گئی ہیں۔ اس نے کہا کہیں سے کچھ پالا

ہے۔ مجھے شک کہ بہت خوش نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ بی کو معلوم ہوگا کہ پیش کرنے کی ضرورت کیا ہوتی ہے۔ اور اس کے بیٹے کے بیٹے کی شادی کی تو
ہے۔ مگر سنا کہ کوئی بات نہیں جانتا۔ ہوتی ہیں تو یہ پیدا کیا ہے۔ بس وہ تو ہاتھ میں ہے وہ کس کا تھا اور خوشی وغیرہ کی
بیٹے چاہتی تھی۔ میں وہ وہ ختم ہی کیا اور انتظار بیٹھ رہی تھی تو اس کے بچے کے بچے کی بیٹی سے ہی ہوتی تھی بچہ بڑا ہو
گیا اس کی طرح۔ سارے بڑے اور مہمان خاندان کی ساری باتیں تب وہ نہیں پڑتے۔ ہاں اس بچے نے پیار ہی کیا ہے کہ بچہ کہیں
بچہ سمجھے پر بتا رہی ہے۔ اس کے بچے ابھی پڑھنے میں پچاس روپیہ کی بات ہے۔ ہمیں کا تھا کہ آپ کا بیٹا ہے اور وہ مجھے کہتا ہے کہ
دے جائیں گے تو ہم کبھی شکر بھی یاد دلا دیا کہ میں وہ سے اور بیٹے میں کام کروں۔ وہ سب میرے دل کا پچھتاوا تھا بیٹا ہوتا۔
جب آپ نے اپنے گھر کے لئے سب ہی بانٹ دیا ہے۔

کہ اس نے میں آؤں کہ جب ہم نے ماں کا بیٹا ہے تو وہ بات کر بیٹھے تھے۔ اس وقت میں نے نہیں اور اس نے
کہ ہم تو گھر آیا اور کہہ رہے تھے بیٹے سے اپنا گھر بنا رہیں گے۔ سب کو ساتھ آ رہے گے۔ لڑکیاں پالی ہیں اور بیٹے تو اپنے ہوتے ہیں۔ بے
پیار معصوم تھا۔ یہ بات آنی تھی تھی کہ ہم نے بھی تم اپنے بیٹے بھی دیا تھا۔ اس نے بچی کو اس کی لڑکی سے بیاہ کر دیا۔ وہ جاتے جاتے
کہہ گیا: اس بات پر ہم نے ۔۔۔ تو پر کس کس پر قدم رکھا۔

اب تو میں برس گزر گئے اس بات کو ——— جانے تم اس گھر کا بیٹا تھا بھی یا نہیں۔ میں کہہ رہی تھی اس کا قصور کیا
ہوں تو تم کو پیدا کرنے سے لے کر اب تک اپنے بیٹے بنانے تک سب تک کا ایک دم جھک رہتے ہیں۔
تم نے پیار کر دیا تو مجھے اس شادی کی خوشی سے ہی کوئی امید نہ رہی۔ اس لئے میں نے اس وقت سے یہ بیٹی کی جلدی کر ڈالی
اور ہے جیسے ختم کر بیٹھے کہ میں بچہ نہ رہی۔ اس کے بچپن سے گھر ہو گیا ہے۔ میری کبھی نہ آتا تھا کہ اب بچوں سے کیا کہوں
نے تو اپنی بہوؤں کی طرح پانی پیتے ہیں نہ رہا۔ اس کے بیچ ملک کے اس خاندان کا بیٹا ہو کے بالا میں یہ ہی جا سکے۔ گھر ہو
تب سے بیٹے ہی خوشی نہ رہی۔ بڑھاپے میں سنسان اور ان کا نام پر منزل رہتا ہے۔ میں بھی اس پاگل پن میں جانے کیا کر بیٹھتی ہوں کہ بیٹے
اور بہوؤں کو ہمیشہ مجھ سے شکایت رہتی ہے۔ بچے کام دھندا کرتے دیکھ کر ہو کر چپکے چپکے ہنستی ہیں کہ اس بڑھیا کو کتنی ہوس ہے
کام کرنے کی۔ جیسے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔
مجھے جانے کیوں اپنے گھر سے اتنی محبت ہے؟ کوئی تنکا اس کا توڑ دے تو جیسے میرے دل پر لگتا ہے۔ بہو بیٹیاں آ
تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں تم اتنی چھوٹی سی بات پر دل کیوں جلاتی ہو ——— وہ کیا جانیں کہ یہ باتیں میرے لئے
کتنی بڑی ہیں۔ میں نے اس گھر کے تنکے تنکے کو کتنی محنت سے جمع کیا ہے۔ اور سب کو بڑا کر کے جانا ہے کہ کوئی جانے
چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ ساس بہوؤں سے جلتی ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ بڑھاپے میں بچوں کا گھر تنکا کتنا بڑا سہارا ہوتا ہے؛
اب میں کیا اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔ شاید اب تو سب ہی اس بات کے منتظر ہوں کہ میں مرتے وقت اپنا خزانہ
کے حوالے کروں گی ——— میرا سب بنا گھر اب اکیلا ہو گیا ہے۔ میں کس بات پر فخر کروں تو پتا شکایت کرنے کا آتا ہے۔

"آپ ہر وقت ستھرائی کے پیچھے کیوں لگی رہتی ہیں! آپ کہیں تو ہم آج ہی آپ کا گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔"
یہ سن کر میں سہم جاتی جیسے کہ کہیں یہ بات ان کے باپ تک نہ پہنچ جائے۔ وہ تو مجھ پر غصہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے
رہتے ہیں کیا کریں ——— ایک بار سے محسوس ہوا کہ غصہ آتے تو وہ نہ کوئی بیٹوں کو ڈانٹ سکتا ہے نہ کسی چیز پر بھی ہو دوں کو
——— بچے یہ جو اتنا لمبا کھینچ کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی مصرف ہو میں نہ تھے۔

جب کوئی کام نہ ہو تو میرا دماغ ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ کبھی سوچتی ہوں کہ شاید ایسی بھی عورتیں دنیا
میں ہوں گی جو ہمیشہ سکھی رہیں۔ ہمیں تو کبھی چین سے سونا بھی نصیب نہ ہوا۔ میرے پوتے ہنس کر پوچھتے ہیں کہ پاپا (جی ان کی)
ماں خود کہاں ہے۔ ہمیں کب ملو گی!

اور میں آنسو پونچھ کر سوچتی ہوں کہ میں کتنی منحوس ہوں۔ میں نے اپنا خون کیسی لاپرواہی سے لٹا دیا۔ کچھ بھی تو بچا کر
رکھا —

آج مجھے یہ سب باتیں کیوں یاد آرہی ہیں ——— ؟ کل میں شام کو ایک فلم کی شوٹنگ دیکھنے ان کے ساتھ
گئی تو مجھے کچھ بھی یاد نہ آتا۔ میں روز کی طرح کسی نہ کسی طرح سو ہی جاتی۔ آج بہو کی چھوٹی بچی کو سنبھالنے کے لیے میں اس
کے ساتھ ایک فلم اسٹوڈیو میں گئی تھی کیونکہ مجھے بچپن ہی سے ان کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میرا بیٹا فلم بناتا ہے اس لیے ہم بڑے
ٹھاٹ سے وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں وہاں گھوم رہی تھیں۔ مگر ایک لڑکی کے پیچھے تو ساری خدائی لگی
ہوئی تھی۔

میری بہو نے پیچھے سے مجھے بتایا کہ یہی وہ ہیروئن ہے جو دس برس کی عمر سے بمبئی سے کام کرنے آئی ہے۔

"مگر اس کی صورت میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ اتنا روپیہ کماتی ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کس کی قسمت ہے ——— " میری بہو نے ہنس کر کہا۔

"اور ماں یہ بے چاریاں کیا جانیں کہ ماں ——— ان کی پالنے والیاں ہوتی ہیں چالاک۔ انہیں اداکاری کے داؤ پیچ سکھا کر
دولت پیش کرتی ہیں۔"

آج وہی میں اس ہیروئن کی شکل دیکھ کر ایک خوبصورت سی کار میں آ گئیں۔ سب کھڑے ہو گئے۔ پروڈیوسر نے خود بڑھ کر دروازہ
کھولا تو وہ اتریں۔ چند ساعتوں کا تکلف ——— یوں جیسے کوئی مہارانی چلی آرہی ہو ——— بے حد قیمتی ساڑھی
پہنے۔ کیمرہ مین ایک طرف ——— لوگ جھوم جھوم کر ادب سے تعظیم سے سلام کرتے رہے کہ جیسے کوئی آسمان کی پری آ گئی ہو۔ جب وہ
مسکراتی ہوئی میرے پاس سے گزریں تو میں چونک پڑی۔

"ماما ——— اماں ——— !"

ماں جانے کس کس طرح سے مجھے غور سے دیکھا ——— جو بہو نے گھبرا کے پیچھے پر سے سنبھالتی ہوئی مسکراتی ہوئی وہ
میری طرف بڑھی ———

تم —— تم تنہا ہو —— اتنی بڑی کیسے ہو گئیں ——؟

(معصومہ کمرے میں بیٹھی ہنڈولی میں سوچ رہی ہوتی ہے کہ اتنی بڑی کیسے ہو گئی ——— یہاں تک کہ لمبا
بچی —— ——؟

بہادر

مسعود مفتی

کرنل بھیا چند سال سے بہت خفا ہیں۔

وہ ہندوستانی وزیر اعظم شاستری اور وزیر دفاع چاون (جسے وہ "وزیر جنگ اور جھوٹ" کہتے ہیں) کو اپنا ذاتی دشمن سمجھتے ہیں کیونکہ ہندوستانی حملہ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ صرف کرنل بھیا کے خلاف تھا۔

وجہ یہ ہے کہ گزشتہ چاند کی ایک ساعت سے کورٹ شپ اُن سے مصروف تھی۔ جہاں مشرق اور مغرب کی روایات کا امتزاج ہو جائے ان ترتیب میں خوشنما انداز ابھر آتا ہے۔ زیرِ نظر فقرہ خالص مغربی روایات کی مرید تھیں اس لیے کورٹ شپ کے دوران میں جتا کر رہی تھیں۔ بنا بریں تو بھیا بھی مشرقی لحاظ سے شرماتے تھے اور مغربی بننے کا ارمان دل میں رکھتے تھے۔ مگر جب کورٹ شپ شروع ہوئی وہ خالص مشرقی انداز میں ظاہر ہوئے۔ منگنی کی ساعت کے قریب ہونے کا فخریہ پہلا موقع ملا۔ تو بے ساختہ عاشق ہو گئے ——— اس لیے گزرے دن کہتے تھے کہ میں کورٹ شپ کر رہا ہوں مگر دراصل ترتیب اُلٹی تھی اور کورٹ شپ اُن سے کھیلنے میں مصروف تھی اور وہ تو پہلے ہی عاشق ہو چکے تھے۔

بہرحال اس عمل کی ایک کڑی یہ تھی کہ بھیا نے ایک طرز سازش کی تھی۔ کہ وہ چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شالامار باغ کا جہاں میں فقرہ سے مل چکے۔ مگر بے تکلفی شدہ نہ پر ہنگامی (وزیر خود نشانے پہ تھے، (——— باز ——— اور [illegible] علی الترتیب) تو شاید کے دیار دونوں میں فقرہ کے دامن کے التفات دیکھنے قصر جائیں گے۔ اس کے بعد ان کے چچا خسر انہیں سیالکوٹ سے مزید دو کیس لے واپس پر وہ شادی کی تجویز پیش کر دیں گے۔ اسی لیے پانچ ستمبر کی رات کو وہ نہایت خوش آئند تصورات کے ساتھ سونے گئے تھے اور [illegible] ساعت سونے میں ان کی ابھی کئی رہ گئی تھیں۔

مگر چھ ستمبر کی صبح کو نقشہ بدلا ہوا تھا۔

شالامار سے متعلق سے فیصلہ سڑک پر جو ہو چکا تھا قصر کے باغات گولہ باری - ہوائی جہازوں اور بمباری کی زد میں تھے اور تین [illegible] سیالکوٹ والے چچا [illegible] کو [illegible] رہے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ اس دن بھیا نے فقرہ کے سامنے تجویز کی کہ وہ [illegible] ایئرپورٹ [illegible] پشاور چلے جائے تو [illegible] کے شروع ہو گئے۔ تب [illegible] نے [illegible] جانے کی تجویز

---

* روزنامہ مشرق میں [illegible] ——— [illegible] ——— [illegible] پاکستانی فضائیہ کے حملوں سے دشمن کے جہاز [illegible] اور وہ بالکل [illegible] ہو گئے

* مصنف کے [illegible]

[illegible] کرتے تھے اور سرکاری [illegible] کرتے تھے۔ ان سب باتوں سے بیا [illegible] تھا کہ ہندوستانی [illegible] تھا کہ [illegible] نشے [illegible] کی طرح دوسری چیزوں کی طرح ہندوستانیوں کی [illegible] تھی۔ وہ کہتے کہ بیا وہاں پہنچ گئے ہیں [illegible] وہاں نہیں ہوتے تھے۔ ہم جیسا بیا ہندوستانیوں کے [illegible] ہے جیسے [illegible]۔ [illegible] انہوں نے [illegible] بیا کا [illegible] تو کیا [illegible] پاکستان سے [illegible]۔ اور [illegible] پاکستان [illegible] سے [illegible] رہے۔

بیا کا یہ استدلال آپ کے لیے نئی چیز ہو تو ہو۔ جانے والے ہرگز نہیں کہ بیا ہمیشہ سے [illegible] ہر چیز کا [illegible] ہیں یہ کہتے ہیں اور دوسرے جیسا کہتے ہیں، اور اگر نہیں کہتے تو نہیں کہنا چاہیے ——— [illegible]۔ [illegible] جب کبھی کسی عورت کی تصویر دیکھتے ہیں تو چل جاتے ہیں کہ وہ ان کی طرف دیکھ رہی ہے ——— [illegible] اپنے آپ کو [illegible] [illegible] کہتے ہیں۔ جیسے [illegible]

"بیا آپ اتنے [illegible] ہیں۔ مگر کبھی کچھ کہتے کیوں نہیں۔"

[illegible] ——— [illegible] سے [illegible] کے دوستوں کا [illegible]۔ اپنا نام [illegible] کے [illegible] ہوئی ہے ———"

پھر [illegible]

"[illegible]۔ جب [illegible] کا [illegible]"

اسی طرح [illegible] میں [illegible] کا [illegible] بتاتے ہیں۔ سال کے سال یہ [illegible] گئے ہیں [illegible] پنجاب یونیورسٹی [illegible] سے [illegible] کوئی قابل [illegible] نہیں ہے ——— جب تک وہ میری بات [illegible] نمبر کیا خاک دیں گے۔"

انہیں یہ بھی [illegible] ہے کہ [illegible]۔ [illegible] وہ ذرا سا اشارہ بھی کر دیں ... [illegible] نہیں کرتے [illegible] نہیں [illegible] نہیں [illegible]۔

کبھی [illegible] سے [illegible] کہتے ہیں۔ " میں [illegible] جیسا [illegible]۔ مگر میں [illegible] نہیں؟"

اسی [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اگر [illegible] کے مقابلے میں [illegible] والا [illegible] سے [illegible] بات کہیں گے۔

شاید [illegible] بہت ہیں۔ [illegible] ہوں [illegible] کو وہ [illegible] ہیں جو [illegible] کے [illegible] پر [illegible] بہت [illegible] ہوتی تھی [illegible]

[illegible] بیا [illegible] کے [illegible] ہیں۔ جس نے ان کی شادی کا [illegible] کر دیا۔ [illegible] انہوں نے [illegible] [illegible] باتیں [illegible] انہوں نے [illegible] دیکھتے [illegible]

تی ہے۔ تو یہ بھی شاستری کا ہی پلّا۔ ... بھاگ بھی کا غیرت تھی۔ مگر وہاں تو لُٹیا ہی ڈوب گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ جنگ کے بعد سے معاشرے میں ایک عام نئی اقدار ابھر رہی ہیں۔ اور لوگوں کے نظریات بالکل بدل گئے۔ چنانچہ جب فلم ایکٹریس شمیم آرا نے اعلان کیا تو اس حالت سے شادی کروں گی جو جموں اور کشمیر پر پاکستان کا جھنڈا لہرائے گا۔ تو بیتا کی فلم بھی مغربیت ترک کرکے مشرقی ہو گئیں اور ... جیسے اگر سو تمبر بجانے پر آگئیں۔ انھوں نے بھی اسی قسم کی شرائط کا اعلان کردیا۔ آپ چاہے اسے عورت کی نادانی کہیں یا جذبۂ وطنی۔ مگر بیتا وطن پرستوں میں پِس گئے۔ چنانچہ شاستری کے پیاسے دشمن ہو گئے۔

خدانخواستہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ بیتا اس جنگ کو ذاتی المیہ ہی سمجھتے تھے۔ یہ اُن کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ کیونکہ اُن کا جذبۂ حب الوطنی اسی شدت سے بیدار ہوا تھا ———— سب جانتے ہیں کہ بیتا کو پاکستان سے کتنی محبت ہے۔ کیونکہ یہاں کے لوگ عرصے سے اُن کی ناز برداریاں برداشت کرتے رہے ہیں۔ کہیں ایسا پیسے چاہنے والے شاید نہ مل سکیں۔ اس لیے وہ بھی سب کی طرح اس ملک کی حفاظت کے لیے اور ملک کا جذبۂ حب الوطنی جوش سے بیدار ہو گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بیتا فوج میں بھرتی کے دفتر پہنچ گئے۔

یہاں یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہیں ہوگا کہ عظیم جنگ ہوتے ہی بیتا نے فرض کر لیا تھا کہ وہ بہادر ہیں۔ ممکن ہے اس وجہ سے وہ ایک بہادر قوم کے فرد تھے۔ مگر وہ تو اپنے آپ کو فطری طور پر بہادر سمجھتے تھے۔ اور خیال بھی تھے کہ اُن کی ساتھی اکثر یہ تسلیم کبھی نہیں کرتیں اور ہم لوگ بھی نہیں مانتے۔ ہم تو خیر بقول اُن کے حسد کی وجہ سے نہیں مانتے تھے۔ مگر جب جنگ کے دنوں میں بہادری کے کارنامے وغیرہ کی فہرست میں اُن کا نام نہ تھا۔ تو انھیں بہت اچنبھا ہوا۔ ہم سے خفگی بھی ہوئی کہ اُن کا نام حذف ہونے پر احتجاج نہیں کیا۔ بالآخر جب جنگ کے بعد صدر ایوب نے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر فضائیہ کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو شک نہیں ہے۔ وہ سب بہادر ہیں۔ تو بیتا کی کچھ تسلی ہوئی اور پھر جب صدر نے اسی تقریر میں کہا کہ جنگ میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی بہادری کے کارنامے دیکھنے والا کوئی موقع پر موجود نہیں ہوتا اور اس کی بہادری کا لوگوں کو علم نہیں ہو سکتا۔ تو بیتا کی بانچھیں کھل گئیں کہ ان کی بہادری بھی بالآخر تسلیم کر لی گئی ہے۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ جس وقت وہ صدر کی تقریر ریڈیو سے سن رہے تھے اس وقت ساتھ ساتھ شیو بھی کر رہے تھے۔ بانچھیں کھلنے سے چہرے کی کھال ذرا کٹ گئی۔ اس حادثہ سے اپنے آپ کو جنگ کے زخمی ہونے والوں میں سے شمار کرتے ہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ نہ جنگ ہوتی۔ نہ صدر ایوب تقریر کرتے اور نہ خون نکلتا۔

یہ ذکر تو ضمناً ہوگیا۔ اصل قصہ تو اُن کے فوج میں بھرتی ہونے کا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ بھرتی ہونے جا رہے ہیں۔ لیکن واپسی پر کوئی اعلان نہ کیا۔ ہمارے پوچھنے پر صرف اتنا بتایا

"ابھی حالات اتنے نازک نہیں ہوئے کہ مجھ جیسوں کی ضرورت پڑے"

اور پھر اداس سے چہرے کے لیے نہایت کر بیٹھ گئے

مگر بعد میں ایک اور دوست بھی اسی گروپ میں گئے اور بھرتی کر دیے گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ بیتا طبی معائنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حالانکہ ... کر گئے تھے۔ اور پورے دو گھنٹے سے پریشانی پر ... رہے تھے۔

"ہوتا یوں کہ جب وہاں گئے تو کئی لوگ باہر والان میں بیٹھے تھے۔ کریتا بھی پریشان ہوتی بیٹھی [illegible]
پہلے جب اندر گئے تو گھنٹے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بیٹا خود ہی جگا تھا مگر ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے [illegible]
بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں نے یہ چیز بڑا خراب ہے کوشش بہت کر کے ہمنے وہاں یا اور دوسری [illegible]"

"ان کا اندازہ کتنا تھا؟" میں نے اس سے دوست سے پوچھا۔

"میں صرف اس وقت شامل ہو سکا تھا جب صلح ہو۔ مگر وہاں تو صرف یہ چیزیں اس لیے بھی نہیں معلوم۔"

"بھائی کی بیماری کتنی تھی۔"

"بس یوں کہو کر فیصلہ کر سکے کہ دوست ذرا پچھلے دو چار مہینوں میں یہ کام چل گیا تھا۔"

"اور قد کی کچھ خوبی کتنی تھی؟"

"منشا کا لکھنا کرنے کو تو کافی تھی۔ مگر لوگوں کے لیے کافی نہ تھی۔"

مگر چند دن بعد بتیا کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کلیں انقلاب کے بس طریقے پر اعتراض ہے ——

"بھئی دیکھئے۔ تم اگر یا پاکستان سے بھی کچھ بات اور جو ہو پا سکتا ہے!"

جلسے سے پہلے بتیا کے دوستوں کی مشاورتیں اور بستیوں میں جایا کرتی تھی۔ مگر جلسے کے دن ہی ایک عجیب [illegible]
کرتی تھی۔ پہلے سب لوگ ندوی کا خبار ہاتھ لیتے۔ رسالوں میں تبصرے پڑھتے۔ پھر باہر والان میں بیٹھ کر صحت حالت پر تبصرہ کرتے
اور ٹرانسسٹر ریڈیو سے خبریں سنتے۔ چنانچہ اس دن جب اکٹھے ہوئے تو بتیا بہت ناراض تھے۔ کہ انہیں اپنی بہادری دکھانے کا موقع
نہیں دیا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ وہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی سونے کی جیتا چاہتے ہیں۔ مگر حالات ان کے ہاتھ
باہر ہیں۔

"اللہ! وہ وقت سے بڑے۔ اگر پہلے ہی ہو جاتا۔ تو جتنے لوگ شہید ہوئے ہیں۔ وہ سب سے زیادہ ملک کے لیے ہیں
زندہ کا زندہ واپس آتے۔"

"ایسی لیس تو جلسے کے بعد بھی ہو سکیں گی۔ اتنا بدلا گیا ہے بس آپ کوشش کریں کہ وہاں پیرو کا ہاتھ مل جائے۔"
صاحب بولے۔

اتنے میں کسی نے ٹرانسسٹر ریڈیو پر ہندوستان کی خبریں لگا دیں۔ وہاں سے اعلان ہو رہا تھا کہ پاکستان نے جنگ بندی کی
قریب ہو شو شعار سے ہیں۔

بتیا غصے سے اچھل پڑے۔ "انہوں نے کون سی بڑی نہیں سے لڑے تھے۔ تو ان لوگوں کے ساتھ وہاں تک دیتے ——
کچھ لوگ کام پتے سے ہیں۔ بہادری سے۔"

ہمنے یاد دلایا۔ "مگر بتیا۔ وہاں تو آپ کا تخیل نہیں بلکہ انتظار کچھ کرنا ہی ہوتا ہے۔"

مسکرائے۔ "وہ ٹھیک ہے۔ وہ بیربل سب اتنے کا شوق ہوتی ہے کہ چہرہ کے پیچھے کا فرد جو —— کپ تشا [illegible]

پہنا کرتے تھے جب کبھی کسی پڑوسی کے ہاں [illegible] چیونٹا پاس پہنچ جاتا۔ اور میں آزادی کی خوشبو پیدا ہو جاتی۔

بیشتر [illegible] میں [illegible] قسم کی بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔ پھر بولے۔

تمہاری [illegible] ہدایات [illegible] کرنا ——— باقی کا اب تک سول ڈیفنس کی جو ہدایات شائع ہوئی

ہیں ان پر تم سب لوگوں سے سختی کرا جائے۔

یہ بات سو فیصدی درست تھی۔ وہ واقعی ان پر خوب عمل کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ بلیک آؤٹ میں کپڑے بھی کالے پہن لیتے تھے۔ سر [illegible] سیاہ [illegible] سے کالا کر لیتے تھے۔ چہرے پر کالک صرف اس ڈر سے نہ ملی کہ کالے کے نقارے بجے جائیں۔ اس لئے [illegible] کو بیک دوبارہ [illegible] چنگاریاں بجنے کے دنوں میں استعمال کرتے تھے۔ لوگوں نے اپنی کاروں پر کپڑا [illegible] بیٹے [illegible] چپکا دیے تھے۔ اور بتیاں بالکل معطل کر کے کار کے نیچے [illegible] اس طرح لگا دی تھیں جیسے [illegible] کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ڈرا کرتے کہ "کار اب کیا صاحب بجھا رہا ہے۔" لیکن اگر کبھی سینہ کھول کر بیٹھا تو بہتر [illegible] ——— جیب میں روئی پیش رکھتے تھے۔ (فرسٹ ایڈ کے لئے) اور بمباری کے وقت دانتوں کے درمیان کچھ رکھنے کو [illegible] ——— ایک جیب دیت سے بھری ہوتی۔ دوسری میں پانی کی چار اونس والی شیشی ہوتی۔ اگر ان کے [illegible] مشتاق کالی ہوگی۔ جنگ میں کیا پتہ ہوتا ہے۔ ہر چیز کا امکان ہو سکتا ہے ——— سر کے بال کافی لمبے تھے [illegible] کم ہو جائے ——— رشین کے جوتے پہنتے تھے کہ بمباری سے گرتی ہوئی عمارت کے نیچے سے بھاگنے میں

[illegible] ——— جوتوں کی گرفت سے [illegible] کالا کر دیا تھا۔

کافی دیر بحث ہو گئی۔ ہم بھیا کو سمجھاتے رہے کہ فوج میں بھرتی ہوئے بغیر بھی آپ خدمت کر سکتے ہیں۔ مگر وہ بہادری کے کارنامے [illegible] ہوئے تھے اور وہ موجودہ حالت میں ممکن نہ تھا۔ بالآخر جب [illegible] برخاست ہوئی تو بھیا سخت [illegible] ہوئے تھے اور ناراض بھی تھے

جب باہر نکلے تو دیکھا کہ سڑک پر بہت سے لوگ ایک شادی کو [illegible] کر رہے ہیں اور اس پر پھبتیاں کس رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ دشمن [illegible] تھا۔ جو ملک کو خبریں پہنچاتا تھا۔ ساتھ ہی ایک [illegible] لوگوں نے کندھوں پر اٹھایا تھا۔ اور ہار پہنائے تھے۔ اس نے [illegible] کو [illegible] سے پکڑا تھا۔ یہ سب لوگ پولیس چیف جا رہے تھے۔

مسٹر [illegible] بولے "بھیا۔ یہ بھی تو بہادری ہے آپ یہ کیوں نہیں کرتے۔"

بھیا اکڑ کر بولے "بہادری ضرور ہے۔ مگر یہ تو ہر کوئی کر لیتا ہے۔ میں تو کوئی بڑا کارنامہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد بھیا دو چار دن غائب رہے۔ اندازہ یہ تھا کہ وہ ہم سب سے ناراض ہیں ——— مگر ایک دن دیکھا تو سڑک پر [illegible]

[illegible] کو [illegible] پیچھے دوڑ رہے ہیں۔

ہاشمی صاحب بولے "بھیا واقعی بہادر ہیں ——— یہ اتنے دن اس لیے غائب رہے کہ [illegible] سے [illegible] پکڑنے

[illegible] سے مدد کرتے ہیں [illegible] دیا ہے۔"

جلد ہی جنگ ختم ہونے تک بھیا گیٹ میں [illegible] تھے اور [illegible] گئی تھی۔ مگر خلاف توقع بھیا نے ہماری [illegible]

[illegible]

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

مگر [illegible]

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

"[illegible]"

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور یہی وہ [illegible] کشیدگی پیدا ہو جاتی۔

[illegible] بہت سی [illegible] ۔ پھر [illegible]

[illegible] ــــــــ [illegible] اب ایک سول ڈیفنس کی ہدایات شائع ہوئی

[illegible]

[illegible] تھا کہ ایک [illegible] میں کپڑے [illegible] کالے [illegible] تھے۔ ہر

[illegible] تھے۔ پھر [illegible] صرف اس لئے [illegible] کہ [illegible] نظر نہ آ جائیں۔ اس لئے

[illegible] میں استعمال کرتے تھے۔ لوگوں نے اپنی کاروں پر [illegible]

[illegible] تھے۔ اور بتیاں بالکل [illegible] کر کے [illegible] نیچے [illegible] دی تھی [illegible]

[illegible] ہیں۔ [illegible] کیا [illegible] ۔ [illegible] وغیرہ بیٹھا تو

[illegible] ــــــــ [illegible] تھے۔ ([illegible]) اور [illegible] وقت [illegible] درمیان [illegible] رکھ کر

[illegible] تھے ــــــــ ایک [illegible] سے [illegible] ہوتی۔ دوسرے میں پانی [illegible] ہوتی۔ اگر ان کے

[illegible] ہوتی۔ [illegible] ہوتا ہے۔ ہر چیز [illegible] ہو سکتا ہے ــــــــ [illegible] تھے

[illegible] ــــــــ [illegible] کے [illegible] تھے کہ ہر بار [illegible] کے نیچے سے بھاگتے ہیں

[illegible] ــــــــ [illegible]

[illegible] ہم [illegible] ہوتی [illegible] بغیر ہم آپ [illegible] سکتے ہیں۔ مگر وہ بہادری کے کارنامے

[illegible] تھے اور [illegible] ۔ آخر جب [illegible] تو بیتا سخت بچے ہوئے تھے اور ناراض بھی

جب باہر نکلے تو دیکھا [illegible] کر رہے ہیں [illegible] کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ [illegible]

[illegible] تھا۔ [illegible] تھا۔ اور [illegible] تھے۔ اس نے [illegible]

[illegible] تھا۔ سب لوگ واپس [illegible] رہے تھے۔

[illegible] بولے " [illegible] ۔ یہ تو بہادری ہے۔ آپ یہ [illegible] نہیں کرتے۔"

بیتا [illegible] بولے " [illegible] ہے۔ مگر یہ [illegible] ہے۔ میں تو [illegible] کرتا ہوں۔"

اس کے [illegible] بیتا [illegible] غائب رہے۔ [illegible] تھا کہ وہ ہم سب سے ناراض ہیں ــــــــ مگر ایک [illegible] دیکھا تو [illegible]

[illegible] ہیں۔

[illegible] " بیتا [illegible] ہیں ــــــــ [illegible] غائب تھے [illegible] نے

[illegible] ہے۔"

[illegible] گئی تھی۔ مگر [illegible] نے [illegible] کی

[illegible] ایک جاسوس کا لگتا ہے۔

بچوں کیلئے نہیں۔ جواب دینا ہوگا۔

"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے مگر وہ شخص ... یہ ضروری ہے کہ اسے پکڑنے سے پہلے ...

کر دو کہ وہ کس ... ہے۔ تاکہ اسے پکڑا جا سکے۔"

وہ لوگ اس کے متعلق بہت کچھ کر چکے تھے۔

"مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ جاسوس ہے؟"

"بہت سی چیزوں سے ___ شاید"

نمبر ایک ___ وہ شکل سے ہی جاسوس لگتا ہے

نمبر دو ___ ہمیشہ اکیلا رہتا ہے۔

نمبر تین ___ جہاں وہ جاتا ہے ... ہر کسی سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔

نمبر چار ___ ... لگتا ہے۔ ... جاسوس ہے۔

نمبر پانچ ___ ... کی طرف ... جاتا ہے۔ ... یقیناً ... ہوگا

نمبر چھ ___ ... وقت کبھی نہیں ہوتا۔ ... بہت کم ... ہے

نمبر سات ___ ... تو یہ یقیناً جاسوس ہوتا۔

نمبر آٹھ ___ وہ ... ہے۔ ... آسانی سے ایک طرف نظر ... دوسری طرف بھی

دیکھ سکتا ہے۔

نمبر نو ___ میں نے اسے بس سے اترتے ... دیکھا۔ ...

گیا۔ سوال یہ ہے کہ ... کہاں چلا گیا۔

نمبر دس ___ اپنے کمرے کو ہمیشہ ... رکھتا ہے ___ یقیناً اندر کچھ ہوگا۔

نمبر گیارہ ___ اگر وہ جاسوس نہیں ... کیا ہے؟

نمبر بارہ ___ ... کی ....

"بچوں ... انکل صاحب نے ... تمہیں یہ کس طرح کا لگتا ہے؟"

اب ہم سب ... وہ یقیناً جاسوس لگتا اور اگر جاسوس نہیں تو جاسوس کا ...

"میں پچھلے ... روز سے اس کا تعاقب کر رہا ہوں"

ہم سب ... کے قائل ہو گئے ... پیش کش ... سب کو ... ہو جائے۔ ...

ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ... ہو جائے۔ ... جائے۔

مگر جیا دلنے "تم سب بچے ہو۔ خواہ مخواہ کام بگاڑ دو گے۔ میں مناسب وقت پر تم کو ساتھ ملاؤں گا۔"

بیتیانے جیمز بانڈ کی چند کتابیں پڑھی تھیں۔ اور شرلاک ہومز اور ارسین لوپن کا نام بھی سن رکھا تھا ——— بس اسی وجہ سے وہ سمجھتی تھی سراغ رسانی ایسے ہی کرتے تھے جیسے بہت کچھ یا کر کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ زمانے۔ اور یہ کارنامے ایک کتنے ہوتے تھے۔

بیتیا جب ملک تو ہم لوگوں نے بڑی دھوم دھام کی تیاریاں کیں۔ بیتیا کی مدد پر افسوس بھی کیا۔ یہ بھی سوچا کہ چپکے چپکے پولیس کو اطلاع دے دے۔ مگر پھر فیصلہ ہوا کہ اگلی پوسٹ کا انتظار کر لیا جائے۔

مگر کافی دن تک بیتیا کی اگلی پوسٹ نہ ملی۔ البتہ اور ذرائع سے جو حالات پتہ چلے وہ آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔

پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ اگلے دن وہ جاسوس کا تعاقب کر رہے تھے کہ اس نے ٹیکسی پکڑی اور ایک طرف نکل گیا۔ بیتیا بھی پیچھے جانے سے پہلے سوچ رہے تھے۔ مگر وہاں کوئی دوسری ٹیکسی نہ تھی۔ وہ چوک کی طرف بھاگے کہ شاید وہاں سے کوئی مل جائے۔ مگر عین اسی وقت ہوائی حملے کا سائرن بج گیا۔ چشم زدن میں ٹریفک رک گئی۔ بیتیا کو بھی ایک خندق میں پناہ لینا پڑی۔

اب اس جگہ میں جاسوسوں کے حصے نئے بند تھے کہ وہ ہوائی حملے کے وقت فضا میں ہوائی جہازوں کی لڑائی کو دیکھیں اور چپ رہا کریں تھے اور خندقیں خالی پڑی رہتی تھیں۔ اس لیے خدا کی دوسری مخلوق انہیں خود مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگی۔ چنانچہ ہم گئے تو بیتیا پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک کتیا اور چار پلوں کے نام ہی حارج ہوئے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بیتیا کتوں سے بہت ڈرتے ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ کتوں کا سرد گرم چکھنے کی وجہ سے اب وہ انسان سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں۔ اس ڈر کی وجہ بچپن تک جاتی ہے۔ جب انہیں کسی ہندوستانی صنعت کے کتے نے بغیر اشتعال کے کاٹا تھا۔ اور ڈاکٹر نے بیتیا کی حفاظت بارہ چودہ ٹیکوں کے کورس سے کی۔ اس کے بعد سے بیتیا اس جنس سے اتنے ڈرتے ہیں کہ اگر کہیں نظر آ جائے تو ڈر کے مارے عجیب و غریب شکلیں بناتے ہیں کہ پھر کتا خود سے ڈرنے لگتا ہے۔ ان کا فلسفہ حسب ذیل ہے۔

۱. پرانے کتے سے ڈرو ——— کیونکہ وہ تجربہ کار ہے اور بغیر بات کاٹتا ہے۔ اور بھونکنے میں بالکل اچھا نہیں ہوتا۔

۲. نئے کتے سے بہت ڈرو ——— کیونکہ اس کی موجودگی میں اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

۳. کتیا سے اس سے بھی زیادہ ڈرو ——— کیونکہ مخلوق کی طرح ان سب سے بڑا کتا بھی بیوی سے ڈرتا ہے۔ چاہے وہ کتیا ہو کیوں نہ ہو۔

۴. چھوٹے پلے سے سب سے زیادہ ڈرو ——— کیونکہ اسے کتیا کی حمایت حاصل ہے۔ یعنی نمبر ایک اور نمبر تین مل جاتے ہیں۔

بہرحال اس وقت بیتیا کو ایک طرف دشمن کے ہوائی جہازوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف بیک وقت ایک کتیا اور کئی پلوں کا۔ کوئی ڈاکٹر بھی حاضر نہ تھا۔ "ہنسا اور روتا" کے مصداق پر بیسر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

بلکہ وہ جب ہم بیتیا کی عیادت کے لیے گئے تو ڈاکٹر کی ڈانٹ کھا رہے تھے کہ وہ جاسوس سے مقابلے کی بجائے کتیا سے مقابلہ کر رہے تھے اور اس سلسلے میں کتوں سے متاثرہ ہسپتال کے ایک کمرے میں لیٹے ہیں۔ اور جاسوس کہاں ہے۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی گئی۔

[illegible] نہیں [illegible] کے لیے اتفاق [illegible]۔

[illegible] تھا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] بیا [illegible]

[illegible]

[illegible] چنانچہ [illegible]

[illegible] بیا نے [illegible]

"یہ تو کوئی ہندوستانی [illegible]۔"

"یا پھر [illegible] ہندوستان [illegible]۔"

[illegible]

"[illegible] ہیں ہوں۔"

[illegible] ہیں [illegible]

[illegible] دیکھتے ہیں۔"

تب بیا [illegible] مسرت سے [illegible] لگے۔ [illegible]

آنکھوں میں [illegible]۔

[illegible] ایک [illegible] بولا

"میاں جی، [illegible] آپ [illegible] تشریف رکھیں۔ [illegible]"

بیا نے [illegible] ایک [illegible] اپنے [illegible]

[illegible]۔ وہ [illegible]

"نہیں آپ مجھے بتائیے کہاں گیا ہے [illegible]"

[illegible] نہیں [illegible] گیا ہے۔ [illegible]"

بیا [illegible] گئے [illegible]

[illegible]

[illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ۵۰۰۰ [illegible]

[illegible]۔

"مم . . . مم . . . میں تو جاسوس نہیں ۔ میں تو تم سے پکڑنے نکلا تھا۔"

سپاہی نے سب سے پہلے ہاتھ باندھ دیا اور رسّی سے بولا۔

"ابا صاحب۔ تم پہلے نماز تو پڑھنے دو۔"

"مگر کیوں؟" بھیا بولے

"وہ سلام کرتا" سپاہی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور بھیا بے بس ہو کر ساتھ چل پڑے۔

رستے میں لوگوں کو شبہ تو نہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اور بچے اکٹھے ہو گئے تھے۔ جب وہ چلے تو بچوں نے نعرہ لگایا۔

ہندوستانی جاسوس ——— مردہ باد!

کالی کلی کالا کالی نے ایک دستہ ہم میں اچھالا۔ جو جیب بھائی جان کی سفید سے سفر کرتا ہوا ان کے رخسار پر آن اترا۔ کیچڑ کم ہے جسم پر ... سیاہ ... شرمندگی تو ان کے بیسا ... سے چھپ گئی اور باقی آدھے کو ... پر آ گئی

تھانے جا کر معلوم نہیں کیا ہوا۔ مگر بھیا کا بیان ہے کہ انہوں نے جب چچا کالی کا شناختی کارڈ دکھایا تو پولیس والوں نے ان کی ... کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کر واپس آ گئے۔ پولیس والوں سے ابھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں اُن کا بیان کیا ہے۔

اب بھیا ... کو ... کر سیدھے اندر ... پکڑنے پر تل گئے۔ خدا نے یہ موقع بھی جلد ہی دے دیا۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ بازار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے پیچھے سے جاسوس کو گزرتے دیکھا۔ بھیا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً لاکر اور چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آ گئے۔ ہانپتے ہوئے انہوں نے غور سے دیکھا کہ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا ہے۔ بھاگ کر گلی کے دہانے پہنچے۔ گلی میں جھانکا تو اس کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔ مگر بھیا جوش کے عالم میں ... کہ شاید گلی آگے سے بند ہے۔ حالانکہ وہ بند تھی اور آخر میں بہت ... راستہ ... والی گلی سے ملتا تھا۔

"بہت تیز ہے کوئی" بھیا بولے "اب کہاں جائے گا۔ انہی مکانوں میں ہوگا کہیں ——— ابھی نکلے گا ہونہہ!"

چنانچہ وہ ... سے گلی کے منہ پر کھڑے ہو گئے۔ دوسری طرف سے تو بقول ان کے گلی بند تھی۔

اتنے میں ایک گھر سے ایک ... پوش ... نکلی ———

بھیا کو شک ہوا ——— یہ ... کیوں ہے ——— اور ... ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے دیکھا اور ... پہنچے۔

"... ——— تم ... نہیں ... تم جیسے ... دیکھے ہیں۔"

اور ... کا ہاتھ کھینچ کر ... پھینکا۔

... کی ... بلند ہوئی۔ بھیا تو ... کے ... مگر وہ ... "چھوڑ ..." ... مارے۔"

سلطانہ اداس ہو کر رونے لگی اور ہم خاموش بیٹھے رہے

ادھر ادھر کے خیالات سے الگ ہو کر بیٹھ گئے ......

.... " اب یہاں اتنی جلدی کوئی کچھ نہیں کر سکتا، جانے کس کی حرکت ہے [illegible] یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے

ہے ...... " جیسے کہا۔

" یہاں تو ہر جگہ چند دن ہی رہتے ہیں، مگر تم سنو کوشش نہ کرنا، میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

" ہم .... ہم .... جیسے کہ تم کو ہی معلوم ہے " بیٹے نے اتنا کہا اور چپ ہو گیا۔

" معلوم ہے، مگر کوئی وقت مقرر نہیں ہوا " معلوم ہے آپ کا پیارا تھا۔ جلدی جلدی وہ سب کچھ بتا دیا کرتے۔

وہ ایک ہی بات کہتے کہ تم کبھی کبھی ہمارے ساتھ رہا کرو۔"

" پیارا ہی .... میں کوئی وقت مقرر کر دیتا " بیٹا بولا۔

" بس یہ کتاب ہے ہمارا .... " وقت ملا " بس تم کو اس طرح ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ یہی میرا پیار ہے " اتنا۔"

" میں دل سے دعا کروں گی۔" اور اس نے کہا " کوئی وقت مقرر کر دیا۔ اور ......

حقیقت ہے جب ہم لوگ بیٹا کی عیادت کرنے گئے تو دونوں کے درمیان ہم سب بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔

" بھائی صاحب ہم سب لوگ آ گئے ہیں، آپ نے ان سب کے لئے دعا کی ہے، بہت اچھا لگا ہے۔"

ہم سب خاموش ہو گئے۔

اس کا چہرہ بھی پھر بدل گیا۔

ہم پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے، اور ہم سب خاموش تھے۔ اس نے اشارہ کر کے آگے جانے کو کہا۔ ہم

سب کو بتا کر اس نے پیچھے دیکھا

" جیسی " بیٹے نے اشارہ کیا۔

پ ... وہ ... بس ... ختم ہو گیا ... جیسی رک گئی۔

بیٹے کو دیکھ کر اس کا چہرہ اترا۔ اور اچھی کر کے ... ہم بھی پیچھے پیچھے ہو لئے۔

" ... وہ مزید بس جاری ہے " بیٹے نے اشارہ کرتے ہوئے کہا " اس کے پیچھے چلو ——— ۱

جیسی اچھا ہو کر دیکھے گا۔

" اے بھائی " اس صاحب کے جیسے آواز آئی۔ " جلدی چلو۔ اس میں بیٹھنا مشکل ہے۔"

جیسی وہ پیچھے بیٹھ کر رہ گیا۔

... ——— جیسی شام ہو گئی " گھر چلو ——— ابھی پہنچتے ہیں۔

ہم سب گھر واپس آ گئے۔

بنیا : ببنیا چھوڑئے۔

ے باہل ساتھ سے آیا۔ ادھر سے ہم نے ہاتھ نکال نکال کر شور کیا۔

ی ہو کر ـــــ اندر جاسوس ہے :

طبا کو مارکیٹ ویلیو بہت زیادہ تھی۔ ساری قوم اُن کی جوانی کی پامالی بھگتی تھی اور اُن کے جذبے اور جوش

راستے فضا میں روک لی۔

س کا راستہ روک دیا۔ ببنیا چھوڑ گھسا کر باہر نکلے ـــــ ٹیک کر سب کے پیچھے گئے۔ دروازے میں

کو گریبان سے پکڑا۔ اور گھسیٹ کر نیچے لانے لگے وہ ذرا بھاری تھا۔ اور مقابلہ بھی کرنے لگا۔ مگر

ہ اٹھا کر نیچے اُتار دیا۔

ت سے منہ کھول کر یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھیں۔ ایک آدھ آواز اعتراض کی بھی آئی۔ " کیا کرتے ہو

ہا : جاسوس : ـــــ اور بس کی فضا ہی بدل گئی۔

ہ کو ۔

ری کو منہ سے آنے لگا جس نے ویسے ہی گالیاں دیں

نے اسے گریبان سے پکڑا اور اچھل کر زور سے مارا

ـــ اب بھاگ کر کہاں جاتا ہے " وہ دانت پیس کر چلائے

سے خون نکلنے لگا۔

ن ہاتھ مارنے والے تھے کہ اس سے شاید ہی کوئی پہنچا تھا بلکہ ایک بار دوسرے کے ہاتھ

بیچ کر دیا

ـــ کیا ہوا ؟ ایک آدمی اوپر والی منزل سے چلاتا ہوا نیچے بھاگا آیا

ستانی جاسوس ہے " ببنیا جی کی نفرت ہی سے چلائے۔

ہ پتہ ہے ؟

دیکھو ابھی کوئی یہ ہر جگہ گھستا پھرتا ہے اور جہاں چار آدمی ہوں اُن کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نیم کے پتے

آغا بابر

یہ بات تو اس پہ واضح تھی کہ عورت کی ذات ادھوری ہے اور پیار ٹھنڈیوں سے بھری ہے مگر یہ کہ رات چھلانے پرائے پھر
نے پھر دیا کو جلسے میں تبدیل کر کے وہ مرد پاس تھا دستک پر پہلے کہ اس کو زور کے چھینٹے لگا کر اس سال وہ مستقبل کی کھڑکیاں
باغ میں جب شام ہی سے قطرہ قطرہ ہو کر مسرتوں کا نور ٹپکنے لگے تو بہار، وہ مرد چہرہ چھپائے شروع سے آخیر تک
ذرا غم میں اس طرح محروم سے ہو جانے جیسے وہ دونوں میں پیاسی ہو۔ اس کا اسے علم نہ تھا۔
خون کی گردش کے بند ہو جانے جیسے گیت کہ باغ اور ستاروں کا عکس ہوتا ہے مگر جب بار بار سیلاب اور آندھیاں آ کر دیا ، وں
میں وہ سال جاتے باغ کو آندھی تک بار کر وہ پانی تال دیا ہے۔ جو پیا کو سینوں سے گٹھا کے پڑنے از اربن تھی جنہیں وہ پیر
بنا ہے اس کا انتظار تھا۔ جو پیا کے اندر بیٹھی ہو اور خیمے کی چھاریاں بھری ہیں کہ شان سہاس منابت بلند تھا۔
وہ چند ستون وہ کی کو دوروں سے بچایا کہ وہ ساعت کی نظر ہوتا مگر جو یا کہ پیچھے پیچھے آگ بجھ جاتی۔ خیمے کو جلتا
ستو جو ستکا وہ پکار پہ چلتی وہ خواب جاری کے پینے والے ہو کر خوشی سے مزاروں اور ان کے پیچھے وہ کو ادا کر دیتیں۔ وہ اس
بڑھکتی آگ سے اپنی روح کے بسنے کو پانے کی بار بار کوشش کرتا مگر پہلے سے دھوکے نے اسے عاجز کر دیا۔ ایک بار کہ
وقت پر باسر بہل کر ادا کیا ہو۔
شاید شادی کی بیوی سے تعلق ہے۔ میں نے اس کی شہرت بھی سنی اور آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ افغان کی بیوی تمہارے ساتھ
بہت خدمت کی ہے جو تم کسی کو تو چھوڑ دو۔ وہ بھی یہاں مگر سہارا دیتی ہے۔ گڈاں کی زرد ہاتھ کے پڑنے سے اٹھتے۔ مگر کہیں دکھا
وہاں۔ احساسات ابھرنے لگے۔ لیکن وہ دیوانی پر چارپائیاں زور سے گر کر اچھلتی تھیں۔ وہ اپنے مرد اور وہ اسا پر ہو عمل کا تب
وقت اس کا سہی جواب ملنے جاتی۔ اس کا جواب آگ جاتا۔ وہ ذرا سال بعد بے بس ہو کر کرسی پر گر پڑتا۔ اس کا جسم لاہور پر چلنے جیسے
ہوا سے سانپ نہ ہوتا۔ وہ بے بسی سے ستاروں کو دیکھتا رات کے سناٹے کو سنتا۔ اس کے اندر زخم کھائے ہوئے سانپ
اٹھتا۔ پھر تا پھرتا ہر پاپی قلب صدمہ سے ٹوٹ کر تصنع کی پر ہول ملامت جیسے اس پر جھک جاتی۔
ستاروں کی کلیاں شاداب وہ یادیں سے بچھڑ کر گر پڑتے۔
تیسرا حصہ نہیں ملا۔
کیونکہ کتاب پر خاص پیر پر جھک جاتا۔ تنکوں کا سلسلہ دور دور تک بکھر جاتا۔
رات کا اندھیرا گو ہستے ہستے بہت کم ہو جاتا۔ بہ بہی کا سدرہ خود ہی آتو چپکا اور اس کا ایک ہی ہو سکتے ہوتے۔

[illegible] ہوگی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] تم نے کیا کہا؟ کیوں کہا؟ تمہیں [illegible]

بات کرنے لگی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سنبھال کر بیٹھ گئے جیسے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بیٹھے ہوتے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] عثمان نے اپنے ننگے سینے کے ساتھ اسے چپکا لیا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے ملی لگتی ہوں گی

"میں کتابوں میں صاحب کا [illegible] ہے۔ [illegible] کے مکروہ۔ سات سلام ہوں ایسی نوکری کو۔"
[illegible] نے [illegible] دیکھ کر [illegible] لیا۔

ایک روز شکیلہ [illegible] میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ پاس آکر بیٹھ گئی۔ ایک لڑکے سے [illegible] خوش ہو کر زندگی کتنی اچھی ہے۔ جمیلہ نے [illegible] ادھر ادھر دیکھا اور بولی:
"اچھا [illegible] کیسے ہو۔"
"کیا؟" شکیلہ [illegible] گیا۔
"وہ سامنے بیٹھی [illegible] سے وہ دوسری ہے [illegible] جیسے ہی [illegible] تھی۔"
شکیلہ نے [illegible] دیکھا۔ [illegible] پیچھے [illegible] میں [illegible] بیٹھی تھی۔ مگر اسے یہ اب معلوم ہوا تھا۔
جمیلہ [illegible] کے [illegible] کی طرف چل دی۔ شکیلہ نے [illegible] کہا جمیلہ کی چال کتنی اچھی ہے۔ پھر [illegible] اپنا [illegible]
[illegible] اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو جمیلہ اور [illegible] اس کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ اس کی قمیص پر [illegible] کی وہ دوسرے [illegible]
[illegible] جیسے وہ [illegible] تھے جیسے وہ [illegible] سے [illegible] کر چلی آئی ہو۔
"میرے میاں [illegible] سے [illegible] بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے پاس بیٹھ جا کرسی پر بیٹھ۔"

جمیلہ کی زبان میں [illegible] تھا۔

اس [illegible] جمیلہ [illegible] دیکھ رہی تھی۔ [illegible] جیسے ہی [illegible] کر [illegible]
[illegible] سامنے جمیلہ کے [illegible] پر [illegible] کر دی جو [illegible] سے [illegible] اس کا [illegible]
[illegible] نے [illegible] کا [illegible] گیا۔
اگلے روز [illegible] اور اس کی بیوی نے کمرہ خالی کر دیا۔ ان کے چلے جانے سے جمیلہ کو کوئی تکلیف نہ ہوئی مگر [illegible] کے
[illegible] جانے سے [illegible] کی [illegible] بیگم صاحب [illegible]
[illegible] ہے [illegible] ہیں [illegible] منظور ہو گی۔"
جمیلہ نے [illegible] دیکھی پھر [illegible] ہو گئی۔ [illegible] نے کہا "[illegible] بچے [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible] جائے تو [illegible] ہو جائے گی۔"
"ابا کیوں نہیں؟"

[illegible] کے ساتھ کمرے میں [illegible] تھے [illegible]
[illegible] کرتے۔ [illegible] کرتی۔ [illegible] کے

[illegible]

• ڈاکٹر کہتے ہیں۔ آپ کے بچے میں نقص نہیں ہے۔

• کیا وہ ٹھیک ہو گیا ہے؟

• ہاں۔

[illegible]

• تمہارے بچے بہت ہیں۔ [illegible]

• بیگم صاحب [illegible]

[illegible]

• [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

• کیا، بیگم صاحب! پانچ بچے پیدا ہونے [illegible]

• تمہارے پاس بچے ہیں نا؟

• ہاں [illegible] تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

• [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گلشن چاہتی تھی کہ وہ اس کی موت سے باہر نکل آتا [illegible] جب چاہتی تو [illegible] بیوی کو [illegible] ایک
[illegible] میں بیٹھے وقت [illegible] کی طرف [illegible] بیٹھی [illegible] کے پاس [illegible]
[illegible] کرسی کے پاس [illegible]

[illegible]
[illegible] شیشے میں [illegible]
[illegible] کرسی کھلی ہوئی ہے۔

[illegible] ستار نے [illegible] ۔ "[illegible] باہر آؤ۔"

وہ ستار جو گلاس صاف کر رہا تھا، یہ کہہ کر چلا گیا۔ جویریہ نے اُس سے کہا "میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ یہ کرسی صاحب کے سامنے سے [illegible] کہا تھا۔ اچھے صاحب [illegible] نہیں گئے۔ تمہاری بیوی نے یہ کرسی کیوں کھولی ہے۔"

اُس نے [illegible] کرسی [illegible] سے بند ہو گئی۔

[illegible] جویریہ اندر چلی گئی۔ جب آئی تو سکول کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے [illegible] بچوں کو سکول [illegible] دیا۔ [illegible] ستار کی بیوی کو [illegible] اور خود برآمدے میں بیٹھ گئی۔ [illegible] وہ کہتی ہے [illegible] گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہیں۔

"اچھی بات ہے: جویریہ نے [illegible] ستار کی بیوی [illegible] میں نے تمہیں [illegible] بتایا تھا۔ تم نے کیا [illegible] گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ [illegible] تم مجھے پتہ [illegible] وقت [illegible] دونوں کی [illegible] ہو جائے۔"

وہ ستار کی بیوی کا رنگ [illegible] کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ ہاتھ [illegible] بولی "میں [illegible] دکھاتی [illegible] جب [illegible] ساتھ [illegible] بیٹی ہے [illegible]"

جویریہ [illegible] نے [illegible] ہاتھ ڈال دیا۔ "زیادہ بات کی تو زبان کھینچ لوں گی۔"

[illegible] " وہ [illegible] بیوی نے [illegible] ہاتھ [illegible]

"[illegible] ہوش ہے۔ کبھی میں نے [illegible] کہا کہ تیرے [illegible]" جویریہ ذرا نرم ہو کر [illegible]

"[illegible] تیرے [illegible] نہیں [illegible]"

[illegible]

"اس نے [illegible] جویریہ کی [illegible]
[illegible]"

جمیلہ نے [illegible] سے [illegible] کر دیا۔ [illegible] جمیلہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کچھ نہیں تھا۔

[illegible] کچھ نہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ی خدا

دسیہ

ننھی بیگم شدت سے بھوکی تھی۔

اس نے چاروں طرف [illegible] اس وقت [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کے [illegible] کے [illegible]
[illegible] تھی۔ [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی بات تھی لیکن [illegible]
[illegible] پانی [illegible] پیٹ بھرے گی تو کیسے؟
[illegible] کی [illegible]
[illegible] نہایت
[illegible] نے جلدی سے [illegible]
[illegible]

اس سے پہلے تو [illegible] پیٹ بھرے گی تو کیسے؟

وہ [illegible] صورت
[illegible] وقت [illegible] کا تھا
[illegible] ہوا۔

[illegible] بہت پیارا تھا [illegible]
[illegible] ملازم [illegible]
[illegible] سب [illegible] کے

[illegible]

[illegible] میں
[illegible] ساتھ [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"[illegible] —— [illegible] ہے۔"

"[illegible]"

[illegible]

"بات کیا ہے؟ —— [illegible]"

"کوئی بات نہیں ہے [illegible] ——"

"[illegible] ہو گیا ہے ——"

"[illegible] ہے —— [illegible]"

"[illegible]"

"[illegible] ——"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ن ——

ہم نے بہت سر ہلایا، منتیں کیں، سمجھایا، ان سے دعائیں دلوائیں۔ لیکن اس کی [illegible] اور بھی بڑھ گئی۔ آپ کی [illegible] کی قسم کھائی [illegible] ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا [illegible] پھر قبول لیکن [illegible] گناہگاری کا [illegible] [illegible] کے قبا سے [illegible] بچے کی خوشی جا [illegible] راستے سے آپ کے کرتے ایسے پڑھتے [illegible] چونکہ [illegible] بیٹھ گیا [illegible]

لیکن ——

بچے نہ تھے اپنی —— ساری کی ساری کم ——:

پنکھے کی تیز ہوا میں بھی [illegible] وہ [illegible] کی طرح اڑ رہا تھا۔

حمیدہ کے گلے میں [illegible] ننھا سا جاوید چپ چاپ سو رہا تھا۔ حمیدہ کی گردن پر پسینے کے قطرے سوئی کے [illegible] ابھر آئے تھے۔ اس نے جاوید کی پیٹھ پر [illegible] ہاتھ پر انگلی بجا کر بولی۔ "بیٹے

——! اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ڈاکٹر سے مزید کوئی دوا لے کر آئیں کل ——"

"اتنے سے بچے کے پیٹ میں کیڑے! [illegible] کے پیٹ میں ہوں تو ہوں ——"

"سارا دن میری جان نہیں چھوڑتا۔ [illegible] اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں ورنہ رات کو تو سو رہا تا!"

[illegible] بڑی ڈھٹائی سے حمیدہ کی پیٹھ سے [illegible] ننھے ہاتھوں سے اس کی [illegible] رہا تھا۔

"میں تو جب تک اس کے ساتھ بیٹھ رہوں گی میری [illegible] نہ چل سکے ——"

"[illegible] پلنگ پر —— شیخ جی نے بہت سے [illegible]۔

لیکن حمیدہ [illegible] کے ساتھ لیٹ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے شیخ جی کے [illegible] سے گھن آتی تھی۔ [illegible] میں جب [illegible] حمیدہ کو [illegible] نفرت پیدا ہو جاتی۔ وہ تو قدرت کی ستم ظریفی سے وہ حمیدہ کے [illegible] حمیدہ [illegible] پلنگ [illegible] —— الٰہی ابا نے کیا دیکھ کر بیاہ دیا۔

جب حمیدہ [illegible] پلنگ پر [illegible] تو [illegible] جاوید کا ہاتھ اس کی پشت پر [illegible] جب نیند کا [illegible] غلبہ ہو گیا تو جاوید [illegible] کے [illegible] سو گیا۔

"[illegible] حمیدہ بولی —— "اس بار ہم آپ کے ساتھ [illegible] —— ہاں!"

"[illegible]"

"[illegible] ہیں۔"

خدا قسم [illegible] شاہ صاحب [illegible] تھے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جب [illegible]

[illegible] پیرزادہ صاحب [illegible] خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے۔ [illegible]

پیرزادہ صاحب [illegible] صاحب [illegible]

[illegible]

پیرزادہ صاحب [illegible]

[illegible] کیا چاہیے؟ —

[illegible] ۲۰ [illegible]
[illegible]

[illegible] —

[illegible] —— [illegible]؟
[illegible] نہیں کیجیے؟

[illegible] نہیں —— استغفراللہ!

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کہیں تھا۔

[illegible]

[illegible] ایک شام [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

اور —— [illegible] نیا باب شروع ہوا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شیخ صاحب [illegible]

شیخ جی چالیس کے پیٹے میں تھے اور تائی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ایک تو عمر میں بیس برس کا فرق تھا۔ دوسرے شیخ جی
صحت کے لحاظ سے [illegible] ... چھینک کیا آتی سارا جسم
ہل جاتا۔ [illegible] ... کبھی سانس اکھڑ جاتا ہے کبھی نسیں کھنچ جاتی ہیں۔ [illegible]
[illegible] ... نے چاٹ لیا تھا۔ آل کھٹ ... [illegible] ... کے
[illegible] تائی کی ... [illegible]

عجیب سی بات تھی کہ ... [illegible] ... کو صحت ... [illegible] ... خوبیاں کتنی ہیں۔ [illegible]
[illegible] ... شیخ جی آتی ... [illegible] ... بات دو سال سے ... [illegible]
[illegible] ... شیخ صاحب ... [illegible] ... دو سال بیت گئے۔ کبھی ... [illegible] ... نکاح کا نام [illegible]
[illegible] ... گئے۔ [illegible] ... رہ گئی ... [illegible]

شیخ جی کچھ ایسے ... [illegible] ... تھے۔ ... [illegible] ... تائی کا خیال رکھتے تھے ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... [illegible]
[illegible] ... زندگی ... [illegible] ... کہ شیخ جی
[illegible] ... [illegible] ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... [illegible]

[illegible] ... ایسی باتیں ہیں ویسے ہی تھی۔

[illegible] ... شیخ جی ... [illegible]
[illegible] شیخ جی ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... [illegible]
[illegible]

[illegible] ... بڑھ گیا۔

[illegible] ... [illegible] ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] ... شیخ صاحب ... [illegible]
[illegible] ... شیخ جی ... [illegible]
[illegible]

[illegible] ... شیخ جی ... [illegible]
[illegible] ... شیخ جی ... [illegible]

[illegible] جاتے ہیں مجھے کہتے اس وقت [illegible] ہو جاتے [illegible]
چہرے سے [illegible] سب پیدا ہوگئی۔ اب [illegible] پریشان ہوگی۔

"مگر یہ کوئی اجنبی کہاں آ گیا" [illegible] آپ [illegible] ——

[illegible] دیکھتے [illegible] لڑکی کی طرف چلنے لگے۔

"آپ یہیں [illegible] شیخ صاحب [illegible] ہوگا۔"

شیخ صاحب [illegible] عادت [illegible] سے بھی قریب [illegible] ہے ہی [illegible]
[illegible] ہوگئی ——

اب [illegible] شیخ جی کے ساتھ [illegible] جواب سنتے [illegible] کی۔ کچھ جب
[illegible]

شیخ جی [illegible] کر رہے تھے۔ [illegible] جلدی جانے لگے۔ [illegible]
[illegible] پیچھے [illegible]

"کیا [illegible] جانے کو شیخ جی؟ ——"

شیخ جی نے [illegible]

"میری طرف دیکھیے شیخ صاحب میری طرف ——"

"تم [illegible] بستر سے نکل آئی ہو ......"

"آپ مجھ [illegible] بیٹھیے [illegible] میری طرف دیکھیے ——"

[illegible] شیخ جی [illegible] ہو گئیں۔

"آپ کا [illegible] کیا ہے؟ ——" [illegible]

"[illegible] کمال ہے [illegible] کوئی پوچھنے والی بات ہے؟"

"[illegible] صاحب؟"

[illegible] ——؟ شیخ صاحب [illegible] چاہتے تھے۔

"میرا آپ کا رشتہ کیا ہے؟ ——" [illegible] سامنے کھڑی تھی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ——"

"آپ [illegible] بہت [illegible] ہے۔" [illegible]

"میں ... تم ... میری [illegible] خدا کے [illegible]"

[illegible] شیخ صاحب [illegible] —— میں نے [illegible]

ش

"—ب کرشن جی کا آپ آ پہنچے [illegible] ہیں۔"

بابا [illegible] کے پاس پہنچ گئے [illegible] کہاں آ [illegible] پھر [illegible]
[illegible] پر [illegible] بڑے [illegible] کر [illegible]
[illegible] پہنچے گا۔

"شیخ جی کیا بات ہے: جیسے آپ [illegible] ہیں [illegible] دیجیے۔"

شیخ جی نے [illegible] پسینے سے [illegible] کر دیے گئے۔ کل [illegible] کر رہی
[illegible] کہ [illegible] سب [illegible] چپ کرا دیتی ہیں۔ ویسے [illegible] شیخ جی [illegible] لگے تھے
[illegible] بات [illegible] شیخ جی [illegible] رہے تھے۔ خاتم
[illegible] اور [illegible] جاتی ہو ——
[illegible] ...... تو کیا حال ہو [illegible] کروں۔
[illegible] ——

[illegible] — شیخ جی آپ نے [illegible]
[illegible] آپ کے [illegible] ہوں گے آپ [illegible] ہیں
—— [illegible] پاس [illegible] رہے گی۔

[illegible] بیٹے [illegible] تھے۔ [illegible] سے [illegible] گذر رہی
[illegible] ایک [illegible]
[illegible] ایک
[illegible] بہت سے
[illegible] کسی [illegible]
[illegible] لگی
[illegible] بات [illegible] ——

[illegible] شیخ جی [illegible] خیال سے [illegible]
[illegible] تھی۔

[illegible] شیخ جی [illegible]
[illegible] تک ہی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ؟

[illegible] ۔

[illegible]

[illegible] تھی ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] گیا ۔

[illegible] گیا ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] وقت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پیشے کے [illegible] سے نکل ہو جائے۔

[illegible] جب [illegible] چکے تھے [illegible] میں جب [illegible] تھے [illegible]
[illegible] —

[illegible] ہے — کہ [illegible] چھوڑ دیتا ہے؟ —

تم کیا معلوم؟ [illegible] کرتے ہیں۔

[illegible] سب [illegible] — ہم [illegible] شیخ [illegible] جاتے ہیں۔

[illegible] کا شربت [illegible] حلق میں [illegible] آنکھوں کے [illegible] سے [illegible] کے کونے [illegible] — چلو جیسی کیا [illegible] تو [illegible] ہو گیا [illegible] روز [illegible] [illegible] جب وہ [illegible] ہونے لگی۔

[illegible] کہ وہ [illegible] اس [illegible] ہوا [illegible] متاثر ہوئی [illegible] کا سفید [illegible] کانوں کے دونوں طرف [illegible] جیسے [illegible] قدیم مصر کی [illegible] ہو۔

آہستہ آہستہ کانوں کی طرف بڑھنے لگے — —

شپ شپ ...... [illegible]

[illegible] — [illegible] بات تھی اتنے سارے [illegible] میں [illegible] شیخ جی کو یاد ہیں [illegible] اپنے مستقبل کے [illegible] تھے۔

بارش آہستہ آہستہ برس رہی تھی

[illegible] ٹپ ٹپ [illegible] گرتی تھیں۔ [illegible] بیٹھنے سے [illegible] جیسے وہ [illegible] میں بیٹھی [illegible] آفتاب [illegible] کسی [illegible] سے [illegible] رہی ہے۔ سارے گھر [illegible] زمین پر [illegible] رہی تھیں [illegible] [illegible] رہی تھیں۔

[illegible] تسبیح [illegible] پر [illegible] رہی تھیں۔

[illegible] شیخ صاحب [illegible] اس [illegible] سے [illegible] آپا [illegible] شیخ صاحب کے لیے [illegible] سارے گھر [illegible] شخص [illegible] بار [illegible] شیخ [illegible] بات [illegible] تھی۔ [illegible]

— [illegible]

[illegible] شیخ [illegible] ہے [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible] نہیں تھا۔ [illegible]

شادی [illegible] سال [illegible] بیٹے [illegible] آپ [illegible]

قسمت سے [illegible] تھیں۔ [illegible] صاحب [illegible]

شادی سے پہلے [illegible] شیخ [illegible] تھی۔ [illegible] تھی۔ [illegible]

سے [illegible] تھا۔ [illegible] شیخ [illegible] اپنے [illegible] شیخ [illegible]

[illegible] شیخ [illegible] عزت بخشی۔ [illegible]

[illegible] تھا۔ [illegible] شیخ [illegible] مرشد [illegible]

اس [illegible] تھی۔ حضرت [illegible] تھی۔ [illegible]

[illegible] تھی۔

[illegible] شیخ صاحب کے [illegible] گا۔

[illegible]

[illegible] شیخ صاحب [illegible]

کی [illegible] شیخ صاحب [illegible]

[illegible] شیخ صاحب [illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible] جائے گی۔

[illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible] ہے

اس [illegible] جائے۔ —

[illegible] شیخ صاحب [illegible] شیخ صاحب

زمین پر گھٹا چھایا ہوا — بڑی قیمتی ہے —
[illegible] شیخ جی کے [illegible]
[illegible] شیخ جی کو [illegible]
[illegible] شیخ جی [illegible] کے [illegible]
[illegible]

شیخ کو جیسا کہ [illegible] آیا۔

جب اس نے [illegible] تو [illegible] پہلے [illegible] ساری خوبیاں پیدا کر کے
[illegible] دیکھ
[illegible] پیل سیٹ پر [illegible] یقین ہے کہ
[illegible]
[illegible] شیخ جی [illegible]

تم کیا سمجھ [illegible] — — ·

حمیدہ [illegible] پیل سیٹ پر بیٹھ گئی۔
[illegible] — اے حمیدہ! جب [illegible] تو پھر [illegible] سے کام لینا کہیں
[illegible] — وہ نہ جانیں
[illegible] سب [illegible] ہیں۔ [illegible]

شیخ صاحب کو [illegible] بیٹھے —

[illegible] جیسی [illegible]

کینال پارک کی جانب سے [illegible] پیل [illegible]

کرسی پر بیٹھیں اور [illegible] تھا۔

[illegible] بیٹھی تھی۔

[illegible] زندگی کے [illegible] کی۔
[illegible] جب [illegible]
[illegible] تم جانتے ہو [illegible]
[illegible] شیخ جی سے [illegible]
[illegible] شیخ [illegible]
[illegible]

[illegible] شیخ جی [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] بیٹھ گئے۔
[illegible] —
تم [illegible] — [illegible]

[illegible]:

"[illegible] . . . . تب تب [illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

—

[illegible]

[illegible]

—

سری موت

لام علی چودھری

فضا بند دماغ پر مسلط ہے۔ چہرے پر پسینے میں مجھے اس کمرے کا [illegible] گم صم بیٹھا ہے۔ سمندر [illegible] کی پکار ہے اور موجوں کا ایک شور سا ہو رہا ہے۔

بند کمرے کی حبس [illegible] ہاتھ پر تھمتا ہوا پسینہ، آنکھوں کی [illegible] سیاہی سفیدی اور سانس کا لمبا اتار چڑھاؤ ....
کمرے سے باہر [illegible] دیکھ رہی ہے یہاں تک کہ [illegible] ہو گیا ہے۔ پسینہ خشک ہو گیا ہے۔ سیاہی سفیدی ختم ہو گئی ہے اور سانس لوٹ آیا ہے۔

شہر سے [illegible] دور ریل کی پٹڑی کے [illegible] کارخانے کے [illegible]
[illegible] کے سامنے [illegible] بند کر کے ایک [illegible] ہے۔

[illegible] مسافر [illegible] گاڑیاں [illegible] چلی آ رہی ہیں اور [illegible] جا رہی ہیں اور [illegible]
[illegible] کی چھت [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] ہے [illegible] والوں کی آوازوں کو
[illegible] دیتا ہے۔

[illegible] کارخانے کی چمنیاں [illegible] کے [illegible]
[illegible] ہیں۔ کارخانے کی [illegible] سے [illegible]
[illegible] سیکڑوں انسانوں سے [illegible] چھت کے
سامنے [illegible] ہو گئی ہے اور بند [illegible] ہو گیا ہے۔

بند [illegible] سر کے بال [illegible] پسینے [illegible]
[illegible]

بند [illegible] اور [illegible]
بند [illegible] ہو رہا ہے۔
[illegible] کیا [illegible] بند [illegible]
بند [illegible]

[illegible]

[illegible] ...... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ...... [illegible]

[illegible]

[illegible]

پاس بیٹھ جاتی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ے نے خوبصورتی سے اس کو سجایا ہے

بجھن جیجی بندے کے صبر پر ماجول ہو گیا ہے اور عزیزہ پاس کھڑی کولے سے پانی کی دھار ڈال رہی ہے۔ اس کے نقشوں سے ہو کی بکی بکی خوشبو [illegible] ہے اور اس کے پیچھے [illegible] ہے کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جب وہ گھڑا اٹھائے کنوئیں کی جانب جا رہی تھی راستے میں کانٹے نے کچھ اس سے چبھتے ہوئے گھر سے [illegible] گندے ابلتے ہوئے کپڑے کے رس کے دھاگے نے اس سے جب بجا ہے جسے چھوٹے بڑے ہر بڑوں نے شرارت کے ایسے جملے چھوڑے تھے کہ اس کے دماغ کے پردے پھٹتے تھے۔ وہ تو ہینڈ پمپ میں کا بھلا ہو کہ اس نے دیکھ لیا اور بیمار کر گھڑا اٹھا لانے کے لیے بھیج دیا۔ اور پھر خود وہاں سے [illegible] یار کوئی بندہ کا کیا حال ہے۔ عزیزہ بہت دنوں سے بیمار [illegible] استعمال کر رہی تھی مگر اسے اب معلوم ہوا ہے کہ یہ رشتہ والا ہے۔

بیمار پانی کا دوسرا گھڑا بھر کے لایا ہے اور ہینڈ پمپ میں سے [illegible] پر اس میں بیری کے پتے بھی ڈال دیا ہے۔ وہ اسے [illegible] کے قریب رکھ کے کھاٹ پر بیٹھ جاتا ہے کہ صحن سے ہٹ کے آگیا ہے۔ اس کے ساتھ تین اور آدمی ہیں جن میں [illegible] بیٹھا ہے۔ صحن میں سے پرال کی ایک چٹائی اٹھا لایا ہے اور وہ چاروں اس پر [illegible] باہر ڈال دیا ہے سامنے ہی بیٹھ گئے اتنے میں بیمار واپس اپنے ہینڈ پمپ کی طرف چلا گیا ہے۔

بندو کو نہلا دیا گیا ہے اور عزیزہ [illegible] کفن کے بیچ کپڑا ڈھونڈنے لگی ہے [illegible] ان سانولے بیٹے کی جیبوں کے نیچے پیسے [illegible] سبز [illegible] بھی ان [illegible] اپنے [illegible] جو [illegible] معلوم ہے [illegible] بندو کو [illegible] پیسے کی استطاعت بھی [illegible] اس کے [illegible] وہ [illegible] کو پیسے [illegible] نہیں۔ وہ کچھ دیر [illegible] میں [illegible] یہاں تک کہ [illegible] احساس کا [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] اپنے [illegible] کے بیچ [illegible] بہت [illegible] دیا [illegible] روپے [illegible] فرش پر صحن کے ہاتھ میں [illegible] کو [illegible] چادروں تلے [illegible] جنازہ اٹھا کے چلے گئے ہیں۔ بندو آج تیسرے دن [illegible] گزر گیا ہے۔ وہ صحن میں پرال کی چٹائی پر بیٹھی [illegible] ہے اور عزیزہ اس کے پاس بیٹھی [illegible] ہے۔

قبرستان [illegible] کے [illegible] سے بہت [illegible] کے [illegible] کی [illegible] ہے۔ [illegible] میں [illegible] بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ [illegible] بیٹے گھر [illegible] [illegible] ساتھ [illegible] بات [illegible] ہے۔ وہ [illegible] ہینڈ پمپ [illegible] بیمار [illegible] [illegible] بچا [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] پیسے [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سمندر کا پھیلاؤ اور پہنائی وہ محسوس کر رہا ہے۔ بندو نہ کہتا کا بیچ ہے یا نہیں دعا کرے کہ کہیں بیچ ادھر سادہ منظر سا
بہے۔ وہ اس کے ذہن سے نکل جائے گا۔
پھولوں کی جیب وہ سونے کا تعویذ اور اس کی چمک کمانے والی چندیا اور پاؤں دابنے والے ہاتھ کہاں ہیں۔ بندو
بھاگ گیا تھا تو تیسری بار بھاگ کیوں نہیں جائے گا۔ بندو آنے جانے رہے گا۔
ویرانی کا ریشم اور خوشبو اور زردی والی شہوت کیسی کر رہی ہے۔ بندو پرانا ہو چکا ہے میں اس کے جھوٹے غم میں کیوں
رو جاؤں؟
وہ کلیسے اور پیرس کے گھر سے نکل کر دل کا سناٹے کو پکڑ کر تیرتی بستیوں کے دہانے اور کالے اژدھے کا نکلنے والی چھنائیاں
کا مخلوق ہوتی دشتیں اور گھڑی اور بڑا دیر رہتے کے اس گشت شبانہ روز گھومتے ہوئے تپتے پنپے اور دن رات چیختے چلاتے
ہے دل اور بستیاں اور ادیں اور جوڑ گویا اپنا رہے ہیں تال بجا رہے ہیں بیچ بجا رہے ہیں کہ سمندر اور پھولوں اور ویرانی نے
ان کا بھید پالیا ہے۔

[illegible]

[illegible] ... چنانچہ [illegible] ...

[illegible]

جب وہ [illegible] سے رخصت ہوئی تو اس کی زندگی کا [illegible] ... اس کے دل میں [illegible] کے خلاف [illegible] ... [illegible] ——————— [illegible] قرآن مجید [illegible] ... [illegible] قرآن مجید [illegible] ... اپنے رب سے دعا کی [illegible] حفاظت کرے!

اس نے [illegible] قرآن مجید [illegible] ...

[illegible]

[illegible] ... چنانچہ اب [illegible] ...

[illegible] ... وہ پہچان نہ سکی وہ کون ہے!

[illegible] ... چنانچہ [illegible] ...

[illegible] ... ساتھ [illegible] تھی!

مجھے نے بیچ شمیم کو یہ تمام باتیں سنائیں لیکن شمیم صرف مسکرا دی شمیم کی مسکراہٹ میں ایک راز چھپا ہوا تھا۔

اتنے میں چائے کی دوسری پیالی لیے جبیں آ گئی اور مجھے نے شمیم کے کمرے سے اپنے کمرے میں چلے جانا مناسب سمجھا کیونکہ جبیں یا شاید [illegible] میں کچھ ایسی باتیں کہہ کر سنا دے کہ تو مجھ پریشان ہو جاتی۔

جبیں نے مجھ کو جاتے دیکھ کر شمیم سے کہا "بہت بہت اداس اداس ہیں یہاں آ کے میں لیکن ہر ایک کے چہرے پر [illegible] تھا [illegible] قہقہہ [illegible] نے؟"

شمیم نے ترس کھاتے ہوئے کہا "بیچاری کو کچھ معلوم ہے" جبیں نے جھنجلا کر کہا "ایسی سیدھی سادی خوب مزے کرتی ہیں ہم [illegible] میں اگر بدنام ہو جاتی ہیں"

شمیم نے کہا "نہیں نہیں ابھی اس کی ایسی کوئی بات نہیں" جبیں نے طنز سے کہا "تو بیک اینڈ کمپنی میں یونہی نہیں نوکری مل گئی [illegible] پر بیٹھے بیٹھے پیسے سے اڑا لیتی ہے"

شمیم نے دوسرے دن کی سپرنٹنڈنٹ کو آتے دیکھا تو جبیں کو مشورہ کر کے چپ ہونے کو کہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے دور ہی سے پوچھا "شمیم رات بیک صاحب تمہارے ہاں آئے تھے؟" "نہیں تو کیوں؟" شمیم نے الٹا پوچھ لیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے لاپرواہی سے کہا "کچھ نہیں [illegible] کے پچھلے پارک میں رات بیک صاحب کی کار کھڑی تھی" شمیم نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا "یہ تو اکثر [illegible] ہیں" سپرنٹنڈنٹ نے دور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "خیر یار تم تو اڑاتی ہو [illegible] کوئی اچھا تو نہیں کرتی۔ کوئی شور و غل تھا اور ہنستے ہوئے باہر نکل گئی وہ کمرے سے شکایت جاری تھی کہ شمیم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "[illegible]"

مجھ کو بیک اینڈ کمپنی میں کام کرتے تین چار ہفتے گزر چکے تھے شمیم سے وہ طلوع نہ تھی وہ [illegible] دفتر میں اپنے افسر کے سامنے بیٹھی رہتی اور اس کا تمام وقت بیکار ہی یونہی بیٹھے گزر جاتا حالانکہ اس کے ساتھ کام کرنے والے مرد [illegible] پسینہ [illegible] والے مزدوروں کی طرح سارا دن کام کرتے رہتے اور مجھ کو دفتر میں یونہی بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک اشتہار کی مانند دفتر میں [illegible] دیکھنے کے لیے رکھی گئی ہے اور اس کا کام دفتر کی زینت بڑھانا ہے۔

مجھ نے ایک دن شمیم سے بیزار ہو کر پوچھا "تم دونوں کے بیکار ہونا [illegible] میں ایسی [illegible] لیے دیتے ہیں [illegible]" —— بہت زیادہ [illegible] ہوتے ہیں" شمیم نے ہنستے ہوئے کہا "کمپنیوں کے مالک سمجھتے ہیں لڑکیاں لڑکوں کی نسبت تجارت زیادہ اچھی طرح [illegible] کر سکتی ہیں۔" مجھے نے اپنے متعلق سوچا اور [illegible] سے ان کو ماں میں جا پہنچایا [illegible] حالانکہ تو کوئی دوسری بات نظر آتی ہے کیونکہ [illegible] کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے تم وہ کوئی بہت بڑا راز ہو۔

ایک دن شمیم کچھ دنوں کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ [illegible] چلی گئی۔ جب واپس آئی تو شمیم [illegible] کے [illegible] میں تھی [illegible] شمیم نے دیکھا کہ مجھ [illegible] ہے۔ شمیم نے ہنستے ہوئے پوچھا "کہو جان میرا [illegible] ہی [illegible]" مجھے نے [illegible] مسکراہٹ [illegible] سے کہا "بیک صاحب کی کمپنی میں بیٹھے بیٹھے کام [illegible] نہیں بیکار [illegible] جاتی ہوں" شمیم نے

[illegible] بیلا بیٹھے بیٹھے [illegible]
[illegible] تم [illegible]
[illegible] اور ڈاکٹر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible]

[illegible] بیٹھ گئے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

بیگم

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] بیگم صاحب [illegible]
[illegible]

[illegible]

بیگم نے جواب دے دیا "میں اعلیٰ [illegible] ہو گئی ہوں"۔ وہ کانپ گئی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ آخر وہ گھبرا کر کار میں یوں بیٹھ گئی جیسے صاحب نے اس پر کوئی حربہ پھینک دیا ہو!

کار تیزی سے [illegible] کے بعد رکی تھی۔ وہ بھی خاموش بیٹھی ہوئی راستے کی رونق دیکھ رہی تھی جیسے وہ [illegible] اس کی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہو۔ اس کے ذہن [illegible] وقت جو کہ وہ جانتی ہو کہ اسے [illegible] کی تمنا رہتی ہے اور اب بیگ صاحب کی کار میں کیوں ہے۔ بیگ صاحب کی نیت کیا ہے؟ بیگ صاحب اس سے کیا چاہتے ہیں؟

کار ایک [illegible] کر کے [illegible] پر آ گئی تھی۔ بیگ صاحب نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا [illegible] بھی اپنے [illegible] تو شہر تو آپ کی بہت تعریفیں کیا کرتے ہیں۔" [illegible] نے [illegible] جواب دیا۔ "بیگ صاحب دراصل [illegible] معاف کیجئے [illegible] گھر کے [illegible] میں اپنے گھر والوں کی [illegible] نہیں کرتی۔"

"مگر [illegible] پڑھی لکھی [illegible] شاید آپ کی [illegible] پرانے خیالات کی ہو۔" بیگ صاحب نے [illegible] کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] بات [illegible] کرتے جواب دیا۔ "بیگ صاحب دراصل میں [illegible] کام کرنا نہیں چاہتی۔" اور اپنے بٹوے سے اپنا استعفیٰ نکال کر صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

کار چل رہی تھی۔ بیگ صاحب [illegible] دیکھ کر [illegible] اور پھر بڑی [illegible] سے کہا۔ "جو اب تم ہماری ملازمت میں نہیں ہو تو اب [illegible] افضل [illegible] میں تمہیں [illegible] بھی [illegible] سکتا ہوں۔" [illegible] نے کچھ جواب نہ دیا اور [illegible] کے [illegible] پہ خاموش ہو رہی۔

بیگ صاحب نے [illegible] کوشش کی کہ وہ [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے پیچھے [illegible] ہو گا۔"

[illegible] خاموش ہو گئی۔ بیگ صاحب [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] بیگ صاحب کے [illegible] [illegible]

[illegible]

کہ لڑکی کے شوہر سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھ سے بہتر کوئی اور کیا ہو سکتا تھا [illegible]۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ [illegible] ہے ایک شریف [illegible]۔ میں نے محسوس کیا کہ [illegible] کے منہ سے جیسا خون نکل آیا۔ بیگ صاحب مجھ سے [illegible] بیگ صاحب کے منہ [illegible] اور تلاش بھرا [illegible] کے معاملہ میں بحالی کی ٹھیک سے [illegible] سمجھ گیا کہ بیگ صاحب [illegible] بحالی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ [illegible] خوشیوں اور امیدوں کا [illegible] یہ خیال آتے ہی بیگ صاحب کے [illegible] پیسے لے گئے:

مجھے اس وقت [illegible] بحالی [illegible] اور اس کی [illegible] میں اس کی عمر [illegible] کی شکل میں [illegible] مسکراتے ہوئے دیکھا۔ [illegible] وہ اپنے [illegible] میں [illegible] بھی [illegible]۔ میں [illegible] اس [illegible] تھی [illegible] اس کے چار [illegible] آنکھیں [illegible] اور [illegible] تھی کہ [illegible] آج [illegible] چاند [illegible] اس واقعہ [illegible] اپنے گھر سے بہت [illegible] تھی اور [illegible] [illegible] اس نے محسوس کر لیا تھا [illegible] کی زندگی [illegible] کرنے کے لیے [illegible] کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا بیگ صاحب لڑکی کی طرف آہستہ آہستہ [illegible] رہے تھے [illegible] پیچھے [illegible] بیگ صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی اور بیگ صاحب [illegible] محبت کا پیغام [illegible] [illegible] محبت کا [illegible] [illegible] پیشانی پر پسینہ آگیا [illegible] —— [illegible] فوراً خیال آیا کہ وہ [illegible] [illegible] وہ [illegible] [illegible] [illegible] میں اس وقت کا [illegible] نہیں [illegible]۔ [illegible] بیگ صاحب [illegible] وہ [illegible] اور بہت [illegible] لڑکی [illegible] بیگ صاحب نے [illegible] شروع [illegible] —— میں نے [illegible] انگلیاں [illegible] بیگ صاحب [illegible] زندگی [illegible] [illegible] دولت تھا — قدموں پر ڈال دینے کو تیار ہوں:

مجھے [illegible] اور [illegible] پیشانی [illegible]

مجھے [illegible] خیال نہیں [illegible] یقین نہیں ہو گیا کہ بیگ صاحب چل بسے ہیں:

اور [illegible] زندگی کا [illegible] تھا [illegible] ایک [illegible] بار [illegible] محسوس [illegible] کا [illegible] [illegible]

ضرورت ہے۔

کا کام [illegible] وہ [illegible] میں [illegible] بیٹھی [illegible] رہی تھیں:

ماں

محمد شریف

[illegible]

"میں تو جیسے [illegible] پانی ہو گیا تھا ——— گٹ پانی ہو گیا تھا ——— گدلا پانی ہو گیا تھا ـــــ"

میں جیسے سو گیا۔ خواب کے ساتھ [illegible] کے ہاتھ [illegible] تسلسل سے چل رہے تھے۔ [illegible] دونوں ہاتھ ایک [illegible]

[illegible] پڑھتے۔ پھر [illegible] کے پیچھے [illegible] کے کمرے [illegible] تھی۔ اور پھر [illegible] پڑھتے۔ جیسے [illegible]

[illegible] کے قریب سے [illegible] کے کھینچ کر [illegible]

"کیا ہے؟"

میں [illegible] کی گود میں [illegible]

"[illegible] میرے [illegible] اور حفاظت کر [illegible]۔"

میں [illegible] کے درمیان [illegible] کے پیچھے [illegible] کے [illegible] کر [illegible] گئے۔ [illegible]

[illegible] کے سامنے [illegible] کتاب [illegible]

[illegible]

[illegible] باتیں [illegible] تھے [illegible]

[illegible] کی [illegible] ہوتی ہے۔

[illegible] تھی۔ [illegible] ان [illegible] کو [illegible] تھا۔ [illegible]

[illegible] وہ وقت [illegible] کی طرح [illegible] میں نے [illegible]

[illegible]

[illegible] کہنے لگی

"[illegible] کی [illegible] چادر میں چھپانے [illegible] تو [illegible] بہت [illegible]۔"

[illegible] کو [illegible] گیا۔ [illegible] نے [illegible] کر [illegible] سے [illegible]

[illegible] کہنے لگے

"[illegible] کی [illegible] ہو جائے گی۔"

[illegible] تھے۔ [illegible] کہ [illegible] سے [illegible]

[illegible] میں [illegible] کے [illegible] میں [illegible] کی [illegible]

[illegible] کے [illegible] جاتی [illegible] کے [illegible] سے [illegible]

[illegible] میں [illegible] ——— [illegible] میں [illegible] کی [illegible]

میں [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کر [illegible]

پھر [illegible] گھر میں سب [illegible] سے [illegible] تھے۔

اُس نے ناک کے لیے سے ملا کر روک لیا۔

میں ابھی تک برتنوں کے ڈھیر میں الماری کے نیچے پڑا تھا۔ آپاں جس طرح جھک کر پلنگ سے اُٹھی تھی اُسی طرح اسپ سے بیٹھ
اس کی آنکھوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

ماں کا چہرہ بہت غم زدہ تھا جیسے میں بنگلے میں سوا تھا والوں کے تو تاریک خلا میں دو لوگ اس طرح نظر آ رہے تھے
کہ قبرستان میں چند قبریں قریب قریب ہوں ——— یہ بلی تھی۔ میں نے جلا کر دیکھ کے ساتھ کھڑے ہو کر پہنچ کی
پو وصلا دیا اور ڈیوڑھی میں آ گیا

ایک دنیا میرے پیچھے تھی اور ایک دنیا میرے آگے۔ بیچ کے دو بیب پاٹ تھے جن کا درمیانی خلا لمبا لمبا ہو رہا تھا۔
میں نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں اور دروازے کے پیچھے چھپ گیا
میں اندھیرے کا لالٹین اوڑھے دبکا کھڑا تھا کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
آپا سے۔

اب کی دفعہ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اسے دیکھ کر میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پہ رکھے
آگے سے کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔
"تیرے گھر جانا ہے گا۔"
میں نے بچوں جیسا منہ ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی
"تیرے آپا کا بیاہ ہے۔ ابھی۔ آپاں کے ساتھ۔"
اس کی بات بہت دکھی ہی تھی۔ اس وقت میرے سارے وجود میں آگ لگی تھی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت
کے نرم ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر مجھے قرار آیا تھا۔ میں آپا کی بات سمجھ نہیں سکا وہ سیدھی کر کے گئی۔ بیت پر تھا ایمان بھلا اسے زندگی
ملتی تھی کیا اس نے مجھے دھکا دیا اور میں ڈر کر دھاڑیں مار کر رو پڑا۔
"دور۔ کمینے۔"
وہ اس دن کی طرح غصہ ور تھی جس کا سارا مال ہتھیائے جا رہا ہو۔ میں سمجھ رہا تھا کہ جیسے اندھا تھا۔ اس کے اندر غصہ تھا۔
اور بچہ تھا ——— میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔
ہمارے گھر سے ملا ہوا ہی ان کا مکان دکھائی دیتا تھا۔ مجھے ڈر سا لگتا تھا۔ میرا خوف تھا۔ اور اس میں امی بہت ڈر گئے جیسے
ہمارے گھر کے پیچھے پردہ تھا۔ اس پہ آپا کا مہمان سب ساتھ ساتھ چلے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں ان کے جیسے کوئی چیز نہ تھا کبھی کبھی
کچھ سا تو ساتھ آپا اور میں ساتھ ساتھ بیٹھ جاتے تھے
میں سامنے بیٹھے ہیں آپا کے چہرے کو بغور دیکھتا۔ پیار بھری نظروں سے تب آپا ڈر گئی تھی اور اب کی بار آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ اُس
نے میرا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا اور پہلے کی۔

[illegible]

"تب ـــ چاند کو دیکھتی ہیں ؟"

[illegible]

[illegible]

کریں۔

"نہیں۔"

[illegible]

[illegible]

"کہیں بیس ملا کیا چاند ؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"نہیں ـــ ہے !!"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوئی حالت بارش سے شدید شاخوں میں چھپے اس پرندے کی سی ہو گئی جس کے سر پر اچانک اولے آگرے۔ پھر اماں کا دل چاہا اس کے بیٹے سر پر وہوں کی بارش ہونے لگے اور اس کا سر چاند ماری کے تختے کی طرح زخموں سے اٹ جائے اور جب خون بہہ کر اس کے منہ میں پہنچے تو وہ اس کو منہ میں آنے والی قطرات شہد کی طرح چاٹنے لگیں

دروازے کے اس طرف وہ کھڑکیاں کرنے لگیں اور آپ سے خوش سے اپنے گرد سنہری تاروں کا جال بننے لگے۔ برکت جتنی تو وہ تصویر میں پڑی موم کی طرح پگھلنے لگے۔

ایک شام برکت بی بیٹھی تھی کا دروازہ نیم وا کیسے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کالا سا چہرا جما ہوا تھا۔ چنبیلی کی شاخوں پر ڈھلکی ہوئی دھوپ کے سرے کی سہولت بیلوں میں بیٹھے چھپے ہوئے تھے اتنے میں برکت بی کی نظر ماں کی رحمت علی پر پڑی اور وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔ آپا کر دیکھ کر ماں کی رحمت علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اباو اس خواب کی طرح جیسا ہوا کیا۔ کی نکل جانے کے بعد سے ایک ٹھیکلیوں کا پتہ تھا۔ شہد دھیرے کر کے شاہ کی میں صندوق کے پیچھے چھپے۔

اب پتہ نہیں تو ماں کی رحمت علی کی دور اندیشی کا نتیجہ تھا یا برکت بی کے عشق کی تاثیر کہ دادی والا مہینہ پر کر کے شادی کا ذکر آگیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر برکت بی کو دلہن بنا کر گھر لے آئی۔ ماں کی رحمت نے اپنے دادا کے بڑے بانے میں جیسا کی ایسی عمر کی سی وہ کا مکمل روپ لیے ہوئے جو دیکھنے والی شادی اندیشی برکت بی تو اس وقت کے بیٹھے میٹھے میاں سے جا کر چھپا لی۔ شادی کے ہنگامے ذرا ٹھنڈے پڑے تو ایک دن اماں نے ہر کونہ دیکھ کر جائزہ لیا اور بھی بیٹ دیکھ کے کر بیٹھے کے اندر کھڑی ہو کر زنانہ عورت پر چھا گیا۔ دادی نے ہنس کر بہو کی طرف دیکھا۔ وہ پاؤں اس کے قریب آئی۔ اس کے سر پر دونوں ہاتھ گھما کر اس کی ساری بلائیں اپنے سر کا صندوق کی چابی اس کے سپرد کرتے ہوئے بولی

"بیٹا اتنی تنگ تنگ ہو دو دونوں نہا کر ہوتوں چھو"

حد تھی انتظار دھیروں کا شوق میں چلی گئی۔ ابا اس وقت گھر میں تھے انھوں نے سب کچھ دیکھا، سب کچھ سنا اور تماشا کر بنا کچھ کہے وہاں سے چلے گئے

بس امی کی دو واپس رہ ۔ تے وا سے نظروں میں ۔ رہ کا انتظار رہتا گیا۔ ان کا سر جھکتا گیا اور ان کی مسکراہٹ ۔ میں پھر اکیلی تھا تھے جیسے وہ زہر میں بدل گئی

دو دن پہلے رخصت ہوئے وہ سال جو جس نے جی بھر کے بھی صورت نہ دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار ستارے جل رہے تھے اس میں ہی وہ بھی جیسے جیسے مسکرا رہے

وہ دن خوشی سے پاگل ہو گئی۔ وہ بکھری ہوئی تھی۔ جاکر کے گھر سے بھی دیکھتی رہی اور جب کے انتظار کر دیں بیٹھے تو تماشا ملے جوڑ دیا۔ آنکھوں میں جیتے جاگتے اور بھی بولنے لگیں

وہ وہ ایسی کر دوں کو کر ایک ہی دھوپ سے گئی۔

دھیرے دھیرے اس کی حالت اس دن کی سی ہوتی گئی جس کو پکڑ کر ایک طرف ڈال دیا گیا ہو اور پھر ایک کو لا کر اس

[illegible]

بابا نے بیٹی کی بات چلائی تو میرے کہیں جیسے آگ لگ گئی۔ مجھے ہے کہ انہوں نے چہرے پر لکھے کرب بتا کے آئینہ دل میں جی جلاتے رہوں
سن بات یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں دیکھنے والوں کی ہمدردی کا نشانہ بنوں۔ بس میں وہ زندگی بھر جلتے رہے تھے۔ وہ میرے
ساتھ سے چلا جانا چاہتے تھے کہ جو درد ان کے دل میں پلتی رہتی تھی۔

میرے قابو سے نکل گئے تھے۔ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ میں نے سوچا انشاء کے ساتھ کر سکے میں وقت چپکے سے مر جائے۔

پھر خیال آیا ــــ کیوں نہ میں ہی مر جاؤں۔ میرا وجود ہی بابا کے سارے دکھوں کی جڑ ہے جب سے بہت عرصے سے
مرجھائے گا تب سب جائے گا ــــ میں نے ٹوپیا پسے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ چاند نے میرے گرد سنہری تاروں کا جال سا بن
دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ قدم قدم ہی گہرائی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ ندی کا ٹھنڈا پانی میرے بدن کو چھو کر نکل گیا۔ ایک قدم پر سسکتی زندگی
آنکھیں چار ہونے کو تھیں۔ اتنے میں دور سے وقت کی آواز آئی۔ وہ چاند کی طرح کی روشنی لیے کنارے پر کھڑے شاہ بابا پکار رہی تھی۔

"بابے ـــ صے بابے؟"

میرا اٹھتا ہوا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں ندی سے نکل کر سیدھا گھر کی طرف بھاگا۔ اماں جی ماں کے برجے کے قریب دھندلے میں بیٹھ
کے رستے پر تھیں۔ میں نے دور ہی سے پکارا۔

"اماں"

وہ اس سے لپٹ گیا۔ یقین وہ اور نہیں تھی۔ ماں تھی۔ وہ بے چینی سے مجھ کو پوچھنے لگی

"تم نے بابے کو دیکھا ہے کہیں؟"

وہ جانے کہ نصیب بابے کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ میرے پاس جیسا انہیں کیا جواب دیتا .... میں تو صرف یہ کہ بابے کو جانتا
ہوں ـــ گھر میں خاموش رہا۔ اماں اس کے بازوؤں سے نکل کر گھر کی طرف ہو لیا۔

زرد پھول

وقار بن الٰہی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کوئی بھی ڈاکٹر نہیں ہے۔ ویسے یہاں کیا آیا ہوں، دو سال اور دو ماہ [illegible] ہے۔ درد سینے میں ہو تو اس کی تکلیف اتنی نہیں ہوتی لیکن اگر
[illegible] ہمارے گھٹنے میں چھپ کے بیٹھ جائے تو پھر وہ نہ جینے دیتا ہے اور نہ ہلاکت کو گلے لگاتا ہے۔

بعض کیوتر سے پیتے ہیں لیکن پیرانے سے سنبھالا نہیں جاتا۔ [illegible] میرے سیکڑوں تصویریں بنا ڈالتے ہیں لیکن کام کی [illegible] ایک بھی نہیں ہوتی۔ اسلم بھی انہی میں سے ایک تھا۔ سارے شہر کو برف میں ڈھکا دیکھ کر اس نے اپنی بلیک اینڈ وائٹ کو نکال [illegible] تھا اور تین فرلانگ دور کے [illegible] سے بار بار [illegible] اور نیچی نیچی ڈھال پہ چلنے لگا جیسے کوئی بہت بڑا سرمایہ اٹھائے ہوئے ہو۔ سارے [illegible] جب ہم سرکاری کوارٹروں کی ڈھلوان راستوں پہ چلے تو اسلم نے ایک دکان کے پاس [illegible] ایک اور خود کچھ [illegible] انداز سے کیمرہ لیے چلنے لگا جیسے وہ بھاری تصویر بنا رہا ہو۔ میں اُکتا کے یہ بغیر نہ رہ سکا۔

[illegible] ہے۔ اگر اس نے تمہیں [illegible] دیئے ہیں تو ——— میں نے بڑھ کر اس سے چھین لیا۔ پھر کیمرہ کو ڈھونڈ [illegible] اس کے [illegible] پس منظر میں بہت اچھی تصویر دیں گے۔ پھر ——— اور میں اسے ہانکتا ہوا پھر اُس لڑکی کی [illegible] پہلے [illegible] پہنچے تو ہم دور تک بھٹکتے رہے۔ اول تو کوئی [illegible] چہرہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور [illegible] تو اس کے [illegible] میں فرق [illegible] ستے بند تھی۔ ایک جگہ جہاں سڑک کافی چوڑی ہو گئی تھی اور دکانوں کے سامنے [illegible] بند دکانوں کے سامنے برف کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک نیلا فراک پہنے [illegible] نظروں سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی دو تین [illegible] کھڑی تھیں۔ ایک کا لباس بہت [illegible] تھا اور باقی [illegible] سادہ کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ وہ [illegible] لڑکی کی طرف [illegible] پیچھے بند دکانوں کی طرف [illegible] غور سے مجھے دیکھا

[illegible] میں اس کی بات سمجھ گیا ——— مجھے [illegible] اجازت کی ضرورت نہیں [illegible] میں نے [illegible] کیا اور پھر [illegible] کے بالکل پاس جا بیٹھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں [illegible] میں نے [illegible] نہیں۔ میں نے [illegible] تصویر بنائی جبکہ وہ [illegible] پہلے [illegible] تھی اور پھر [illegible] کے میں نے ان عورتوں کی طرف دیکھا [illegible] چہرے پر [illegible] اور [illegible] دیکھ کے [illegible] ہے۔

[illegible] جیسے [illegible] اور ——— وضاحت کے دوران میرے [illegible] دیکھ رہا تھا [illegible] میں نے [illegible] بالکل [illegible] کی طرف دیکھا [illegible] درمیان میں [illegible] ہوا اور وہ [illegible] مجھے لگتا تھا جیسے [illegible] میں بیٹھے ہوئے [illegible] سے اتر گئے [illegible] بچارگی [illegible] ہے۔ [illegible] وقت بھی مجھے [illegible] محسوس ہوا تھا جیسے وہ [illegible] کو قتل کر دیا ہے اور اب [illegible] نگاہوں کا [illegible] جیسے پانی میں [illegible] گئی ہیں [illegible] گئے تھے [illegible] ہوا تھا۔

[illegible] میں [illegible] کر [illegible] ——— [illegible] لگتا ہے [illegible] کب کہاں اور کس وقت وہ مجھے [illegible] ——— [illegible] پانی اور دوسرا

[illegible] ہوتا ہے جیسے ابا اور سوتیلی اُن کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ [illegible]
[illegible] میں [illegible] آ رہا۔ پھر ایسی باتیں ... [illegible]
[illegible] چپکے ... [illegible]
[illegible] ... [illegible] —— تو [illegible]
اس بیہودہ پن سے ہم نہیں نکل سکا۔

چونکہ وہ یہی چاہتی تھی کہ میں ان کی ... [illegible] ... ایک کتاب [illegible]
[illegible] کرنے لگی ... [illegible]
[illegible] کتاب ... [illegible] ... پڑھنے سے پہلے ... [illegible]
[illegible] وہ کتاب ... [illegible] ... دیکھ کر پھر [illegible]
[illegible]
[illegible] ... کتاب کے [illegible]
[illegible] ... چند برس [illegible]
[illegible] ... دیکھا تھا کہ کتاب ... [illegible]
[illegible] ... چاہیے ... [illegible]
[illegible] میں نے کتاب بند کر کے اس سے ملا۔

"آپ مصروف ہیں تو میں آپ کو یاد دلا دوں ——" وہ بھی قدرے گھبرا کر کہ میں نے اس کی پریشانی کو شاید ... [illegible]
پھر وہ جلدی سے اٹھا دی۔ یہ وہ مسکراہٹ زبردستی کی تھی۔ اس نے بھی کتاب بند کر دی۔ ساڑھی کے پلو کو درست کیا اور
کھڑی ہو گئی۔

"سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ آپ کو یاد دلا دیجیے ——"
"مری جان ... [illegible] کے ساتھ ایک ... کی تصویر ——" باقی فقرہ اس کی ہنسی میں ڈوب گیا۔ وہ ہنستی ہوئی
کے دروازے پر ... کتاب ... [illegible] کتاب رکھ دی اور پھر ... تھی۔
"جی، جی کہو۔ یاد رکھو نہیں آ رہا کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے۔ بچی کی تصویر تو آپ نے بہت عمدہ بنائی ہوئی
[illegible] جب بھی ... [illegible] ... کی تعریف میں دو چار ... [illegible]!
ہو گیا

"اس وقت تو کہیے۔ آپ کہیں تو میں بتا دوں گا۔ لیکن ——" اس نے یہ بات ... [illegible]
چپ چاپ باہر نکل گئی —— [illegible] ... [illegible]

[illegible] خوشبو [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ [illegible] ——— اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں

شام [illegible] سے تھوڑی دیر پہلے جب میں گھر سے نکلا ہوں تو میں نے [illegible] دونوں ایک جیب سے نکال کے دوسری جیب میں [illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] سامنے تھے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"آپ نے بہت دیر کر دی۔ [illegible] چلیے، اچھا ہی کیا آپ نے۔" [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں نے نہیں کہا تھا [illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ بہت [illegible] تھی۔ [illegible] تو مجھے یاد آیا کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] کتابیں پڑھتا تھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

• [illegible] ہوتا ہے ——— [illegible]

• [illegible] ——— تم بے حد مصروف [illegible]

[illegible]

• [illegible]

[illegible]

• بہت سے مصنف تمہیں پسند ہوں گے ——؟

• [illegible]

[illegible] مصنفوں کا انتخاب تو بہت دور کی بات ہے۔ جس کی کتاب سامنے آجائے ، اُسی کو پڑھ لیتی ہوں ——— [illegible]

[illegible]

• [illegible] میں چلتی ہوں۔ [illegible] ———

[illegible]

اُس روز [illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ اُسے پالے ہوا تھا، بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب بہت سے لوگ میرے پاس کھیلتے تھے وہاں تیس بیٹھ وہ پڑا رہتا تھا کہ اس پر کوئی سبز شاخ نہیں نکلتی، بہت ہی تھا کہ کوئی پتہ ہوتی تھی کوئی پھول کھلتا ہی تھا۔ میری یادداشت کے باوجود وہ ہمیشہ ہی خشک رہا۔ پھر پتہ ہی نہ تھا کہ کسے خشک ہو کر رہ گئی۔ زینب ہر مرتبہ اس کے لئے کوئی پودا لاتا۔ آہستہ آہستہ یقین سا ہو گیا کہ زینب کی محبت کا کوئی نہیں پھلے گی۔ اس کے گالوں پر کبھی گلاب نہیں کھلیں گے۔ اس زمین کو جائے اس کے چہرے پر کبھی سرخی نہیں آئے گی نہیں ——— اس مدت کے بعد میں پہلی مرتبہ تو اس سے پروفیسر حامد کے ہاں ملا تھا۔ حامد کی بیوی بڑی عجیب عورت تھی۔ میں نے سکول کی تصویر پہ بنائی تھی اور اب میں خال اشتراک کے ہاں گیا تھا جس نے استقبال کچھ یوں کیا تھا جیسے میں اس کا کچھ کرتا رہا ہوں۔ کچھ پہلے سے وہ سالوں سے دوستی کا گوشہ میں ہم اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ سورج کی لو دامن کرتی سامنے دیوار پہ ستی ہوئی غائب نہ ہو گئی۔ مجھے یاد ہے زینب نے ہنستے ہنستے اپنی آنکھوں سے کہا ' اپنی آنکھوں کو گرا کے نیم گرم نیم سرد زمین کو کہا تھا۔

' یہی تو بات ہے کہ انسان ہمیشہ ہمیشہ محروم رہا ہے۔ وہ بنیادی حقیقت کو اتنا بھی نہیں کہ وہ تو ایک کھلونے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے کہ کوئی خوشی پالی گئی تو بس ہے، نہیں تو وہی غموں کی دلدل اور وہی اس میں دھنس کے نیچے جاتا ہوا انسان ——— ' پھر اس نے بچوں کو اٹھایا۔ میں گھبرا کے پروفیسر کی طرف دیکھنے لگا

' لیکن مزہ تو جب ہے کہ یہ خوشی وہ خود چھینے ——— ' پروفیسر نے کہا۔ ان پہلے عصری حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

' اوہو ——— تو تم بڑی گہری باتیں کرنے لگی ہے۔ یونیورسٹی تو تمہیں فلسفے کے ہاتھ پاس چھوڑ آؤں لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ چھینے سے جو خوشیاں حاصل کی جاتی ہے۔ کوئی اپنا آپ اس کو کر دیں نہیں کرتیں ——— ' زینب نے کہا کچھ بھی نہیں۔ صرف پروفیسر کا ہاتھ پکڑ کر جیسے وہ کہہ رہی ہو جس نے زندگی کو سنوارا ہے پروفیسر تم کیا جانو ———

وہاں سے اٹھے تو باہر لانبے بیٹھ کر پیچھے لوٹ کے ہاتھ پہ چھینے لگا تو جانے کیوں احساس ایک کے بچے جیسے لوگوں میں ہونے لا بچے میں ——— میں نہیں ہوں۔ اپنی کوٹھی کے سامنے رک کے زینب نے مجھے ہنسا دینے کی دعوت دی لیکن مجھے کام تھا کر جانے کیسے بہانہ کر دیا۔

دوسری اور تیسری مرتبہ کچھ دنوں بعد ملنے آئی۔ وہ شاید مترجم کا فیصلہ کرنے آئی تھی۔ وہیں لائبریری سے کچھ سامان پر بیٹھے اس نے جب پرچے کا اور ان میں سے چند ایک کو اٹھا کر دیکھتے ہی سامنے رکھ کے تو میں نے اس سے کہا۔ ' تم نہیں پڑھو گی کیا ——— ؟ '

' میں گھر پہنچ کر بہت اداس رہی ——— تم سارا سارا دن ان کتابوں سے الجھتے رہتے ہو، تھکتے بھی تو نہیں۔ پتہ نہیں تم نے کتنا وقت بیکار گزار دیا ——— ' پھر تھوڑی دیر رک کے اس نے کہا۔ ' کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے ان کتابوں کو جلا دوں۔ تمہاری ان آنکھوں میں زندگی ہمیشہ چھا رہتی ہیں لیکن ——— مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔

' اچھا تھا پہلے تو نہ ہو ——— '

' میں جتنا چاہتی ہوں اتنی ہی دور وہ کتابیں ہیں کہ چپکے ہو رہا ہو کہ کچھ بھی نہ ملے گی۔ ہو سکتا ہے پڑھتے اس لئے ہیں کہ بار بار

ما بدولت کو کیا ہے [illegible] ——— ستم تو یہ ہے کہ [illegible] ہے جو [illegible] ——— اس
نے یہ بات [illegible] کی جنس کے لئے تھی۔

• تمیں ہے۔ [illegible] ہو گیا ہے کہ [illegible] ہے وقت ہوں۔ [illegible] پہنچ گیا۔

نہیں [illegible] ہے۔ وہ [illegible] بات کرنا [illegible]

جیسا [illegible] ہیں ——

• [illegible] ہو گیا ہے [illegible]

• [illegible] تقریباً ختم کر چکا ہوں۔ [illegible]

پھر [illegible] کے [illegible] تشکیل [illegible] سے اس کے [illegible]
[illegible] تھا۔ [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] خوش ہو تو ———

پھر زینی [illegible]
[illegible] نہیں ہے تو [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کرنا چاہتے ہیں کہ [illegible]
[illegible] دیکھے گا

میں [illegible] بیٹھ گیا۔ [illegible] ایک
[illegible] تھا۔ [illegible]
سے [illegible] نہیں [illegible] دیکھتا ہوں تو
[illegible]
دیتا ہے۔ [illegible]

وہ [illegible] نہیں [illegible] ——— بے
[illegible] نہیں [illegible] تھی۔ وہ
[illegible] ———
[illegible] چند سطریں [illegible] کتاب بند کر دی ——— پھر [illegible]

سے گھر جا کر بارش میں خوب تر کے تھک گیا اور کسی نے بھی جواب نہ دیا تو جیسے میری نیند ٹوٹنے لگی۔ جیسے میرا خمار اترنے لگا۔ ایسا خمار جس نے میرے ذہن کو چکاچوند کر دیا تھا۔ میں نے دو موٹی کتابیں زمین پر رکھیں۔ ایک کتاب لے کے بیٹھ گیا۔ نظریں کتاب پر تھیں مگر میں سوچ رہا تھا۔ میں یونہی بھٹک گیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ زینی مجھے دوست سمجھتی ہے اور اسی طرح ہمیں کئی دوست ہونا چاہیے تھے۔ زینی ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ مجھے رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ جو نہ بات کا کہہ دی ہے۔ میں بھی کتاب پر دو تین ورق کو لیکن کتاب زیادہ مشکل سے پڑھنے لگا لیکن —— صرف ایک پیرا گراف ہی پڑھ سکا تھا کہ میں نے پھر کتاب بند کر دی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔

"کہیں زینی تو نہیں آ گئی ——؟"

لیکن وہ ایک چپراسی تھا جو لائبریری سے کتاب مانگنے آیا تھا۔

پھر بہت دیر کی بات ہے۔ یونیورسٹی بند ہونے والی تھی اور میں اپنے تھیسس میں مصروف تھا کہ ایک روز زینی اچانک ملی۔ اس کے ہاتھ میں سفید سفید تازہ کھلے پھول تھے۔ کپڑے سادہ تھے لیکن اس میں سے دھیمی دھیمی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اہتمام زیادہ تھا لیکن یہ بتا رہی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بھٹک نہ سکے۔ لیکن میں اس اہتمام سے زیادہ اس کے مزاج کی نفاست کی قدر کرتا رہا۔ جیسے ہمیشہ سے ہنس کے اس سے کہا

"میرا خیال تھا تم مجھے یہاں نہیں ملو گے کہ تمہارے تھیسس تو اب تک مکمل ہو چکے تھے۔" میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ میری کمزوری کو تو نہیں بھانپ گئی۔ کہیں وہ طنز تو نہیں کر رہی۔ پر اس کا چہرہ تو اس گلاب کی طرح معصوم تھا جو تازہ کھلا ہو۔ میں نے چاہا اس سے … کا شکریہ ادا کروں۔ میں نہیں کر سکا۔ میں نے چاہا اس سے پوچھوں تم … تھے وہ کیوں نہیں … میں نہیں پوچھ سکا۔ میں نے چاہا اس سے اپنی سادگی کی … کر دوں میں نہیں کر سکا۔ صرف اتنا پوچھا۔

"تم بہت دنوں سے … کیسے ہو زینی ——" اس کے چہرے کا رنگ تھوڑا سا بدل گیا لیکن تبدیلی بالکل … البتہ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے ہاتھوں سے ہینڈ بیگ کے … کو پکڑے رکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی

"مجھے کچھ دست ہی ——" میرے منہ … خیال آیا۔ میں کیوں نہ اس کے ڈیڈی کے بارے میں پوچھوں۔ میں نے آج تک یہ جاننے کی کوشش نہ کی تھی اور نہ ہی اس نے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کیسے ہیں۔ پھر میں نے سوچا اگر میں اس سے یہ سوال کیا تو جانے وہ کیا سوچے؟ مجھے معلوم ہے زینی سے ہے اس کے ڈیڈی ہے تو نہیں۔

مجھے اس روز شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ … ہوں وہ مناسب نہیں ہے۔ اب زینی آئی ہے تو میں بہت خوش ہوں۔ میں پہلے دن کی طرح … اپنا سب کچھ بھول گیا ہوں۔ بس اسی کو … دیکھ رہا ہوں۔ وہ بہت باتیں کر رہا ہوں۔ زینی نے بہت سی باتیں … میں نے پوچھا۔ اس کے بعد کیا ہوا —— اس کے چہرے کو دیکھا اس کے چہرے کا رنگ … ایسے جیسے اس کے چہرے پر امید کی کرن … تھی لیکن … [illegible] نے … اپنی اہمیت دینے لگ گیا تھا۔

: پھر شوقی تو ذرا بھی بہت [illegible] نہیں۔ [illegible] تھا [illegible] ہو جاتا۔ وہ [illegible]
[illegible] ہے ——— :

: دوسرے [illegible] مستقبل ہے جو چاہے ———

: [illegible] نہیں [illegible] :
[illegible] آنکھیں [illegible]
نہیں گیا۔

: بہت [illegible] خوش ہے۔ [illegible] مستقبل [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] نہیں [illegible] ان کے ساتھ [illegible]
[illegible] زندگی [illegible]
بہت [illegible] ہے

: [illegible]
[illegible]
[illegible]

: [illegible] زیادہ [illegible]
[illegible] وقت [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بتا سکتا تھا کیونکہ نظر آتا تھا۔ میرا موضوع آپ ہی ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے اُس کی بیماری کی فکر کرتی تھی۔ اور پھر تیس منٹ کے ایک دس منٹ کی تنہائی میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری پیشانیاں گرم تھیں۔ یونیورسٹی کی گھنٹی کی آواز اب زور زور سے بجنے لگی تھی۔ وہ نزدیک ہی اب بھی تھے یونیورسٹی میں وہ طوفان بند ہو گئی تھی۔ بتایئے ہم مرتی ہیں لیکن وقت نہیں نکلتا۔ گزرتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے وقتوں میں دینی کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ نہر پر جاتے ہوئے کچھ پوچھ لیتا تھا۔ کبھی کبھار ٹیلی فون بھی کر لیتا تھا لیکن پھر مجھے پتہ نہیں سنا کہ وہ آ نہیں سکا۔ صرف ایک روز جب میں نے ٹیلی فون کیا تو کسی نے بتایا کہ شاید کہ بیمار ہے۔ میں بیٹھ گیا تھا اور پھر میری بہت زیادہ ہی کر پاؤں۔ بہر حال پھر گاڑی اسٹارٹ کر دیا۔

پھر اس روز جب میں تیس منٹ کے بعد وہاں وہ نہر کے کنارے بیٹھا اور اُس میز پر پہنچے۔ سال کے صرف سردی پڑھنے لگی تو پہلے کی طرح پھر وہاں ہی نرمی آ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ ٹیلی فون پر بیٹھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں سفید پھول اور ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ تھی۔ میرے سامنے بیٹھ کے اُس نے بے تعلقی سے کہا۔

"میرا تو خیال تھا تم اطلاع دیئے بغیر ہی چلے گئے ہو گے۔ تمہارے دفتر فون کیا تو پتہ چلا کہ تم ابھی تک یہیں ہو۔ اور سخت مصروف ہو کہ کہیں بیٹھے ہو۔" دراصل جذبات نے ایک ساتھ مجھ پر یورش کر دی تھی اور میں مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو کھول کے غور سے مجھے دیکھا۔ پھر چپ چاپ سر جھکا کے ایک پھول اٹھایا اور ورق ورق کر کے میز کی سطح پر بکھیر دیا۔ اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں جو اُبھرا ہوا تھا جیسے ہم دونوں کی طرح سب کچھ کہہ گیا

"تم تو اتنا بھی کیوں نہیں بولتے۔ تم ملے کر آج کیوں نہیں دیتے۔ تمہیں بتاؤں تمہارے دل میں کیا ہے۔ لیکن ٹھہرو پہلے تمہیں یہ بتا دوں کہ میرے اندر کیا ہے؟" میں اُس سے سب کچھ کہہ گیا سب کچھ ———— زینی پہلے تو چپ دیکھتی رہی اور تکتی رہی پھر اُس نے پرچہ کر دیا۔ اور اپنے ناخنوں سے کھینچنے لگی اور پھر اُس نے گھبرا کے میرے گال آنسو میں بھیگ رہی تھی۔ میں اُس کے ہاتھ کا پنکھ لگتا تھا اُس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ اُن پھولوں کی طرح جو اُس کے بالوں میں تازہ سے تھے کانپتے ناخنوں سے اُس نے جیسے وہ چاند چمکیلا ہیں۔ جو اپنی انگلیاں چبا رہی اور جیسی دو بڑی سی چمکیلی حسین تھی اس کی ...

"تم نے خط کیا ہے۔ میں تم سے ایک منٹ کے ہاتھ جوڑ کر۔ میرا خیال تھا تم کوئی بات کہو گے لیکن ———— تم نے اگر میری صحت میں کچھ پوچھا ———— بے شمار صحت میں اب بہتر ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں بتایا کہ میرے علاوہ تمہیں کوئی بھی زینی کا کوئی ہے اس وقت نے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ اس کے نیچے تمہیں زینی کچھ کرنے کی کوشش کرے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ وہ کہتا بتاتی ہوں نہیں۔" بے شک جب کہ کوئی والدہ ہے پہلے تھی بہر حال اب جیسے وہ پہلی جگہ تھی کہاں جیتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت درست ہو گئی۔

"تم جیسے دیکھ کر ابھی نہیں ہو۔ تمہیں ابھی نہیں جانا چاہیے۔ تھا ... میں تم سے تھا تمہیں کسی نے کہا سنا نہیں تم خود سمجھ گئے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا وقت وہ خوشی کے لئے قبول کر لو۔ وہ خوشی کسی کی تقدیر میں نہیں کچھ نہیں۔ کہو جانے والے سوچتے تو صرف وہ بھی ختم ہو جانے۔ ہم دونوں نے چند لمحے ایک ساتھ گزارے ہیں۔ جیسے اس خوشی سے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حد درجہ بیزار کی سب سے شکایت ہمیشہ ان کا نام ہی نہیں لیتی۔ انھوں نے مجھے سرسری سی تعلیم دی۔ کوٹھی کے اچھے کمروں میں کبھی نہیں آنے
دیتے تو بچپن زندگی کا بیشتر حصہ ان کی یادوں میں ان کے زمانہ میں گزرتا ہے۔ پر اب ——"

میں وقت نہیں ہے سنو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے لگتا تھا بالکل نہیں [illegible] سرگیا تھا اور
بیمار خواب دیکھ رہا ہوں اور —— یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی سینما ہال میں بیٹھا ہوں اور ایک منہ چڑاتی تصویر دیکھ رہا ہوں کہ میں کے
ایک ایک کر کے نہ جانے کہاں سے نکلے جا رہے ہیں۔ میں نے بے بسی سے ان دھندلکوں سے نکلنے کی کوشش کی۔ دو چار مرتبہ کرسی پر پہلو
بدلا، زینی کی طرف دیکھا۔ جس میں اب شاید نگاہیں اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ پھر میں نے اس کے سامنے سے کپ اٹھایا، تھوڑی سی کافی
باقی بچی تھی جسے پیتے ہوئے سوچا کر بڑی خاموشی سے پوچھا

"دیکھو زینی۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ اس کا تعلق تمہارے ڈیڈی سے تو نہیں۔ پھر ——" زینی نے اتنی لمبی دیر میں پہلی مرتبہ
نگاہ اٹھایا، میری طرف دیکھا اور کسی قدر بے بسی سے بولی۔

"تمہارا قصور نہیں۔ ممکن ہے ابھی تم سوچ رہے ہو ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ میں تمہیں سمجھا سکوں گی یا نہیں۔ یہ تو دوسری بات ہے کہ اس
بارے میں میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔" اس کی نگاہیں جھک گئیں اور میں سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ صرف اپنے آپ کو یا اس لیے کہ
دینا چاہتی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں

"نہیں ڈیڈی کو میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی۔ تم بھی یہ سمجھ لو۔ آج سے چار پانچ برس پہلے انھوں نے سروس چھوڑ دی تھی کہ ایک سیٹھ
[illegible] ان کے پاس جائداد کافی تھی لیکن سب کچھ شراب، کلب اور ان چیزوں کی نذر ہو گیا۔ دو دوست ہوتے۔ یہ تینوں دوست ہیں
بہت اچھے دوست۔ دولت نہ ہو تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں آ کر کی کوٹھی میں ہم رہتے ہیں۔ وہ بھی چند ہی دن ہوئے ایک
[illegible] ان کے پاس اب تنخواہ ہی ہے۔ [illegible] دو چار [illegible] پھر —— اس کے بعد —— اس نے سر نیچے کر لیا۔
یوں محسوس ہوا جیسے وہ بات کہنا تو چاہتی تھی لیکن اس کا لہجہ ٹوٹ گیا ہے۔ [illegible] نے اس کی آواز کو دبا دیا ہے۔ میں نے سوچا
شاید کوئی بات ہو سکتی ہے جس نے اسے یوں روک لیا ہے۔ پوچھا۔

"پھر —— اس کے بعد کیا ہو گا زینی۔ تم خاموش کیوں ہو گئی ہو ——"

زینی نے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا پھر دونوں کہنیاں میز پر ٹیک دیں اور گردن جھکا کے دونوں ہتھیلیاں گردن پر رکھ لیں
[illegible] ہو گئی تھی۔

"میرا خیال تھا تم سمجھ گئے ہو گے۔ [illegible] [illegible] ضرورت ہے [illegible]
[illegible] کی وجہ ہے کہ اب وہ بہت زیادہ [illegible] [illegible] کے [illegible]
[illegible] [illegible] ساتھ شامل ہو کے
[illegible] مجھے میں تو اب [illegible] [illegible] نہیں تھی۔ [illegible]

"تو میرے بارے میں کیا تم اپنے ڈیڈی کا ساتھ چھوڑ دو گی ——؟"

[illegible]

[illegible] ۔

[illegible] —

[illegible] — [illegible]

[illegible] —

[illegible]

[illegible]

[illegible] —

[illegible] — [illegible] —

[illegible]

[illegible] —

[illegible]

اس نے جانے کے لیے قدم اٹھایا تو میں نے عجلت سے کہا

"دیکھو زینی سنو تو ——— ہم ———" وہ ذرا رک کے پیچھے مڑی اور میری بات کاٹ دی

"میں کیا نہیں کر سکتی۔ نہیں کہہ سکتے تم؟ تمہیں اگر پہلے سے قدر ہوتا تو باقی ہو۔ ہے ہم وہ کہتا ہی رہی، پھر میرا باپ ہے اور اُسے

تمہارے بغیر گھر میں تمہارے ساتھ چلی گئی تو وہ میری کے لائے گا ——— آخر کس طرح کی اولاد ہے ——— اور پھر میں کسی صورت نہیں سنبھال سکتی۔"

پھر اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور باہر نکل گئی۔

میں نے اس پر زبردستی کی کوئی نہیں کی پیچھے سے باہر چلا گیا مگر کہیں کوئی نہیں تھا سالوں سے یہ ... اس کا راز

سب چھوڑ آیا ہوں یہیں مجھے کہیں بھی زینی جیسی لڑکی نہیں ملی۔ مجھے کہیں بھی وہ ٹھنڈا سایہ نہیں آیا جو ان دنوں میں مجھے حاصل تھا جب زینی

میرے ساتھ تھی کبھی میرے کانوں میں اس کی آواز کے رس سے آشنا نہیں ہوئے۔ اس کے بعد زینی نے کبھی مجھے کوئی فون نہیں کیا کبھی خط

نہیں لکھا اور نہ ہی کبھی ملنے کی کوشش کی۔ ایک بار سڑک پر وہ آئی تھی تو مجھے دیکھتے ہی وہ ایک دکان میں چلی گئی اور میں اسے جگہ جگہ تلاش کرتا

پھرا۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کہاں ہے میں اسے دوسرے شہروں میں، اور سب ساحلوں اور دوسرے

گھروں میں تلاش کرتا رہا ہوں۔

ایک مدت کے بعد وطن آیا ہوں تو معلوم ہوا ہے کہ زینی کی شادی ہو گئی ہے اور اپنے میاں کے ساتھ ... ہے

بیچ دیا تھا۔ اس کا خاوند ... ہے ... خوش نہیں ہے ... جاتے ہیں۔

تو میرے سامنے ... ہے ... جانتا ہوں ... مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں لیکن کچھ

باتیں ضرور ہیں کبھی کبھی وہ باتیں ... کہ ... لیے کے ...

کے ... ہوں کو پیار دیا ... ہوں ...

... مجھے ... ہوتا ہے۔

زمین کا درد

اقبال متین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پاتا ہوں کہ مجھے اتنے مشوروں میں کہ میں بھی فراخ دلی سے با سکوں ۔۔۔ لیکن اتنے کشنوں میں کہاں سے لاؤں ——— چاند تک پہنچنے والوں میں ایسا تھیم چھ لگا ہے کہ اس کے پاس کشنوں کا دفتہ نہیں رہا ہے ——— اور میں اپنے اس دور میں پیدا ہونے پر فخر کرتا ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر جھوٹ جیسی ہوتا ہے

کہانی شاید اسی طرح شروع ہوتی تھی جس طرح میں آپ کو سنا رہا ہوں ——— کہانی تو رواں دواں ہوتی ہے جیسے جاگتے آدمی کے سانس کی طرح مسلسل ——— میں یوں کہ کہانی شروع ہو اور آپ اس کے ہو رہیں ——— میں یہ سارے گر جانتا ہوں لیکن مگر میں تب کہ آخری آخری سانسوں کی کہانی سنا رہا ہوں تو کہانی کے تسلسل کا کیا ہوگا ——— پھر بھی میں آخری آخری سانسوں کو جوڑ کر انہیں مسلسل اور مربوط کر کے آپ کو کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب رات نے دن کو یاد کر لینے میں سے تاسف پھیلا دیا تو زمین کی ساری ہنگامہ آرائیاں چپ کی نیند سو گئیں ——— اور یہ تو قبرستان تھا جہاں میں بیٹھا تھا ——— یہاں تو زمین سانس بھی نہیں لیتی تو زندگی کے ... والا ملک ... ہوگا اور اس سے زخم بھرے ہوں گے۔

میں گلدستہ اس کی قبر کے پائنتی رکھ کر بیٹھا ہوں جس پر ... میں نے خون ... کے نیچے چھپا کر پالش کیے ہوئے پتھر سے ڈھانپ دیا ہے اور اب یہ تو مجھے بتا ... کہ ... پھول ... اگر یہاں ... رکھ دیے ہیں اور بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا ہوں

آج پڑھنے لگی تو تنہائی اور شدید ہو گئی ——— شہر خموشاں مردوں کا شہر نہیں ہوتا اگر آپ کو اس شہر کا ایک باسی بھی پیارا ہو اور میں اس کی قبر کے پائنتی بیٹھا ہوں جو تو مجھے بہت پیارا تھا ——— جس نے موم بتیاں جلا کر قبر کی منڈیر پر رکھ دی ہیں ——— میرے اطراف اجالے پھیل گئے ہیں اور میرے بیٹے کی قبر کی سیدھی جانب دوسری قبروں کے کتبوں کے سائے لمبے ہو گئے ہیں ——— اجالے کے ساتھ یہ سائے کتبوں سے پھٹنے کے لیے پیچھے آ گئے ہیں اور جب میں ساکت ... نہیں رہتے۔

یہ قبرستان بہت عجیب ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں اس کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوں ۔ ... ہوتی ہیں۔ چھوٹی بڑی، نئی پرانی، بہت پرانی ——— میری پشت پر چبوترے کے احاطے کی دیوار ... سامنے بہت ... ہو رہا ہے اور ایک بہت بڑی قبر کے مانند لگتا ہے ... ——— ... چبوترے کے درمیان میں ... آنے جانے کے لیے ——— راستہ بچھا کر زمین کا ... ہے وہ مرنے والوں کا تذکرہ ہے۔

وہ شمع کے اس حصے نے جو ابھی باقی موم بتیاں جلانے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے ... چونکہ میں موم بتیاں جلا دیتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو جب میں یہاں ہوتا ہوں تو مجھے ان اجالوں ... اطراف ... سے ... زندگی ... مجھے لگتی ہے ———

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تمہارے سینوں میں جو ابھی زندگی رہ رہی ہو۔

میں اس لڑکی سے ملنے آیا ہوں —— اُوٹ پٹانگ بہت سی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ بے پناہ تنہائی کے گھٹنے کا غم جو ان مظلوم انسانوں کو ہے جو قبروں پر پڑے انتظار کر رہے ہیں میرے پیچھے چلا آتا ہے اپنے سینے پر سے جو پہاڑوں کا بوجھ لیے اور [illegible] ایک دینے کی سوچ رہا ہے۔

اور پھر جی مرا بھی تو آسان نہیں —— وہ پھر شروع ہو گیا ہے —— مٹی کا تیل چالیس روپے سستا ہو گیا ہے۔ اس طرح مرنا تو بہت سستا پڑے گا۔

میں ڈرتا ہوں اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ اور اب سلام کے بعد میں اس کو اتنا وقت بھی نہیں دیتا کہ وہ پھر کچھ مجھ سے کہہ سکے۔

اس وقت تو وہ میرے پاس نہیں ہے۔ اس وقت تو میں اکیلا ہوں لیکن میں ڈر رہا ہوں کہ وہ آ نہ جائے —— روشنی کے اس دھبے نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلنے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے میرا سکون چھین لیا ہے۔ میں پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں۔

روشنی کے یکایک غائب ہو جانے سے اندھیرے زیادہ گہرے ہو گئے ہیں لیکن آنکھیں دیکھتے دیکھتے اندھیروں سے مانوس ہو گئی ہیں اور اب میں اپنے سامنے گنبد کا دروازہ ہمیشہ کی طرح دیکھ سکتا ہوں جو بند ہے۔ اس گنبد میں میرے پر دادا یا پھر شاید ان کے بھی پر دادا سو رہے ہیں۔ میں نے صحیح رشتہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے علم کے دریا بہائے ہیں اور انسانوں کے ذہنوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور ان سے روحانی [illegible] حاصل کی ہے۔ بہرحال میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایسی ہستیاں ہیں جن کے اعلیٰ مقامات پر پہنچنے پر میں بھی فخر کر سکتا ہوں جس طرح ان کی وہ پیاسی روح کرتی ہے جو گھنڈر ہوتے ہوئے بنگلے سے نکل کر مجھ پالا میرے پیچھے موم بتیوں کی روشنی کا دھبہ دیکھ کر چلی آتی ہے۔ یہ روح جو میری رشتے دار ہے اور گنبد میں سونے والی ان برگزیدہ ہستیوں سے اس کا رشتہ زیادہ قریبی ہے۔

مجھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑی ہوئی اس لڑکی کو دیکھ کر یاد آیا۔ میری نانی امی یہاں گنبد کے باہر بیٹھی رہا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ آدھی رات کو نقارخانے میں بجتے تھے جیسے نوبت کی آواز ہو گئی ہو —— عید بقر عید میں نوچندی کے جب بیٹھتے تو خاندان کے اکثر بچے ان کے ساتھ مل جل کر ایسے ہی خاصی زور شور سے تیار ہو جاتی۔ تو گنبد کے دروازے پر بیٹھا کرتی تو گنبد کے دروازے کھول دیے جاتے اور سب کے سب ادب سے اندر داخل ہوتے —— بند کمرے میں بوسیدہ کاغذوں کا ساتھ ہوتیں اور وہ اتنا اندھیرا ہوتا کہ موم بتیاں جلا دی جاتیں —— پھر قرآن خوانی شروع ہوتا اور وہ کورس کے آس پاس مل جل کر گاتی تھیں۔ اور اس سے زیادہ تر لوگ پڑھتا۔ جس کسی کو جتنا یاد تھا شروع ہو جاتا یہ سلسلہ جاری رہتا تا آنکہ صبح ہو جائے۔

یہ چار صدیاں تو میں ابھی تک ذرا کھینچ کر لے جاتے۔

چند لمحوں کے لیے سارا ہنگامہ [illegible] ہو گئی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کس نے مجھے یہ کہ کر یاد دلایا تھا۔
تو سوچتا ہوں کہ ... [illegible] ... کی بہ نسبت ... [illegible] ... کی طرف
نے اس عالم [illegible] کے لیے مجھ کو ... [illegible] ... آ گیا۔

[illegible] نے کسی کو ... [illegible] ... دیکھ کر قریب سے
[illegible] ... ہے۔ اس بے بسی
کی ... [illegible] ... سب سے زیادہ ... [illegible] ... کے تماشے کی طرح ہے۔ ... [illegible]
... [illegible] ... ہے۔

اب ... [illegible] ... جیسے یہاں دیکھنے کے لیے مجھے ... [illegible]
... [illegible] ... نظر آتی
... [illegible] ... کوئی مسافر یہاں ہوتا تو
... [illegible] ... جیسے ... [illegible] ... ہیں کہ ... [illegible]
... [illegible] ... معلوم ہوتا ہے۔

کسی ... [illegible] ... نہیں ہے ... [illegible] ... زندگی کی ... [illegible] ... کے ساتھ
... [illegible] ... ہے

... [illegible] ... جس شخص کا ... [illegible] ... دیکھے بغیر ... [illegible]
... [illegible] ... نہیں دیا ہے —— ... [illegible] ... سے ... [illegible]
جائیں گے —— اس سے پہلے جب اپنے ... [illegible] ... کیا تھا تو مجھ سے کسی
... [illegible] ... کا تھا

" ... [illegible] ... بیٹھے ہو اس وقت تو ... [illegible] ... ہونا چاہیے تھا"
اور اس سے پہلے کہ ... [illegible] —— اس نے ... [illegible] ... دیا تھا۔
"تم ... [illegible] ... نہیں ... [illegible] —— ... [illegible]"

جب یہ باتیں ہوئی تھیں اس وقت ... [illegible] ... پتا ہے —— ... [illegible] ... تھا۔ مجھے
... [illegible] ... تھا —— وہ ... [illegible] ... کے پیچھے ... [illegible] ... آئی تھی

... [illegible] ... جب یہاں آیا ہوں تو ... [illegible] ... کی طرح
... [illegible] ... کے ... [illegible] ... اپنے بیٹے کی قبر ... [illegible]
دیکھنے —— ... [illegible] ... نہیں ہوا تھا۔ ... [illegible] ... تھی —— ... [illegible] ... بیٹا تھا کہ میں نے ... [illegible]

ہیں۔ جیسے جب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں اور جب میں نے گنبد کے بوسیدہ دروازے کو بند دیکھا تو اس دروازے
کی دراڑ سے مجھے پیلا سرکش چہرہ جھانکتا ہوا دکھائی دیا جو کہ حضرت سے پیسہ مانگنے کی اجازت کو زیادہ دنوں تک برداشت نہ
رہ سکا تھا ——— اور جب میں یادوں کو گنبد کی تاریکیوں میں پھینک کر سیدھا اپنے بیٹے کی قبر پر واپس آیا تو میں نے سگریٹ
جلانے کے لیے کچھ لمحے ماچس کی احتیاط سے تیلی جلائی کہ لو ابھر کر پھیلنے والی زرد روشنی میں کتنے چہرے ہوتے ہوئے لمحات میں
بند ہونے والی نظروں سے چھپ گئے ——— لیکن میری آنکھوں نے ایک عجیب چیز دیکھ لی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار
نہ ہوا ——— میں نے جھک کر دیکھا ——— میں جو کچھ دیکھ رہا تھا سچ تھا ——— وہ کون ہے، وہ کون ہے جو میرے غم میں
شریک ہو گیا ہے ——— وہ پھول جو میں نے قبر پر چڑھانے کے لیے لیے تھے وہ تو پیپل کے بکھرے ہوئے بوسیدہ پتوں
میں الجھ گئے تھے۔ ان پر پیلا پن آ گیا تھا [illegible] تھا۔ پھر یہ تازہ پھول کس نے میرے بیٹے کی قبر پر چڑھا دیے تھے ———
میں نے پھول اٹھا کر اپنی آنکھوں سے بالکل قریب کیے ——— میری آنکھوں کی پوروں نے پھولوں کی نمی اور ٹھنڈک
محسوس کی۔

ابھی سورج کی کرنوں نے نہیں چھوا ہے ——— نرم پھول میری بھیگی ہوئی پلکوں سے لگ رہے تھے ——— میں نے
انہیں قبر پر اس احتیاط سے رکھ دیا جیسے پلکوں میں آنسو پرو رہا ہوں۔

کچا موم بتیاں جلا کر اس گلی [illegible] روح کی طرح قدموں کی کسی چاپ سے بند سرسراہٹ جلتی ہے
——— میں نے [illegible] سب سے بڑی موم بتیاں جلا دیں ——— تازہ پھولوں نے میرے بیٹے کی قبر کے پاس بچھے ہوئے
پتھروں پر اپنی نمی کے نقش چھوڑے ہیں۔ میں نے انہیں چومنا چاہا تو میرا سایہ قبر پر ڈول گیا ——— پھر میں نے خود کو سنبھالا
——— وہسکی کی بوتل سے کئی گھونٹ لیے۔ پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر اس طرح چپ چاپ بیٹھ رہا جیسے
زندہ سانسوں کی آواز سن رہا ہوں

اس کے اجالے نے ذرہ ذرہ کے اندھیروں کو اور گہرا کر دیا تھا۔ نیم کے بوڑھے درخت کی ٹہنیوں کو اب جب نہیں کئی جگنو
چمک رہے تھے۔ یہاں اگر جگنوؤں کا کھیت بھی بچھا دیا جائے تو بے فائدہ ہے ——— یہاں جگنوؤں کی چمک، موم بتی کے اجالے،
نظروں کی جھلملاہٹ کچھ بھی تو ان کے اندھیروں کو دور کرنے کی اہمیت نہیں رکھتے۔

مجھے محسوس ہوا کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کوئی نہیں ہے
لیکن وہ کون ہے ——— وہ ——— بوڑھے نیم کے گھنے اندھیرے میں ——— میں کھڑا ہو گیا ہوں
میں نے غور سے دیکھا ہے۔ یقیناً کوئی ہے۔

میں آہستہ آہستہ اس سے بے خبر ہو گیا ہوں۔ میں نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی قبر پر نظر ڈالی ——— موم بتیوں کی
روشنی میں [illegible] کتبے پر کندہ [illegible] اس کی تاریخ پیدائش، اس کی تاریخ وفات کچھ بھی نہیں پڑھ سکا [illegible]
[illegible] ——— [illegible]

[illegible] کہا ان سے اس کی یاد مٹ چکی ہے

[illegible] ——— [illegible] سے

[illegible] ——— [illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— نہیں ——— ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں

ہوگا ——— [illegible] ——— تمہارے بیٹے کی [illegible]

ہے ——— [illegible] ——— تمہارے زخم ہرے ہیں ——— آؤ میرے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible] ——— سب میرا [illegible]

[illegible] ——— اور وہ جنگلی جھاڑیوں کے ایک جھنڈ نے میری نظروں کو آگے بڑھنے سے روک

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] اپنے بیٹے کی قبر [illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

میں نے اس سوال سے پہلے کسی اور سوال کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا

[illegible]

[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible] ———

[illegible] ———

[illegible] ——— [illegible]

ڈاکٹر [illegible]

اس نے اثبات میں صرف گردن ہلائی۔

میں سب کچھ کہہ گیا اور اس کا منہ تکتا رہا ——— حالانکہ میں اس سے یہ پوچھ کر بھی کیا کرتا کہ یہ جان کا حصہ ہی سے کر دیتیں
جس کا یہ پتہ ہے۔
اور پھر اس نے مجھے بات کرنے کی مہلت بھی تو نہیں دی تھی۔
ٹوٹی ہوئی قبروں پر پیر رکھتی ہوئی وہ اپنے کھنڈر ہوتے ہوئے مکان کی طرف تیز تیز چلی جا رہی تھی اور کھنڈر سے کسی زخموں والے بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز میں صاف سن رہا تھا۔
اپنے بیٹے کی قبر پر واپس آتے وقت میں نے اس قبر کو نہ روندنے کے خیال سے جس کی شکستگی نے میرا دل ہلا دیا تھا کتنی قبریں روند ڈالیں جو سرے سے مٹ چکی تھیں۔
ہوا کے کسی آوارہ جھونکے نے میرے بیٹے کی قبر کا دیا بجھا دیا ہے لیکن جب میں اس کی تربت کے پائنتی پہنچا ہوں تو دور بادلوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا چاند صاف اتنا ابھر گیا ہے کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں اور ہلکی مدھم چاندنی سارے میں بکھر کر ٹوٹ ٹوٹ گئی ہے

——— میں نے بوتل منہ سے لگا کر دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیے ہیں۔
——— میں نے کھنڈر سے آتی ہوئی زخموں والے بچے کے رونے کی آواز پھر سنی ہے۔
——— میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھولوں کو پھر دیکھا اور یہ سوچا بھی نہیں کہ یہ کس نے چڑھائے ہیں۔
——— میں نے پھولوں کا دونا کھول کر وہ پھول بھی قبر پر چڑھا دیے جو میں اس کے لیے لایا ہوں۔
——— میں نے سگریٹ جلا کر چاند کو دیکھا ——— وہ اب درختوں سے بلند ہو کر بادل کی اوٹ میں چھپ رہا ہے مجھے افسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لوگ مجھ تک پہنچ بھی جاؤ تو اس زمین کے دکھ کو زمین ہی پر چھوڑ آؤ گے تا۔ میرے سینے میں اتنی وسعت کہاں ہے جو زمین کا سارا دکھ سمیٹ سکوں
اور چاند نے بادل کی چادر تان لی۔
میں یہ چاہ کر بھی کچھ تو نہیں کر سکتا

سیکنڈ راؤنڈ

انتظار حسین

چچے چھتے، صحن، چھت سے بیت کر چھتا ہے۔ دونوں پار سو قطار قطار مکانوں کے نئے بنے کی آگے کا آگے گھاٹوں سے
ندی ہوئی کوٹھی، وہ دیکھیے بیچ کی محیلی کی ایک کی کھڑکی پر خوبصورت انسانی صورتوں سے ابھری ہوئی ہیں۔ اور پھر اس کوٹھی کے سامنے سے
گنبد اس کے دروازے پہ ایک شرح لی پر WELCOME لکھا ہوا تھا۔ اس چھتی دکان کی ایک دوسرے میں فقیر کی مشینی کھڑکی
ہوگئی۔ اللہ شاہجہاں آباد تیا، اور خرت گم ہیں گلیوں سے ہٹے ہوئے۔ اور ابھی ابھی وہ اپنے گھر سے چلا تو تھا جہاں پھر سے شہر کے
کمرے میں آرام بیٹھ کر رہے تھے کہ جنگ ہو کر رہے گی۔ ابھی ابھی بڑے ابا نے دیوان حافظ سے فال نکالی تھی اور دیوان کیا تھا کہ جنگ ہوگی
"آگے کیا ہوگا۔ یہ شعر بتا رہا ہے۔"

"وہ میں بتاتا ہوں۔" چچا میاں جو اب تک کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"سنو بھئی" بڑے ابا نے دیوان حافظ بند کرکے ایک طرف رکھا اور عینک اتار کر کیس میں رکھنے لگے۔

"بس شمالی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔"

"کیسے؟" بڑے ابا عینک کیس میں رکھتے رکھتے رک گئے۔

"کیسے کیا۔ بس ہو جائے گا۔ مگر صرف شمالی ہند پر۔ جنوبی ہند کی بابت کوئی ذکر نہیں تھا۔"

"کیسے ہو جائے گا۔ کوئی ثبوت؟"

"ثبوت" چچا میاں نے بڑے ابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی۔"

بڑے ابا سوچ میں پڑ گئے۔ تامل کیا۔ پھر بولے۔ "انہوں نے یہ لکھا ہے؟"

"صاف لکھا ہے جی۔"

بڑے ابا پھر سوچ میں پڑ گئے۔ آخر انہوں نے بند کئے ہوئے کیس کو پھر کھولا، عینک لگائی اور دیوان حافظ اٹھا
"فال دیکھتا ہوں۔"

اور اس کا مطلب کیا یہ تھا کہ دیوان حافظ کی فال کا ... پر مہر سڑک سے لگنے سے مگر اس لمبی اور کشادہ سڑک پر سے
دو پار قطار قطار مکانوں کے نئے سڑک سے مڑ کر چلتا چلا ... یوں ہی خیال آیا کہ ابھی تھوڑے دنوں پہلے اس سڑک کی صورت کیسی
ہو گئی تھی ... لگتی ہے ... نظر آتی تھیں ... گلی تھی ... ہوئی ... مکانوں پر ...

سڑک پر ٹریفک کے ساتھ ٹریفک کے سپاہی تیزی سے سیٹیاں بجاتے اِدھر اُدھر پھرتے۔ جس سے پھنسی ہوئی موٹر کاریں رستوں سے اتر کر ختم ہو جاتیں۔ تو تھوڑی تھوڑی دیر بعد ٹریفک نظر آتی۔ اور سڑک خالی اور خاموش ہو جاتی۔ وہ خالی اور خاموش سڑک کتنی عجیب لگتی تھی۔ ساری فضا پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جیسے اسے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آج وہ ظاہر ہوئی ہے۔ آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ اور اب، اب سڑک پھر سے کتنی مصروف ہو گئی ہے۔ اب پھر سے کاریں کتنی ایلی ہو گئی ہیں۔ چلتی دکھتی کاریں میک کے بغل میں دوسری اسمبنی پکی اور سنہری دیکھیں۔ ایک لمبی لاری سے بڑی بھاری جیسے ٹرک نیلی سیاہ بریدی جوڑوں میں جلوس نکالتی۔ "ظاہر!" پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ مسعود اور رضا بس سٹاپ کے قریب کھڑے تھے۔ وہ رک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں قدم مارتے ہوئے آ گئے۔ "تو خالی ہے نا اس وقت؟"

"اور کیا؟"

"بس پھر چلیں۔ گرینڈ سے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ مگر سالی ٹیکسی مل جاتی تو اچھا ہوتا۔"

"اس وقت یہاں ٹیکسی ملے گی۔ توبہ کرو۔"

"چلو پھر پیدل چلتے ہیں۔ کون سی ایسی لانبی گلی ہے۔"

"یار، وہ پہنچے پہنچے ہوں گے۔" "آج شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔"

"ہاں بہت بیڑیں ذبح ہوئی ہیں آج۔" مسعود نے یہ فقرہ بہت گمبھیر لہجہ میں کہا تھا۔ مگر وہ اور رضا دونوں ہنس پڑے۔

پھر رضا کہنے لگا۔ "اصل میں موسم کے انتظار میں شادیاں رکی ہوئی تھیں۔ موسم اس برس بدلنے ہی کو نہیں کہتا تھا۔ بہرحال اب موسم بدل گیا۔"

اس نے رضا کی طرف دیکھا اور کسی قدر الجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "ہاں موسم بدل ہی گیا۔" چپ ہوا۔ پھر بولا "کیا خیال ہے، یار وہ سیکنڈ راؤنڈ ہو گا؟"

"سیکنڈ راؤنڈ؟" مسعود نے بے دھیانی سے کہا۔ "لگتا تو نہیں۔"

"ہاں یار لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" اس کا لہجہ اور الجھ گیا۔

"کیسے لگتا ہے؟" رضا نے گرم لہجہ میں سوال کیا۔

مسعود نے لہجہ میں تھوڑی سی طنز پیدا کرتے ہوئے کہا "شاید تم نے ظاہر کی پہلی بات نہیں سنی۔"

"کون سی پہلی بات؟"

"یعنی یہ کہ شادیوں کا موسم شروع ہو گیا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ سڑکوں کی گہما گہمی بھی واپس آ گئی ہے اور رکشاؤں کا میٹر بھی پھر سے تیز چلنے لگا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وقت واپس آ چلا ہے۔"

"مرا دل وقف عقیدت ہو گیا ہے"

"جیسے دل وقف کی تین نشانیاں ہیں۔ اس سے پہلے تم پر تو ان دلشادوں کا تیر چلا ہوا ہے دل چھلنی"

اس جواب پر رضا چپ ہو گیا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالا۔ مسعود اس کی طرف بڑھا پھر ایک سگریٹ منہ میں لگا کر سلگایا۔ سگریٹ کا کش لیا۔ پھر بولا "لگتے ہو۔ جلے ہو گے"

مسعود ہنس پڑا۔ پھر کہنے لگا: "یہ لوگ جذباتی ہو رہے ہیں۔ ابھی پتہ نہیں ہے دل جلا کیا ہوتا ہے"

"معاف کرنا"۔ رضا نے پلٹ کر "پتہ نہیں ہمیں بھی نہیں پہلے دل جلے کیا ہوتے ہیں۔ دل جلے عشق پر وہ مر کے رہتے ہیں کہ شروع کرنے سے شروع ہوتے ہیں نہ ختم کرنے سے ختم ہوتے ہیں"

"خوب"۔ مسعود نے طنزیہ انداز میں داد دی۔

"مسعود" وہ بولا "رضا ٹھیک کہتا ہے۔ عشق بے شک رہو مگر سینہ فگار ہوتا نہیں عشق میں تو نہیں ہوتا"

"عشق تم بھی نہیں ہوتا" رضا نے لقمہ دیتے آگے کہا۔

مسعود نے رضا کی بات کو نظر انداز کیا اور اس سے مخاطب ہوا "یہ دل ہم تو ابھی تک ہوا ہے، قصہ ختم نہیں ہوا ابھی"

"تو بھی کیا وہ نہیں ہی ہوا"

"پہلے سے تو بہت کرا دو، سیکنڈ ہینڈ کر لو۔ کیس تو دو دو کا دوسرا پانی پانی ہو"

اس نے ہنسی ہنسی سی ہنسی اور چپ رہا۔

رضا اسے دیکھتا رہا۔ "یار یہ جو لوگ CYNIC ہوتے ہیں یہ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں"

وہ چپ ہوا۔ پھر براہ راست مسعود سے مخاطب ہوا "تم خفا ہو گئے ہو؟"

"نہیں کیا فرق اس سے کیا فرق پڑتا ہے"

"بہت فرق پڑتا ہے" رضا کے لہجے میں ایک برتری کا احساس پیدا ہوا "میں خفا ہو گیا ہوں۔ تم نے سچائیوں کو نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے"

مسعود جواب میں چپ رہا۔ پھر وہ چلتے چلتے بولا "یار مودی سے سگریٹ تو لے چلیں"

اصل میں وہ جس راستے پر منزل کے قریب آ گئے تھے، مودی کی دکان تو وہ مقام تھی جہاں سے وہ گزرتے ہوئے ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ دن میں اسے پہچانتے تھے۔ چلتے چلتے وہ پہنچے اور مودی کی دکان پر رک گئے۔

"مودی" مسعود نے کہا "سگریٹ بیچتا ہے؟"

"بیچتا ہوں" مودی نے قلندرانہ شان سے جواب دیا۔

گرم ماحول میں مسعود نے شفقت بھری نگاہ ڈالی۔ جب آدمی ہے

"شفقت جوع کو؟" مولوی چونکا۔ "شفقت بوی کو آپ نے دیکھا ہے رضا صاحب؟"

"ہاں ..... ہاں" اس نے برتری کی شان کے ساتھ کہا۔

اس موٹے آدمی نے جس نے شلوار کے ساتھ کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر جناح کیپ منڈھی ہوئی تھی۔ رضا کو غور سے اور احترام کی نظروں سے دیکھا۔ "اچھا جی، تو آپ کی شفقت بوی سے باتیں بھی ہوئیں؟"

مولوی بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولا۔ "خواجہ صاحب جی، آپ ہمارے رضا صاحب کو نہیں جانتے۔ یہ بہت بڑے ... محاذ دیکھ کے آگئے ہیں۔ اچھا جی رضا صاحب، بتاؤ شفقت بوی کیسا لگتا ہے۔ کیا سوچتا ہے؟"

"بہت عجب آدمی ہے" رضا کہنے لگا۔ "وہ ہمیں اس مقام پر لے گیا جہاں عزیز بھٹی کی شہادت ہوئی تھی۔ اس ... بتانے لگا۔ اتنے میں ایک جوان آیا اور بولا کہ جانے کا وقت ہے۔ آپ لوگ اب واپس چلیں۔ ہم واپس چلنے لگے۔ مگر ... وہیں کھڑا رہا۔ ہم ٹھٹھکے۔ ہم نے کہا میجر صاحب، آپ نہیں چلیں گے؟ شفقت بوی نے ہمیں غور سے دیکھا اور کہا کہ یہاں سے واپس جاؤں؟ اس مقام سے جہاں عزیز بھٹی کا خون بہا ہے؟ آپ لوگوں کو واپس جانا ہے۔ آپ واپس جائیں۔ میں تو یہیں کھڑا ہوں ... ... ہم اس شخص کی صورت دیکھنے لگے۔"

"سبحان اللہ" خواجہ صاحب نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گئے۔

"میں چھمب جوڑیاں بھی گیا تھا" اور رضا نے سوچنے کے انداز میں کہا "معلوم ہے چھمب میں داخل ہوتے ہی پہلے ... دکھائی دیتا ہے؟"

"کیا؟" خواجہ صاحب اور مولوی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"قبریں؟"

"قبریں"

"ہاں قبریں۔ ایک لمبی قطار چلی گئی تھی برابر برابر ایسی قریب قریب جیسے یہ ... رجمنٹ کے سپاہی تھے۔ مگر عجب بات ... نئی قبریں تھیں اور وہ جگہ قبرستان کی نہیں لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ میدان جنگ میں لیٹے ہیں۔ ہم نے فاتحہ پڑھی۔ جب ... تو ایک سپاہی ہمارے قریب ... کہنے لگا کیا خیال ہے آپ شہری بھائیوں کا، ہم ان قبروں کو چھوڑ کر واپس ... ... یہ میرا جی چاہتا ہے میں کہوں، مگر کچھ کہہ نہیں سکا۔ بس ... بس کچھ دل بھر آیا۔"

چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

تھوڑی دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ پھر خواجہ صاحب کسی قدر آہستہ لہجہ میں بولے "بات پکی ہے جی۔ ... کیسے چھوڑ دیں؟"

مولوی نے جھرجھری لی اور کہا "خواجہ صاحب جی، مذاق نہیں ... ہو کر رہے گی"

"یا شاید کچھ پتہ نہیں۔"

"یہ کیسے نہیں جی" مودی تڑپتا ہوا بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کشمیر ہمارا فوجی حلقہ ہے۔ میں کہوں تو ہر کوئی ہمارا حق ملک ہے۔ یا پھر کیسے ہے کہ ... اب گنتے ہوں" اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا۔ "اور تحریک خلیفہ صاحب کی ختم۔ پھر سمجھو تو ہی مولانا صاحب کا منہ چڑا۔ اب میں پوچھوں کیوں کہ کشمیر میں ان مجاہدوں کا کوئی قصور نہ کرو ہی۔ یا فضول بات ہے"

خواجہ صاحب نے مودی کی بات سنی اور پھر وہ اس سوٹ بوٹ والے شخص سے مخاطب ہوئے جو ابھی ابھی کار سے اتر کر کھانا کھا رہا تھا اور ذہنی حیثیت سے بظاہر بڑی ملتوں کے لئے ابھی ابھی کراچی کو چھوڑا تھا۔ "کیوں جناب خیریت کیا کہتی ہیں۔ جنگ ہو جائے گی؟"

سوٹ بوٹ والے شخص نے تامل کیا پھر بڑی متانت سے بولا "بات یہ ہے کہ ......"

"ہاں کہیے؟" مودی نے پان لگاتے ہوئے پوچھا۔

سوٹ بوٹ والے شخص نے کہا "سادہ خوشبودار دینا"

خواجہ صاحب نے بے چینی سے کہا "ہاں جی"

سوٹ بوٹ والے شخص نے اسی متانت سے بات پھر شروع کی "بات یہ ہے کہ پاکستان ابھی جنگ افورڈ نہیں کر سکتا"

"جی کیا فرمایا؟" مودی کا ہاتھ پان لگاتے لگاتے رک گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ" سوٹ بوٹ والے شخص نے پھر اسی متین انداز میں بات کی "ایک چھوٹے ملک کو جس کے وسائل محدود ہوں کسی بڑے ملک سے ٹکر لینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے"

"اس ملک کے یار بڑے ملک نے تو بڑی جان کا زور لگایا۔ مگر ہوا کیا؟" مودی کا منہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

"ہو گیا" سوٹ بوٹ والا شخص نہایت متانت سے مسکرایا "مجھے کہنا تو نہیں چاہیے۔ مگر بہر حال اتنا واضح ہے کہ اس جنگ کا اثر ترقیاتی منصوبوں پر بہت پڑے گا"

مودی نے پان لگاتے لگاتے ہاتھ روکا۔ مصالحے پان کو لپیٹ کر پڑیں کسے ہوئے لفافے کو پیش کر دیا۔ مولانا بیگم صاحب سے بولیں لے گئے" اور دو روپے نکال کر سوٹ بوٹ والے شخص کے سامنے رکھ دی۔

"میں نے پان بھی مانگا تھا"

مودی نے انگلی سے سامنے دوسرے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے بھکاری کی طرف اشارہ کیا "پان وہاں سے"

سوٹ بوٹ والے شخص نے کسی قدر برہمی سے دو روپے اٹھا کر جیب میں رکھی اور واپس اپنی کار کی طرف چل دیا۔

شرارت ہوتی ہوئی کار کو مودی دیکھتا رہا جب وہ روانہ ہو گئی تو اس نے بہت غصہ سے کہا "امریکہ کا پٹھو"

"یہ شریف آدمی تھا" خواجہ صاحب نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"شریف آدمی؟" مولوی نے تیزی سے کہا "خواجہ صاحب آپ جانتے ہیں اسے؟"

"نہیں یار، میں تو نہیں جانتا کون صاحب ہیں"

"خیر چھوڑو جی" خواجہ صاحب بولے "مولوی تو یہ بتا کہ لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی؟"

"بتا دوں؟"

"بتاؤ نا"

"خواجہ صاحب جی، رات کو اٹھو بارہ بجے کے بعد میں آسمان کو دیکھو۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا کہ لڑائی ہو رہی ہے یا نہیں ہو رہی"

"یار میری نانی کہہ رہی تھی۔ ...... " مولوی! خواجہ صاحب رکے اور بولے "میری نانی تو بہت ڈری ہوئی ہے"

مولوی نے سیدھا سوال کیا "خواجہ صاحب جی، اوپر والی بات بتاؤ۔ پاکستان میں کچھ دھماکا ہوا؟"

"نہیں"

"پھر بھارت میں ہوا۔ یا کہیں دور کہیں ہوا؟"

"ہوا"

"ہوا کیا جی۔ وہاں پہ تو کال پڑ رہا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ وہ ادھر آ گئی"

خواجہ صاحب نے اس بات کو وہیں چھوڑا اور کہا "خیر یہ تو دمدار ستارہ ہے۔ مگر وہ کیا تھا یار میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا"

"کیا؟" مولوی نے سوال کیا۔

"پرسوں رات کی تیسری رات تھی۔ کوئی آدھی رات کا وقت۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک روشنی سی اور جیسے آسمان میں آگ لگی ہوئی ہو۔ کئی منٹ تک لگی رہی پھر غائب۔ میں اب تک یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا چیز تھی۔ ...... پھر اس رات"

خواجہ صاحب رک کر بولے "تو پھر بہت چلی۔ چھت ایسے ہل رہی تھی جیسے پنکھا ہلتا ہے"

مولوی نے بہت غور سے یہ واقعہ سنا۔ پھر بولا "یہ تو ٹھیک ہے تین دن بعد کی بات ہے۔ مگر مجھے تین دن پہلے پتہ چل گیا تھا۔ پوچھو کیسے۔ وہ ایسے کہ خواجہ صاحب میں نے خواب دیکھا۔ جیسے شام ہو، دیکھتا ہوں کہ آگ لگی ہے۔ جیسے سارا باغ جل گیا ہو۔ میں پھر وہ آگ ایک دم سے بجھ گئی۔ اور سارے درخت ویسے کے ویسے ہیں۔ خواجہ صاحب عجیب بات ہے جتنی دیر وہ آگ خود ہی بجھ گئی۔ اور درخت سب ویسے ہی ہرے ہیں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ پھر تیسرے دن یہ ہو گیا"

خواجہ صاحب حیرت سے منہ دیکھتے رہے پھر بولے "یار صاحب بعض بعض خواب بڑا سچا ہوتا ہے"

مولوی پھر سوچ میں گم ہو گیا" یہ تو خوف کی بات تھی۔ سب اور سکوت بات کرتے کرتے اس نے اسے مسعود اصغر کو
دیکھا" بابو جنتی میاں تم بھی سنو۔ خواجہ صاحب کی بیٹی بڑی نماز کے بعد ایک عجیب پڑھتی ہوں مگر کنڈی بند کیے بیٹھے ہوئے
پھولوں تسبیح پھیر رہے تھے۔ مولوی آنکھ ایسا لگا جیسے کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس جا۔ میں نے
مڑ کر آنکھیں کھولیں۔ پیچھے مڑ کے دیکھا .... کوئی بھی نہیں تھا .... اور آج بھی ایسا ہی ہوا۔ بس
جھپکی آئی تھی۔ لگا ... کوئی کھڑا ہے۔ کہہ رہا ہے نظام الدین اولیا کے پاس جا .... میں حیران ہوں خواجہ
صاحب کی کہ اس بات کے ماننے کیا ہوئے"

خواجہ صاحب کا رنگ اتر گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد آنکھیں کھولیں اور بولے "آج کل کے
نوجوانوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں"

مولوی بولا "میں کہتا ہوں کہ بتو اب تو تم نے آنکھ سے سب کچھ دیکھ لیا۔ اب تو سمجھ لو۔ اب بھی نہیں سمجھتے؟"
پھر بیٹھے مولوی ان کی خاموش کرسی کی طرف متوجہ ہوا" کلر کے جی ہیں سب لوگ میری باتوں پر ہنستے ہیں"

مسعود ہنس دیا "مولوی تو پاگل ہے۔ دیکھیں کیپسٹن کا ایک پیکٹ دے دے"

کیپسٹن کا پیکٹ آیا۔ تینوں نے سگریٹ سلگائی۔ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رضا نے اچانک بے چینی کا اظہار کیا "یار چلو"

"کرفیو سے نہیں چلو" مسعود نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"یار اب دیر ہو گئی ... مجھے یاد آیا کہ تو اس وقت گھر جانا تھا کہ مہمان آنے والے تھے" رضا نے سگریٹ کا ایک کش
لیا "اچھا تم چلو۔ اور یہ وہ جا۔"

"ہم بہت خیال میں کہ نہیں تھا ہو کہ آج جمعرات ہے" اس نے بعد میں کہا۔

"کیوں ... تم بھی نوٹ سے ہو؟"

"نوٹ کی بات نہیں۔ ایک طرف چلو یہ پارٹی کیسی نہیں ہے ... وقت یہاں ہم نے گزار دیا۔ ابھی تو دیر
ہو رہا ہے آج کچھ موڈ نہیں ہے"

مسعود کچھ الجھ سا ہو گیا۔ پھر رضا سے بولا "چل ...... اس میں بیٹھ رہے ہیں۔ رکنا نہیں چاہیے تھا"

"ہاں ... ہمیں دیکھے بغیر ہی چلا" "ہمیں رکنا نہیں چاہیے تھا"
ٹیکسی جو نہیں ملی تھی۔ اور ٹیکسی کے لئے انہوں نے ایسی کوشش بھی نہیں کی۔ یوں بھی سب سڑک نسبتاً خاموش
اور نہیں بہو لی پھیلی میں ایک عجب ... تھی۔

"یار ظاہر" مسعود چلتے چلتے بولا "تم اس بات کو ... ہو۔ کیا ہم کچھ ......"
"نہیں یار" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا "وہ تو میں کوشش کر رہا تھا۔ سب کوئی قصہ نہیں ہے"
"پھر اس سے تو کب وہ کیا؟ مگر" مسعود کہنے لگا "ایک قلمی نسخے ہی کوئی ہے"

"کیا؟"

"نہیں۔ رستے میں نکلنا نہیں چاہیے تھا۔"

وہ نہایت بے معنی سی ہنسی ہنسا۔ "پھر کیا ہو جاتا؟"

"پھر بھی کیا ہوتا۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آدمی اس رستے پر پڑے ہی نہیں جیسے میں نہیں پڑا۔ سمجھتا ہوں کہ یہ قصہ ہی بکواس ہے۔ مگر اس رستے پہ پڑے تو پھر انتہا تک جانا چاہیے۔ چاہے انجام کچھ ہو۔ بیچ میں رک جانے کے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔ آخر عشق اور مال پسندی میں کیا رشتہ ہے؟"

"عشق اور جنگ۔" اس نے مسعود کی بات کا جواب نہیں دیا، اپنے ہی طور پر کچھ کہنے لگا۔ یا شاید وہ بات بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "بات صاف ابھی کہاں کی۔ عشق اور جنگ۔"

"دونوں اصل خانہ خرابی۔" مسعود نے ٹکڑا لگایا۔

"ہے تو یہی مگر ...."

"مگر کیا ...."

"یار تم سے ذکر کی بات کیا ہے۔"

"کیا؟"

"ذکر کی اصل بات یہ ہے کہ جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے اور عشق بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر!"

"تو پھر یہی کہ جنگ شروع نہ کرو مگر شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک ختم ہو تو ختم ہو جاتی ہے۔"

"اور عشق؟"

"وہ بھی۔"

"واقعی؟" مسعود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

وہ کچھ اکھڑ سا گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "یار کچھ پتہ نہیں۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر چلتے چلتے مسعود نے کہا "تمہیں ایک خبر سناؤں۔ وہ لندن جا رہی ہے۔"

"مجھے خبر ہے۔"

"تمہیں افسوس تو ہوگا۔"

"کس بات کا؟"

"اس کے چلے جانے کا۔"

وہ ہنسا۔ "وہ تو پہلے ہی جا چکی تھی۔"

مسعود نے چودھری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو"

"کیا واقعی اب کوئی قصہ نہیں ہے؟"

وہ پھر ٹھٹھکا، چپ ہوا، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا "یار پتہ نہیں۔"

پھر دونوں چپ ہو گئے۔ چپ چاپ۔ جیسے چپ چاپ کچھ سوچ رہے ہوں "بات یہ ہے کہ عشق ختم کرنے کا تو کہہ ... مگر اس ... ہم نے تو بہت سی ہم الجنس مصروف رکھنے کے لیے پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ... جنگ ہی ختم ہو جائے ... بہت بے عقلی کی بات ہے۔ تو تم نے سنا ہے کہ ... حافظ سے تم نے فال نکالی ہے جنگ ہوگی؟"

مسعود زور سے ہنسا اور خاموش ہو گیا۔

دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ وہ بس اور لڑکے وہ سڑک جس پہ چلتے ہوئے آ رہے تھے اور وہ سڑک سے ... پڑا تھا اس وقت خالی اور پرسکون تھی۔ اس کوٹھی کے سامنے کاروں کی ... قطار نہیں تھی۔ دو تین کاریں کوٹھی کے احاطے کے کھڑی تھیں اور درختوں کی ... بلب جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کوٹھی کے سامنے سڑک بہت نظر آ رہی تھی۔

اس نے چلتے چلتے پوچھا "تو پھر کب؟ یار ٹھنڈ سی ہے۔"

"کیا؟" مسعود نے سوال کیا۔

"یہی کہ جنگ ہوگی یا نہیں ہوگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"حافظ شیرازی کی فال سے پوچھو۔"

"حافظ شیرازی کی فال۔" مسعود بولا۔

مسعود پھر ہنس دیا اور چپ ہو گیا۔

"یار مسعود تم کچھ ... نہیں کر سکتے۔"

"کیا کرامت کریں یار۔" وہ کس قدر بیزاری سے بولا اور پھر چپ ہو گیا۔

پھر وہی چپ چاپ۔ خاموش سڑک اور قدموں کی چاپ۔ ... قمقموں سے جگمگ کرتی ہوئی کوٹھی کے سامنے کی منور سڑک پیچھے رہ گئی تھی۔ آگے سڑک خالی اور خاموش تھی اور اندھیرے میں تھی۔ اور اسے پھر دنوں کی خالی اور خاموش سڑک کا دھیان آ گیا۔ مگر اس وقت وہ خالی اور خاموش سڑک کتنی پر رونق نظر آتی تھی اور اس میں کتنا شور تھا۔ اور اب .... ایک خالی اور سڑک بس شور کرتی ہوئی قریب سے گزر کر چلی گئی

"اور پھر کیمپ سے نکل جا رہے تھی؟"

آئی، بات کچھ تو وہ بھی ملا ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ گئے بھی تو پیدل ہی تھے۔"

مسعود: اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس مرتبہ اس نے بہت سنجیدگی سے مسعود کو مخاطب کیا ہے۔

"ہاں:"

"کیا خیال ہے تمہارا جلی ہوگی:"

مسعود اسے تکنے لگا۔ پھر بولا "بتاؤں اپنا خیال۔"

"ہاں:"

مسعود کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ سوچ میں پڑ گیا پھر بڑی بے چارگی کے لہجے میں بولا "یار کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

کوڑیوں کے مول

(چوتھی قسط)

ترجمہ: مسز اے۔ احمد سعدی

کمال نے اشارہ پر جیب سے چونی نکالی اور وکٹر کو دیکھتے ہی وہ کرسی کے قریب گیا۔

منگوا دیا؛ ایک روپیہ یا آٹھ آنہ ——"

وکٹر نے بہروپ کی طرح کمال کو اوپر دیکھا، اس کا اشتعال کہ اب یہ بات تو وہ بھول ہی گیا تھا

کہہ نہ سکا۔ —— تم کیوں کیا سوچ رہے ہو؟ سیدھی سی بات کیوں؟ [illegible] گھنٹے سے یہاں کھڑا ہو کر تمہارا انتظار کر رہا

تھا، سوچا تھا کہ تم اپنا پہلے مسلمان کے ناتے چندہ دے دو گے، تو میں نے کہہ دیا ہے کہ اردو کتابیں چھپنے کو دیں گی۔"

وکٹر نے کہا —— ہم نے تو نہیں کہا ——"

"نہیں کہا؟ تو پھر کتنا چندہ دیا؟ سیدھی سی بات کہیں؟"

تھوڑی دیر کے بعد وکٹر کو سیدھی سی بات یاد آئی، جیب سے نکالے ہوئے ورق الٹ کر دیکھنے لگا، آخری ورق

دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا؟ تم نے بھی نہیں دیا؟"

وکٹر نے کہا —— "میں نے کہا تو نہیں بھائی، چندہ کے بارے میں کہنا ہی بھول گیا۔"

"بیٹھ جا! چندہ کے لیے مولوی کے گھر کے پیچھے گئے اور وہاں جا کر چندہ کی بات ہی بھول گئے، پھر تم دو گھنٹے وہاں

بیٹھے کیا کر رہے تھے؟ بولو، بولو؟"

کمال نے وکٹر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، دیکھتا ہوں تم سے کچھ بھی نہ ہوگا، میں سمجھتا تھا [illegible] اب کے [illegible]

[illegible] ایک مرد مسلمان کو تم سے نہیں ہو سکتا، میں راستے سے گھوم کر چندہ وصول کر کے [illegible]

[illegible] یہ نہیں ہوگا ——"

اس کے بعد [illegible] گیا، پھر وہ

"پھر آخر وہ کیا [illegible] کیا [illegible] بتاؤ ——"

"وہ سب تو دوسری باتیں تھیں؟"

"کمال! اف، دوسری باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ مولوی کے ساتھ تم، تمہاری دوسری باتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ [illegible]

...سے ساتھ میرا ان کی طلبہ وں کو کیا باتیں ہو سکتی ہیں، میں بھی تو سنوں؟"

، "وہ بیٹھ گئے کہا ـــــ "ممی دیدی بہت اچھی لڑکی ہے، وہ اور لڑکیوں جیسی نہیں ہے۔"

...سے لڑکیوں جیسی نہیں، کیا مطلب؟ سب تو ایسے لوگ نیک فطرت کے ہوتے ہیں وہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ جو جو ا
...یا ایسے طالب علم بھی دیسے ہی ہیں، مگر جب سے یہاں آئے ہیں تب سے لڑکوں کی بھلائی کر کے خوش ہوں کے
ہیں، بھول جاؤ تو جھوٹ نہیں ہوتے، مگر وہ بیمار ہے تو ادھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتا، وہیں سب کچھ اندر
چا، ندیان، بری تمام دنیا میں بھرو، مگر ان کو لکھا چکے ہیں ـــــ"

کی باتوں پر کان بھی نہیں دھرا۔

نہیں معلوم، ممی دیدی کا بہت مصیبت میں ہے۔

کیا مصیبت؟ اتنا روپیہ ہوتے ہوئے کیسی مصیبت؟"

ت ایک مصیبت میں ہے، ممی دیدی کی تکلیف دیکھ کر مجھے اس پر رحم آتا ہے۔"

ـــــ تم کیا مصیبت میں ہے، مجھے بھی دکھاؤ، مجھ سے زیادہ مصیبت اور تکلیف بھی کسی کو ہو سکتی ہے؟"

بہت بھاری بات ہے، لیکن ممی دیدی کی زندگی ہم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ باہر سے دیکھنے میں کچھ پتہ نہیں چلتا
پھنسی رہتی ہے، بس میں پڑ کر رہ جاتی ہے، تڑپتی ہے، بات نہیں کرتی ہے، بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہے لیکن
...ملی ہے، جس امیری میں وہ بہت زیادہ دکھی ہے، جانتے ہو ...

معلوم ہوا؟"

...نے بتایا ہے۔"

...ے سنوں تو سہی؟"

...کو نہیں بتاؤ گے بھائی؟"

کیا مطلب؟ تکلیف کا کوئی سبب تو ہوگا، جیسے کھانے کو نہیں ملتا، یا تمہارے لیے روپیہ نہیں ہے؟
...ہو سکتے ـــــ"

...ہے ـــــ وہ بیٹھ گئے کہا۔

...کیسی باتیں کرتے ہیں، تمہاری ممی دیدی نے کیا قصور کیا ہے؟"

قصور نہیں کیا، تم اسے تقدیر کا لکھا کہہ سکتے ہو، اپنی قسمت کے ہاتھوں وہ تکلیف اٹھا رہی ہے، اس کے
...نہیں ـــــ"

...کی ہمیشہ زندہ نہیں رہتی، ایک نہ ایک دن تو ان مر ہی جائے گی، اور اصل میں اس نے یہ سب لکھ کر تمہیں بعد
...کا ٹھہرنا بہت مشکل ہے، سمجھ سکتے ہیں، جانے دو، تم سے یہ سب کہہ کر کیا فائدہ ہوگا، لاکی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] J. T. Sunderland [illegible] India in [illegible] [illegible]
Catalogue [illegible] India in Bondage [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے، بہت خوش نظر آ رہے ہو، کیا سبب ہے تمہیں؟"

کہنے لگا: "بابا کی جیت اچھی ہو گئی، کیا؟ کرن کا بیاہ ہو گیا؟ کرن کو ملازمت مل گئی؟ نہیں، یہ سب کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

میں نے کتابوں میں سے ایک ایسی کتاب پڑھنا شروع کی ہے کہ تم پڑھو گے تو چونک اٹھو گے۔۔۔"

"کون سی کتاب ہے؟"

کرن نے کتاب دکھائی۔

"بھیرو نے مجھے پڑھنے کے لیے دی ہے۔ یہ [illegible]"

وہ کون سی کتاب تھی، کیا [illegible] تھا، کس کی لکھی ہوئی تھی، اب یاد نہیں رہا، شاید کوئی فرانسیسی مصنف تھا، اسی کی سوانح عمری کا ترجمہ تھا۔ [illegible] کی سوانح عمری تھی۔ بھیرو نے بہت سی کتابیں دی تھیں، کہاں کہاں سے لا کر دیں، اچھی اچھی کتابیں، کہ میں پڑھوں۔ [illegible] دیتے تھے، وہ سب کتابیں تو اب دکھائی ہی نہیں دیتیں۔

کرن نے کہا: "یہاں سے پڑھ کر دیکھو، کیا خوب لکھا ہے ———"

وہ زمانہ کب کس صدی کی بات تھی۔ وہ [illegible] صدی میں ایک وقت ایسا تھا جب [illegible] اس کی حالت بھی ایسی ہی تھی [illegible] سے پہلے دنیا میں [illegible] تہذیب کے [illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible] تہذیب نے جنم لیا تھا، ان دونوں قوموں کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ وہاں کے محکوم [illegible] بھی اسی طرح دیوتا کے نام پر [illegible] کو دے دیتے تھے۔ وہاں کی [illegible] بھی [illegible] حاصل نہ کرنے کی وجہ سے [illegible] کے [illegible] میں [illegible] زندگی گزارتی تھیں۔ وہاں بھی [illegible] کی طرح [illegible] تھا۔ [illegible] نہیں تھا، تہذیب [illegible] نہیں ہو سکی تھی۔ [illegible] ان کی [illegible] نہیں [illegible]۔ [illegible] لوگ [illegible] وہاں کے لوگوں کی طرح [illegible] کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ [illegible] وہاں بھی محکوم [illegible] لڑکیاں [illegible] چھپا کر [illegible] وہاں بھی [illegible] کے خواب [illegible] اور وہاں بھی [illegible] [illegible] جانوروں کی طرح [illegible] وہ [illegible] کیا [illegible] [illegible] جب [illegible] کے محل [illegible] [illegible] خوش رہتے تھے، [illegible] قوت اور بقا کے [illegible] رہتے تھے؟

[illegible] نے کہا: "[illegible] ہم لوگوں کے ساتھ [illegible] آج [illegible]؟"

[illegible] وہاں بھی [illegible] کے [illegible] میں [illegible] [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] —

[illegible] ——

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"When I see the poor without the clothing and without the shoes which they themselves are engaged in making, and contemplate the small minority who do not work and yet want for nothing, I am convinced that Government is still the old conspiracy of the few against the many, only it takes a new form – ––"

[illegible]

[illegible]

[illegible] Conspiracy [illegible]

[illegible] ——

مسٹر شی ۴

کرم نے کہا ـــــ وہ لیپ ہوا کرتا ہے، یہاں تو لائبریری بھی تفریح کا ذریعہ ہے جلانے کے لیے، ورنہ یہ سرمایہ دار سب مفت کے ہیں، یہ سب ـــــ کمینوں کی جماعت کے ہیں ـــــ

دیکھا کہا ـــــ بیکی گھر میں بہت تکلف ہے۔

کرم کہا ـــــ ذرا یہ سب لالہ کی سازش ہے، جو کچھ تمہارا ... ہے، ذرا یہ بات بھی ہیں تم خوبصورت چہرہ دیکھ کر [illegible] ہو جاتے ہو، دیکھ لو گے تمہارے لالہ جی چندہ نہیں دیں گے، وہ ہرگز چندہ نہیں دیں گے ـــــ

لیکن نہیں، اس روز یہ ایک لطیفہ ہوا، میری لالہ جی سے ملاقات ہو گئی، شام کے وقت وہ دفتر سے لوٹ رہے تھے اور اس روز ان کے چہرے ... تھکے ہوئے تھے، کلف شدہ پتلون پہنے ہوئے تھے اور سر پر ہیٹ تھا۔

انھوں نے کہا ـــــ ارے دیو بابو!

دیکھ پڑھ کے ذرا سہارا دو ـــــ

آج آپ بہت سویرے واپس آ گئے؟

آج ان کا نہیں، کام نہیں ہے کا تو گھر نہیں ملو گا۔

ایک بار مجھے کبھی ... کہ وہ پوچھے لالہ جی کیا کام کرتے ہیں، کس دفتر میں ملازم ہیں، [illegible] کے بعد مجھے چندے کی بات یاد آ گئی۔

لالہ جی، کیا آپ چندہ دیں گے؟

چندہ؟ کیسا چندہ؟

جو لائبریری کا ـــــ

تم لوگوں نے کیا لائبریری قائم کی ہے؟ خوب، خوب، اچھی بات ہے۔

لالہ جی نے دوست نوازی کی، دیکھا [illegible] چپ چاپ کھڑا تھا، لالہ جی کو سمجھ نہ سکا۔

لالہ جی، اس لائبریری کا سیکرٹری [illegible] ہے ـــــ

یہ بات ہے؟ واہ، بہت اچھی بات ہے۔ تم لوگوں نے کہاں لائبریری کھولی ہے؟

لالہ جی نے بہت سارے باتیں دریافت کیں، کتابیں پڑھنا بڑی اچھی عادت ہے، [illegible] کتابیں [illegible] ہے۔

لالہ جی نے کہا ـــــ

میں تمہاری لائبریری ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں دیو بابو ـــــ

کہنے لگا ——

"ابھی پہنچے! ——"

وہ پھر کہنے لگا ——

"[illegible] ——"

"[illegible]؟"

[illegible]

[illegible]

"[illegible] ......"

[illegible] نے کہا ——

"[illegible] ......"

کہنے لگا ——

"[illegible]

[illegible] ——"

[illegible]

[illegible]

کہنے لگا ——

"[illegible] ......"

[illegible] نے کہا ——

"[illegible] ——"

[illegible] ——

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——

"میں سے نہیں بتا سکتا؟"
کرن نے کہا ـــــ
"پہلے میں لائبریری دیکھ لوں، آپ ذرا سا انتظار کیجئے گا۔"

متعدد دنوں کے بعد بھی اس وقت کے یاد آنے پر آج تک شرم بھی آتی اور ہنسی بھی اور دکھ بھی ہوتا! لیکن اس وقت تو بیچارہ معلوم نہیں تھا کہ ککا بابو اتنی دلچسپی سے اس کی لائبریری دیکھنے کیوں جا رہے تھے! آفس سے تھکے ماندے واپس آنے کے بعد بھی بستی میں پھیلی ہوئی گندگی کو پھلانگتے ہوئے وہ وہاں کیوں چلے گئے تھے! بہت دن پہلے کی بات ہے اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہی لائبریری دکھانا اگر اس کے لیے مصیبت کا سبب بن جائے گا اور وہ لائبریری کرن کی زندگی میں تباہی لے آئے گی۔

ککا بابو نے کہا ـــــ "وہ بہت اچھی لائبریری ہے، یہ لائبریری تم ہی چلا رہے ہو شاید؟"

کرن نے جلدی سے کہا ـــــ "اس میں کا سیکریٹری بھی اور وہی پریسیڈنٹ ہے ـــــ"

لالٹین کی روشنی میں ککا بابو ایک ایک کتاب اتار اس کی ورق گردانی کر رہے تھے، فرش پر بوسیدہ چٹائی بچھی ہوئی تھی مٹی کی دیواروں اور چھپر سے بہت بھیکے اٹھ رہے تھے اور اس دوران متعفن آب و ہوا اور لالٹین کی دھندلی روشنی میں ککا بابو کا جوش اُن کی دلچسپی اور شوق و تجسس دیکھ کر دیپکر اور کرن کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ چندہ تو بہتوں نے دیا تھا، زبانی ہمدردی بھی بہتوں نے جتائی تھی اور راستے گھاٹ میں بہتوں نے حیرانی ان کی دل شکنی کی تھی، بہتوں نے حوصلہ افزائی بھی کی تھی، لیکن ککا بابو کی طرح کسی نے بھی جوش و دلچسپی اور شوق و تجسس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے لائبریری میں قدم رکھ کر اس کی عزت بڑھادی تھی اور وہ احسان تلے دبا جا رہا تھا۔

کرن نے کہا ـــــ "ککا بابو! آپ ہم لوگوں کے پریسیڈنٹ بن جائیے، آپ پریسیڈنٹ ہو جائیں گے تو ہم لوگوں کو بڑی آسانی ہو جائے گی ـــــ"

ککا بابو نے پوچھا ـــــ "کون کون ممبر ہیں؟"

"سبھی کو ممبر بنایا ہے ککا بابو" کرن نے جواب دیا ـــــ "ذولفی، لالو، چاند، چھوٹے رام، بہار، سبھی کلاس فرینڈ ہیں، بیرسٹر پاڑہ کے لڑکے نرل، پلٹو اور چندی بھی آتے ہیں، کمال سب تو۔"

ککا بابو نے پوچھا ـــــ "اور محمود جمعدار؟"

دیپکر نے کہا ـــــ "ان کو تو کھوں سے سر اٹھانے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔"

کرن نے کہا ـــــ "میں محمود وغیرہ کے پاس بھی گیا تھا، محمود وغیرہ کہتے ہیں کہ ہم ان پڑھ ہیں..."

"تمام ممبر یہاں آتے ہیں؟" ککا بابو نے پوچھا۔

"کوئی نہیں آتا ککا بابو، میں اکیلے ہی روشنی جلا کر یہاں بیٹھا رہتا ہوں، کوئی نہیں آتا، دیکھو نہیں آتا۔"

ککا بابو نے کہا ـــــ "ٹھیک ہے، اب میں دیکھ لوں گا۔"

آپ پیتے نہیں ہیں؟

[illegible]

میرے ...

[illegible]

[illegible]

تم کتابیں پڑھتے ہو؟

کہنے لگا — یہ پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے —

نے کہا — بہت خوب!

[illegible]

نے گھبرا کر کہا — نہیں، میں چلا گیا۔

[illegible]

[illegible] ہم لوگوں نے [illegible]
استعمال نہیں کرتے تھے اس لیے ہر ایک [illegible] جتنا کچھ [illegible] ہے [illegible]
[illegible]

کاکا بابو نے پوچھا ——

"یہ سب باتیں تمہیں کس نے سکھائی ہیں؟"

کرو نے جواب دیا —— [illegible] انکل کاکا بابو! ابھی تو [illegible] انگریز [illegible]
[illegible] بہت سے [illegible]
[illegible] تمام لوگوں کو یہی بات [illegible] جائے"
[illegible]

وجے نے کہا "[illegible] باتیں [illegible]"

"[illegible] ہے؟"

کاکا بابو اشتیاق سے پوچھ بیٹھا۔

"[illegible] بہت [illegible] معلوم ہوتا ہے؟"

وجے نے کہا —— "[illegible] باتیں نہیں [illegible] ہیں" [illegible]

کے ساتھ [illegible] باتیں [illegible] ہیں"

کاکا بابو سوچ میں پڑ گئے۔

"بہت اچھا، بہت اچھی بات ہے۔ [illegible] بہت خوشی ہوئی"

[illegible]

کاکا بابو کو [illegible] دیر ہو گئی تھی، انھوں نے کہا ——

"اچھا اب ہم چلتے ہیں، کیوں؟"

کرو نے کہا —— "پھر آئیے گا کاکا بابو!"

"خود آگئی تھی۔"

اس کے بعد جب سے وہ وہ پہلا دن کا اکرام سے شروع سے بیٹے کر رکھ دو پہلے سے کہا
آیا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کر لالا بابا نے پہلے دن ہی کی طرح وہ سب (ڈ) کا کھایا گئے
دیکھنے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پیشانی پر کہ سب ہمیشہ کی طرح تھی خوشی ہوئی، تھی چند
سمجھ بھی نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہے، وہ خوشی کے مارے جیسے گنگ ہو گیا تھا اور اس کی دونوں آنکھیں خوشی
سے بہنے لگیں جب لالا بابا نے کہا۔

"تم مجھے ایک بار ملنے دیجیے۔"

"کب لالا بابا؟"

"آج ہی کیوں نہیں۔" لالا بابا نے کہا۔

لالا بیٹھ گئے اور وہ خاموشی سے بیٹھ رہے جب تک پاس چھوڑ گیا، اس کے بعد ایک بار پھر ایک
جیسے کہہ سکتے کہ وہ بیٹھ گئے تھے وہ اپنی جیبیں ٹٹولی چابی پر ہاتھ رکھا ہے تماشہ دیکھنے لگا۔ چند
جز خوشی کے وہ جب ان سے ملنے کے وقت میں لگ رہے تھے جیسے اسی طرح وہ دیکھنا چاہتے تھے ویکھ
نہیں، وہ کوئی بات سے ملتے ہیں اس کی سنت گزر گئی۔ تھی۔ سوچا وہ چپ رہے بے اختیار ان کا چہرہ
آنکھوں پر چہرے خوشی و دولت کے ساتھ آیا، ہاتھ ملتے ہوئے دیکھتے رہنے کے بعد اس کی حالت
کہہ "آج سے اسے معلوم کرنا چاہا۔

لیکن کیوں کا دھیان اس طرف نہیں تھا، وہ اپنے جا رہا تھا، وہ چکر کا بار سوچ رہا جیسے اپنے آ
قریب پڑی وہ شیشی پر تنے کی گرہ تھی۔

وہ اسے سنبھالتے ہوئے کے پیچھے تک لے چلا گیا۔

"نزلی جاؤ، نزلی جاؤ کرو۔"

انہوں نے جلدی سے سیٹ پر رکھ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کمرے کی حالت دیکھ کر وہ خود
ہو رہا تھا۔

"نزلی جاؤ کرو۔"

"چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔"

دیکھنے پھر کہا ــــ "آؤ دیکھیں کہ تو پانی پی لیں گے، نزلی بھا۔"

کرو نزلی گیا ــــ "میں کیا کروں بتاؤ تو ...... دل چاہتا ہے کسی کو کچھ کر کے بس چیخوں۔"

"کیوں؟"

کرہ کی حالت واقعی پاگلوں جیسی تھی۔

تبھی چرہ خوش ہو کر بولی "بہت بھائی، میں کیا کروں بتاؤ تو؟"

وہ چیخنے لگا ——— "تم پانچ پانچ ہزار، تمہارے … دیکھنے کی تو یہی ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔"

"مجھے وہ آج ہی کہاں ملا ہی نہیں، سوال ہی نہیں، میں تمام بات اچھا ہوں گا، تمہارے کام آ سکتے اپنے آدمی ہیں

، تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا تھا؟ میں نے جھوٹ نہیں کہا، آدمی کہ کر گالی دی ہے"

کرہ نے چپ سی طرف دیکھ کر دیکھ کر حیرت سے بھولی انسانی … میں ایک لاکھ روپیہ انعام پا کر بھی اس طرح دیا نہ

تھا۔ دیکھ کر نے کرہ کو زبردستی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا

"اول جاؤ، اک جاؤ، چپ رہو۔"

اسے اپنے آپ اس دیکھ کر سر … دیکھ کر دیکھ کر بھی خود کو سنبھال نہ سکا تھا لیکن اس وقت دیکھ کر کو معلوم نہیں تھا کہ اتنی

اس سے پہلے اسے کبھی کسی بات کا دکھ پیدا نہیں … تو جلدی سے اس نے قائم کیا کہ اس آدمی کے ساتھ انسانی کی جا

سکتی ہے، آدمیوں سے چندہ دیا ہے، وہ شعبہ … کے ساتھ … کے راستے میں ملاقات ہوئی تھی، ایک بات پر اس

پانچ روپیہ چندہ دے رہا تھا۔ دکان میں سے بالکل … گا اور … گیا تھا۔ لیکن اس دن کرہ اس طرح خوش

ہے کہ نہیں ہوا تھا اور جنہوں نے کچھ بھی نہیں دیا تھا اور … سے چندہ دینے کی دھمکی دی تھی ——— وہ سب کیا خواب

ہی تھے؟ اس کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ کون اچھا ہے اور کون خراب؟ روپے کے پیمانے سے؟ روپے سے انسان کی انسانیت

ناپی جا سکتی ہے؟ مگر وہ اگر پانچ روپیہ چندہ دیتے تو وہ بھی ہاں ایک … میں کرہ کی نگاہوں میں اچھے آدمی ہو جاتے

یا؟ دیکھ کر کے بعد میں بہت بار … سوچا تھا لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کوئی مستقل جواب اس کی سمجھ میں نہیں آیا

تھا۔ اس نے سوچا تھا، وہ کیسا چاہتے ہیں سے وہ انسان کو پرکھ سکتا ہے؟

کرہ نے کہا ——— "مہاجن، ہم تو دلی … کا جالی"

"مگر روپیہ کہاں ہے؟"

"مجھے پتہ ہے گا، میں بستر کے نیچے چھپا کر رکھوں گا اور سبھی کو پڑھنے کے لیے دوں گا۔"

دیکھ کر نے کہا ——— "اب تم جا کر کھانا کھاؤ، میں گھر جاتا ہوں۔"

اس وقت بہت تیز ایک چھال ہوئی تھی کہ وہ … میں تنہا تھا، اشارہ اسے خوشی سے وہ کھانا نہیں کھا سکے گا

شاید سے کبھی نہیں وہ واقعی تو، یہ کس نے سوچا تھا کہ کام کا پار … اس کا … کی مدد کرے، اس طرح … میں آ کر

اس کی بہت قدر کی گئی تھی، اور چندہ کا کام اور … میں … کر سکے تو … وہ

کوئی … پیدا کرتی … کے بعد … اور … آئی … کے

کام … سے … آ گیا … سے … اور … سے … ان

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پھر چہرے سے مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"تم بہت کچھ جانتے ہو وِیکر!"

واقعی بچارہ وِیکر واٹسن کے بارے میں جانتا ہی کیا تھا، صرف اس کی شکل دیکھ کر رہا تھا۔ خوبصورت سب سے صحت مند چہرہ تھا اس کا اور ستر کے قریب سن تھا بوڑھوں کو دیکھیں تو وِیکر کو ان کی خوشی جھلکتی تھی، خوشی بھی بڑی تھی... وہ کبھی ہنستا تھا، یہ تو سب وہ انسان ایک کو تو ایک آئیڈیل انسان، اس دور میں سامنے سنا تھا بار بار دیکھ کر سے دنیا کے تمام دن حیرت معلوم ہوتے تھے

انھوں نے کہا تھا ۔۔۔ "اس سے خوبصورتی جھلکتی ہے وِیکر، خوبصورتی تو انسان کو کبھی نہیں بلاتی۔"

جیسے اس دور زمان بیچارہ اسٹریٹ کی اس دوپہر کی سے باہر نکلنے کے بعد وِیکر کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا میں اگر کوئی آئیڈیل انسان ہو سکتا ہے تو وہ صرف ۲۷۲ نمبر میں اور صرف وِیکر ہی نہیں بلکہ نے بھی یہی سوچا تھا اور اسی میری گلی سے نمبر ایک بی میں جاکر وِیکر نے دیکھا ۔۔۔ دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا، وِیکر اندر داخل ہو گیا، اور کمرے دونوں کو ان بار ہی کہانے کے سامنے جانے کیا کہہ رہا تھا۔

"کون؟"

"میں جون کالی ماں، میں جون دیو۔"

"اس وقت اچانک؟"

"۲۲۰ بار نے مجھے بلایا ہے۔" وِیکر نے کہا۔

"ہاں وہ تو بہار مکس دوستی بھی اوپر کہا ہے۔"

کالی ماں اتنا کہہ کر اپنے کام میں لگ گئیں، مگر اس کالی ماں کے نہ سے تک اور ذوق: "ہاں" پھر بھی دیکھتی، جیسے کام کرنے میں انھیں راحت ملتی ہو اور چپ چاپ رہتا ہے بیان نہیں انہیں۔

وِیکر نے کہا ۔۔۔ "مبارک ہو کالی ماں، ۲۲۰ بار، ۲۵ نمبر کا نمبر کہہ رہے ہیں۔"

"واقعی، اچھا تو ہے۔"

"۲۵ نمبر والے سب ہی ہو گئے ہیں۔"

۲۵ بار نے سب سے بڑی خبر دی سب کو پہنچ کر سنا دیا تھا، اس کا بھی پتا تھا کسی دیکھی تھی۔ محلے کے تمام لوگوں میں اس کمال کا علم رہا وہ کچھ بیچارگی سے

دوسری منزل پر کمس دیو کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، شاید ستی بھی وہیں موجود تھی، اب تمام ستی کی ضرورت بھی مگر دیکھ ہو گی وہ سب بیٹھی تھیں ہوگی۔ تھوڑی دیر پہلے سیر کر جانے پہنچے ہوئے کمس دیو کی نے اس سے وہ کچھ کہا تھا، وِیکر کو یاد آگیا۔ واقعی کمس دیو کی بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہے، اس سے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا، جیسے وِیکر تو جانتا تھا کہ وہ کتنی تکلیفیں سہتی ہیں، کبھی کبھی کر کمس دیو کو خط لکھا کرتے ہیں، شاید ستی بھی ضرور دیتی ہے، کمرہ ہے کسی دن ستی اس سے کہیں

وہ سب کے ساتھ پہلے [illegible] بعد ممی دیدی کے پاس کیسے آگیا ہے؟

وکی بڑے پالنے [illegible] پہنچ گیا۔

ممی دیدی اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جیسے ہی وہ اندر موجود نہیں تھی، تو کیا ستی [illegible] گھر واپس جائے گی

وکی نے آواز دی ——— "ممی دیدی!"

ممی دیدی نے کتاب سے نظریں ہٹا کر حیرت سے وکی کی طرف دیکھا۔

بولی ——— "کیا ہے؟ تو پھر کیوں آگیا؟"

"تمہیں معلوم ہے ممی دیدی کا لالا بابو جو کل [illegible] کے ممبر ہو گئے ہیں۔" وکی نے کہا ——— "انہوں نے

ابھی بلایا ہے۔"

ممی دیدی جو گھبرا گئی جیسے وہ کسی انجانے خوف سے سہم گئی ہو۔

"بلایا ہے؟ کیوں بھئی؟"

"معلوم نہیں۔" وکی نے جواب دیا

ممی دیدی نے پوچھا ——— "ستی سے تیری ملاقات نہیں ہوئی؟ ستی تو تیرے ہی یہاں گئی ہے!"

"میرے یہاں؟ اچھا! کیا کہنے؟"

"کہتی تھی تیری ماں کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

وکی حیرت سے ممی دیدی کا منہ تکنے لگا ——— ستی اس کے یہاں گئی ہے، اس کی ماں سے باتیں کرنا چا[illegible]

وکی نے کہا ——— "میں لالا بابو سے مل کر ابھی آتا ہوں۔"

"میں نے لالا بابو سے کیا بات ہے؟" ممی دیدی نے پوچھا۔

"لالا بابو ممی دیدی!"

ممی دیدی نے پھر یاد دہانی کرا دی، بولی ——— "مگر یہ ہے کہ تم میرے بارے میں کچھ بات نہ کرنا، تو ک[illegible]

میں کچھ نہیں جانتا، سمجھ گئے نا؟"

"ذرا دیر میں [illegible] مت جانا؟"

"نہیں جاؤں گا۔"

"بھوت بن جاؤ گے، بکے!"

اتنی دیر میں وکی زینے سے لپک کے تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ تیسری منزل پر اس وقت لالا بابو کپڑے تبدیل کرکے [illegible]

سامنے بیٹھے شاید خبر کا انتظار کر رہے تھے۔ وکی کے قدموں کی آواز سن کر انہوں نے فائل ایک طرف سرکا دی اور [illegible]

دیکھو بیٹا، کرسی کی طرف اشارہ کرکے بولے۔

"بیٹھو۔"

وہ بیٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیمس کاکا بابو کا چہرہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس کا چہرہ اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ قدرے سنجیدہ تھا۔

کاکا بابو نے کہا ۔۔۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں بلایا ہے۔"

وشال نے کہا ۔۔۔ "آپ کے چلے آنے کے بعد کمرہ اچھا [illegible] تھا۔"

"کیوں؟"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کاکا بابو۔ ہم لوگ بڑی مشکل سے لائبریری چلا رہے ہیں خاص طور سے کرن بڑی محنت کر رہا ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو۔ خود دیکھا کر وہ لائبریری چلا رہا ہے۔ لائبریری کے پیچھے وہ دیوانہ ہو رہا ہے۔ رات رات بھر سوتے نہیں، لائبریری کی کتابیں دیکھتا ہے۔"

کاکا بابو نے تمام باتیں غور سے سنیں اس کے بعد بولے

"میں نے تمہیں کیا کہنے کے لیے بلایا ہے جانتے ہو؟"

وہ قدرے رک کر بولے ۔۔۔

"تم کرن کے ساتھ مت رہا کرو۔"

وشال ایک دم چونک اٹھا جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ اسے کاکا بابو کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔

"کیوں کاکا بابو؟" اس نے پوچھا۔

کاکا بابو نے کہا ۔۔۔ "ہاں میں کہتا ہوں تم اس کے ساتھ مت رہا کرو۔"

"لیکن وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو!"

کاکا بابو کا چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اتنا سنجیدہ تھا کہ [illegible] دیکھ کر اس کا چہرہ دیکھ کر [illegible] ہوتے ہوئے تو اس نے کاکا بابو کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"لیکن اس نے تو کوئی قصور نہیں کیا ہے کاکا بابو۔ آپ کو معلوم ہے کتنی تکلیف سے [illegible] کے ساتھ [illegible] سال سے [illegible] زندگی میں کتنی محتاجی ہے [illegible] کیا ہے [illegible] گھر میں [illegible] اس کے [illegible] بیمار ہیں۔ [illegible] تیار کرتا ہے [illegible] ہے پھر کچھ چندہ [illegible] ایک پیسہ بھی گھر میں [illegible] کے لیے نہیں ہوتا۔ اس جیسا نیک لڑکا......"

"چپ رہو۔"

کاکا بابو کی آواز ذرا کرخت تھی۔

بولے ۔۔۔ "شادی کو کتنے دن ہو گئے [illegible] تم کیا جانتے ہو؟ تم نے ابھی دنیا"

سمانی پر پہنچا ... بعد ممی ڈیڈی کے پاس کیسے آنا ہے!

وکٹر دبے پاؤں ... چلا گیا۔

ممی ڈیڈی اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ لیکن ستی وہاں موجود نہیں تھی۔ تو کیا ستی ابھی تک گھر واپس نہیں آئی؟

وکٹر نے آواز دی ۔۔۔ "ممی ڈیڈی!"

ممی ڈیڈی نے کتاب سے نظریں ہٹا کر حیرت سے وکٹر کی طرف دیکھا۔

"ہاں ۔۔۔ کیا ہے؟ تو پھر کیوں آ گیا؟"

"تمہیں معلوم ہے ممی ڈیڈی ۲۷ اور ۲۸ نمبر کے لوگوں کو ... ممبر ہو گئے ہیں۔" وکٹر نے کہا ۔۔۔ "انھوں نے بلایا ہے۔"

ممی ڈیڈی چونک اٹھی جیسے وہ کسی انجانے خوف سے سہم گئی ہو۔

"بلایا ہے؟ کیوں سے؟"

"معلوم نہیں۔" وکٹر نے جواب دیا۔

ممی ڈیڈی نے پوچھا ۔۔۔ "ستی سے تیری ملاقات نہیں ہوئی؟ ستی تو تیرے ہی یہاں گئی ہے!"

"میرے یہاں؟ ابھی؟ کیا کرنے؟"

"کہتی تھی تیری ماں کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

وکٹر حیرت سے ممی ڈیڈی کا منہ تکنے لگا ۔۔۔ ستی اس کے یہاں گئی ہے، اس کی ماں سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔

وکٹر نے کہا ۔۔۔ "میں ۲۷ نمبر سے ہی گزر کر آ رہا ہوں۔"

"میں نے جو کہا تھا تجھے یاد ہے نا؟" ممی ڈیڈی نے پوچھا۔

"یاد ہے ممی ڈیڈی۔"

ممی ڈیڈی نے پھر یاد دہانی کرا دی۔ بولی ۔۔۔ "مگر پوچھے کہ تم میرے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں؟ تو کہہ دینا بس جانتا ہوں۔ سمجھ گئے نا؟"

"زیادہ بتانا مت جانا؟"

"نہیں بتاؤں گا۔"

"شاباش، بول دو بچے!"

اتنی دیر میں وکٹر زینے طے کرکے تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ تیسری منزل پر اس وقت ۲۷ کا بابو کپڑے تبدیل کرکے بیٹھے شاید وہ کچھ کام کر رہے تھے۔ وکٹر کے قدموں کی آواز سن کر انھوں نے فائل ایک طرف سرکا دی اور اس کے بعد کرسی کی طرف اشارہ کرکے بولے۔

بیٹھو۔

وسیم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیلم کا کا بابو کا چہرہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ان کا چہرہ اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ قدرے
ستا ہوا تھا

انھوں نے کہا ۔۔۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔

وسیم نے کہا ۔۔۔ آپ کے بلانے سے پہلے ہی میں آنے والا تھا۔

کیوں؟

اسے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی ہے کاکا بابو۔ ہم ایک نئی شکل سے لائبریری چلا رہے ہیں۔ خاص
طور پر بڑی محنت کر رہا ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو۔ خود نکال کر وہ لائبریری چلا رہا ہے۔ لائبریری کے پیچھے
دیوانہ ہو رہا ہے۔ رات سوتے میں بھی وہ لائبریری کا ہی خواب دیکھتا ہے۔

کاکا بابو نے تمام باتیں غور سے سنیں۔ اس کے بعد بولے

میں نے تمہیں کیا کہنے کے لیے بلایا ہے، جانتے ہو؟

وہ قدرے رُک کر بولے ۔۔۔

تم کرن کے ساتھ مت رہا کرو۔

یکایک وسیم کے سامنے جیسے بجلی گر پڑی۔ اسے کاکا بابو کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔

کیوں کاکا بابو؟ اس نے پوچھا۔

کاکا بابو نے کہا ۔۔۔ ہاں، میں کہتا ہوں تم اس کے ساتھ مت رہا کرو۔

لیکن وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے کاکا بابو!

کاکا بابو کا چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ آج پہلی بار تھا کہ وسیم نے ان کا چہرہ دیکھ کر ... ہمیشہ مسکراتے ہوئے
ہوئے تو اس نے کاکا بابو کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

لیکن کرن نے تو کوئی قصور نہیں کیا ہے کاکا بابو! آپ کو معلوم ہے کتنی تکلیف سے وہ پڑھتا ہے۔ ... سامنے ...
ہے۔ اس کی زندگی میں کتنی مصیبتیں ہیں، کتنی کٹھنائی ہے۔ ... کے گھر میں کھانا ... اس کے ... سال سے
بیمار ہیں۔ اس کی ماں جینو تیار کرتی ہے ... اس کی ... چلتی ہے۔ پھر ... ایک پیسہ بھی گھر میں ...
کے لیے نہیں دیتا۔ اس جیسا نیک لڑکا .....

چپ رہو۔

کاکا بابو کی آواز میں بڑی سختی تھی۔

بولے ۔۔۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟ ... تم ابھی ... نیک ... تم نے ابھی دیکھا

[illegible] ۷۷۲ [illegible]

۷۷۲ بابا کہنے لگے ۔۔۔ انسان کا سب کچھ دیکھا نہیں جاسکتا۔ ایسے [illegible] پیدا نہیں ہوتا [illegible]
[illegible] میں نے بہت کچھ [illegible] [illegible]
[illegible]

یہ بات ختم کر کے ۷۷۲ بابا خاموش ہو گئے۔ [illegible] نہیں [illegible] ۷۷۲ بابا کی باتوں کی [illegible] ۷۷۲
[illegible] دیکھتے [illegible]

۷۷۲ بابا نے کہا ۔۔۔ شادی [illegible] ہے [illegible] سے
[illegible] کیا اس [illegible] ساتھ [illegible] کیا تمہیں [illegible]
ہے [illegible] شادی [illegible] کا مقصد [illegible] جائے گا؟

اب تو [illegible]

۷۷۲ بابا کہنے لگے ۔۔۔ [illegible] ساتھ [illegible] ہے [illegible] زیادہ پیار [illegible]
[illegible] دنیا [illegible] نہیں [illegible] ساتھ ساتھ [illegible]
[illegible] ٹھیک ہی [illegible] نہیں ہے۔

اس کے بعد [illegible]

اب تم جا سکتے ہو۔

[illegible] اس نے سوچا [illegible]
[illegible] کیا قصور کیا ہے؟ [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] ساتھ [illegible] ساتھ ساتھ
[illegible] ساتھ [illegible]
[illegible] کیا قصور کیا ہے؟ [illegible] کیا [illegible] انسان کو
[illegible] انسان [illegible] ساتھ [illegible] سکتے ہیں؟ [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] ساتھ [illegible] کیا اس
ساتھ [illegible] کیا [illegible] ساتھ [illegible]
[illegible] ہے [illegible] نہیں ہوتا؟ [illegible]

ونیکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہو۔ تمام کشش اچانک ہی ختم ہو گئی یا ایک سر ہو گئی۔ اس پاؤں کے نیچے کی زمین، سر کے اوپر کا آسمان اور دوسری ساری چیزیں جیسے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہوں اور وہ کسی خلا میں لٹک رہا ہو۔ اس کا کوئی وجود نہیں، اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ حالانکہ ... پہلے تک وہ انہیں اپنا سمجھتا رہا تھا۔ یہ کالا بابا، یہ ٹھمی دیدی، یہ کاشی ... یہ ادھر ادھر کے دوست، اہل محلہ، یہ کالی گھاٹ کے راستے، گلیاں سب کچھ جیسے اس کے اپنے تھے۔ آسمان پر چھائے بادل بھی اس کے اپنے تھے۔ سورج بھی اپنا تھا۔ ادھر ... شاخیں ... بھی اپنا تھا اور ... گلیوں میں گھر ... بھی اپنے تھے۔ کسی سے محبت یا نفرت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں جو کچھ اچھا تھا، جو کچھ برا تھا، جو کچھ چھوٹا تھا اور جو کچھ بڑا تھا، جو کچھ ادنیٰ تھا اور جو کچھ اعلیٰ تھا، ونیکر تو ان سب سے وابستہ تھا۔ ونیکر کی وابستگی تو ان سب سے تھی ... کالا بابا کی باتوں سے جیسے اس ... چشمے میں ... شگاف پڑ گیا تھا۔ ونیکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گم ہو گیا ہو ... سب کچھ رہ گیا ہو ... ٹھمی دیدی، کالی ماں ... کہیں وہ گم ہو گیا ہو، نہیں کھو گیا ہو، جیسے اسے ... روشن ہو گیا ہو اور اب اسے ... کشش کے ... کا سراغ نہیں ملتا تھا۔

"اچھا!"

دوسری منزل کے برآمدے میں ٹھمی دیدی نے دیکھ لیا تھا۔ وہ ... کے دروازے کے ... کھڑی ہوئی اتنی دیر سے جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ قریب آ کر ... سے پوچھا ۔۔۔ "اتنی دیر تک کالا بابا کے ساتھ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

ونیکر کی آنکھوں میں ... تھا۔ ٹھمی دیدی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی ... "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"ٹھمی دیدی، ابھی میں ... جاؤں گا" اس نے کہا۔

"کیوں؟ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کالا بابا تو ... رہے تھے۔"

"میں تمہیں ... بتاؤں گا ٹھمی دیدی، ابھی میں جا رہا ہوں۔"

ٹھمی دیدی حیرت سے ... کچھ بھی نہ ...

ونیکر نے کہا ... "تم کچھ خیال مت کرو، ٹھمی دیدی، ابھی مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں ابھی گھر جا رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر ٹھمی دیدی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ تیزی سے ... بڑھ گیا اور زینے سے نیچے اتر گیا ... ونیکر کی آنکھوں میں ... سائے ... رہا تھا ... کے ساتھ ... کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ... کوشش ... ہیں اور ... دنیا پر اس سر زمین پر اس کا کوئی حق نہ رہا ہو۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ونیکر سیدھا ... پر ... گیا ... ہوا تھا ... کے بعد ... ہر چیز کو صاف ... دیکھا ...

یہ دیکھ کر وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ اس کا سب کچھ اس کے سامنے بکھر گیا۔
میرے بچے! آنکھیں کھولو، تمہاری ماں تمہیں دیکھ رہی ہے۔"
سامنے ستی کھڑی تھی۔

ستی واپس جا چکی تھی اور وکرم کھڑا ہی رہ گیا تھا۔ اندھیرے میں وکرم اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو ... اچانک اسے ہوش آیا۔

"ستی۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا کوئی وجود نہیں ہو جیسے اس کا وجود ختم ہو گیا ہو، وہ کہیں کھو گیا ہو۔ اس دنیا میں نہ ہو جیسے اس دنیا میں سب کچھ اس کا سمجھ میں نہیں آ سکا۔

"ستی تم یہاں؟"

وکرم کسی شیطان کی طرح ستی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"تم نے مجھے بلایا؟"

"ہاں! اتنی دیر تک تم کہاں تھے؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

وکرم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جیسے ستی اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو۔

اس نے کہا ...... "میں؟ تمہارے پاس ہی تو ہوں؟"

"ہاں تم یہیں پر ہو ... تو پھر کس سے باتیں کر رہے تھے؟ یہاں پر تمہارے سوا اور کون ہے؟"

اتنا کہہ کر ستی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی ——

"تمہیں تو پتہ ہی ہوگا۔ اتنی دیر تک میرے یہاں کیا کرتے رہے؟"

"کیوں؟ تمہارے یہاں جا آنا منع ہے؟"

وکرم عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ ... کے بعد اس نے ... وقت پر ... تک ... اس سے

کہا تھا، اس نے ابھی تک ... نہیں ... کیا اس کے ... ہیں؟

اس نے کہا "کیوں؟ تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟"

ستی نے کہا "بتاؤ! اتنی دیر تک میرے یہاں کیا کرتے رہے؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

وکرم خاموش رہا۔ پھر ... کسی ... دونوں ... کی زندگی کی بات یاد آئی۔

"بتاؤ کس سے باتیں کر رہے تھے؟ ... "

وکرم نے ستی کی طرف دیکھا ... کی بات معلوم ہو چکی ہے۔ ستی کیا اس پر شبہ کر رہی ہے؟ اندھیرے

مینا کی آنکھوں کی تحریر پڑھنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا پھر بھی وہ ایک ٹک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ تاریکی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بیشتر گھروں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ مینا دروازے کی طرف پشت کیے ہوئے کھڑی تھی اور دینکر راستے میں کھڑا ہوا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اندر برآمدے کی روشنی مینا کی پشت پر پڑ رہی تھی اور اس کے سر کے بالوں اور ساڑی کے آنچل پر بکھر رہی تھی۔

"کہاں؟ چپ کیوں ہو؟ کس دوست سے باتیں کر رہے تھے؟"

دینکر نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔"

"پھر کس کے ساتھ؟"

"ماما جی کے ساتھ۔" دینکر نے جواب دیا۔

اس کی باتیں سن کر مینا معصوم سی جیسے کچھ سمجھ گئی ہو

بولی ——— "تم زمانے کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ تمہاری ماں جیسی بہن تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہے جلدی گھر جاؤ۔"

اتنا کہہ کر شاید وہ چلی جاتی۔ لیکن دینکر نے جواب میں سوال کر دیا۔ "دیکھو، اگر میں نے کسی دوست سے باتیں کی ہوں تو اس میں کیا برا ہے؟"

مینا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ بری بات کیا ہے؟ دوستوں کے ساتھ تم جتنی چاہے باتیں کرو لیکن تمہیں پڑھنا لکھنا ہے تو باتیں کرنا اچھا نہیں ہے۔ تمہاری ماں کہہ رہی تھی کہ تم پڑھنے لکھنے پر بالکل دھیان نہیں دیتے۔"

یکایک مینا بالکل جل سی گئی جیسے یہ دوستی نہیں ہو۔

دینکر نے کہا ——— "میں تو لکھتا پڑھتا ہی ہوں۔"

"لکھتے پڑھتے ہو؟ میں تمہاری ماں سے سب کچھ سن چکی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم ایک سال سے فیل ہو گئے ہو۔ دن رات اسی کے ساتھ گھومتے رہتے ہو میں سب کچھ سن چکی ہوں۔"

یکایک دینکر نے سوال کر دیا۔

"تم کو پتہ نہیں میں کیوں نہیں پڑھتا ہوں؟"

"کیوں نہیں جانا چاہیے؟"

دینکر نے کہا ——— "میں یہ نہیں سمجھتا، تم کو پتہ ہے جیسے یہاں ... میں تو جانا چاہتا ہوں۔"

[illegible] سے [illegible] تھا:

[illegible] بہت دیکھنے میں جیسا تھا اب ویسا نہیں ہے۔ [illegible]
[illegible] سے یہاں آگئی تھی۔

وہ پچھلے کہا —— "تیرے ساتھ دوستی کرنے کے لیے تم کو [illegible] ہو؟"

ستی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ —— "میں نے [illegible] تعلق [illegible] پر [illegible] کرتا [illegible] بہت [illegible] ہو —— [illegible] نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔ تم شاید [illegible] باتیں کرتے ہو؟"

یہ بات [illegible] کے وہ [illegible] یاد آگئیں جو [illegible] نے کسے بتائی تھیں۔

اس نے پھر پوچھا "اچھا ستی، سچ سچ بتاؤ، تم یہاں کیوں آگئی تھیں؟"

"یہ مجھے کیوں نہیں جانا چاہیے تھا؟"

"نہیں، تم سچ سچ بتاؤ، تم یہاں [illegible] کبھی نہیں [illegible] پھر [illegible] دونوں سب یہیں چلی گئیں؟"

ستی نے کہا —— "کیوں، تم پوچھتے ہو [illegible]؟"

"نہیں، میں یہ نہیں کہتا، [illegible] کوئی [illegible] تو کبھی نہیں جاتی۔ [illegible] نہیں جاتا [illegible] نہیں جاتے —— پھر تم یہاں کیوں آئی تھیں؟"

"[illegible] بھی نہیں جانا چاہیے۔ [illegible] نہیں ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں اُن سے مختلف ہوں۔"

وہ پچھلے سر ہلایا

"نہیں، مجھے یقین نہیں آتا، تم اُن سے [illegible] نہیں ہو۔"

ستی اس کی باتیں [illegible]، وہ خاموش کھڑی رہی، اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ پچھلے کہا —— "اصل بات یہ نہیں ہے، اصل بات میں جانتا ہوں۔"

"کیا ہے اصل بات؟"

وہ پچھلے کہا —— "تم میرے یہاں کس لیے آئی تھیں، میں جانتا ہوں۔ مگر [illegible] سمجھتا ہوں۔"

ستی [illegible] رہ گئی۔

"کیا جانتے ہو تم؟ بتاؤ تو سہی، میں کس لیے آئی تھی۔ بتاؤ تو دیکھوں؟"

"یہ ابھی نہیں بتاؤں گا۔" وہ پچھلے جواب دیا۔

پھر وہ زینے سے اُتر آئی۔

"نہیں، یہ میں کبھی تمہیں نہیں بتاؤں گا۔"

وکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے ستی اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھ رہی ہو، جیسے وہ اس کے دل کی تہہ میں چھپی ہوئی باتوں کا کھوج لگانا چاہتی ہو۔ ستی اس کے بالکل قریب آگئی تھی۔ وکٹر پیچھے ہٹ گیا۔

بولا ـــــ "تم سمجھتی ہو، میں کچھ بھی نہیں چھپاتا، کیوں؟"

ستی نے کہا ـــــ "بہت خوب، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایسا سمجھتی ہوں؟"

"تم سب کچھ چھپاتے ہو۔" وکٹر نے کہا ـــــ "تم کہتی ہو تمہارے ابا جان سمجھتے ہیں اور اماں بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں۔ وہ کچھ ہو، تم مجھ سے کوئی بات معلوم نہ کر سکو گی۔ تم میرے یہاں آ کر رہی ہو، اس سے پہلے کہ تم میرے راز معلوم کرنے پر اصرار کرو، جتنی دلچسپی کرو، میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

یکایک وکٹر کی زبان سے ایک لمحے کی باتیں سن کر ستی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

بولی ـــــ "اس کا مطلب؟"

"نہیں، اس کا مطلب بھی نہیں بتاؤں گا۔" وکٹر نے جواب دیا ـــــ "تم دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہو، بھروں کو دکھ دیتی ہو، حالانکہ دکھ دینے سے آدمی کو کتنی تکلیف ہوتی ہے یہ تو نہیں جانتی؟"

ستی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اس نے پوچھا ـــــ "کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں جس کی بات کر رہا ہوں، یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔" وکٹر نے جواب دیا ـــــ "میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم کیا سمجھتی ہو؟ تم تو صرف شک کرتی ہو۔"

"شک کرتی ہوں، کس پر؟ کس پر شک کرتی ہوں؟"

"جیسے جانتی ہی نہیں کہ کس پر شک کرتی ہو؟ یہ بھی تمہیں بتانے کی ضرورت ہے کیا؟"

ستی نے ایک لمحے بعد کچھ سوچا، پھر بولی

"تم کس کی بات کر رہے ہو، بتاؤ تو؟ تم سے یہ سب کس نے کہا ہے؟ کسی نے کہا؟"

وکٹر نے کہا ـــــ "میں تمہیں بتا دوں اور تم سب کو بتا دو ـــــ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

ستی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ـــــ

"میں کس پر شک کرتی ہوں، تم نے یہ تو نہیں بتایا؟"

"اور کس پر؟ مجھ پر، تم مجھ پر شک کرتی ہو، تم سمجھتی ہو میں کچھ بھی نہیں جانتا؟"

"تم پر شک کرتی ہوں؟ میں تم پر شک کیوں کروں گی۔ کس لیے تم پر شک کروں گی؟ تم نے کیا [illegible] ہے؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وکٹر سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور وکٹر کو ایسا محسوس ہوا، جیسے اگر ستی نہ ہوتی تو وہ اس پر چلا کر

غصے سے جھنجھلا اٹھتی۔

دنیائے عرب

بصیر عالم

دنیائے عرب کی سیاست ـــــ دوسری جنگِ عظیم کے بعد

دوسری جنگِ عظیم کے بعد [illegible]

کوئی ایک دنیا میں ایسے مسائل چھوڑ گئی جو جنگِ عظیم سے پہلے بھی موجود تھے مگر ان کا کوئی حل نہیں ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد فاتح طاقتوں نے ابھی نقشہ [illegible] کیا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد اکثر اہم مسائل پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔

جنگ کے نتیجے میں امریکہ اور روس کو بڑی طاقتوں کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اب یہ دونوں ملک [illegible] ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ ان دونوں ملکوں کے نظریات میں جو تضاد تھا وہ جنگ کے دوران مشترکہ دشمن کے خلاف [illegible] طاقتوں کی شکست کے ساتھ ہی یہ تعاون ختم ہو گیا اور اشتراکیت و سرمایہ پرستی کے درمیان دشمنی کا آغاز ہو گیا۔ روس نے جنگ کے بعد [illegible] سے فائدہ اٹھایا اور امریکہ نے اپنی دولت کے ذریعے اشتراکیت کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی [illegible] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء سے ان طاقتوں کے کمیونسٹ اور سرمایہ دار گروہوں کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ دنیائے عرب بھی اس سرد جنگ سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہ علاقہ جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے پہلے ہی بین الاقوامی اہمیت کا حامل تھا اور پٹرول کی دریافت نے اس کی اہمیت کو دوچند کر دیا تھا۔ مغربی طاقتیں پہلے ہی اس علاقے میں سیاسی غلبہ رکھتی تھیں۔ اب روس بھی یہاں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ جبکہ عرب عوام ہر قسم کے سامراج سے اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ دنیائے عرب کی سیاست مغربی سامراج، کمیونزم اور عرب قومیت کے درمیان کشمکش کی آئینہ دار ہے۔

مئی ۱۹۴۵ء میں عرب لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۵۰ء میں عرب لیگ کے ارکان نے اجتماعی تحفظ کے معاہدے پر دستخط کیے جس پر ۲۲ اگست ۱۹۵۲ء سے عمل درآمد کیا گیا۔ یہ معاہدہ [illegible] مغربی طاقتیں چاہتی تھیں کہ عرب اقوام ان کی سرپرستی میں دفاعی معاہدے کریں۔ چنانچہ برطانیہ نے ترکی اور عراق کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ کرایا اور ۱۹۵۵ء میں [illegible] برطانیہ، ایران اور پاکستان بھی شامل ہو گئے۔ مصر نے بغداد پیکٹ کی مخالفت کی [illegible] شاہ حسین [illegible] اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مصر نے شام اور سعودی عرب سے [illegible] معاہدے کیے [illegible]

[illegible]

جس کو شکست کو عربوں کی مکمل شکست اس وقت سامنے دیکھنے میں نہیں آئی جب ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا تھا۔ مصر کو اسرائیل کی بڑھتی ہوئی عسکری طاقت سے خطرہ تھا اور مغربی طاقتوں سے اسلحہ خریدنے میں ناکام رہے تھے۔ اس لیے مصر نے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں کمیونسٹ ملکوں سے ہتھیار خریدے۔ مغربی طاقتوں کو مصر کی یہ روش سخت ناگوار گزری۔ برطانوی وزیر اعظم سر انتھونی ایڈن نے امریکی صدر آئزن ہاور سے ملاقات کا، جس کے نتیجہ میں دونوں نے جنوری ۱۹۵۶ء میں یہ اعلان کیا کہ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے اسرائیل اور عرب ریاستوں کی یہاں موجودہ سرحدیں قائم رکھنے کا جو عہد کیا تھا وہ اس پر قائم رہیں گے۔ اس ملاقات میں سر ایڈن نے واضح کیا کہ صدر آئزن ہاور عرب ملکوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کرنے کا اعلان کر دیں وہ واضح نہ ہونے کی وجہ سے تیل سے متعلق اپنے معاشی مفاد کے پیش نظر امریکہ عرب ملکوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ سر ایڈن کی مصر دشمنی آخر کار جنگ سویز کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کے نتیجہ میں انہیں وزارت عظمیٰ اور نہر سویز سے جیسے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ سویز کی شکست نے جہاں ایک طرف دنیائے عرب میں آزادی کی تحریکات کو تقویت بخشی وہاں دوسری طرف سامراجی طاقتوں کو اپنے مفاد کے اجتماعی تحفظ پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور نے امریکی کانگریس سے یہ اختیار حاصل کیا کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کو چار سو ملین ڈالر امداد دے سکتے ہیں اور بوقت ضرورت کسی بھی ملک میں فوجی مداخلت کر سکتے ہیں۔ جب ۱۹۵۸ء میں لبنان خانہ جنگی کی آماجگاہ بن گیا تو امریکہ نے وہاں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ عراق میں شاہ فیصل کا تختہ الٹنے کے بعد برطانیہ نے بھی اردن میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ان دونوں ملکوں سے بیرونی فوجوں کو رخصت ہونا پڑا۔

شمالی افریقہ میں تیونس اور مراکش نے ۱۹۵۶ء میں آزادی حاصل کر لی۔ الجزائر میں بھی قوم پرستوں نے ۱۹۵۴ء میں فرانسیسی سامراج کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور ایک طویل اور خونریز جنگ کے بعد ۱۹۶۲ء میں آزادی حاصل کر لی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے دنیائے عرب میں آزادی کی جو جدوجہد شروع ہوئی تھی اس کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب اور خلیج فارس کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سوا آج تمام عرب ممالک کم از کم سیاسی اعتبار سے آزاد ہیں۔ اس آزاد دنیائے عرب کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند اہم ملکوں کی جدوجہد آزادی اور سیاست کی روشنی میں حسب ذیل اجمالی جائزہ کا تجزیہ کیا جائے۔

مصر

اس وقت جبکہ دوسری عالمی جنگ قریب الختم تھی مصری قوم پرستوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس معاہدے کی رو سے برطانیہ کو مصر کے مواصلات اور دفاع پر اختیار حاصل تھا۔ سوڈان کا مستقبل بھی مصر کی مرضی کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ نہر سویز کا دفاع بھی برطانیہ کی ذمہ داری تھی اور اسے نہر کے علاقہ میں فوجیں رکھنے کا اختیار حاصل تھا۔

ادھر مصری قوم پرستوں کے مطالبات یہ تھے کہ وادی نیل کے تحت مصر و سوڈان کو متحد کیا جائے اور نہر سویز کے علاقہ سے برطانوی فوجیں ہٹا لی جائیں۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدے پر نظر ثانی کے سلسلے میں مصری حکومت اور برطانیہ کے درمیان مذاکرات جاری رہے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مصطفیٰ نحاس پاشا کی حکومت نے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۳۶ء کے معاہدوں کو یکطرفہ طور پر منسوخ کر کے شاہ فاروق کو مصر و سوڈان کا بادشاہ قرار دیا۔ اس پر برطانوی فوجوں سے مصریوں کی جھڑپیں شروع ہو گئیں [illegible] مصری حکومت کے اس اقدام پر [illegible] برطانیہ نے [illegible] پیش کی کہ مصر کو [illegible]

پہنچ گیا۔ جب کہ ایک ہی وقت مشرق وسطیٰ کی فضاؤں کو اسکے تیل، قدرتی وسائل اور اجارہ داری کو بچانا ... اور یہ
علاقہ بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا جبکہ برطانیہ حق تسلیم کرنے کی بجائے مصر پر قبضہ جمانا چاہتا تھا چنانچہ
جرنیلوں نے تحریک کو ختم کر دیا۔ ان دنوں مصر میں عوام اور فوج بادشاہت کے خلاف تھے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو
سلطنت کی شکل اختیار کر گئی۔ ان حالات نے ثابت کر دیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ عوام کو اپنا حق ملنا چاہیے اور اس نے شاہ پر حملہ کر دیا۔
شروع ہی سے فوج کا ناصر اور نجیب شاہ فاروق سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن وہ
کسی طرح خون ریزی کے لیے تیار نہیں تھے چنانچہ انہوں نے خاص پاشا کو ... کر دیا اور چند دن کے اندر ہی بنائے
اور ... مصر میں بادشاہی ختم ہو کر مصریوں کے ... جمہوریت کا خیال ... ہے
بادشاہ فاروق کی حکومت کی نذر ہے۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو فوجی افسروں کے ایک گروہ نے جنرل نجیب کی قیادت میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا۔ ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کو شاہ فاروق ملک سے چلے گئے اور ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو مصر کو جمہوریہ قرار دیا گیا جس کے پہلے صدر جنرل نجیب مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد جنرل نجیب اور کرنل ناصر کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ ... جس کی رو سے اپریل ۱۹۵۴ء کو جنرل نجیب جمہوریہ مصر کے صدر اور کرنل ناصر وزیر اعظم نیز انقلابی کونسل کے صدر مقرر کیے گئے۔ اب حقیقی اختیارات انقلاب کے اصل سربراہ کرنل ناصر کے ہاتھ میں تھے۔

معاہدۂ سوڈان

جنرل نجیب کے عہد میں سوڈان کا مسئلہ حل ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ مذاکرات کے ذریعے حل ہو جائے لیکن برطانوی حکومت انقلابی حکومت سے مذاکرات کے لیے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ جنرل نجیب نے برطانوی حکومت کو نظر انداز کر کے سوڈان کی سیاسی پارٹیوں سے براہ راست مذاکرات شروع کر دیے۔ انقلابی حکومت کی یہ چال کامیاب ثابت ہوئی۔ برطانوی حکومت جانتی تھی کہ اگر مصر و سوڈان کے عوام نے یک وقت بغاوت کر دی تو ... کے نتیجے پر پہنچ جائے گی اس لیے انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ مصری حکومت اور سوڈانی جماعتوں سے مذاکرات کیے جائیں۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء کو ایک معاہدہ پر دستخط کیے گئے جس کی رو سے مصر و برطانیہ کا مشترکہ دور حکومت ختم ہو گیا اور سوڈان کو خود مختاری مل گئی۔ معاہدہ میں طے پایا کہ سوڈانی پارلیمنٹ کے لیے فوری انتخابات کیے جائیں اور تین ... کمیشن مقرر کیے جائیں۔ پہلا کمیشن گورنر جنرل کی مدد اور حکومت میں مشورہ دینے کے لیے، دوسرا انتخابات کے انتظام کے لیے اور تیسرا انتظامیہ میں سوڈانیوں کی شمولیت کے لیے۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۵۳ء میں انتخابات ہوئے اور ... پارٹی جو مصر سے اتحاد کے حق میں تھی کامیاب ہوئی۔ مصر و برطانیہ کے درمیان معاہدہ کے مطابق ... سال بعد ... انتخابات ہونے چاہئیں تھے لیکن ان انتخابات سے قبل ہی سوڈانی پارلیمنٹ نے سوڈان کی آزادی کا اعلان کر دیا اور مصر و برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ سوڈان کو آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کریں۔ مصر و برطانیہ نے سوڈان کی آزادی تسلیم کر لی اور اس طرح ۱۸۹۹ء کا معاہدہ جس کی رو سے سوڈان پر مصر اور برطانیہ قابض رہے تھے ختم ہو گیا۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں سوڈان کی آزادی کے ساتھ ... سوڈان کے

پھیلانا مقصود تھا۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ سوڈان عرب لیگ کا رکن ہوگا اور اس کی خارجہ حکمت عملی غیر جانبدار ہوگی۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں فوج نے جنرل عبود کی قیادت میں ازہری کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں فوجی حکومت نے دریائے نیل کے پانی کی تقسیم کے متعلق مصر سے ایک سمجھوتہ کر لیا اور اس طرح ایک ایسا مسئلہ حل ہو گیا جو مستقبل میں مصر و سوڈان کے درمیان نزاع کا باعث ہو سکتا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اسلامی پارٹیوں کی رہنمائی میں جنرل عبود کی حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ حکومت کے تشدد کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ مظاہروں نے عوامی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ آخرکار جنرل عبود کو مستعفی ہونا پڑا اور سوڈان میں دوبارہ جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔

مصر کی داخلی سیاست

(۱) انقلاب کے وقت مصر میں دو منظم سیاسی پارٹیاں یعنی وفد پارٹی اور اخوان المسلمین موجود تھیں۔ انقلاب کے ساتھ ہی ایک تیسری سیاسی پارٹی منظر عام پر آئی اور وہ تھی فوج کے آزاد افسروں کی تحریک۔

وفد پارٹی میں مختلف جمہوریت پسند عناصر شامل تھے ان میں سرمایہ دار، شاہ پرست جاگیردار اور آزاد خیال نوجوان غرض ہر قسم کے لوگ تھے لیکن پارٹی کی قیادت سرمایہ دار اور جاگیردار عناصر کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ لوگ صرف اپنے طبقہ کے لیے آزادی اور جمہوریت چاہتے تھے۔ شاہ فاروق ان کے طبقاتی مفاد کی علامت تھے اور شاہ کے توسط سے ان لوگوں کے فائدے سے برطانوی سامراج سے مل جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل جدوجہد کے باوجود وفد پارٹی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اخوان المسلمین احیائے اسلام چاہتی تھی۔ یہ جماعت مذہبی تھی اور نچلے متوسط طبقہ تک محدود رہی۔ مصر کی نئی نسلیں مغربی خیالات و نظریات سے متاثر ہو چکی تھیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں قومیت، جمہوریت اور اشتراکیت کے نظریات سرایت کر چکے تھے۔ ۱۹۳۶ء سے قبل فوج میں شاہی خاندان اور طبقۂ امرا کے نوجوان ہی افسر ہوتے تھے لیکن اس کے بعد سے فوجی افسری کے دروازے عوام کے بیٹوں کے لیے بھی کھول دیے گئے اور افسروں کے طبقہ میں ترقی پسند نوجوان بھی شامل ہو گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے جمال عبدالناصر کی قیادت میں آزاد افسروں کی تحریک شروع کی اور آخرکار انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔

اپریل ۱۹۵۴ء میں کرنل ناصر مصر کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ ان کی اقتصادی، معاشی اور سیاسی اصلاحات سے سرمایہ دار اور جاگیردار جو زیادہ تر شاہی کے کارندے اور سیاسی پارٹیوں کے ممبر تھے ناخوش تھے۔ نجیب اور ناصر کے درمیان اقتدار کی کشمکش میں بھی ان عناصر کا بھی ہاتھ تھا۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اسکندریہ میں جب ناصر ایک جلسہ میں خطاب کر رہے تھے تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جس سے وہ بچ گئے۔ حملہ آور اخوان المسلمین کا ایک ممبر تھا۔ اس واقعہ نے کرنل ناصر کے ہاتھ مضبوط کر دیے۔ انھوں نے نہ صرف اخوان المسلمین اور دیگر سیاسی پارٹیوں کو ختم کر دیا بلکہ جنرل نجیب کو بھی اس بنا پر صدارت سے معزول اور ان کے مکان میں نظر بند کر دیا کہ حملہ آور سے ان کا تعلق رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد کرنل ناصر نے ملکی سیاست کے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

"جس وقت تک مصر میں کوئی قانون ساز مجلس قائم نہ ہو سکے جب تک جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا اثر ختم نہیں ہو جائے گا۔"

ختم ہونے کے تقریباً تین سال بعد ۱۹ جون ۱۹۵۶ء تک برطانوی فوج کے آخری دستے کا انخلاء عمل میں آیا اور مصر کی ایک نئی حکومت وجود میں آئی جس کے تحت صدر ناصر
۔ مصری فوجی انقلاب جس میں سوائے جنرل نجیب کے
کے تمام فوجی افسر شامل تھے۔

معاہدۂ سوئز

۱۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مصر اور برطانیہ کے درمیان سوئز کے بحری اڈے کے تخلیہ کے متعلق ایک معاہدہ پر دستخط کیے گئے۔ اس معاہدہ کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

- بحری اڈہ بیس ماہ کے اندر اندر خالی کر دیا جائے گا۔
- سوئز کے علاقہ میں تمام فوجی بحری اڈے اور ان کی عمارتیں مصری حکومت کی ملکیت ہوں گے۔ مزید برآں چند ہزار کی تعداد میں برطانوی ماہرین رکھے جا سکتے ہیں۔
- اگر کسی بیرونی طاقت نے عرب لیگ کے کسی ملک یا ترکی پر حملہ کیا تو برطانوی فوجیں سوئز کے فوجی اڈے پر دوبارہ قابض ہو جائیں گی اور مصر انہیں تمام سہولتیں مہیا کرے گا۔
- نہر سوئز پر تمام ملکوں کے جہازوں کو آزادی سے گزرنے کی اجازت ہو گی۔
- ۱۹۳۶ء میں مصر و برطانیہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔
- یہ معاہدہ سات سال تک نافذ رہے گا۔

جنگ سوئز

۱۹ جولائی ۱۹۵۶ء کو امریکہ نے اعلان کیا کہ اس نے اسوان ڈیم کی تعمیر کے منصوبے پر امداد دینے کا ارادہ ترک کر دیا ہے کیونکہ مصر کی حکومت کی مالی حالت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جمال عبدالناصر نے کہا کہ مصر اپنے منصوبے کو خود پورا کرے گا اور نہر سوئز کی آمدنی اس کے لیے کافی ہو گی۔ جیسا کہ مصر پر برطانیہ اور فرانس کے کئی ملکوں کا قرضہ تھا اسے ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ روس اور دیگر کمیونسٹ ملکوں سے مالی امداد کے لیے ایک معاہدہ کیا گیا۔ مصر کے اس اقدام سے مغربی طاقتیں برطانیہ اور فرانس نے سوئز نہر کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اس کا جواب صدر ناصر نے ۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو نہر سوئز کمپنی کو قومیانے کا اعلان کر دیا۔ یہ اقدام سوئز کمپنی کے حصص داروں کے لیے جن میں برطانیہ اور فرانس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ برطانیہ نے لندن میں ۲۲ ملکوں کی کانفرنس منعقد کی جس میں امریکہ کی یہ تجویز منظور کی گئی کہ نہر سوئز کا انتظام ایک بین الاقوامی ادارے کے سپرد کر دیا جائے۔ مصر نے یہ تجویز رد کر دی۔ [illegible] سوئز پر مصر کا حق ہے۔ اس کے بعد برطانیہ اور فرانس نے سلامتی کونسل میں شکایت کی۔ مصر کی بیشتر تجویز کو ناقابل قبول قرار دیا گیا۔ اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا اور برطانیہ اور فرانس کی فوجیں بھی مصر کی سرزمین پر اتر آئیں۔ جنرل اسمبلی کی قرارداد کے بعد جنگ بند ہوئی اور نہر سوئز کی آزادی کی بحالی کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں نہر استعمال کرنے والوں کی ایک جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا۔

دنیا کو اس بات سے خبردار کیا کہ معاملات میں مداخلت کی ان کی ترامیم کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

برطانیہ اور فرانس کا افسوس ناک رویہ پہلے ہی ظاہر کر رہے تھے کہ وہ نہر کا مسئلہ طاقت کے زور پر حل کرنا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے پہلے ہی اسرائیل کو مصر پر حملہ کرنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اسرائیل نے مصر کی توجہ ہٹانے کے لیے پہلے اردن کی سرحدوں پر حملے کیے اور پھر ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اچانک مصر پر حملہ کر دیا جس میں غازہ اور جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ ہو گیا۔ برطانیہ اور فرانس نے مصر اور اسرائیل کو متنبہ کیا کہ وہ نہر سویز کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور اپنی فوجوں کو نہر سے دس میل دور رکھیں اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو برطانیہ اور فرانس نے بندرگاہ سعید اور بندرگاہ فواد پر بمباری کر کے وہاں اپنی فوجیں اتار دیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جنگ بندی سے متعلق قرارداد برطانوی حق تنسیخ کی وجہ سے منظور نہ ہو سکی۔ چنانچہ یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کیا گیا اور جنرل اسمبلی نے جنگ بندی اور غیر ملکی افواج کے انخلا کی قراردادیں بھاری اکثریت سے منظور کر لیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر روس نے برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کو مداخلت کی دھمکی دے دی اور اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ روس کی یہ دھمکی کام کر گئی۔ برطانیہ اور فرانس نے جنرل اسمبلی کی قراردادیں قبول کر لیں۔ جنگ بندی پر فوراً عمل کیا گیا مصر کی سرزمین سے برطانوی اور فرانسیسی فوجیں واپس چلی گئیں۔ اسرائیل نے البتہ تاخیر اور ٹال مٹول سے کام لیا لیکن آخر کار اسے واپس جانا پڑا۔ مصر اور اسرائیل کی سرحدوں پر بین الاقوامی فوج تعینات کی گئی اور اقوام متحدہ نے اپنے خرچ سے نہر سویز کو ڈوبے ہوئے جہازوں سے صاف کرایا۔

برطانوی وزیر اعظم انتھونی ایڈن کا خیال تھا کہ وہ تین چار روز میں نہر سویز کے تمام علاقے پر قبضہ کر کے اقوام متحدہ سے فاتح کی حیثیت سے بات کریں گے اور نہر سویز سے متعلق اپنی شرطیں منوا لیں گے لیکن یہ جنگ تقریباً دس دن تک جاری رہی اور برطانیہ و فرانس نہر سویز کے تمام علاقے پر قابض نہ ہو سکے۔ اس عرصہ میں دنیا کی رائے عامہ حملہ آوروں کے خلاف شدید طور پر ہو گئی اور روس نے اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ مسٹر ایڈن کو امید تھی کہ امریکہ ان کا ساتھ دے گا۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس وقت امریکہ دنیائے عرب میں غیر مقبول ہونا نہیں چاہتا تھا اور اس کے اپنے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا چنانچہ امریکہ نے بھی برطانیہ اور فرانس کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اقوام متحدہ کی قراردادیں مان لیں۔

اس جنگ کے نتیجے میں برطانیہ اور فرانس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہر سویز سے دستبردار ہونا پڑا۔ صدر ناصر دنیائے عرب کے قائد بن گئے۔ روس مشرق وسطیٰ میں [illegible] عرب میں مقبول ہو گیا اور برطانیہ اور فرانس کے دوست کی حیثیت سے امریکہ کی غیر مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔

اقوام متحدہ کی قراردادوں اور روس کی دھمکی نے حملہ آور طاقتوں کی فوجی فتح کو سیاسی شکست میں تبدیل کر دیا۔ مگر مصر کو دنیا کے سامنے [illegible] جو حمایت حاصل ہوئی تھی وہ روس کی دھمکی سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔ سو جنگ سویز ناصر کی سب سے بڑی فتح اور حملہ آور طاقتوں کی سب سے بڑی شکست کی علامت ہے۔

سویز کا بحران برطانیہ کے لیے ہر لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوا۔ اسے نہر سویز سے ہاتھ دھونے پڑے: [illegible]

[illegible]

[illegible] الجزائر [illegible] کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ [illegible] [illegible] جنگ کے [illegible]

[illegible] الجزائر کی کامیابی سے [illegible] عرب قوم پرستی [illegible] قائم ہوگئی۔ مصر [illegible] [illegible] ۱۹۵۸ء میں مصر و شام نے مل کر متحدہ عرب جمہوریہ بنائی [illegible] ۱۹۶۱ء [illegible] شام نے بہت جلد یہ محسوس کیا کہ [illegible] چنانچہ ۱۹۶۱ء میں شام [illegible] متحدہ عرب جمہوریہ سے علیحدگی [illegible] ۱۹۶۲ء میں یمن کے کرنل سلال نے امام یمن کی حکومت کا تختہ الٹ دیا [illegible] سعودی عرب [illegible] کرنل سلال [illegible] مصر [illegible] جنگ [illegible] ۱۹۶۷ء [illegible] شاہ فیصل [illegible] صدر ناصر [illegible]

کے زیر تنظیم ہیں یہ ہیں اس امر پر متفق ہیں جیسا کہ نصف پایا گیا ہے کہ لوگ موجودہ جمہوری نظام کو پسند کرتے ہیں یا امام سیف البدر کے خاندان کی حکومت چاہتے ہیں۔

اب تک ایسی کئی مثالیں سامنے آئی ہیں کہ صدر ناصر پہلے عرب ملکوں کی حکومتوں سے دوستی کرتے ہیں اور پھر ان ملکوں کے عوام اور فوج میں اپنے حامی پیدا کر کے ان حکومتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب دیگر عرب ریاستوں کے حکمران صدر ناصر سے تعلقات پیدا کرنے میں بہت محتاط ہو گئے ہیں اور اپنے عوام کو مصر کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ اگر صدر ناصر مصری غلبہ کی بجائے واقعی عرب اتحاد چاہتے ہیں تو وہ سازشوں اور فوجی انقلابوں سے حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے صحیح مقاصد کا تعین کر کے ایک بین الاقوامی عرب تحریک کی ضرورت ہے ـــــ جب یہ تحریک عوام میں مقبول ہو جائے گی تو ایک ایسی متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئے گی جس پر کسی ایک ملک کا غلبہ نہیں ہوگا۔

عراق

پہلی عالمی جنگ کے بعد عراق پر برطانوی قومیت قائم ہو گئی تھی۔ برطانیہ نے شریف مکہ کے سب سے بڑے لڑکے فیصل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ ۱۹۳۲ء میں عراق آزاد ہو گیا لیکن حبانیہ اور بصرہ کے اڈوں پر برطانیہ کا قبضہ قائم رہا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران رشید علی نے برطانیہ کے خلاف جرمنی کے حق میں بغاوت کی جس کے نتیجہ میں سارے عراق پر برطانیہ کی فوجیں قابض ہو گئیں۔ جنگ کے اختتام پر عراق کی قسمت برطانیہ کے سب سے بڑے حامی جنرل نوری السعید کے ہاتھوں میں تھی۔ جنگ کے بعد سے ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب تک عراقی حکومت برطانیہ کے اشاروں پر چلتی رہی۔ اس عرصہ میں مغربی طاقتوں کی کوشش یہ رہی کہ عراق کو بجائے عرب کا لیڈر بن جانے کے اس کی مدد سے ایک ایسا عرب کی دفاعی تنظیم بنائی جائے جس کی سرپرستی مغرب کو حاصل ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر سب سے پہلے عراق اور ترکی کے درمیان معاہدہ پر دستخط ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں بغداد پیکٹ وجود میں آیا۔ جب ۱۹۵۸ء میں متحدہ عرب جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تو عراق میں عرب قومیت کے حامیوں نے جمہوریت کے حق میں ایک بیداری پیدا کی جس کا توڑ کرنے کے لیے عراقی حکومت نے اردن کے ساتھ مل کر وفاقی عرب مملکت بنائی لیکن جولائی ۱۹۵۸ء میں بریگیڈیر جنرل عبدالکریم قاسم نے شاہی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور شاہ فیصل، شہزادہ عبدالالہ اور وزیراعظم نوری السعید قتل کر دیے گئے۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی وفاقی عرب مملکت ختم ہو گئی اور چند ماہ بعد عراق معاہدہ بغداد سے بھی علیحدہ ہو گیا۔

توقع تھی کہ معاہدہ بغداد سے علیحدہ ہونے کے بعد عراق متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ صدر کرنل عارف متحدہ عرب جمہوریہ میں شمولیت کے حق میں تھے لیکن صدر قاسم چاہتے تھے کہ عراق کو عرب مشرقی عرب ممالک کی قیادت حاصل ہو جائے۔ اس اختلاف نے کرنل عارف کو حکومت سے علیحدہ کر دیا اور صدر ناصر عراق کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے کرنل عارف کے ذریعہ اور دوسری بار کرنل شواف کے ذریعہ قاسم کی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں بار ناکامی ہوئی۔ صدر ناصر کے حامیوں کی مخالفت نے صدر قاسم کو عراق کی کمیونسٹ پارٹی کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کا اثر خارجہ پالیسی پر یہ ہوا کہ عراق نے روس سے فوجی اور اقتصادی امداد ہی نہیں بلکہ اخلاقی حمایت بھی حاصل کی۔ کمیونسٹ پارٹی سے قاسم کے اتحاد کا توڑ صدر ناصر کے حامیوں نے اس طرح کیا کہ بعث پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد کے نتیجہ میں بعث پارٹی نے ۱۹۶۳ء میں

شام کی حکومت اور پھر دوبارہ ۱۹۶۳ء میں کرنل عارف کی قیادت میں عراق میں عبدالکریم قاسم کی حکومت ختم ہو گئی۔ انقلاب کے بعد ان عبدالکریم اور عفلق کے ساتھی اسے ملے کرنل عارف عراق کے نئے صدر بنے۔ عراق اور شام میں بعث پارٹی کی وجہ سے قریبی تعلقات قائم ہو گئے اور یہ توقع ہو گئی کہ عراق و شام متحدہ عرب جمہوریہ میں شامل ہو جائیں گے لیکن صدر عارف اور بعث پارٹی میں کشمکش شروع ہو گئی اور اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ صدر عارف اور بعث پارٹی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

۱۹۶۱ء میں عبدالکریم قاسم نے دعویٰ کیا کہ کویت عراق کا حصہ ہے۔ دعویٰ یہ کیا تھا کہ عثمانی عہد میں کویت بصرہ کا حصہ تھا کیونکہ کویت میں برطانیہ اور امریکہ کی تیل کمپنیاں قائم ہیں۔ برطانیہ نے کہا کہ وہ اپنے معاشی مفادات کے تحفظ میں فوج کا استعمال سے گریز نہیں کیا اور کویت میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ کیونکہ عرب ملکوں کی عرب لیگ سے امریکہ ... کی حمایت حاصل تھی جو عبدالکریم قاسم کی کمیونسٹ نوازی کے خلاف تھیں۔ عبدالکریم نے عرب سیاست سے کنارہ کشی میں اپنی اخلاقی لیڈری کو ختم کر دینے کے لیے ... یہ نہیں معلوم تھا کہ برطانیہ بھی کوئی اور کی آنکھوں کے سامنے کر کے کھڑا ہو جائے گا۔ کویت کا مطالبہ عراق نے سنجیدگی سے نہیں کیا تھا۔

۱۹۶۳ء میں صدر عارف اس مطالبے سے دست بردار ہو گئے اور برطانیہ نے کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ عراق اور برطانیہ کے درمیان اس مسئلے پر بات چیت سے کویت کو مزید فائدہ پہنچ گیا اور برطانیہ نے اسے مکمل آزادی دے دی اور اقوام متحدہ کا ممبر ہو گیا۔

شمالی افریقہ

شمالی افریقہ میں لیبیا، مصر، الجیریا اور مراکش عرب ریاستیں شامل ہیں۔ اس حصہ کو مغرب بھی کہا جاتا ہے۔

لیبیا

دوسری عالمی جنگ سے قبل لیبیا پر اٹلی کا قبضہ تھا۔ جنگ کے بعد اقوام متحدہ کی نگرانی میں آیا اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو لیبیا آزاد ہو گیا۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں برطانیہ اور لیبیا کے درمیان باہمی دوستی اور دفاع کا ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانیہ کو لیبیا میں اڈے قائم کرنے کا اختیار مل گیا۔ بعد میں امریکہ نے بھی سرحد کے قریب ایک ہوائی اڈہ قائم کر لیا۔

تیونس

تیونس کو فرانس نے ۱۸۸۱ء میں زیر حفاظت لے لیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مکمل آزادی کے لیے تحریک شروع ہوئی جو مارچ ۱۹۵۶ء میں تیونس کو آزاد کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مسٹر حبیب بورقیبہ تیونس کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انہوں نے تیونس کے بے ... کو معزول کر دیا اور ملک کو جمہوریہ قرار دے کر خود اس کے صدر ہو گئے۔ مگر فرانس نے تیونس کی آزادی تسلیم کی لیکن بنزرت پر اس کا فوجی اڈہ قائم تھا۔ اس بحری اڈے کو فرانس سے خالی کرانے کی جدوجہد جاری رہی۔ آخر ۱۹۶۳ء میں فرانس نے یہ اڈہ بھی تیونس کے حوالے کر دیا اور تیونس سے فرانس کے تعلقات بہتر ہو گئے۔

تیونس کے صدر حبیب بورقیبہ اعتدال پسند لیڈر ہیں۔ وہ مغرب کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ گو وہ عرب اتحاد کے قائل

دیا گیا۔ اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب ممالک میں تمام ہونے والے مسائل میں جمال ناصر سے حبیب بورقیبہ کی نہیں بنتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جمال ناصر عرب اتحاد کی آڑ میں مصر کے اقتدار اور اپنی شخصی حکومت کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اسرائیل کے مسئلہ پر بھی انہیں دیگر عرب ممالک سے اختلاف ہے۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ عرب ریاستیں اسرائیل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے انہوں نے تجویز پیش کی کہ عرب ریاستیں اسرائیل کو اس شرط پر تسلیم کر لیں کہ وہ اقوام متحدہ کی ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے مطابق فلسطین کا تصفیہ کرنے پر راضی ہو جائے اور عرب مہاجرین کو دوبارہ اسرائیل میں بسائے۔

حبیب بورقیبہ کے اس بیان پر تیونس اور عرب میں بہت سے لوگ برہم ہوئے اور متحدہ عرب جمہوریہ، شام اور عراق نے تیونس سے اپنے سفیر واپس بلا لیے۔ حبیب بورقیبہ کی تجویز سے اسرائیل نے بھی اتفاق نہیں کیا۔ اسرائیلی وزیر اعظم نے گو اس بات کو سراہا کہ پہلی بار ایک عرب ملک نے مذاکرات کی تجویز پیش کی ہے تاہم انہوں نے اس امر کا اعادہ کیا کہ اسرائیل عرب مہاجرین کو واپس لینے پر تیار نہیں ہے اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر عرب ملکوں نے دریائے اردن کے معاون دریاؤں کا رخ موڑنے کی کوشش کی تو اسرائیل طاقت کا استعمال کرے گا۔

عرب ریاستوں اور اسرائیل کے شدید رد عمل نے صدر بورقیبہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں۔ چنانچہ انہوں نے صدر ناصر کو ایک خط لکھا جس میں وضاحت کی کہ میں نے ایک مرحلہ وار طریق کار پیش کیا تھا اور میرا مقصد بھی یہی ہے کہ فلسطین سے یہودیوں کا غاصبانہ قبضہ ختم کیا جائے۔

مراکش

۱۹۱۲ء میں فرانس نے ایک معاہدے کے ذریعہ مراکش کا دفاع اور امور خارجہ اپنے اختیار میں لے لیے اور بعد میں [illegible] پر قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد قوم پرستوں کی جدوجہد آزادی نے زور پکڑا [illegible] جنوری ۱۹۵۳ء میں فرانسیسی فوج اور قوم پرستوں کے درمیان [illegible] تصادم ہوا۔ فرانسیسی حکام نے مراکش کے سلطان سیدی محمد بن یوسف کو معزول کر دیا کیونکہ وہ قوم پرستوں کی استقلال پارٹی [illegible] انہوں نے سلطان کے چچا زاد بھائی محمد بن عرفہ کو مراکش کے تخت پر بٹھا دیا [illegible] سلطان کی بحالی پر مجبور ہونا پڑا۔ [illegible] ۱۹۵۵ء [illegible] ۱۹۵۶ء [illegible] گئے [illegible] مراکش کے [illegible] کے [illegible] ۱۹۶۱ء [illegible] اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

الجیریا

فرانس نے ۱۸۳۰ء میں الجیریا پر قبضہ کیا [illegible]

کالونی کے جدید دینشک کی حیثیت دلائی اور فرانسیسی حکومت نے بھی الجیریا کو مستقل طور پر فرانس میں ضم کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ اس کے معاشی اور سیاسی اسباب تھے۔ معاشی سبب یہ تھا کہ الجیریا فرانس کو ۔۔ فی صد شراب فراہم کرتا تھا اور پانچ لاکھ فرانسیسی وہاں معدنیات اور تیل کے ذخیرے ہیں۔ سیاسی سبب یہ تھا کہ فرانسیسی نو آبادکار اپنے غلبہ و تسلط سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور نہ صرف سیاسی بلکہ فوجی منصوبوں پر بھی ان کا اثر تھا یہی وجہ تھی کہ الجزائر کی آزادی کے لیے ایک طویل اور خونریز جدوجہد کرنی پڑی۔ یہ جدوجہد یوں تو ۱۹۳۰ء سے ہی شروع ہو گئی تھی لیکن ۱۹۵۴ء سے اس نے جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ ۱۹۵۴ء میں نیشنل لبریشن فرنٹ کی بنیاد نے اس جدوجہد کو وسعت دی اور اس میں شدت پیدا کر دی۔ فرانس نے الجزائری عوام کو شکست دینے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ۵ لاکھ فوج بھیج دی لیکن آزادی الجیریا جاری رہی۔ افرو ایشیائی اقوام نے اقوام متحدہ کے ہر اجلاس کے ایجنڈے میں الجیریا کا مسئلہ اٹھایا تو فرانس نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا۔ ستمبر ۱۹۵۸ء میں جلا وطن حریت پسندوں نے الجیریا کی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ یہ وقت وہ تھا کہ فرانس کی حکومت الجیریا کی بغاوت سے تنگ آ چکی تھی۔ اسے چند فرانسیسی نو آبادکاروں کے لیے کروڑوں روپے روزانہ خرچ کرنا پڑ رہا تھا اور اس کی اقتصادی حالت بہت بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن فرانسیسی نو آبادکار بلکہ تمام فوجی افسر شروع سے الجیریا کی بغاوت کو دبانا چاہتے تھے اور یہ کام کمزور اور غیر مستقل جمہوری حکومتوں کے بس کا نہیں تھا۔ انہیں ایک سخت مزاج ڈکٹیٹر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے بغاوت کر دی اور مطالبہ کیا کہ جنرل ڈیگال کو فرانس کا حاکم بنایا جائے۔ اس بغاوت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ فرانس کے وزیر اعظم مستعفی ہو گئے اور جنرل ڈیگال ان کی جگہ وزیر اعظم بنائے گئے۔ فرانس کو ایک نیا دستور دیا جس کے تحت پارلیمانی نظام کی جگہ صدارتی نظام نے لے لی اور جنرل ڈیگال فرانس کے بااختیار صدر ہو گئے۔ ابتدا میں جنرل ڈیگال نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوجی طاقت سے الجیریا کی بغاوت کا مسئلہ حل کر دیں گے۔ لیکن بعد میں واضح ہو گیا کہ الجزائری عوام اس طرح دبنے والے نہیں ہیں۔ ادھر فرانس کی اقتصادی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور وہ اپنے یورپی شرکاء میں کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کمزوری کے باعث معاہدہ اوقیانوس میں فرانس کے رتبہ پر خراب اثر پڑ رہا تھا اور اس کی امید جاتی رہی۔ فرانس ایک بار پھر بڑی طاقت بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہو اور ایٹمی طاقتوں کے زمرے میں شامل ہو جائے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب الجزائری عوام کے خلاف جنگ کا فضول خرچ ختم ہو جائے۔

صدر ڈیگال اس طرح سوچ رہے تھے۔ فرانسیسی نو آبادکار اور فوجی افسر صدر ڈیگال کے خیالات میں اس تبدیلی سے برہم ہو گئے اور انہوں نے ایک بار پھر بغاوت کر دی۔ لیکن ان باغیوں کے خلاف صدر ڈیگال ایک سخت مزاج ڈکٹیٹر ثابت ہوئے۔ انہوں نے باغی جنرلوں کو گرفتار کر لیا اور ان میں سے بعض کو پھانسی کے تختہ پر بھی چڑھا دیا۔ باغی فوجیوں سے نپٹنے کے بعد صدر ڈیگال نے الجزائری عوام کے نمائندوں سے مذاکرات کی پیش کش کی اور یہ مذاکرات ایویان میں شروع ہو گئے۔

مارچ ۱۹۶۲ء کے پہلے ہفتہ میں فرانسیسی حکومت اور الجزائر کی عارضی قومی آزاد حکومت کے نمائندوں نے ایویان میں ایک معاہدہ

دستخط کیے جس کی رو سے فرانس نے محاذ قومی آزادی کو الجزائری مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ محاذ کو شہروں میں سیاسی
یا اقتدار کا حق حاصل ہوگا۔ فرانس نے یہ مطالبہ بھی مان لیا کہ گرفتار شدہ الجزائری گوریلوں کو جنگی قیدی کہا جائے گا اور ان کے ساتھ
سلوک کیا جائے گا جو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ فریقین اس امر پر متفق ہو گئے کہ الجزائر فرانس کے تعاون سے آزادی حاصل
کرے گا اور آزادی کے سوال پر فرانس اور الجزائر میں استصواب رائے کیا جائے گا۔ تین سال کے عرصہ میں فرانسیسی فوجیں الجزائر خالی کر دیں
گی اور صرف مرس الکبیر اور ریگن کے اڈے فرانس کو دے دیے جائیں گے اور ان یورپینوں کو الجزائر میں رہنے دیا جائے گا جو الجزائر کا شہری
بننا پسند کریں گے۔

فرانس اور قومی محاذ کے درمیان مندرجہ بالا معاہدہ کا خیر مقدم تمام دنیا میں کیا گیا لیکن فرانسیسی نو آبادکاروں اور چند رجعت پسند
(جنھوں نے اسے منسوخ کرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انھوں نے ایک خفیہ تنظیم بنائی جس نے دہشت انگیز
کارروائیاں شروع کر دیں۔ انھوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار کو اپنا شعار بنا لیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے اگر
اٹھ کھڑے ہوئے تو فرانسیسی فوجیں حرکت میں آ جائیں گی اور دوبارہ جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے معاہدہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس دہشت
انگیزی کے دوران مسلمانوں نے جس نظم و ضبط اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آخر کار دہشت پسند مایوس ہو گئے اور انھوں
نے الجزائری حکومت سے اس یقین دہانی پر ہتھیار ڈال دیے کہ انھیں عام معافی دے دی جائے گی۔

فرانس اور الجزائر میں استصواب رائے کے ذریعہ دونوں ملکوں کے عوام نے ایویان کے معاہدہ کی توثیق کر دی اور الجزائر
آزاد ملک کی آئینی حیثیت حاصل ہو گئی۔

آزادی کے وقت بن خدا الجزائر کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے فرانس سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے الجزائر کے رہنما
بن بلا مکمل طور پر متفق نہیں تھے۔ وہ فرانس کو کوئی رعایت دینے کے خلاف تھے۔ وہ سوشلزم کے قائل تھے جبکہ بن خدا اور فرحت عباس
مغربی طرز کی جمہوریت چاہتے تھے۔ بن بلا فرانسیسی دہشت پسندوں کو عام معافی دیے جانے کے بھی خلاف تھے۔ ان اختلافات کے
باعث بن خدا اور بن بلا میں کشمکش شروع ہو گئی۔ آخر کار بن بلا کامیاب ہو گئے اور انھیں الجزائر کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ ان کی اس کامیابی
میں فوج کے سربراہ کرنل بومدین کا بڑا ہاتھ تھا۔ بن بلا یقیناً ایک مخلص شخص تھے لیکن ان میں آمرانہ رجحانات تھے اور خود رائی حد درجہ
کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام رفقاء سے ان کے اختلافات بڑھتے گئے اور وہ انھیں اپنے راستے
سے ہٹاتے گئے۔ کریم بالقاسم، فرحت عباس اور بن خدا نے الجزائر چھوڑ دیا اور آیت احمد نے قبیلیہ میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ ابھی
یہ بغاوت پوری طرح فرو نہ ہونے پائی تھی کہ مغربی صحرا میں مراکش نے سرحدی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ الجزائر میں شامل صحرا کے
ایک بڑے حصے پر مراکش کا دعویٰ ہے۔ یہ حملہ اس دعوے کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کوشش تھی۔ الجزائر نے اپنی فوجیں مراکش کا
مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کر دیں اور چند دنوں تک سرحدوں پر لڑائی جاری رہی۔ [illegible] ایتھوپیا کے شاہ ہیل سلاسی نے مراکش اور الجزائر کی لڑائی ختم کرانے کی
کوشش کی۔ انھوں نے ان کے سربراہوں کو [illegible] تنظیم افریقی اتحاد کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس نے فریقین کے درمیان
جنگ بندی کرا دی اور سرحدی تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ اس سمجھوتے نے الجزائر کو [illegible]

میں کمزوری پیدا ہو گئی اور نہ انہیں ابھی اتحاد کی قدر معلوم ہوئی۔ چنانچہ [illegible] اپنے پاس [illegible]
پامال نہ ہو سکی۔

بین الاقوامی سیاست میں یہ بات مسئلہ کی تحقیق کرتے ہے [illegible] کمیونسٹ [illegible] کی طرف زیادہ متاثر ہونے کا خطرہ [illegible] ایشیائی کانفرنس کا منعقد کیا جانا [illegible]۔ یہ کانفرنس ۲۹ جون ۱۹۴۹ء کو ہونے والی تھی جس سے پہلے ۱۸ جون ۱۹۴۹ء کو [illegible] نے [illegible] حکومت ختم کر دی [illegible] گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ [illegible] کا تمام [illegible] خطرہ تھا۔ اس لیے انڈونیشیائی [illegible] نے کانفرنس کو [illegible] ۱۹۴۹ء تک کے لیے ملتوی کر دیا [illegible] کے باعث یہ کانفرنس [illegible] نہ ہو سکی۔ [illegible] کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ [illegible] کا تعلق ہے [illegible] حکومت [illegible] کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ البتہ داخلی معاملات میں [illegible] واضح [illegible] ہوئی ہے۔

دنیائے عرب کا مستقبل

عرب لیگ کی حالیہ کانفرنس جو ستمبر ۱۹۴۹ء کے تیسرے ہفتہ میں بمقام [illegible] منعقد ہوئی جس میں اسلامی عرب ریاستوں نے حصہ لیا۔ [illegible] نے [illegible] عرب [illegible] اختلافات کے [illegible] شرکت نہیں کی۔ اس کانفرنس کے فیصلوں سے عرب ملکوں کی موجودہ حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے۔ کانفرنس میں عرب ریاستوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کیے اور ایک اعلامیہ شائع کیا۔

معاہدہ کی خاص خاص باتیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عرب اقوام اپنے اتحاد و یکجہتی کا اعادہ کرتی ہیں۔ وہ خصوصاً فلسطین کے مسئلہ پر متحد و متفق ہیں۔

۲۔ عرب اقوام عہد کرتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیں گی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ نہیں کریں گی۔

۲۲ ستمبر ۱۹۴۹ء کو ایک اعلامیہ کے ذریعے بتایا گیا کہ عرب رہنماؤں نے [illegible] مسئلہ فلسطین [illegible] کے معاونین کا [illegible] پر اتفاق کر لیا ہے۔ اس اعلامیہ میں عرب ریاستوں نے سفارش کی کہ [illegible] نام [illegible] کے [illegible] معاہدہ کے مطابق حل کیا جائے۔ انہوں نے [illegible] عام [illegible] مقاصد کی تائید کی اور مطالبہ کیا کہ ان تمام [illegible] کو ختم کر دیا جائے جو دنیائے عرب کی سلامتی اور [illegible] کے لیے خطرہ ہیں۔ انہوں نے حق خود ارادیت کی حمایت کی اور مطالبہ کیا کہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی تجاویز کے مطابق حل کیا جائے۔ آخر میں عرب رہنماؤں نے اعلان کیا کہ آزادی [illegible] اگر کسی ایک قوم کی آزادی خطرے میں پڑتی ہے تو باقی تمام قوموں کی آزادی کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ ہے [illegible] کانفرنس کا [illegible] عرب ریاستوں کی [illegible] حکمت عملی اور نظریات کا آئینہ دار ہے۔ [illegible] نئی نہیں ہیں۔ [illegible] اس سے قبل بھی [illegible] پر عمل کرنے کا وقت [illegible]

ہیں۔ جب تک یہ اسباب موجود رہیں گے دنیائے عرب کے اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ ان اسباب کو موٹے طور پر داخلی اور خارجی اسباب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

داخلی اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عرب اقوام معاشی، تعلیمی اور سیاسی اعتبارات سے پس ماندہ ہیں

۲۔ پس ماندگی کے باعث کسی بھی ریاست میں عوامی راج نہیں ہے۔ بعض ریاستوں میں ہنوز بادشاہوں کی حکومت ہے اور بعض میں خالص فوجی آمریت یا جمہوریت نما آمریت ہے۔ جہاں شاہی نظام ہے وہاں جاگیردارانہ معیشت ہے۔ وہاں ملک کا تیل غیر ملکی کمپنیوں کے انتظام میں ہے۔ تیل کی آمدنی کا نصف بادشاہ اور اس کے خاندان کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ یہ آمدنی ملک کی ترقی اور عوام کی بہبود کے لیے خرچ نہیں ہوتی۔ جہاں آمریت یا نام نہاد جمہوریت ہے وہاں ضرور غیر ملکی امداد و منصوبہ بندی کے ذریعہ ترقی کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اس ترقی سے اب تک اونچے طبقے کے لوگوں کو ہی فائدہ پہنچا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ریاستوں کا نصب العین اشتراکیت ہے۔ جب تک عوام منصوبہ بندی کے فوائد اور اشتراکیت کے مقاصد سے آگاہ نہ ہوں گے وہ حکومت سے شعوری اور عملی تعاون نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا حکمراں طبقے واقعی عوام کا تعاون چاہتے ہیں؟ شاید نہیں۔

۳۔ عرب اتحاد، مشترکہ فوج، مشترکہ دشمن کے خلاف متحدہ اقدام ——— یہ سب عوام کو خوش کرنے کے لیے اعلامیوں میں لکھنے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اتحاد کے لیے نظریاتی ہم آہنگی اور معاشی و سیاسی نظام کی یکسانیت ضروری ہیں۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ عرب رہنماؤں میں نظریاتی اختلاف ہے۔ عرب ریاستوں میں مختلف معاشی و سیاسی نظام رائج ہیں اور محدود وطنیت وسیع تر عرب قومیت پر غالب ہے۔

۴۔ موجودہ حالات میں مشترکہ دشمن کے خلاف اور چند مشترکہ مقاصد کے لیے اتحاد ہو سکتا ہے جو کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن صرف ایک حد تک۔ کیونکہ جب بھی اس حد کو پار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اختلافات کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔

خارجی اسباب :

۱۔ اکثر عرب ریاستوں کے وسائل خصوصاً تیل، سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ سامراجی طاقتیں اپنے معاشی تسلط اور سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں اور ان کا سب سے [illegible] مقصد یہ ہے کہ عربوں کو متحد نہ ہونے دیا جائے۔

۲۔ عرب ریاستیں سامراجی طاقتوں کے معاشی تسلط سے [illegible] معاشی اور فوجی امداد لیتی ہیں۔ [illegible] کمیونسٹ ملک سے بھی امداد [illegible] طرف عرب [illegible] کشمکش اور سازشوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

۔ دُنیائے عرب کا جغرافیائی محل وقوع جنگی حیثیت کا حامل ہے۔ اس لیے آج بھی یہاں عرب دنیا میں مغربی طاقتوں کے فوجی، بحری اور ہوائی اڈے موجود ہیں۔ تیل اور مشرقی دُنیا سے تجارت کی حفاظت کے پیش نظر یہ اڈے مغربی طاقتوں کو بہت عزیز ہیں۔ یہ اڈے اور علاقے میں اسرائیل کا وجود عرب ممالک کی سلامتی کے لیے مستقل خطرہ ہیں۔ ان خطروں نے جہاں ایک طرف عوام میں اتحاد و یک جہتی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا ہے وہاں دوسری طرف ان حکمران طبقوں کو اتحاد کا دشمن بنا دیا ہے جن کے مفاد ان بیرونی طاقتوں سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ بظاہر عوام کے ساتھ ہیں لیکن دراصل وہ ان مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

مندرجہ بالا اسباب کی روشنی میں دُنیائے عرب کی سیاست کا ایک مایوس کن نقشہ ابھرتا ہے لیکن جہاں عوام میں اپنے حقوق اور مفاد کا شعور بیدار ہو رہا ہے ان کے مستقبل سے مایوس ہونا تاریخ اور تقاضائے صداقت سے منکر ہونے کے مترادف ہے۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ دُنیائے عرب کے عوام کو صحیح نصب العین دیا جائے اور انھیں حقیقت پسندانہ طرز عمل سے آگاہ کیا جائے۔

عرب عوام کے اتحاد کی چند منفی اور مثبت بنیادیں ہیں۔ منفی بنیادوں میں سامراج دُشمنی، اسرائیل دشمنی اور دوسرے تمام عوامل شامل ہیں جن سے تمام دُنیائے عرب دوچار ہے۔ منفی بنیادوں سے عارضی اتحاد حاصل ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن مستقل اتحاد کے لیے مثبت بنیادوں پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ مثبت بنیادوں میں اسلام اور عربی زبان شامل ہیں۔ بد قسمتی سے عرب رہنماؤں نے منفی بنیادوں اور عربی زبان پر زیادہ زور دیا ہے اور اسلام کو فراموش کر دیا ہے۔ کیونکہ عربوں نے اپنے روایتی نظریۂ حیات کو تقریباً ترک کر دیا ہے اس لیے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اسے مغرب کے نظریات سے پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اشتراکیت، قومیت، جمہوریت وغیرہ نے ان میں نا اتفاقی پیدا کر دی ہے۔ اسلام میں ہر دور کے جدید تقاضوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت اور لچک پائی جاتی ہے۔ اگر اسلام میں جدید نظریات کی اچھی باتوں کو سمو دیا جائے تو یہ جمہوریت اور کمیونزم کے سیاسی و معاشی نظریات کا کامیاب جواب ثابت ہوگا اور اس کے احیا سے نہ صرف دُنیائے عرب بلکہ دُنیائے اسلام کے اتحاد کی راہیں کھل جائیں گی۔



XO-23-193-65-UD


صابنوں میں ایک سے ایک بہتر سلسلہ
Lily
SOAP
FLAKES
ZULFEQAR
ملبوسات کے لئے مثالی
SWAN
سوان
جراثیم کش
ہر مقصد کیلئے
موزوں ترین
صابن


کیریلین
double 2 two
ڈبل ٹو شرٹس
۱۰۰ فیصدی پولسٹر • استری سے بے نیاز • دھوئیے اور پہن لیجئے
ماہرین کی زیر نگرانی سلوائی کردہ ۔ کیریلین گارمنٹس
ماہرین کی زیر نگرانی
سلائی کردہ
کیریلین
گارمنٹس
کریم سلک ملز لمیٹڈ - کراچی

